... کے شہنشاہ — مسٹر ہنری فورڈ

میری زندگی کی کہانی

موٹر کاروں کے بادشاہ

مسٹر ہینری فورڈ کی لاجواب و انمول کتاب

مائی لائف اینڈ ورک

کا ترجمہ

پنڈت اوما دت۔ بی۔ اے ایل ایل۔ بی
سیلز منیجر۔ گنگا گلاس ورکس لمیٹڈ بالاوالی ضلع بجنور

پبلشرز گرگ اینڈ کمپنی دہلی

مطبوعہ کورونیشن پرنٹنگ ورکس دہلی

قیمت چار روپے

دو لفظ

میں اِس کتاب کو تجارت کی گیتا مانتا ہوں جس طرح سے ہر ہندو کے لئے اپنے دھرم شاستر وں مسلمان کے لئے قرآن اور عیسائی کے لئے بائبل پڑھنا نہایت ضروری قرار دیا گیا ہی۔ اسی طرح ہر شخص کے لیئے جو بیوپار کرتا ہے۔ یا اس میدان میں قدم رکھنا چاہتا ہے۔ خواہ ایک معمولی دوکاندار کی حیثیت سے یا ایک بہت بڑے کارخانہ کے مالک یا مینیجر کی شکل میں اس کا بڑے غور اور پوری توجہ کے ساتھ پڑھنا قطعی لازمی ہے۔ اس کو پڑھ کر اس کی آنکھیں کھل جاویں گی۔ ابھی تک لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ سستی لاگت سے کسی چیز کو بنا کر یا سستے داموں پر خرید کر مہنگے داموں پر بیچ لینے کو ہی تجارت کہتے ہیں۔ فورڈ صاحب نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ یہ بالکل نکما خیال ہے۔ اور یہ سب سے گھٹیا درجہ کی تجارت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تجارت روپیہ پیدا کرنے کا ایک بہت بڑھیا طریقہ اور ذریعہ ہے۔ اور خوب روپیہ کمانا کوئی پاپ بھی نہیں ہے۔ لیکن دوسروں کی آنکھوں میں دھول ڈال کر یا اُن کی ناواقفیت کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر دولت مند بننا بہت بُری اور ناواجب حرکت ہے۔ فورڈ صاحب خود کروڑپتی ہیں۔ مگر اُنہوں نے یہ روپیہ کس طرح کم سے کم لاگت پر اعلیٰ سے اعلےٰ درجہ کی کاریں مارکیٹ میں پیش کر کے پبلک کی سچی اور اصلی خدمت کر کے کمایا۔ اس کا مفصل حال اِس کتاب میں درج ہے۔

میری یہی آرزو ہے کہ ہندوستان کا ہر بیوپاری اور ہر کارخانہ دار اس کتاب میں بتائے ہوئے اصولوں کی پیروی کرتا ہوا نہ صرف خود خوب دھن دَولت کمائے اور سکھی ہو۔ بلکہ اپنے ساتھ کے کام کرنے والوں ملازموں، کاریگروں اور مزدوروں، غرضکہ ساری خلقِ خدا کا بھلا کرے۔ فورڈ صاحب نے لاکھوں روپیہ خود کمائے اور لاکھوں روپیہ اپنے نوکروں چاکروں اور کاریگروں میں بھی بانٹ دیئے

کیونکہ اُن کا ہمیشہ یہی اصول رہا ہے۔ کہ خود کھاؤ اور دوسروں کو بھی کھانے دو۔ ہر کارخانہ کو جتنا منافع ہوتا ہے اس میں مالکوں کے ساتھ ساتھ اُس میں کام کرنے والے کاریگروں اور مزدوروں کا بھی ضرور کافی حصّہ ہونا چاہئیے۔ کیونکہ اُن کی مدد ہمت کے بغیر کارخانہ کو کبھی اُتنا منافع نہ ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بھگوان نے اُن کے کام میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی دی ہے۔ اور اس وقت اُن کا نام دُنیا کے چند سب سے زیادہ کامیاب اور مشہور انسانوں میں شمار ہوتا ہے۔

آخر میں میں میسرز کرٹس براؤن لمیٹڈ پبلشرز۔ نیویارک کا بہت شکرگزار ہوں جنہوں نے مہربانی سے مجھ کو اس کتاب کا ہندوستانی زبان میں ترجمہ کرنے کی اجازت دے دی ہے۔

اوما دت

بھینٹ

اپنے پرم پوجیہ اور پیارے بھائی

پنڈت وشنودت جی۔ بی۔ اے۔ سول انجینیر

مینیجنگ ڈائرکٹر گنگا گلاس ورکس لمیٹڈ بالا والی ضلع بجنور

کے شری چرنوں میں

جو مسٹر ہنری فورڈ کی طرح بالکل سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور بلند خیال رکھتے ہیں اور جن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ حالانکہ انہوں نے اس کتاب کو پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء میں پڑھا۔ مگر یہ باتیں اُن کی خصلت میں بہت عرصے پہلے سے داخل ہو چکی ہیں ۱۹۱۸ء میں اس کارخانہ کے جاری ہونے کے دن سے لے کر آج تک برابر وہ فورڈ صاحب کے اصولوں پر عمل کرتے چلے آئے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے اندر گلاس کی لائن میں اس کارخانہ نے جو اتنا نام اور رتبہ پایا ہے اُس کی بڑی وجہ یہی ہے۔

اومادت

میری زندگی میں روشنی کے مینار

مسٹر ہینری فورڈ کے بارے میں اُن کے ایک گہرے دوست پادری ولیم ایل سٹیجر کی قلم سے ۱۹۳۵ء میں امریکہ کے مشہور رسالہ ٹرو سٹوری میں ایک آرٹیکل نکلا تھا جس کے چند دلچسپ حصے نیچے درج کئے جاتے ہیں۔

عام طور پر مسٹر ہینری فورڈ اپنے متعلق کچھ بتانا پسند نہیں کرتے۔ جب کبھی ان سے اس قسم کا سوال کیا جاتا ہے تو وہ اوّل اُس کو ٹال جائیں گے اور کوئی اور ذکر چھیڑ دیں گے۔ ورنہ ایک دو سرسری باتیں کہہ کر معاملہ ختم کر دیتے ہیں میں اُن کو مدّت سے جانتا ہوں۔ اور اکثر ملتا رہتا ہوں میں نے کئی مرتبہ ان سے مفصل بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوتی تھی۔ مگر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ سردی پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ شام کے جھٹ پٹے میں فورڈ صاحب اپنے ڈیربورن کے دفتر کی ایک کرسی پر آرام کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میرا بہت سالوں سے یہ پوچھنے کو دل کر رہا تھا کہ وہ کون سے شخص ہیں جنھوں نے آپ کی زندگی پر خاص اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ میں نے آج مناسب موقع اور وقت سمجھ کر یہ سوال کر ڈالا۔ اور میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب فورڈ صاحب نے بلا کسی تکلّف کے بڑی سادگی اور آسانی کے ساتھ یوں کہنا شروع کر دیا:۔

"دُنیا میں ہر شخص نے جس سے میرا واسطہ پڑا ہے میری مدد کی ہے۔ ایسا کوئی بھی شخص نہیں ہوگا جس کا میری زندگی کے ساتھ کبھی تعلق پڑا ہو اور وہ مجھ پر تھوڑا بہت اثر نہ چھوڑ گیا ہو۔ خاصکر چار عورتوں نے میری جتنی مدد کی ہے اس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ اور میں اُن کے احسان کا بدلہ عمر بھر ادا نہ کر سکوں گا یہ چار عورتیں ہیں میری ماں بہن۔ ساس اور بیوی۔ ان سب کی میری زندگی پر گہری چھاپ پڑی ہے۔"

"میری ماں میرے لئے اس دنیا میں اتنا کچھ کر گئی ہیں کہ ان سب کی تفصیل دینا میرے لئے ناممکن ہے"

لوگ ہم سے اکثر پوچھا کرتے ہیں۔ کہ ہم اپنی دوکانیں اس قدر بالکل بے داغ صاف ستھری اور شیشے کی طرح چمکتی کیوں رکھتے ہیں۔ میری ماں ہر کام پورے طریقہ اور سلیقہ کے ساتھ کیا کرتی تھیں۔ اور بہت صفائی پسند تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح سے میری ماں کا رسوئی گھر نہایت صاف ستھرا اور اُجیالا رہتا تھا۔ اور وہاں تنکا تک کبھی پڑا نظر نہ آتا تھا۔ اُسی طرح ہماری دوکانیں بھی رہنی چاہئیں۔ آپ چاہے اسے میرا وہم سمجھیں مگر میں تو اس کو دھرم کا ایک لازمی انگ ماننے لگا ہوں۔ اور مجھ کو یہ پختہ یقین ہو چلا ہے کہ لوگ گندی اور غلیظ جگہ کی نسبت صاف ستھری جگہ میں کئی درجہ زیادہ خوش اور نیک بن کر رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ویسے بھی یہ منافع کا سودا ہے۔ کیونکہ دیکھ لیجئے۔ ایک انجن کو جتنا آپ صاف سنوار کر رکھو گے اُتنا ہی وہ زیادہ چلے گا۔ اور بہتر کام دے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پرانی کہاوت ”بھگوان کی بھگتی سے اُتر کر دوسرے درجہ پر صفائی ہے“ بہت حد تک سچّی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ اور ملا دینا چاہئے کہ ”صفائی خوشحالی کی بھی جان ہے“ جہاں پر اور جس کام میں گندگی اور بے سلیقہ پن ہو گا وہاں پر بربادی اور تباہی کے آنے میں دیر نہیں“۔

ایک بار میری ماں نے مجھے صحت کے اصولوں کے متعلق ایسا اچھا سبق پڑھایا جو مجھے ساری عمر یاد رہے گا۔ جب میں سکول جایا کرتا تھا تو میری ماں میرا کھانا ساتھ باندھ دیا کرتی تھی۔ مگر اس کھانے میں صرف سادہ چیزیں ہوا کرتی تھیں۔ اور اس وجہ سے ہم سب بچوں کی صحت بہت عمدہ رہا کرتی تھی“۔

”مگر ایک دن میں اسکول سے گھر بیمار لوٹا۔ میری ماں کو بہت فکر ہو گیا۔ اور اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہوئی۔ آخر کار میری چوری پکڑی گئی۔ میرے بھائی نے ماں کے پاس شکایت کر کے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اصل بات یہ تھی کہ میں اپنی سادہ روٹی سکول کے ایک دوسرے لڑکے کے کیک کے ساتھ بدل لیا کرتا تھا۔ اور اُس کو کئی دن متواتر کھانے کی وجہ سے بیمار پڑا۔ ماں کو مجھ پر بہت غصّہ آیا اور اُنہوں نے مجھکو ایسی سخت سزا دی کہ میرے سدا کے لئے کان ہو گئے“۔

میں جانتا ہوں کہ فورڈ صاحب کے خوراک کے بارے میں چند خاص قانون اور قاعدے ہیں جن پر وہ بڑی سختی سے عمل کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ بھوک رکھ کر کھاتے ہیں بلکہ میں نے یہ آزما کر دیکھا ہے کہ جتنے ان کے کھانے والے ساتھی ہوتے ہیں ان سب میں کم کھانے والے سدا ہی نکلتے ہیں اور ایک دفعہ ایک دوست نے اُن کا اتنا کم کھانے اور بہت تڑکے اُٹھنے پر مذاق اُڑایا۔ اور

ہنسی ہنسی میں یہ بھی پوچھا کہ شہر میں آئے دن اتنی دعوتیں اور پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مگر اُن میں تمہاری شکل بہت کم دیکھنے میں آتی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ فورڈ صاحب نے مسکرا کر جواب دیا کہ میں شہر تو جاتا رہتا ہوں۔ مگر صرف ان موقعوں پر جبکہ میرے دوستوں میں سے کسی کی موت چھوڑ پن یا بیٹھ ہونے کی وجہ سے واقع ہو گئی ہو!

یہی وجہ ہے کہ گو فورڈ صاحب نے حال میں ہی اکہترویں سال میں قدم رکھا ہے تو بھی اتنی عمر ہو جانے کے باوجود اُن کی جسمانی حالت جیسی اچھی اور عمدہ ہے ویسی ساری امریکہ بھر میں بہت کم آدمیوں کی ہوگی۔ اب بھی اُن کی چال میں لچک اور پھرتی ہے۔ آجتک اُنہیں کبھی زکام نہیں ہوا، وہ ہر روز اپنے کام پر موجود ہوتے ہیں صبح ۷ بجے اُٹھتے ہیں اور کارخانہ کھلنے کے وقت جب کاریگر اور مزدور لوگ اپنے اپنے کاموں پر آرہے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے دفتر میں پہونچ چکے ہوں گے۔ یا کارخانہ کے اندر کہیں گھوم رہے ہوں گے۔ اُن کو کارخانہ کے اندر کاریگروں وغیرہ کو کام پر آتے ہوئے دیکھنے میں خاص مزہ آتا ہے۔ اور اسی لالچ سے وہ عام طور پر بہت سویرے اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ یہ سب عادتیں اُن کی ماں کی ڈالی ہوئی ہیں۔ اس لئے وہ اپنی ماں کے اتنے احسانمند ہیں کہ جب پرماتما کی کرپا سے وہ بہت دولتمند بن گئے تو اُنھوں نے ڈیربورن کے جس گھر میں اپنا بچپن گزارا تھا۔ اُس کی رسوئی گھر کے تمام فرش اور آنگن کو کُھدوا کر وہ سب چینی کی پلیٹیں اور پرچ پیالے وغیرہ نکلوا کر رکھ لئے۔ جن کی بابت اُن کو خیال پڑتا تھا کہ میری ماں ان کو استعمال کیا کرتی تھی، اور میری ماں کے ان کو ہاتھ لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اُس پُرانے گھر کا جو کچھ اور سامان اور فرنیچر ملا اُن کو بھی انہوں نے بڑی حفاظت سے سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے۔

تھوڑی دیر رُک کر فورڈ صاحب پھر کہنے لگے "میں ابھی تیرہ سال کا تھا۔ جب میری ماں پرلوک سدھار گئیں۔ اُس کے بعد میری بہن نے گھر بار کا چارج لیا اور ہم سب بہن بھائیوں کو پال پوس کر بڑا کیا۔ میں اُس کا ہمیشہ بہت احسانمند رہوں گا۔ کیونکہ اُس نے واقعی ہمارے ساتھ ایک سچی بہن کی طرح سلوک کیا"۔

"میری ساس کو میری قابلیت اور تجویزوں پر پورا بھروسہ تھا۔ میں ہمیشہ اپنی تجویزیں اور تجربوں کی رپورٹ اُس کے سامنے پیش کیا کرتا تھا۔ وہ میری سب باتوں کو بڑے دھیان سے سُنا کرتی تھی۔ اور

اتنی سیانی عورت تھی کہ وہ میری تمام باتوں کو یہاں تک کہ جو کچھ میں گیس انجنوں اور مشینوں کے متعلق بھی تلایا تھا۔ ان کو وہ بالکل اچھی طرح سے سمجھ لیتی تھی۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اوّل تو عام خلقت کے لئے کسی کار کے بنانے کا خیال کرنا ہی فضول ہے کیونکہ یہ کبھی ممکن نہیں ہوسکتا۔ ادھر گیس کی کار تیار کرکے دینے کی بابت تجویز سوچنا اور بھی بڑی حماقت ہے۔ مگر میری ساس بڑی سمجھدار اور عقلمند تھی۔ اور اُس نے ہمیشہ میری اسکیم کی حمایت کی۔"

"میری بیوی نے سدا میرا ساتھ دیا ہے۔ نہ صرف اس نے شروع شروع میں میری ہمّت باندھی ہے اور میرا حوصلہ بڑھایا ہے۔ جبکہ میں اپنی پہلی کار کے بنانے میں رات دن جُٹا رہتا تھا۔ مگر ہاتھ میں روپیہ پیسہ بہت تھوڑا تھا۔ اور باہر سے کوئی آسرا دینے والا یا دل بڑھانے والا نہ تھا۔ بلکہ اس نے آج تک برابر میری مدد کی ہے اور دلیری دی ہے۔ جب میں باگلے ایونیو کی ایک چھوٹی سی دوکان کے اندر اپنی پہلی کار تیار کر رہا تھا تو وہ راتوں کو جاگ کر میرے پاس بیٹھی رہا کرتی تھی۔ جب ہم شہر ڈیرائے کے اندر اپنی کار کو پہلے پہل چلانے لگے۔ تو ہم کو یہ دھمکی دی گئی کہ کیونکہ اس کار کے چلنے سے گھوڑے بدکتے ہیں اس لئے ہم کو گرفتار کر لیا جاوے گا۔ مگر میری بیوی نے ذرا پرواہ نہ کی۔ اور وہ اُن چند شخصوں میں سے تھی جو سب سے اول میرے ساتھ اس کار میں سوار ہوئے۔ اُس نے ہمیشہ مجھے نیک صلاح دی ہے۔ میری مدد کی ہے۔ اور میرا حوصلہ بڑھایا ہے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ وہ میری سب سے پہلی اور پکّی پجارن ہے۔ کیونکہ جب شروع دنوں میں کسی کو میرے تجربوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔ اور ہر شخص کو میری کامیابی میں بہت شک و شبہ تھا۔ اُس کو میری کامیابی کا پورا یقین اور بھروسہ تھا۔"

سکول کے اُستادوں نے بھی میری کافی مدد کی ہے۔ ہمارے سکول میں ایک ماسٹر جی ہوتے تھے جن کا نام کیلوگ تھا۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ مجھے اپنی جماعت کی کتابیں پڑھنے کی نسبت گھڑیوں کے پُرزے کھولنے اور گھڑیوں کو مرمّت کرنے کا زیادہ شوق ہے۔ تو اُنہوں نے مجھے جھڑکنے کی بجائے میری ہمت بڑھائی اور مجھے مشورہ دیا کہ مجھے خوب دل لگا کر یہ کام کرنا چاہیے۔ ایک اور ماسٹر جی نے جن کا نام وارڈ صاحب تھا۔ ایک دن مجھے نصیحت کی کہ تم یہ رقموں کے سوال لکھ کر کیوں نکالا کرتے ہو دماغ سے کیوں کام نہیں لیتے؟ ہمیشہ رقموں کے جوڑنے وغیرہ کے سوال زبانی نکالا کرو۔ تب سے میں ایسا ہی کرتا ہوں اور نتیجہ یہ ہے کہ اب مجھے ہمیشہ اپنے دماغ سے سوچ کر کام کرنے کی عادت پڑ گئی ہے

اور قمیص جوڑنے کے لئے بھی کاغذ پنسل استعمال نہیں کرتا۔"

فورڈ صاحب بڑے ایشور بھگت ہیں۔ اپنی ماں کی یادگار میں اُنہوں نے اپنے گاؤں گرین فیلڈ میں ایک چھوٹا سا گرجا گھر بنا رکھا ہے جس میں روز صبح ساڑھے آٹھ بجے سے لے کر نو بجے تک ایشور پرارتھنا ہوتی ہے۔ بائبل پڑھی جاتی ہے اور بھگوان کی مہما کے بھجن گائے جاتے ہیں۔ فورڈ صاحب کو ایشور بھگتی میں حد سے زیادہ یقین ہے اور اُن کا کہنا ہے کہ لوگوں کے بیشک مذہب جُدا جُدا ہوں اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔ مگر ہر سمجھدار شخص کے لئے ایشور کی ہستی میں یقین رکھنا اور دھرم کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنا اور کام کرنا نہایت لازمی ہے۔ چنانچہ بہت بار دیکھا گیا ہے کہ اگر وہ چند دنوں کی غیر حاضری کے بعد کہیں باہر سے لوٹتے ہیں اور گرجے کا وقت ہو گیا ہو تو وہ پہلے وہاں کی پرارتھنا وغیرہ میں شامل ہونگے اور بعد میں اپنے گھر جاوینگے۔

فورڈ صاحب کو پرندوں کا بہت شوق ہے۔ یہ پیار اور لگاؤ اُنہوں نے اپنے باپ سے سیکھا ہے۔ ابھی وہ تین برس کے تھے جبکہ ایک بار ان کا باپ اُنہیں سیر کرانے باہر لے گئے اور راستہ میں ایک جگہ اشارہ کر کے کہنے لگے وہ دیکھو۔ یہ گانے والی چڑیا کا گھونسلہ ہے۔ تب سے ہی اُن کو یہ چڑیا سب سے زیادہ پیاری ہے۔ حالانکہ انہوں نے اپنے احاطہ میں باون طرح کے پرندے پال رکھے ہیں۔ پرندوں کے لیئے ان کا دل بہت ہی نرم ہے اور وہ اُن کو ذرا سی بھی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک بار جب اُنہیں یہ پتہ چلا کہ کارخانہ کے اندر کسی جگہ پر ایک پرندے نے بچے دیئے ہیں تو آپ نے اُدھر کے جانے کا دروازہ ہی بالکل بند کرا دیا۔ تاکہ اُس پرندے کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ اسی طرح ایک مرتبہ فصل کھیتوں میں پک کر کٹنے کو تیار کھڑی تھی۔ مگر جب اُنہیں یہ خبر ملی کہ ان کھیتوں میں پرندے انڈے سے رہے ہیں۔ تو آپ نے فوراً یہ حکم دے دیا کہ فصل کاٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بھلے ہی کھڑی کی کھڑی خراب ہو جائے۔ پرندوں کے بارے میں اسی قدر دلچسپی لینے کا اثر یہ ہوا ہے کہ اب وہ صرف گھونسلہ دیکھ کر یا پرندہ کا گانا سُن کر جھٹ سے بتا دیتے ہیں کہ یہ فلاں پرندہ ہے۔ وہ ہمیشہ پرندوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کرتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو پرندوں سے بہت کچھ سبق سیکھ سکتے ہیں۔ پرندے جانتے ہیں کہ اصل دولت کیا ہے۔ انسان کو اس کی خبر نہیں۔ وہ روپیہ کو دولت سمجھے بیٹھا ہے۔ اور اس لئے اس کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔ مگر پرندوں کو پتہ ہے کہ دولت کا خزانہ تو

اصل میں قدرت ہے۔ اور اس کا دل کھول کر خوب فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ اسی لیے جب کام میں مندی آنے لگتی ہے تو انسان کا دم خشک ہونے لگتا ہے۔ مگر پرندوں کو اس کی ذرا پرواہ نہیں ہوتی۔ خواہ کیسا موسم ہو۔ وہ اپنے وقت پر برابر اپنی جگہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ کیونکہ اُن کو اس بات کی خبر ہے کہ قدرت کے خزانہ میں کبھی کمی نہیں پڑتی اور اس لئے وہ ہمیشہ خوش چہچہاتے رہتے ہیں۔ اور بڑے مزے سے اپنی زندگی کے دن گزارتے ہیں۔

فورڈ صاحب بچوں سے بھی بہت پیار کرتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ بچے ہماری اُمیدیں اور ہماری اُمیدوں کی صبح ہیں۔ وہ زمین کی سب سے نئی چیز ہیں اور قدرت اس سے بہتر چیز بنا کر ہمیں کبھی نہیں دے سکتی۔ ان کو دیکھ کر ہمارا حوصلہ بڑھتا ہے اور دل مضبوط ہوتا ہے۔ مصیبت اور مایوسی کے دنوں میں ان کے نزدیک رہ کر ہماری ڈھارس بندھتی ہے۔ یہ ہمیں زندگی اور تازگی بخشتے ہیں۔ انسان ان سے بہت کچھ نصیحت حاصل کرسکتا ہے۔ جتنا وہ ان کے پاس رہے گا اُتنا ہی اُس کے لئے اچھا ہے۔

آخر میں میں نے ان سے یہ سوال کیا کہ آپ کے دوست مسٹر تھامس اے ایڈیسن نے آپ کی زندگی پر کیا اثر ڈالا ہے۔ کیونکہ میں یہ جانتا تھا کہ فورڈ صاحب مسٹر ایڈیسن کی اُتنی ہی عزت کرتے ہیں جتنی کہ مسٹر ایڈیسن فورڈ صاحب کی۔

جواب میں اُنہوں نے فرمایا کہ "نوجوانی میں میری سب سے بڑی یہی خواہش تھی کہ میں بھی کبھی ایڈیسن جیسا لائق اور ہوشیار بنوں۔ اور سیانی عمر میں آ کر تو وہ میرے دوست بن گئے تھے۔ گو پہلے اُن کو بجلی کی دُنیا کا جادوگر پکارتی تھی۔ اور ہر شخص کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ آئندہ زمانہ میں بجلی کا ہی بول بالا رہے گا۔ انہوں نے میرے منہ سے گیسولین کار بنانے کا خیال سن کر میری خوب پیٹھ ٹھونکی۔ اور حوصلہ بڑھایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ میرا دل بہت ڈگمگا رہا تھا۔ اور چاروں طرف سے میرے کان میں یہی آواز پڑتی تھی کہ یہ بالکل نکما خیال ہے اس میں کامیابی کی کوئی صورت نہیں اور مجھ کو اسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ میرا دل ٹوٹ چکا تھا اور ایک طرح سے میں اس تجویز کو ترک کر دینے کا ارادہ کر چکا تھا۔ ایسے نازک وقت میں مجھے ایک ایسے جانکار کی سخت ضرورت تھی۔ جس کو اس علم کی سچی واقفیت ہو۔ جو میری بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کو کنارے پر لگا سکے۔ میرے گرے ہوئے حوصلہ کو اُبھار سکے۔ اور مجھے دلیری اور ڈھارس دے کر پاؤں پر کھڑا کر سکے یہ کام ایڈیسن صاحب نے کیا۔"

"مجھے خود تو گیس لیس کار کی کامیابی میں رتّی بھر بھی شک وشبہ نہ تھا۔ لیکن چاروں طرف سے لوگوں کی باتیں سُن سُن کر میرا دل بیٹھتا جاتا تھا۔ یہ میری زندگی کا سب سے نازک موقعہ تھا۔ خوش قسمتی سے انہیں دنوں میں مجھکو ایڈیسن انجینیروں کی سوسائٹی (جس کا میں بھی ممبر تھا) کے ایک جلسہ میں شریک ہونے کے لیئے نیویارک جانا پڑا۔ وہاں پر کسی نے باتوں باتوں میں میری گیس موٹر کار کا ذکر بھی چھیڑ دیا۔ اس وقت بھیڑ بہت تھی۔ صرف سرسری طور پر موٹر کار کے واسطے گیس انجن کی تجویز سُن کر بھلا ایڈیسن صاحب فوراً کیسے یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ بہت اچھا خیال ہے۔ لیکن جب میں نے بعد میں ان کے سامنے اپنی ساری تجویز کھول کر بیان کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور میز پر زور سے مُکّا مار کر کہنے لگے۔ کہ واہ میرے نوجوان! تم نے کمال کر دیا ہے۔ واقعی تمہاری تجویز نہایت عمدہ ہے۔ اس پر جمے اور ڈٹے رہو۔ اور اس کو مکمل کر کے عملی جامہ پہناؤ۔ تمہیں حد سے زیادہ کامیابی ہوگی۔ کیونکہ بجلی کی کاریں صرف وہیں پر استعمال ہو سکیں گی۔ جہاں نزدیک میں بجلی کی طاقت پیدا کرنے والے اسٹیشن ہوں گے۔ سٹوریج بیٹری اس قدر بھاری ہے کہ اس سے کام لینا مشکل ہے۔ بھاپ کی کاریں بھی کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ ان کے لئے بائلر اور آگ کی ضرورت ہے۔ مگر تمہاری کار اپنے اندر بالکل مکمل ہے، اور اس کو باہر سے کسی چیز کی مدد درکار نہیں ہے۔ نہ آگ۔ نہ بائلر۔ نہ دھواں اور نہ بھاپ۔ بھئی تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، تم ضرور بازی لے جاؤ گے۔ بس تم لگے رہو۔ اس خیال کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ جیت تمہاری ہی"۔

اس رات ایڈیسن صاحب کا میز پر مکّا مار کر یہ باتیں کہنے سے میری جان میں جان پڑ گئی۔ اور میرا حوصلہ بندھ گیا۔ ابھی تک میں بہت سوچ بچار میں پڑا ہوا تھا اور کچھ فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ دُنیا کا سب سے بڑا ایجاد کرنے والا یہاں تک کہتا ہے کہ میری گیس موٹر کار بجلی کی موٹر کار سے بھی بڑھیا نکلے گی۔ وہ لمبے لمبے فاصلے چل سکے گی۔ اور ان کاروں کو ہر جگہ آسانی سے ہائیڈ رو کاربن مل سکے گی تو پھر مجھے کیا ڈر ہے۔ میرے سب خدشے اور اندیشے دور ہو گئے۔ میں نے جم کر یہ کار بنانا شروع کر دیا۔ نتیجہ ساری دنیا کے سامنے ہے"۔

اتنا کہہ کر فورڈ صاحب بولے "سو بھائی دیکھ لو۔ جب کسی کو ضرورت آن پڑتی ہے تو وقت پر کوئی نہ کوئی مددگار پیدا ہو ہی جایا کرتا ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے۔ اگر ہم سیکھنے والے ہوں تو سکھلانے والوں کی کمی نہیں۔ اگر ہم دوستی اور محبت کرنے والے ہیں تو دوسرے بھی ہم سے ضرور دوستی اور محبت کریں گے۔ ہم سب کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ ہمیں بچوں کی ضرورت ہے۔ دوستوں کی بھی ضرورت ہے۔ سرمایہ دار کو

کاریگر اور مزدور کی ضرورت ہے۔ کاریگر اور مزدور کو سرمایہ دار کی ضرورت ہے۔ ایک آدمی کو اپنی بیوی کی ضرورت ہے۔ بیوی کو اپنے آدمی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ہر قوم کو دوسری قوم کی ضرورت ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ اگر دنیا میں ہر طرف سے ہمیں مدد نہ ملتی تو ہم کبھی فورڈ کار نہ بنا سکتے تھے۔"

اصل بات کیا ہے؟

ہمیں اپنے ملک کے اندر روزگار بڑھانے کا خیال تھوڑے عرصے سے ہی ہوا ہے۔ کہنے کو ہم خواہ کتنی ہی ڈینگیں کیوں نہ مار لیں لیکن اب تک یہ ساری شاندار ترقی آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ یہ درست ہے کہ جو کچھ ہم آج تک کر پائے ہیں اس کو دیکھ کر ہمیں واقعی شاباش ملنی چاہیئے۔ لیکن جب ہم اس کا مقابلہ اُس کام کے ساتھ کرتے ہیں جو ابھی کرنا باقی ہے تو اُس کے سامنے ہماری پچھلی کارگزاریوں کی کچھ حیثیت نہیں رہتی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ملک میں اس وقت جتنے کارخانے چل رہے ہیں اُن سب کو ملا کر اُن میں جتنی بجلی کی طاقت خرچ ہو رہی ہے اُس سے کہیں زیادہ طاقت ہم اکیلے زمین جوتنے میں استعمال کر کے ضائع کر رہے ہیں تو اس سے ہمیں تھوڑا بہت اندازہ اس بات کا لگ سکتا ہے کہ ہمارے لئے ترقی کرنے کا ابھی آگے کتنا وسیع میدان کھلا پڑا ہے اب جبکہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں گڑبڑ پھیلی ہوئی ہے اور چاروں طرف کھلبلی مچ رہی ہے یہ ایک بہت اچھا موقع ہے کہ ہمارے سامنے جو کام کرنے کو ہے اُس کی نسبت ہم اپنے پچھلے تجربہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے عمدہ سے عمدہ تجویزیں سوچ کر نکالیں۔

جب کوئی آدمی ہمارے سامنے بجلی کی طاقت مشینوں اور صنعت کے بڑھانے کا ذکر کرتا ہے تو ہماری آنکھوں کے سامنے ایک ایسی مردہ اور سر سے پاؤں تک دھاتوں میں ڈھلی ہوئی دنیا کا نظارہ کھنچ جاتا ہے جہاں سے بے شمار بڑے بڑے کارخانے قائم ہو جانے کی وجہ سے درخت

پھول پتے۔ پرندے اور ہرے بھرے کھیت سب ایک دم غائب ہو گئے ہیں گویا اس دنیا میں
ہر جگہ صرف دھاتوں کی بنی ہوئی مشینیں ہی چلا کریں گی اور لوگ بھی مشینوں کی طرح کام کرتے ہوئے
نظر آیا کریں گے۔ میں ان سب باتوں کو نہیں مانتا۔ میرا خیال یہ ہے کہ جب تک ہم مشینوں اور
ان کے استعمال کو اور بھی اچھی طرح سے سمجھ نہیں لیتے۔ اور جب تک ہمیں اس بات کا بالکل ٹھیک
طور پر پتہ نہیں لگ جاتا کہ ان کے ذریعہ ہم اپنی زندگی کو کہاں تک دلچسپ بنا سکتے ہیں تب تک
ہم درختوں۔ پرندوں۔ پھلوں اور ہرے بھرے کھیتوں کا ہرگز پورا پورا لطف نہیں اٹھا سکتے۔

میری سمجھ میں ہم لوگوں نے اپنی زندگی کی تمام دلچسپیوں کو یہ سوچ کر پہلے ہی کافی سے زیادہ
برباد کر لیا ہے کہ زندگی بسر کرنے اور زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے چیزیں حاصل کرنے میں ہمیشہ کچھ
نہ کچھ مخالفت رہتی ہی۔ ہم وقت اور اپنی طاقت اتنی بے کار ضائع کر رہے ہیں کہ زندگی کا لطف اٹھانے
کے لئے ہمارے اندر باقی کچھ نہیں رہتا۔ طاقت۔ مشینیں۔ روپیہ اور مال اسباب یہ سب چیزیں ہمیں
اسی حد تک اچھی لگتی ہیں۔ جہاں تک ہمیں ان سے زندگی بسر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یعنی یہ دل کی ایک
خواہش پوری کرنے کے محض ذریعہ ہیں۔ مثال کے طور پر میں ان مشینوں کو محض مشینیں نہیں سمجھتا جو مارکیٹ
میں میرے نام سے مشہور ہیں۔ اگر ان کے بنانے میں میری صرف اتنی ہی غرض ہوتی تو بہتر تھا کہ میں
کچھ اور کر لیتا۔ میں ان مشینوں کو دنیا کے سامنے پیش کر کے یہ اصول ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ

میرا یہ اصول صرف کہنے سننے کی بات نہیں ہے بلکہ خالص قیمتی چیز ہے جس پر عمل کر کے
دنیا انسان کی زندگی بسر کرنے کے واسطے ایک بہت بہتر جگہ بن جائے گی۔ فورڈ موٹر کمپنی کی اتنی
غیر معمولی کاروباری ترقی میرے اس اصول کو ایسی اچھی طرح سے ثابت اور ظاہر کرتی ہے کہ معمولی
سے معمولی عقل کا آدمی بھی اس کو بخوبی سمجھ جائے گا اور اس کے درست ہونے کی بابت کسی قسم کا شک
کرنے کی ذرا بھی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ آج تک مجھ کو موجودہ صنعت روپیہ اور سوسائٹی
کے نظام ہرا نہیں سکے۔ اس لئے اس لحاظ سے ان پر نکتہ چینی کرنے کا مجھ کو حق حاصل ہو گیا ہی۔

اگر مجھے صرف اپنا مطلب سدھ کرنے کا خیال ہوتا تو سوسائٹی کے اندر جیسا آج کل نظام چل رہا ہی
اس میں کچھ تبدیلی کرنے کے لئے میں بالکل زور نہ دیتا۔ اگر مجھے صرف روپیہ کمانے کی فکر ہوتی تو موجودہ نظام
ہی بالکل ٹھیک ہے کیونکہ اس میں بھی میں دھڑا دھڑ روپیہ کما رہا ہوں لیکن مجھے عام خلقت کی خدمت کرنے کی

دشمن ہے کیونکہ موجودہ نظام میں مال اور محنت دونوں بہت رائیگاں جا رہے ہیں اور بہت سے لوگوں کو
اُن کی محنت اور مزدوری کا پورا معاوضہ نہیں ملتا اس لئے اس کے ذریعہ خلقت کی نہایت عمدہ خدمت
نہیں ہو سکتی اور اس کے باوجود نتیجہ پھر بھی کچھ نہیں نکلتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس معاملہ پر اچھی طرح سے
غور کر کے نئی نئی تجویزیں نکالی جاویں اور اس میں جو نقص ہوں اُن کو رفع کیا جائے۔

دنیا میں لوگ ہمیشہ سے نئے خیالوں اور اصولوں کی کھلی اُڑاتے چلے آئے ہیں، اسلئے اگر دنیا
میری باتیں سُن کر ہنستی ہے تو میں اس سے ناراض نہیں بلکہ میں خود یہ کہتا ہوں کہ نئے خیالوں اور
اصولوں کو قبول کرنے سے پہلے اُن کو اچھی طرح سے ٹھوک بجا کر دیکھ لینا چاہیئے اور جب تک وہ درست
اور سچے ثابت نہ ہوں اور کسوٹی پر پورے نہ اُتریں تب تک اُنہیں ہرگز ماننا نہیں چاہئے۔ اس سلسلے میں
انسان کا شکی مزاج ہونا بہت اچھا رہتا ہے۔ شکی مزاج سے میری مراد یہ ہے کہ انسان سوچ سمجھ کر قدم رکھے
اور دوسرے کے کہنے پر اندھا دھند اعتبار نہ کر لے۔ ہماری ساری تہذیب اور ترقی کی تہ میں یہی ایک قاعدہ
کام کرتا ہوا نظر آئے گا۔ دنیا کی موجودہ بہت سی بھاری مصیبتوں کی وجہ یہی ہے کہ نئے خیالوں اور اصولوں کو
ہوشیاری کے ساتھ جانچ پڑتال کئے بغیر کہ آیا وہ اچھے ہیں یا بُرے قبول کر لیا گیا ہے۔ کوئی خیال یا اصول
صرف اس لئے اچھا نہیں کہلاتا کیونکہ وہ پُرانا ہے نہ ہی وہ صرف اس لئے بُرا بن جائے گا کیونکہ وہ نیا ہے
لیکن اگر ایک پُرانا خیال یا اصول خوب کام دے رہا ہے تو اُس کو کسی حالت میں بھی ترک نہیں کرنا چاہئے
ایک خیال یا اصول ویسے تو بڑی انمول چیز ہے لیکن آخر ہے تو صرف ایک خیال یا اصول۔ ہر ایک
آدمی جو ذرا بھی عقل رکھتا ہے ایک خیال یا اصول سوچ کر نکال سکتا ہے مگر اس کی اصل قدر تب ہی معلوم
ہوتی ہے جبکہ اُس کو کوئی عملی شکل میں ڈھال کر فائدہ اُٹھاتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس وقت مجھے سب سے بڑی لگن پبلک کے سامنے پورے طور پر یہ ظاہر کر دینے کی لگی ہوئی ہے کہ
جن اصولوں پر چل کر ہم نے آج تک کام کیا ہے وہ ہر جگہ۔ ہر موقع اور ہر کام میں زیادہ سے زیادہ استعمال
ہو سکتے ہیں اور کہ وہ صرف موٹر کاروں ٹریکٹروں کے واسطے خاص نہیں بنائے گئے بلکہ عام ہیں اور ہر
کاروبار میں ہر مقام اور ہر وقت میں ایک جیسے مفید اور فائدہ مند ہیں۔ اس امر کا مجھے پختہ یقین ہے کہ قدرتی
طور پر ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے میں ان اصولوں کو ایسی اچھی طرح سے ثابت کر کے دکھا دینا چاہتا ہوں کہ
سب لوگ ان کی سچائی کے قائل ہو جائیں اور یہ مان لیں کہ یہ کوئی نئے اصول نہیں بلکہ قدرتی طور پر

ایسے ہی ہونے چاہئیں۔

قدرت نے یہ قاعدہ بنایا ہے کہ ہر انسان کو کام کرنا چاہیئے اور اُس کے دل میں یہ خیال پختہ بیٹھ جانا چاہیئے کہ دُنیا میں صرف ایمانداری کے ساتھ محنت کرنے سے خوشحالی اور خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ عام طور پر انسان کے سر پر جو مصیبتیں پڑا کرتی ہیں اُن میں سے اکثر کی وجہ یہی ہوا کرتی ہے کہ انسان اس قدرتی اصول پر عمل کرنے سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ میرے دماغ میں ابھی تک کوئی ایسی معقول تجویز نہیں آئی جو اس قدرتی اصول کو پورے طور پر قبول کرنے کے بغیر کامیاب ہوتی ہوئی نظر آسکے۔ اس لئے اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ ہم سب کے لئے کام کرنا لازمی ہے۔ جو کچھ ہم آج تک کر پائے ہیں وہ صرف ہمارے اس قاعدے پر ڈٹے رہنے کا نتیجہ ہے کہ جب کام کئے بغیر ہمارا چھٹکارا نہیں تو پھر کیوں نہ اُسے عقل کے ساتھ اور سوچ سمجھ کر کریں اور کہ جتنا ہم بہتر کام کریں گے اُتنی ہی ہماری حالت بھی بہتر بنے گی۔ میرے خیال میں یہ باتیں اتنی سیدھی سادی اور معمولی ہیں کہ ایک موٹی عقل کا انسان بھی ان کو بخوبی سمجھ سکتا ہے اور ہم سب کو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کو قبول کئے بغیر دُنیا میں ہمیں کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔

میں ایک ریفارمر (سدھار کرنے والا) نہیں۔ میری رائے میں دُنیا کو سدھارنے کی حد سے زیادہ کوششیں ہو رہی ہیں اور ہم ریفارمروں کی ضرورت سے زیادہ عزت اور قدر کر رہے ہیں۔ دُنیا میں اس وقت دو طرح کے ریفارمر موجود ہیں اور دونوں سوسائٹی کے لئے وبال ہیں جو شخص اپنے آپ کو ریفارمر کہتا ہے وہ سوسائٹی کے موجودہ نظام کو ایک دم توڑ مروڑ کر چکنا چور کر دینا چاہتا ہے اس کی حالت اُس آدمی جیسی ہے جو اپنی ساری قمیض کو اس وجہ سے چاڑ پھینک دینے کے واسطے تیار ہے۔ کیونکہ اُس میں بٹن کے سوراخ تنگ ہونے کے سبب کالر بٹن ٹھیک نہیں لگتا۔ اُس کو کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ میں ان سوراخوں کو ذرا اور بڑا کیوں نہ کر لوں۔ اس قسم کے ریفارمر کو کبھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ زمانہ کا جو رُخ ہے اُس کی اصلیت اور ریفارم کے کاموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اگر ایک ریفارمر ہر سوال یا معاملہ کی اصلیت کے پیچھے چلنے لگے تو اُس کا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جائے۔ اُس کو سوسائٹی کی اصل صورت کی جانب سے لازمی طور پر آنکھیں بند رکھنی پڑیں گی ورنہ اُس کا کام ہو نہیں سکتا۔

۱۹۱۴ء سے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے دماغوں کے اندر ایک نئی قسم کا اُجالا پیدا ہو گیا ہے اور وہ پہلی مرتبہ عقل سے سوچنے سمجھنے لگے ہیں۔ اُن کی اب آنکھیں کھل گئی ہیں اور اُن کو محسوس ہونے لگا ہے

کہ ہم بھی دُنیا کے اندر آئے ہیں۔ تب کھلے بند ہو کر انھوں نے اپنی سوسائٹی کے رنگ ڈھنگ کو باریک نگاہ سے دیکھنا اپنا حق سمجھا۔ اور جب انھوں نے غور سے دیکھا تو انہیں موجودہ دُنیا کے اندر بہت سے نقص نظر آئے۔ سوسائٹی میں میل جول کے قاعدوں کی نسبت ہر شخص کو نکتہ چینی کرنے کا پورا اختیار ہے ایک نکتہ چیں کے ہاتھ بڑی طاقت ہوتی ہے جس کا نشہ شروع شروع میں انسان کے سر کو چڑھ جایا کرتا ہے خاص کر نوجوان نکتہ چیں کی حالت میں تو غضب ہی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے دل میں یہ خیال پکا گھر کر لیتا ہے کہ موجودہ نظام جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دینا چاہیئے اور اس کی جگہ نیا نظام آنا چاہیئے۔ چنانچہ اس لہر میں بہ کر روس کے اندر سچ مچ ایک نئی دنیا قائم کر دی گئی۔ ریفارم (سدھار) کرنے والوں کا کام جانچنے کے واسطے وہاں سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔ اس نئے روس میں ہم دیکھتے کیا ہیں کہ زندگی کے ہر محکمہ اور کام میں کثرت رائے نہیں بلکہ قلت رائے کی حکومت ہے اور دوسرے گو انسان نے قدرت کے قانون کے خلاف سوسائٹی کے قانون بنانے کی کوشش کی تھی مگر قدرت نے زار (روس کا بادشاہ) سے بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ ان کو رد کر دیا۔ قدرت نے تمام سوویٹ ری پبلک کو روند کر کے رکھ دیا ہے کیونکہ اُس نے قدرت کی طاقت کا سامنا کرنا چاہا تھا اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے لوگوں کو اُن کی محنت کا پورا پورا معاوضہ وصول کرنے کے حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لوگ یہ کہنے لگ گئے ہیں کہ اب روس کو ذرا اور محنت سے کام کرنا پڑیگا مگر صرف اتنا کہہ دینے سے معاملہ کی اصلی صورت ظاہر نہیں ہوتی۔ اصلیت یہ ہے کہ گو بیچارہ روس اب بھی بڑی محنت سے کام کر رہا ہے مگر اس کے کام کی کچھ قدر نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پر کوئی دل کھول کر کام کرنے نہیں پاتا۔ یونائٹڈ اسٹیٹ میں ایک کامگار آٹھ گھنٹہ روزانہ کام کرتا ہے مگر روس میں اُسے بارہ سے چودہ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ یونائٹڈ اسٹیٹ امریکہ میں اگر کامگار ایک دن یا ایک ہفتہ چھٹی کرنا چاہتا ہے اور اس کیلئے اُس کی جیب میں کافی پیسے ہیں تو اسکو کوئی منع نہیں کر سکتا۔ مگر روس میں سوویٹ ری پبلک کے ماتحت کارگار کو کام پر ضرور جانا پڑتا ہے۔ خواہ اُس کا دل کرے یا نہ۔ وہاں کسی باشندے کو آزادی حاصل نہیں۔ سب کو قانون اور قاعدوں میں جکڑے ہوئے جیل خانہ جیسی بندھی چال والی خشک اور پھیکی زندگی ڈنڈے کے زور بسر کرنی پڑتی ہے اور اچھے بُرے یا چھوٹے بڑے کی بالکل کوئی تمیز نہیں سبھی کو ایک لکڑی سے ہانکا جا رہا ہے۔ یہ غلامی نہیں تو اور کیا ہے آزادی کا مطلب ہے لگاتار مناسب عرصہ تک کام کرنے کا اور اس طرح سے معقول آمدنی پیدا کرنے کا حق اور اپنی زندگی کے چھوٹے موٹے کاموں کو بے فکری اور چین کے ساتھ کرنا یا ان دونوں کے اندر

اسی قسم کے دوسرے بہت سارے آزادی کے اختیاروں کے اکٹھے مل جانے کا نام سب سے اونچی بڑی آزادی ہے۔ معمولی درجہ کی آزادی میں انسان کو اس قسم کے چھوٹے اختیار حاصل ہوتے ہیں۔ مگر ان کو پاکر لوگ اپنی زندگیاں بڑے مزے سے گزارتے ہیں۔

عقل اور تجربے کے بغیر روس کا بھلا کب تک گزارہ ہوسکتا تھا۔ جوں ہی اُس نے کمیٹیوں کے ذریعے کارخانوں کو چلانے کی کوشش کی سب کے سب فیل ہوکر بند ہوگئے کیونکہ ان کمیٹیوں میں تیار مال کی تعداد بڑھانے اور کام کی باتوں کے بجائے فضول بحث مباحثوں میں بہت وقت ضائع ہوا کرتا تھا۔ ان کمیٹیوں نے جوں ہی لائق کاریگروں کو نکالا ساتھ میں لاکھوں من قیمتی کچے مصالحے بھی رائیگاں چلے گئے۔ ان عقل کے اندھوں نے جوش میں آکر لوگوں کو بھوکا مروادیا۔ سوویٹ گورنمنٹ اب انجینیروں۔ انتظام کرنے والوں۔ فورمینوں اور سپرنٹنڈنٹوں کو جن کو اس نے پہلے کان پکڑ کر باہر نکال دیا تھا۔ منتیں کرکے واپس بلا رہی ہے اور اُن کو بڑی بڑی تنخواہیں دینے کا لالچ دے رہی ہے لیکن پھر بھی کوئی آنے کو تیار نہیں۔ بولشویزم نے جن دماغ اور تجربہ رکھنے والے لائق آدمیوں کو کل دھکے مارے تھے آج اُنہیں کو چلا چلا کر واپس منگوا رہی ہے۔ روس میں اس "ریفارم" کا بس یہی ایک نتیجہ نکلا کہ ملک کے اندر زیادہ مال بنانے کے راستہ میں نئی رکاوٹ کھڑی ہوگئی۔

اس ملک کے اندر ایک ایسی خطرناک اور منحوس جماعت ہے جو ہاتھ کی کار کرنے والوں اور ان ہاتھ کی کرنے والوں کے واسطے نئے نئے کام دماغ سے سوچنے اور نکالنے والوں کے درمیان گھسنا چاہتی ہے جس اُلٹے چکر میں پھنس کر روس نے اپنے ہاں سے عقلمند تجربہ کار اور لائق آدمیوں کو ملک سے باہر کردیا تھا۔ یہی اس وقت اس ملک (امریکہ) میں بڑے زور سے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں پھیلا رہا ہے۔ ہمیں ہرگز کسی پردیسی تباہ کرنے والے اور لوگوں کو خوش دیکھ کر جلنے والے کو ہماری قوم کے اندر بگاڑ پیدا کرنے اور ہم کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑا بھڑا دینے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ یاد رکھو کہ اتفاق کے ساتھ رہنے میں ہی امریکہ کی طاقت اور آزادی ہے۔ اس کے خلاف ہمارے ملک میں ایک دوسرے قسم کا ریفارمر موجود ہے جو اپنے آپ کو ریفارمر نہیں کہتا مگر مزہ یہ ہے کہ وہ ہر طرف سر سے پاؤں تک تبدیلی چاہنے والے ریفارمر کے ساتھ سب باتوں میں پورا پورا ملتا ہے۔ میری مراد پرانی چال کے مریدوں سے ہے جس کو یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ وہ اور بولشویزم میں یقین رکھنے والا بالکل ایک ہی تھیلی کے بٹے ہیں وہ کوئی پرانا زمانہ جو اس کے دماغ میں ہے

پھر واپس آیا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ اُس وقت حالت سب سے بہتر تھی بلکہ اس لئے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کو اُس زمانہ کا سب حال معلوم ہے۔

ایک گروہ بہتر دُنیا قائم کرنے کی غرض سے موجودہ تمام دنیا کو ایک سرے سے بالکل ملیامیٹ کر دینا چاہتا ہے اور دوسرا موجودہ دُنیا کو اتنا اچھا سمجھتا ہے کہ اُس کی رائے میں اس کو قطعی نہ چھیڑ کر اسی طرح چلنے گویا بربادی کے منہ میں جانے دینا چاہئے۔ دوسرے گروہ کو بھی پہلے کی طرح آنکھیں کھول کر نہ دیکھنے کی وجہ سے غلطی لگ رہی ہے اس دُنیا کو ملیامیٹ کر دینا عین ممکن ہے مگر اس کی جگہ ایک نئی دُنیا کھڑی کر دینا ممکن نہیں۔ دُنیا کو آگے بڑھنے سے روک دینا ممکن ہے لیکن تب اس کو پیچھے ہٹنے یعنی برباد ہونے سے روکنا ممکن نہیں۔ یہ اُمید کرنا حماقت ہے کہ اگر موجودہ نظام بالکل اُلٹ پلٹ کر دیا جائے تو پھر ہر ایک کو پیٹ بھر کر کھانا مل جایا کرے گا کیونکہ اگر اس کا بالکل خاتمہ ہی ہو جائے تو پھر سب کی آمدنی کافی بڑھ جائے گی۔ آفت یہ ہے کہ یہ ریفارمر اور پُرانی چال کے مرید زندگی اور سوسائٹی کی اصلی حالت اور سچی باتیں جاننے سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔

ہمیں ہمیشہ یہ ضروری احتیاط کرنی چاہئے کہ جب ہمارے سامنے کوئی پُرانی چال پر کیا ہوا کام یا معاملہ آئے تو ہمیں بلا دیکھے بھالے ہرگز نہیں مان لینا چاہئے کہ یہ ضرور ہی ٹھیک ہوگا اور عقل کی بات ہے بھی یہی۔ پچھلے چند سالوں میں ہمیں ہر طرح کے سبز باغ دکھلائے گئے ہیں اور ہمارے سامنے ترقی اور خوشحالی کے ایسے عمدہ عمدہ نظارے اور نقشے کھینچے گئے ہیں کہ بے اختیار منہ سے واہ واہ نکلتی ہے۔ مگر نتیجہ وہی نکلا ٹائیں ٹائیں فش گویا یہ سب کچھ چھلاوا تھا اور ترقی کے راستے پر آگے بڑھنا نہ تھا۔ ہمیں بڑی میٹھی میٹھی باتیں سُنائی گئیں جیسے اب ہمارے سب دُکھ درد دور ہو جائیں گے لیکن اُن پر اعتبار کر کے جب اُن کے پیچھے لگ کر چلنے لگے تو گھر کے چولھے میں آگ جلنے کی بھی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ تب لوگ اس قسم کے زمانہ کی یاد سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے اور اس بات کا پُرانی چال کے مریدوں نے خوب فائدہ اُٹھایا اور اس کا ذکر کر کے بڑے لمبے چوڑے وعدے اُنھوں نے دُنیا کے ساتھ کئے کہ اب ہم پھر وہی "پُرانا زمانہ" لے آئیں گے جو بہت اچھا تھا۔ اس "پُرانے زمانہ" کا عام طور پر یہ مطلب ہوا کرتا ہے کہ ہمارے کام اور قاعدوں میں جو کمزوری اور خرابیاں پہلے تھیں وہ پھر سے ہماری سوسائٹی کے اندر داخل ہو جاویں اور کیونکہ ایسے شخص بالکل لمبی سوچ کرنے والے نہیں ہوتے اس لئے ان کو کبھی کبھی ہر سوال اور معاملہ کی اصلیت پہچان کر "عملی طور پر کام کرنے والے آدمی" سمجھ لیا جاتا ہے۔ ایسے آدمیوں کے ہاتھ میں جب حکومت اور طاقت کی باگ ڈور آ جاتی ہے تو لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ اب ہمارے دن پھر گئے ہیں اور آئندہ سب کام ٹھیک

ٹھیک ہوا کریں گے۔

دنیا میں سب سے اوّل اور ضروری تین چیزیں ہیں۔ کاشتکاری۔ مال تیار کرنا اور بار برداری ان کے بغیر سوسائٹی ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ ان کے ذریعہ دُنیا میں ایک دوسرے سے میل جول قائم ہے۔ زمین سے پیداوار کرنا کارخانوں میں مال تیار کرنا۔ اور ایک جگہ سے دوسرے مقام پر چیزیں ڈھونا۔ یہ کام باوا آدم کے وقت سے ہوتے چلے آئے ہیں اور آج بھی انسان کی ضرورتیں ان کے بغیر قطعی پوری نہیں ہوسکتیں۔ یہ ہماری جسمانی زندگی کے جان پران ہیں جب یہ نہ رہیں گے تو ہماری سوسائٹی بھی ختم ہو جائے گی۔ بے شک موجودہ نظام کی وجہ سے آج دُنیا کے اندر بہت سی باتوں میں خرابی پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن اگر بنیادیں پختہ ہوں تو ہمیں حالت سدھر جانے کی اُمید رکھنی چاہئے۔ مگر ہمیں سخت مغالطہ یہ ہو رہا ہے کہ ہم بنیادوں کو بدل ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس طرح سے سوسائٹی کی ترقی کے راستہ میں کانٹے بوتے ہیں۔ سوسائٹی کی بنیادیں ہیں انسان اور پیداوار کرنے مال تیار کرنے اور مال کو ڈھونے کے وسیلے۔ جب تک کاشتکاری۔ کارخانے اور بار برداری دنیا میں موجود ہیں تب تک دُنیا ہر قسم کی مالی تکلیفوں یا سوسائٹی کے رسم و رواج میں تبدیلیوں کے باوجود قایم رہے گی جتنا اچھا ہم اپنا فرض ادا کریں گے، اُتنی ہی دُنیا بہتر ہوگی۔

کام کرنے کو بہت پڑا ہے۔ بیوپار بھی ایک کام ہے۔ مگر جو چیزیں ہماری تیار کی ہوئی پہلے ہی موجود ہیں اُن پر سٹہ بازی کرنا بیوپار کرنا نہیں کہلاتا۔ البتہ اس طرح سے بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے تھوڑی بہت ناموری ضرور پیدا ہو جائے گی مگر قانون بنا کر سٹہ بازی کا ہرگز خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔ ذرا غور کر کے دیکھو قانون کے ڈنڈے میں زور ہی کتنا ہے۔ قانون کے ذریعہ کبھی کوئی سدھار کا کام نہیں ہو سکتا۔ یہ زیادہ سے زیادہ پولیس کے سپاہی کا کام دے سکتا ہے۔ اس لئے جو کام قانون کے کرنے کا نہیں اُس کے واسطے صوبوں کی حکومتوں سے یا ملک کی گورنمنٹ سے اُمید رکھنا بالکل فضول ہے۔ سرکاری قانون کے ذریعہ ملک سے غریبی کو دور کرنے اور امیر آدمیوں کے لئے خاص رعائتیں ہٹانے کی جتنی ہم کوشش کریں گے اُتنی زیادہ اور غریبی پھیلے گی۔ اور خاص رعایتوں کی تعداد بڑھتی جائے گی ہم نے اپنی گورنمنٹ کا بہتیرا تجربہ کر کے دیکھ لیا اور قانون بنانے والے اسمبلیوں اور کونسلوں کو بھی کافی آزما لیا۔ گو اور ملکوں سے کم۔ کہ عام طور پر قانون جاری کرتے وقت سرکار ان سے وہ بڑے بڑے فائدے نکلنا ظاہر کیا کرتی ہے جو کوئی قانون بھی کبھی نہیں کر سکتا۔

جب کہ ایک ملک کے ہر طرف — جیسا کہ امریکہ میں ہوا — سب چھوٹوں بڑوں کے دل میں یہ خیال

بتھا دیا جائے کہ گورنمنٹ کی راجدھانی گویا ایک بہشت ہے جس کے مالکوں کے پاس اتنی طاقت ہے اور جن کے
اختیار اتنے زبردست اور بے شمار ہیں کہ وہ خدا کی طرح جو چاہیں کر سکتے ہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ دن بدن غلامی
کے گڈھے میں گرنے کی تیاریاں کر رہا ہے اور اس کے سر پر تکلیفوں اور مصیبتوں کے بادل منڈلا رہے ہیں ہماری
مدد گورنمنٹ کی طرف سے کوئی نہیں آئے گی۔ بلکہ ہمیں خود اپنی مدد کرنی ہوگی۔ اگر ہماری مرضی ہو تو ہم گورنمنٹ کو چاہئے
یہ مدد دیدیں کہ اُس کے بڑے وسیلوں کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم مناسب مقدار اور ترتیب میں سب لوگوں کی انکی
حیثیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ بھلائی کر سکیں۔ ہم چاہیں تو گورنمنٹ کی مدد کر سکتے ہیں مگر گورنمنٹ ہماری کچھ
امداد نہیں کر سکتی۔

"بیوپار کے کاموں میں حکومت کا کم دخل اور گورنمنٹ کے کاموں میں زیادہ بیوپاری مادہ ہونا چاہیئے" یہ
ایک بہت اچھی کہاوت ہے جس کا کہ بیوپار اور گورنمنٹ کو اتنا فائدہ نہیں پہونچتا جتنا کہ عام خلقت کو بیوپار کرنے کی
غرض سے یونائٹڈ اسٹیٹ کو نہیں بنایا گیا تھا اور نہ ہی جن بنیادی اصولوں کے مطابق اس کی گورنمنٹ کے قاعدے
اور قانون قائم کیئے گئے ہیں۔ اُن کی تہہ میں کوئی بیوپاری نیت کام کرتی ہے۔

یونائٹڈ سٹیٹ کا ملک یعنی اس کی زمین لوگ گورنمنٹ اور بیوپار یہ محض سب وسیلے ہیں جن کے ذریعہ لوگ آرام
کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنتے ہیں اور سکھ کی نیند سوتے ہیں۔ گورنمنٹ صرف ایک نوکر کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کو
اس سے اونچا درجہ کبھی نہیں دینا چاہیئے۔ جوں ہی لوگ گورنمنٹ کے ماتحت ہو کر چلنے لگتے ہیں۔ خدا کی مار پڑنی شروع
ہو جاتی ہے۔ کیونکہ گورنمنٹ اور لوگوں کے درمیان اس قسم کا رشتہ قدرت۔ شرافت اور انسانیت تینوں کے خلاف ہے
بیوپار کے بنا ہمارا گزارہ نہیں اور گورنمنٹ کے بنا بھی ہمارا گزارہ نہیں جس طرح سے ہماری زندگی کے واسطے اناج اور
پانی لازمی ہیں اسی طرح بیوپار اور گورنمنٹ بھی نوکر کے طور پر ہمارے لئے سخت ضروری ہیں لیکن مالک بن کر یہ سوسائٹی
کے قدرتی ٹھیک نظام کو بالکل اُلٹ پلٹ دیتے ہیں۔

ایک ملک کی ترقی اور خوشحالی وہاں کے لوگوں کے اختیار میں ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ ان سے
بہتر کوئی دوسرا یہ کام ٹھیک طور پر نہیں سنبھال سکتا۔ گورنمنٹ بنا کچھ لیئے دیئے وعدے تو خوب کر سکتی ہے مگر ان وعدوں
کو پورا کبھی نہیں کر سکتی۔ وہ سونے چاندی کے سکوں کو ٹھنکا ٹھنکا کر اور میٹھی میٹھی باتیں بنا کر لوگوں کو ٹھگ سکتی ہے جیسا
کہ یورپ میں ہوا۔ (اور جیسا کہ مہاجن لوگ جہاں تک ممکن ہو سکا پبلک کو روپیوں کی جھنکار سے دُنیا کے تختہ پر
ہر جگہ آج تک بھرماتے رہے ہیں)۔ لیکن باتوں سے نہیں بلکہ کام اور صرف کام کرنے سے ہی وعدے کوئی لگاتار

پورے کرسکتا ہے اور خواہ منہ سے نہ کہے مگر دل میں ہر شخص اس بات کو اچھی طرح سے جانتا ہے۔

ایک دانا قوم جیسے کہ ہم ہیں مالی زندگی کے بنیادی طریقوں کو جہاں تک اُس کا بس چلے گا کبھی تباہ نہیں ہونے دے گی۔ لگ بھگ سبھی یہ جانتے ہیں کہ دُنیا میں مفت ذرا کام بھی نہیں ہو سکتا اور لگ بھگ یہ بھی سب کوئی اگر جانتے نہیں تو کم سے کم محسوس ضرور کرتے ہیں کہ دُنیا میں اصل دولت روپیہ نہیں۔ ہر شخص کی ہر ضرورت اور خواہش کو۔ اور وہ بھی مفت بیٹھے بٹھائے پورا کرنے کی آسان ترکیبیں عام طور سے لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اُنہیں دیکھتے ہی ایک معمولی انسان بھی خواہ اُس کے پاس ان کے خلاف کوئی دلیل ہو یا نہ ہو جھٹ سے بول اُٹھے گا کہ یہ بالکل نکمی اور بے سود ہیں۔ اُس کا دل ہی گواہی دے دیتا ہے کہ یہ سب بالکل غلط ہے۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ نظام سر سے پاؤں تک بھدا ہے اس میں بے شمار غلطیاں ہیں اور یہ بہت جگہ سے نامکمل ہے لیکن دُوسروں کے مقابلہ میں اس میں ایک خوبی ضرور ہے کہ یہ کام تو دے ہی رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ آہستہ آہستہ کسی دوسرے نظام میں تبدیل ہو جائے گا اور نیا نظام ابھی کام ضرور دے گا مگر اس لئے نہیں کہ اُس کے اندر کوئی خاص صفت ہو بلکہ اس لئے کہ جیسا لوگوں نے اُسے بنا دیا ہے ویسا وہ ضرور چلے گا۔ بولشویزم دنیا میں کامیاب کیوں نہیں ہوا اور کیوں نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ مالی نہیں ہے۔ اس بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ ملک میں صنعت کا انتظام پرائیویٹ کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ یا گورنمنٹ کے۔ نہ اس بات سے کچھ فرق پڑتا ہے کہ کامگار کا جو آمدنی میں حصّہ ہو اُس کو تنخواہ کے نام سے پکارا جاتا ہے یا اُسے "ڈیوی ڈینڈ" کہا جاتا ہے۔ نہ ہی اس بات سے فرق پڑتا ہے کہ ملک کے اندر لوگوں کے واسطے خوراک۔ کپڑے اور رہائش کی تعداد اور مقدار مقرر کر دی گئی ہے یا ہر کسی کو اُس کی مرضی کے مطابق کھانے پینے اور رہنے کی آزادی دے دی گئی ہے۔ یہ سب بڑی چھوٹی اور معمولی باتیں ہیں جن کا بندوبست کرنا کچھ مشکل کام نہیں۔ بولشویزم کے چلانے والوں اور لیڈروں کی نالائقی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی ساری لیاقت اور طاقت ان چھوٹی اور معمولی باتوں کا انتظام کرنے میں خرچ کر دی اور اس میں ہی اپنا سارا وقت ضائع کر دیا۔ بولشویزم کے فیل ہو جانے کا سبب یہ ہے کہ وہ قدرت اور انسانیت کے خلاف تھا۔ ہمارا موجودہ نظام پھر بھی چل رہا ہے کیا اس میں کچھ نقص ہے؟ بیشک اس میں ہزاروں نقص ہیں۔ کیا یہ بھدا ہے؟ بے شک یہ بھدا ہے۔ انصاف اور عقل دونوں کی رُو سے یہ کبھی کا ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر پھر بھی یہ ختم نہیں ہوتا کیونکہ چند مالی اور انسانیت کے بنیادی اصولوں پر اس کی عمارت کھڑی ہے۔

مالی بنیادی اصول ہے محنت کرنا۔ محنت کر کے ہی انسان زمین سے پیدا وار حاصل کرتا ہے جو خلقت کے کام آتی ہے اگر لوگ محنت نہ کریں تو اناج اور دوسری چیزوں کی فصلیں کہاں سے ہوں۔ سو مالی بنیادی اصول یہ ہے کہ قدرت نے ہمارے چاروں طرف جو کچھ مصالحوں اور سامانوں کے ڈھیر لگائے ہوئے ہیں اور جن کو نہ ہم نے پیدا کیا ہے اور نہ ہم کہہ سکتے ہیں اُن کو عقل کے ساتھ اور صحیح طور پر استعمال کرنے کی ہم میں سے ہر ایک شخص محنت کرے۔

انسانیت کا بنیادی اصول ہے انسان کو اپنی محنت کی اُجرت پانے کا حق اس کو کئی طرح سے بیان کیا جاتا ہے۔ کبھی اس کا نام مال جائداد میں حق" دھرا جاتا ہے۔ کبھی یہ مذہب کے اس حکم کے اندر چھپا ہوا ہوتا ہے کہ چوری مت کرو" کیونکہ دوسرا آدمی اپنی چیز کا مالک ہے اور اُس میں حق رکھتا ہے اس لئے اُس کو چُرانا جرم ہے۔ جو آدمی محنت کرتا ہے صرف اُسی کو اُس کی اُجرت پانے کا حق حاصل ہے۔ اگر کوئی دوسرا اُس کو چراتا ہے تو نہ صرف وہ محنت کرنے والے کی اُجرت چھینتا ہے بلکہ وہ ایک پاک انسانی حق کو پاؤں کے تلے روندتا ہے۔

جس چیز کے بنانے میں ہم نے کوئی کام نہیں کیا تو اس کو استعمال کرنے کا بھی ہمیں کوئی حق نہیں مگر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہم کام کر کے کچھ بنائیں گے تو اُس کا سارا فائدہ پونجی دار لے جائیں گے اور ہمیں کچھ نہیں ملے گا وہ پونجی دار جو مال تیار کرنے کے ہمیشہ بہتر طریقے نکالنے اور ان پر عمل کرنے کی وجہ سے پونجی دار بنے ہیں۔ سچ پوچھو تو وہ سوسائٹی کی جان ہیں اصل میں اُن کا اپنا کچھ نہیں ہوتا جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں اور جو کچھ اُن کے پاس نظر آتا ہے وہ سب گویا امانت صرف دوسروں کے بھلے کی خاطر ہے۔ دوسری قسم کے پونجی دار وہ ہیں جو تجارت کی آڑ میں محض روپیہ بٹور کر پونجی دار بنے ہیں۔ سوسائٹی ان موذیوں کے پنجے سے کبھی بچ نہیں سکتی۔ مگر ان میں فائدہ کرنے اور نقصان پہونچانے دونوں طرح کی خوبیاں موجود ہیں۔ اگر ایسے آدمیوں کی آمدنی زیادہ اور بہتر مال تیار کرنے میں خرچ ہوتی ہے تو ان کے ہونے سے رتی بھر بھی نقصان نہیں۔ لیکن اگر ان کی آمدنی عام خلقت کے اندر مال اور روپیہ بے سب طریقہ سے کسی کو کم اور کسی کو زیادہ بانٹ کر گڑبڑ پیدا کرنے اور مال تیار کرنے والوں اور لوگوں کے درمیان جھگڑے اور نفرت پھیلانے کے کام میں استعمال ہوتی ہے تو وہ واقعی موذی پونجی دار ہیں۔ اور جب کام کے مطابق سب کو مناسب تنخواہیں ملا کریں گی تب یہ سب مٹ مٹا کر ختم ہو جائیں گے اور کام کے لوگوں کو اُس وقت مناسب تنخواہیں ملنے

گئیں گی جب لوگ اس اصول کو پورے طور پر سمجھ لیں گے کہ دنیا کے اندر صحت۔ دولت اور سکھ کو پانے کا
صرف ایک ہی ایسا پکا طریقہ ہے جو کبھی فیل نہیں ہوتا اور وہ ہے کام ـــ کام۔ اور کام
کوئی وجہ نہیں کہ جو آدمی کام کرنے کو تیار ہو اُسے کام کرنے اور اُس کی پوری اُجرت پانے کا موقع
نہ ملتا ہو۔ اسی طرح اس کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ جو آدمی کام کرنے کے قابل ہو مگر حرام خور ہے اُسے اس کے
کام کی پوری اُجرت کیوں ملے بلکہ اُس کا کام جس حد تک سوسائٹی کے لئے مفید اور فائدہ مند ہے اُس سے
ایک دمڑی بھی زیادہ اُجرت پانے کا اُس کو ہرگز موقع نہیں دینا چاہئے۔ اگر اُس کا کام سوسائٹی کے
حق میں بالکل مفید نہیں تو وہ ایک پائی بھی وصول کرنے کا حق دار نہیں۔ اگر وہ اس طرح سے رہ کر بھوکا مرنا
چاہتا ہی تو یہ اس کا اختیار ہے۔ یہ دیکھ کر کہ دنیا میں آج کل کچھ لوگ اپنی لیاقت اور محنت سے بہت زیادہ
اُجرت پا رہے ہیں ہم بھی اگر اس بات پر اڑ جائیں کہ ہم میں سے ہر شخص کو اس کی لیاقت اور محنت سے
زیادہ اُجرت ملنی چاہیئے تو ہمارے ہاتھ پلے کچھ بھی نہیں پڑے گا۔

یہ ڈھول پیٹنا کہ دنیا میں سب انسان برابر ہیں اس سے بڑھ کر بیہودہ اور خلقت سے دشمنی کرنے
والی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ یہ پورے یقین اور دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سب انسان ہرگز برابر
نہیں ہو سکتے۔ اور اگر جمہوری راج کا کوئی اصول سب انسانوں کو برابر ماننے کی حمایت کرتا ہے تو اس کا
نتیجہ ترقی کے راستے میں صرف رکاوٹ پڑنے کے اور کچھ نہیں ہو گا۔ سبھی انسان ایک جیسا کام نہیں
کر سکتے۔ دنیا میں بڑی لیاقت والے انسانوں کی تعداد تھوڑی لیاقت والوں کے مقابلہ میں کم ہے اس لئے
زیادہ تعداد میں ہونے کی وجہ سے تھوڑی لیاقت والوں کے لئے بڑی لیاقت کے انسانوں کو کھینچ کر
نیچے گرا دینا بالکل ممکن ہے انہیں دھکا دیتے ہوئے وہ خود اور نیچے گر پڑیں گے۔ سوسائٹی کے لیڈر ہمیشہ
بڑی لیاقت کے آدمی ہوا کرتے ہیں اور یہ صرف اُن کی بدولت ہے کہ تھوڑی لیاقت والوں کا کم محنت اور
کام کر کے بھی گزارہ چل رہا ہے۔

اگر جمہوری راج کے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لیاقت کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے سب کے ساتھ ایک
جیسا برتاؤ کیا جائے تو اُس سے لوگوں میں بیکاری بڑھے گی۔ قدرت کے اندر کوئی دو چیزیں بالکل ایک
جیسی نہیں اپنی جانچ میں ہم اپنی تمام کاریں بالکل ایک جیسی بناتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے پوری
دیکھ بھال کے بعد اور پوری احتیاط کے ساتھ ان کے تمام پرزے نہایت لائق کاریگروں کے ہاتھوں سے

بہتر سے بہتر مشینوں پر بالکل ایک جیسے تیار کرواتے ہیں۔ یہ سب فِٹ بھی بڑے مزے کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور اگر دو فورڈ کاروں کو پاس پاس کھڑا کر کے سرسری نگاہ سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں دیکھنے میں بالکل ایک جیسی لگتی ہیں اور دونوں ایسی ایک جیسی بنی ہیں کہ اگر ایک کا کوئی پرزہ نکال کر دوسری میں ڈال دیا جائے تو وہ بالکل فِٹ بیٹھ جائے گا لیکن اصلیت یہ ہے کہ وہ دونوں ہرگز ایک جیسی نہیں۔ جوں ہی انہیں سڑک پر ڈالا جائے گا ایک کسی طرح سے چلے گی اور دوسری اور طرح۔ ہمارے یہاں بہت سے ایسے آدمی موجود ہیں جنہوں نے سیکڑوں بلکہ ہزاروں فورڈ کاریں چلائی ہونگی اور اُن کا کہنا ہے کہ اُنہوں نے اپنی عمر میں کوئی دو گاڑیاں بالکل ایک جیسی چلتی ہوئی نہیں دیکھیں۔ اور کہ اگر اُنہیں کسی کار کو ایک گھنٹہ یا کم عرصہ کے لئے چلانے کا موقع ملے پھر اُس کار کو چند نئی کاروں میں ملا دیا جائے تو وہ صرف شکل دیکھ کر اُس کار کو نہیں پہچان سکیں گے لیکن اگر اُنہیں ان سب کاروں کو عین ویسی حالت میں اور ایک گھنٹہ کے لئے دیا جائے تو وہ فوراً پہچان لیں گے۔

یہ باتیں میں نے ابتک سرسری طور پر کہی ہیں آؤ ذرا اُنہیں کچھ اور کُھل کر بیان کریں۔ ایک آدمی سوسائٹی کی جتنی خدمت کرتا ہے یعنی جتنا اپنے آپ کو اُس کے لئے مفید ثابت کرتا ہے اُس کے مطابق اُسکو زندگی بسر کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ اس قاعدے کے ذکر کرنے کا یہ بڑا اچھا موقع ہے کیونکہ ابھی صرف تھوڑا عرصہ پہلے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ایک انسان کے لئے ہر کام اپنی سوسائٹی کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے کرنا بالکل غیر ضروری ہے۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ نہ کوئی لاگت کی پرواہ کرتا تھا اور نہ کسی کو سوسائٹی کے بھلا کرنے کی فکر تھی۔ کارخانوں اور سوداگروں کو بن مانگے دھڑا دھڑ آرڈر مل رہے تھے۔ کبھی وہ زمانہ تھا جب سوداگر آرڈر حاصل کرنے کے لئے خریدار کی منت خوشامد کیا کرتا تھا۔ اب یہ وقت آگیا گویا مال بیچ کر سوداگر ایک طرح سے پیدا کے اوپر مہربانی کرتا ہے۔ یہ بیوپار کے لئے بُری علامت ہے۔ ایک بیوپاری کا کسی اکیلے کے ہاتھ میں چلا جانا بُری علامت ہے بیوپار میں اندھا دھند منافع کا ہونا بُری علامت ہے۔ بیوپار کے لئے دھکا پیل کرنے کی ضرورت کا نہ رہنا بُری علامت ہے جس طرح ایک تندرست چوزہ کی یہ نشانی ہے کہ وہ دانہ چگنے کے لئے زمین کریدتا پھرتا ہے بیوپار کو چمکانے کے لئے ہاتھ پاؤں سدا مارتے رہنا نہایت ضروری ہے۔ مگر اُس وقت سب کچھ بیٹھے بٹھلائے مل رہا تھا لوگوں نے اس اصول کو کہ چیزوں کی قیمتیں اُن کی لاگت اور حیثیت کے مطابق چارج ہونی چاہئیں۔ اُٹھا کر طاق پر دھر دیا تھا پبلک کو اپنی شے یا خدمت سے خوش رکھنے کی بالکل کسی کو پرواہ نہ تھی بلکہ عام طور پر دُگر

کا "پبلک بھاڑ میں جائے" ظاہر کرنے والا لہجہ وسلوک ہوا کرتا تھا بیوپار کے لئے اس سے زیادہ بری بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ لوگوں کا ایک طبقہ اس خلاف معمول حالت کا "خوشحالی" نام دھرتا تھا مگر یہ خوشحالی نہ تھی۔ یہ تو روپیہ حاصل کرنے کے لئے بیکار بھاگ دوڑ تھی۔ روپیہ کے پیچھے اس طرح سے بھاگ دوڑ کرنا بیوپار نہیں کہلاتا۔

اگر ایک آدمی خوب چوکس رہے اور سوچ سمجھ کر جس راستے کو اس نے پکڑا ہے اس سے نہ ڈگمگائے تب تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے واسطے یہ غلطی کر بیٹھنا بہت آسان ہے کہ اول خوب روپیہ جمع کرلے اور پھر اور زیادہ روپیہ اکٹھا کرنے کی کوشش اور چکر میں پبلک کو اُن کی ضرورت کے موافق مال سپلائی کرنا ایک سرے ہی سے بھول جائے۔ روپیہ کمانے کی غرض سے بیوپار کرنا نہایت غیر محفوظ اور کچا کام ہے۔ یہ آج ہے اور کل نہیں۔ چلتا بھی ہے تو رک رک کر اور وہ بھی اکثر زیادہ سے زیادہ چند سالوں کے لئے۔ بیوپار کا کام ہے۔ لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنا۔ نہ کہ روپیہ پیدا کرنا یا سٹہ بازی کرنا۔ لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مال تیار کرنے کا مطلب ہے کہ جو چیز تیار کر کے سپلائی کی جاوے گی اس کی کوالٹی اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور قیمت تھوڑی ہوگی۔ اور وہ چیز نہ صرف تیار کرنے والے کو منافع دے گی بلکہ اس سے عام لوگوں کو بھی بہت فائدہ پہنچیگا لیکن روپیہ کا جو اصلی کام ہے اس کی بجائے اگر الٹا استعمال ہونا شروع ہو جائے تو مال تیار کرنے کا فائدہ صرف مال تیار کرنیوالے کو پہنچیگا مال تیار کرنے والا عام لوگوں کی خدمت کر کے یعنی اُن کے فائدہ کی چیز بنا کر ہی خوشحال ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ تھوڑے عرصہ کے لئے وہ ردی اور بیکار چیز لوگوں کے سر مڑھ کر خوشحال بن سکے لیکن اگر ایسا کبھی ہو بھی جائے تو یہ محض اس کی خوش قسمتی کہنی چاہئے۔ ورنہ جیوں ہی لوگوں کو اس کی کارستانی کا پتہ چلیگا اس کا خاتمہ نزدیک سمجھو۔ جن دنوں مارکیٹ میں خوب تیزی تھی مال تیار کرنے والوں کی زیادہ تر کوشش رہتی تھی کہ جتنا ممکن ہو سکے لوگوں کو خوب لوٹ لیا جائے۔ اس لئے جیوں ہی لوگوں کی آنکھیں کھلیں بہت سے تیار کرنے والوں کے دیوالے نکلنے شروع ہو گئے۔ اور آخر میں وہ ختم ہو گئے تب ان لوگوں نے چلانا شروع کر دیا کہ ہائے مارکیٹ مندا ہو گیا اس لئے مارے گئے مگر یہ سراسر جھوٹ تھا۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ یہ لوگ اپنے کاروبار میں لیاقت اور عقل کو استعفادے کر نالائقی اور حماقت کے ذریعہ کامیاب ہونا چاہتے تھے۔ اور دنیا میں یہ کبھی ممکن نہیں۔ روپیہ کا حد سے زیادہ لالچ کرنا روپیہ سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا سب سے بڑھیا طریقہ

ہے۔ لیکن جب ایک آدمی پبلک کی صرف خدمت کرنے کی غرض سے اپنے دل کی تسلّی کے واسطے اس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ سوسائٹی کے لئے ضرور نیک اور مفید ہے کسی کام کو کرتا ہے تو روپیہ اپنے آپ کھچا چلا آتا ہے اور دولت کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔

سوسائٹی کی خدمت کرنے سے لازمی طور پر خوب روپیہ پیدا ہوگا۔ روپیہ پیدا کرنا بھی نہایت ضروری ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ روپیہ پیدا کرنے کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ آدمی خوب کما کر پھر آرام طلب بن جائے بلکہ اُسے یہ سمجھنا چاہیئے کہ سوسائٹی کی اور بھی خدمت کرنے کا اب مجھے موقع ملا ہے۔ دُنیا میں مجھے آرام طلب زندگی سب سے بُری چیز لگتی ہے۔ کسی شخص کو بھی آرام طلب بننے کا حق حاصل نہیں۔ اس تہذیب کے زمانہ میں ایک سُست آدمی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اگر کسی شخص کے دماغ میں کوئی ایسا نظام چلانے کی تجویز ہے جس میں بالکل روپیہ کی ضرورت نہ پڑے تو اس سے اور بھی گڑبڑی پھیل جائے گی۔ ہمیں اپنی زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے لئے خرید اور فروخت لازمی طور پر کرنی پڑے گی جس کے لئے ایک ناپ تول کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ کہنا کہ جن چیزوں کی ہمیں زندگی میں ضرورت پڑتی ہے ان کو حاصل کرنے کے واسطے ادلا بدلی روپیہ کے موجودہ سسٹم کے مطابق بہت اچھی طرح سے ہو رہی ہے واقعی بہت شک والی بات ہے۔ مگر یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر میں آگے چل کر کسی بیان میں بحث کروں گا۔ مگر میرا روپیہ کے موجودہ سسٹم کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ لوگوں کی نظروں میں روپیہ کی ضرورت سے بہت زیادہ قدر ہونے لگی ہے اور اس وجہ سے مال کے تیار ہونے میں مدد ملنے کی بجائے اس سے رُکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔

میں لوگوں کو سادگی کی راہ پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ذرا غور کرو کہ عام طور پر لوگوں کے پاس کتنا تھوڑا دھن ہوتا ہے اور اُن کو زندگی کی صرف معمولی ضرورتیں پورا کرنے کے لئے کتنا زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے (حالانکہ میری اپنی یہ رائے ہے کہ ہر شخص کو زندگی کے تھوڑے بہت مزے اُڑانے کا بھی حق حاصل ہے۔ مگر خیر وہ تو دور کی بات رہی) کیونکہ لگ بھگ جو چیز ہم تیار کرتے ہیں وہ ضرورت سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہوتی ہیں۔ ہماری خوراک۔ ہماری پوشاک۔ ہمارے گھروں کا فرنیچر یہ تمام چیزیں جیسی آج کل دیکھنے میں آ رہی ہیں اُس سے کہیں زیادہ سادہ ہو سکتی ہیں اور دیکھنے میں اس سے کئی گنا خوبصورت بھی لگیں گی۔ پہلے زمانہ میں چیزیں خاص ڈھنگ سے بنا کرتی تھیں مگر تب سے ان میں آج تک کچھ نہ کچھ بُری بھلی تبدیلیاں ہوتی چلی

آئی ہیں۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم خبطی لوگوں کی طرح رہنا شروع کر دیں۔ اس کی ضرورت نہیں یہ لازمی نہیں کہ پوشاک کی جگہ ایک جھگلا سا ہی کر گلے میں لٹکا لیا جائے۔ یہ چاہیے بنانے میں آسان ہو۔ مگر اس کو پہن رکھنے میں ضرور دقت ہو گی۔ ایک کمبل کو سینے میں کسی خاص بڑی لیاقت اور محنت کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر ہم ہندوستانیوں کی طرح اسے اوڑھ کر کام کرنے لگیں تو ہم میں سے کوئی بھی بہت کچھ نہ کر پائے گا۔ اصلی سادگی وہ کہلاتی ہے جو کام سب سے اعلیٰ دے اور جس کے پیچھے لگ کر سب سے زیادہ آرام ملے جلد باز ریفارمروں کا سب سے بڑا نقص یہی کہ وہ ہمیشہ آدمی کی چھاتی پر سوار ہو کر اُسے زبردستی ایک خاص ڈھنگ سے رہنے سہنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ جب عورتوں کی پوشاک میں ریفارم کرنے پر زور دیا جاتا ہے ـــ جس کا عام طور پر یہ مطلب ہوا کرتا ہے کہ عورتیں بھونڈا لباس پہننا شروع کر دیں ـــ تو یہ خیال ہمیشہ معمولی شکل وصورت والی عورتوں کے دماغ سے نکلا کرتا ہے جو چاہتی ہیں کہ دوسری بھی ہمارے جیسی سیدھی سادی نظر آیا کریں۔ یہ درست طریقہ نہیں۔ پہلے ایک ایسی شے کو پکڑو جو تمہاری رائے میں بالکل ٹھیک کام دے رہی ہو۔ پھر یہ دیکھو کہ اس میں کون کون سے حصے بالکل بے کار ہیں جو ترک کئے جا سکتے ہیں۔ یہ قاعدہ جوتی۔ لباس۔ گھر۔ مشین کا پرزہ۔ ریل گاڑی۔ جہاز۔ ہوائی جہاز۔ غرضیکہ ہر شے کے بارے میں استعمال ہو سکتا ہے۔ جیسے جیسے بیکار حصے گھٹتے جاویں گے اور ضروری حصے سادہ بنتے جاویں گے تیوں تیوں لاگت میں بھی کمی ہوتی چلی جائے گی۔ یہ بالکل موٹی بات ہے مگر بڑی حیرانی ہے کہ عام طور پر ایک شے کو سادہ کرنے کی بجائے اُس کی تیاری کے عملوں اور بنانے کے خرچ کو کم کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اصول کی بات یہ ہے کہ درستی پہلے خاص شے سے شروع ہونی چاہیے۔ اوّل یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا یہ ایسی اچھی بھی بنی ہے یا نہیں جیسی کہ ہونی چاہیے اور آیا یہ اتنا اچھا کام بھی دے رہی ہے یا نہیں جتنا کہ اسے دینا چاہیے۔ اس کے بعد یہ غور کرنا چاہیے کہ کیا اس کے بنانے میں جو کچھ مصالحے استعمال ہوتے ہیں وہ بہتر سے بہتر ہیں جو دستیاب ہو سکتے ہیں یا جن کی بعض خوبی یہی ہے کہ وہ نہایت مہنگے ہیں۔ ان سوالوں کا جواب حاصل کر لینے کے بعد پھر یہ سوچنا چاہیے کہ کیا اس شے کی پیچیدگی اور وزن کو کم کیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح کی اور بھی بہتیری باتیں ہیں جن کی طرف تب توجہ کرنی چاہیے۔

جس طرح پگڑی یا ٹوپی میں ٹانکنے کے لئے کلغی کو فضول بھاری بنانا بیوقوفی ہے۔ اسی طرح ہر شے

کو ضرورت سے زیادہ وزنی بنانا عقلمندی نہیں بلکہ سچ پوچھو تو یہ زیادہ بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ کلغی کا یہ فائدہ ہو سکتا ہے کہ اس سے پگڑی یا ٹوپی پہچانی جا سکتی ہے۔ مگر ایک شے میں ضرورت سے زیادہ وزن دینا صرف مضبوطی کو ضائع کرنا ہے معلوم نہیں لوگوں کے دلوں میں کہاں سے یہ وہم پیدا ہو گیا ہے کہ ایک چیز جتنی وزنی ہوگی اُتنی ہی زیادہ مضبوط ہوگی۔ ایک بوجھا ڈھونے والے کے لئے تو شاید یہ خیال اچھا ہو لیکن اگر ہم نے ایک شے سے ہتھوڑے مارنے کا کام نہیں لینا تو اُسے فضول بھاری بنانے کا کیا فائدہ۔ بار برداری کی کسی مشین کو کیوں فضول بھاری بنایا جائے۔ اس کی بجائے اگر وہ مشین یہ فضول بار بھی اُس بوجھے کے ساتھ اُٹھانے کے قابل بنا دی جائے جس کے واسطے یہ تیار کی گئی ہے تو کتنا اچھا ہو۔ موٹے آدمی پتلے آدمیوں کے برابر کبھی تیز نہیں دوڑ سکتے۔ لیکن ہم عام طور پر اپنی گاڑیاں اور کاریں اس طرح بناتے ہیں کہ جیسی فضول وزن دار ہونے سے اُن کی رفتار بڑھ جائے گی۔ دُنیا میں فضول وزن اُٹھا کر پھرنے سے بھی کافی غریبی پیدا ہوتی ہے۔

وہ وقت آنے والا ہے جب ہمیں پتہ لگ جائے گا کہ کس طرح سے ہم چیزوں کے وزن کو آدھا بھی ہلکا کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر لکڑی کو لیجئے چند کاموں کے واسطے ہمیں آج تک اس سے بہتر کوئی شے نہیں ملی۔ لیکن لکڑی اس استعمال میں حد سے زیادہ ضائع ہو جاتی ہے۔ ایک فورڈ کار میں جو لکڑی خرچ ہوتی ہے اُس میں پندرہ سیر کے قریب پانی ہوتا ہے یہ مقدار ضرور کم ہونی چاہئے اور کوئی نہ کوئی ضرور ایسا طریقہ ہوگا جس سے یہ ممکن ہو سکے۔ ہمیں ضرور کوئی ایسا طریقہ ڈھونڈنا چاہیئے جس سے ہم ایک شے کو فضول وزن دار بنائے بغیر ویسا ہی مضبوط اور لچکدار بنا سکیں۔ اسی طرح اُس میں اور بھی بہتری کی کئی صورتیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔

کسان نے اپنا روزانہ کام خواہ مخواہ اتنا زیادہ پیچیدہ بنا یا ہوا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ عام طور پر ایک کسان جتنی محنت کرتا ہے اُس کا صرف پانچ فی صدی حصہ مفید مطلب کے لئے خرچ ہوتا ہوگا۔ جس طرح سے آج کل ایک کھیت پر کام ہوتا ہے۔ اگر اس طرح کوئی کارخانہ چلانے لگے تو وہاں کامگاروں کا ہلّہ سننے کے سوائے کام رتی بھر بھی نہ ہو۔ جس طریقہ پر ہماری موجودہ کاشتکاری ہو رہی ہے۔ یورپ کے سب سے نکمے کارخانے میں بھی اتنا گندہ اور ردّی انتظام دیکھنے میں نہیں آتا ہوگا۔ بجلی کی طاقت کا پورا فائدہ کبھی نہیں اُٹھایا جاتا بلکہ کم سے کم لیا جاتا ہے۔ نہ ہر کام صرف ہاتھ سے کیا جاتا ہے بلکہ کام کو باقاعدہ اور ترتیب سے کرنے کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ ایک کسان اناج میں سے مٹی اور گرد صاف کرنے کے لئے درجن بار ایک کمزور اور جھولتی ہوئی سیڑھی پر چڑھنا اُترنا پسند کرے گا اور کیاریوں میں پانی ڈول بھر بھر کر پہونچاتا رہے گا حالانکہ یہی کام

کھیت میں چند لمبے پائپ بچھا کر وہ بڑے مزے سے کر سکتا تھا۔ مگر اس بیچارے نے ایک ہی سبق پڑھا ہوا ہے اور وہ یہ کہ جب زیادہ کام کرنے کو جمع ہو جائے تو باہر سے آدمی روزانہ اجرت یا تنخواہ پر بلا لو۔ اس کا ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ اپنی کاشت کی ترقی کے واسطے کچھ خرچ کرنا روپیہ کو برباد کرنا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کاشت سے جو پیداوار ہو رہی ہے وہ موجودہ زمانہ کے سستے سے سستے داموں پر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو اپنی واجب قیمت سے بہت زیادہ مہنگی فروخت ہو رہی ہے۔ کاشتکاری سے جو منافع ہو رہا ہے وہ آج کے حساب سے زیادہ سے زیادہ ہوتے ہوئے بھی جتنا واقعی میں ہونا چاہیئے بہت کم ہے۔ کاشت کی پیداوار کے اونچے دام اور کم منافع ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کو تیار کرنے میں کافی طاقت اور بہت سی محنت رائیگاں چلی جاتی ہے۔

ہماری اپنی کاشت ڈیر بورن میں ہر کام مشینوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ہم اس وقت تک بہت سے فضول عملوں اور بیکار حصوں کو ترک کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ لیکن سچ پوچھو تو ابھی ہم نے اصلی بچت کو چھوا تک نہیں۔ ابھی تک ہم نے پانچ یا دس سال رات دن لگ کر اس سوال کو حل کرنے میں صرف نہیں کئے کہ واقعی ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ جو کچھ آج تک ہم کر پائے ہیں اس کے مقابلہ میں جو ابھی کرنا باقی ہے بہت زیادہ ہے۔ لیکن پھر بھی خواہ ہماری فصلیں اچھی لگی ہوں یا بری ہمیں آج تک کبھی گھاٹا نہیں پڑا بلکہ ہمیشہ زبردست منافع ہوتا رہا ہے۔ ہم کسان تو نہیں مگر کاشت کے کام کو عقل اور ترتیب سے کرنے والے صنعتی بندے ضرور ہیں۔ جیوں ہی کسان ایک صنعتی کے طور پر کام کرنا شروع کر دے گا جس کا مصالحوں اور سامان کو یا آدمیوں کی لیاقت اور محنت کو ذرا بھی ضائع ہوتے دیکھ کر دل دہل جاتا ہے۔ تب کاشت کی پیداوار اتنی سستی بکا کرے گی کہ سبھی کو پیٹ بھر کر مزے کے ساتھ کھانا مل جایا کرے گا اور اس سے اس قدر زیادہ منافع ہوا کریں گے کہ لوگ کاشتکاری کے کام کو سب سے کم خطرناک اور سب سے زیادہ آمدنی دینے والا پیشہ سمجھنے لگ جائیں گے۔

اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ اس کام کی اصلیت کیا ہے اور اس کو کرنے کا سب سے بہتر طریقہ کیا ہے ان تینوں باتوں کی ناواقفیت کی وجہ سے ہی کاشتکاری کو منافع دینے والا پیشہ خیال نہیں کیا جاتا جس طرح آج کل کاشتکاری کی جاتی ہے اس طرح سے چل کر واقعی کسی طریقہ سے بھی کبھی منافع نکل نہیں سکتا۔ کسان خدا پر بھروسہ رکھ کر اپنے بزرگوں کی چال پر چلتا رہتا ہے وہ یہ نہیں جانتا کہ زمین سے پیداوار

کرتے وقت لاگت اور خرچ میں کس طرح سے بچت کی جا سکتی ہے اور نہ اُسے یہ خبر ہے کہ مارکیٹ میں مال کیسے بیچا کرتے ہیں۔ اگر ایک کارخانہ دار کو نہ مال تیار کرنے کی جانچ ہو اور نہ مال فروخت کرنے کی تو بھلا اُس کا بیوپار کب تک چل سکتا ہے۔ کسان کا آجتک کاشتکاری کے کام میں جُٹا رہنا اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ واقعی یہ بہت منافع دینے والا پیشہ ہے۔

کارخانہ ہو یا کاشت۔ دونوں جگہ سستے داموں والی چیزیں بھاری تعداد میں تیار کرنا ——— اور سستے داموں والی چیزوں کے بھاری تعداد میں تیار کرنے کا مطلب ہے سب کے لئے پیٹ بھر کر روٹی ——— بالکل سہل کام ہے لیکن بھاری نقص یہ ہے کہ عام طور پر معمولی سے معمولی باتوں کو بھی بہت پیچیدہ بنا دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کوالٹی بہتر بنانے کی بات کو لیجئے۔

جب ہم کسی شئی کی کوالٹی کو بہتر بنانے کا ذکر کرتے ہیں تو عام پر ہمارے دل میں اس کے اندر کچھ تبدیلی کر دینے کا خیال ہوا کرتا ہے۔ گویا ایک شئی کو محض بدل ڈالنے سے اُس کی کوالٹی بہتر ہو گئی! مگر میں یہ نہیں مانتا۔ جب تک میں ایک شئی کی بہتر سے بہتر ممکن کوالٹی دریافت نہیں کر لیتا تب تک میں اُس کو تیار کرنا بالکل شروع نہیں کرتا۔ مگر اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ایک شئی کو کبھی تبدیل ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ مگر میری رائے میں تجربہ کرنے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جائے گی کہ آخر میں جا کر فائدہ ہمیشہ اُس صورت میں زیادہ رہتا ہے کہ جب تک موجودہ حالت میں ایک شئی کا جس قدر مفید مطلب بنانا عمدہ ڈیزائن کا ہونا اور اُس میں استعمال ہونے والے اعلےٰ درجہ کے مصالحے یا سامان حاصل کرنا ممکن ہو سکتا ہے اُس کی بابت پوری پوری تسلی نہ ہو جائے تب تک اُس کو بنانے کی کوشش بھی شروع نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر ایک آدمی کو اپنی لیاقت کے موافق تجربہ اور تلاش کرنے کے باوجود پورا اطمینان اور یقین نہیں آتا تو بہتر ہو کہ وہ اپنی تلاش اُس وقت تک جاری رکھے جب تک اُسے پورا اطمینان اور یقین نہ حاصل ہو جائے۔

ایک شئی کو بازار میں فروخت کرنے کے واسطے تیار کرنے سے پہلے اُس کے اندر کے نقصوں کو درست کرنا سیکھو۔ کام کرنے کا اصلی اور مناسب طریقہ یہی ہے کیونکہ جیسی شئی تیار ہو گی اُس کے موافق کارخانہ۔ نظام بیچنے کے انتظام اور روپیہ کا بنکوں سے بندوبست یہ سب اپنے آپ بنتے چلے جائیں گے۔ شئی تیار کرنے والے کے ہاتھ میں یہ ایک ایسی تیز دھار والی بیوپاری چھینی ہے جس سے اُس شئی کے بیکار حصے کٹ کر الگ گرتے جائیں گے! اور اس طرح سے وہی شئی اور زیادہ تعداد میں تیار کرنے کے واسطے کافی فقت

نکل آیا کرے گا۔ بہت سی تجارتی فرموں کے فیل ہونے کا چھپا ہوا سبب یہی ہے کہ لوگ ایک شی کی شکل حیثیت اور خوبی کے متعلق پوری واقفیت حاصل کیئے بغیر اُس کا بنانا شروع کرنے میں نہایت جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ مال تیار کرنے میں سب سے بڑی بات ہے کارخانہ یا گودام کھڑا کر دینا یا بنک کے ساتھ روپیہ کا انتظام کرنا یا اور دوسرے بندوبست کر لینا اور بس۔ مگر اصل میں جو بڑی بات ہے وہ شی ہی جو تیار کی جاوے گی۔ اور اُس کا ڈیزائن پورے طور سے مکمل کر لینے سے پہلے ہی اُس کو اگر جلد بازی میں آکر بنانا شروع کر دیا جاوے گا تو سمجھ لینا چاہئیے کہ اتنا وقت بیکار ضائع گیا۔ آج میری جس کار کو فورڈ کار کے موڈل ٹی کے نام سے پکارا جاتا ہے اُس کا ڈیزائن ڈھونڈھنے اور مکمل کرنے میں مجھے پورے بارہ سال لگے تھے۔ اور اس عرصہ میں میں نے اس موڈل کی ایک کار بھی بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ جب تک ہمارے ہاتھ اصلی شی نہیں لگی تب تک ہم نے پورے زور شور سے اس کار کو تیار کرنا بالکل شروع نہیں کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہی کہ اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی اس کے ڈیزائن میں ہمیں کوئی خاص تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

ہم ہمیشہ نئے نئے تجربے کرتے رہتے ہیں اگر آپ کو کبھی ڈیربورن کے آس پاس کی سڑکوں پر گھومنے کا موقع ملے تو آپ کو راستے میں لگ بھگ سب قسم کی موڈلوں کی بہت سی فورڈ کاریں ملیں گی۔ یہ نئے نکلے ہوئے موڈل نہیں بلکہ محض آزمائشی کاریں ہیں۔ یہ درست ہے کہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے میں ایک نئے اچھے خیال کو ہاتھ سے نکلنے نہیں دیتا لیکن فلاں خیال واقعی اچھا ہے یا بُرا اس بات کا فیصلہ کرنے میں میں کبھی جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔ اگر سرسری نظر میں مجھے ایک خیال اچھا جچتا ہے یا میں یہ دیکھتا ہوں کہ ممکن ہے۔ کوشش کرنے سے اس میں کوئی فائدے کی صورت نکل آئے گی تو میں ہر پہلو سے اُس خیال کی جہاں تک ضروری ہوتا ہے پورے طور پر آزمائش کرتا ہوں لیکن ایک خیال کی محض آزمائش کرنے میں اور کار کے ڈیزائن کو بدل ڈالنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دوسرے کارخانے والے ایک شی کے بنانے کے طریقہ میں کچھ فرق کرنے کی بجائے اُس کے ڈیزائن میں تبدیلی کرنے کے لیئے بہت تیار رہتے ہیں مگر ہمارا راستہ انسے بالکل مختلف ہے۔

ہمارے کارخانہ کے اندر جو بڑی تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ بنانے کے طریقوں اور عملوں میں ہوا کرتی ہیں۔ یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جن طریقوں اور عملوں سے ہم نے اپنے موجودہ موڈل کی پہلی کار تیار کی تھی اُن میں سے شاید کوئی ایک آدھ ایسا ہو گا جسے آج بھی کار تیار کرنے میں ہم بالکل اسی شکل میں استعمال کر رہے ہوں یہ وجہ ہے کہ ہم اپنی کاریں اتنی سستی بنا رہے ہیں۔ کار کے اندر

جو تھوڑی بہت تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ کار کے چلانے میں زیادہ سہولیت پیدا کرنے کے خیال سے کی گئی ہیں۔ یا ڈیزائن میں ہم نے تب کچھ فرق کیا ہے جب ہم نے تجربہ سے دیکھ لیا کہ اس سے کاریں اور بھی مضبوطی آجائے گی جیسے جیسے ہمیں مصالحوں اور سامانوں کی نسبت زیادہ واقفیت ہوتی جاتی ہے اُس کے مطابق ہم اپنی کاریں میں استعمال ہونے والے مصالحوں اور سامانوں میں مناسب تبدیلیاں کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ اگر کسی وقت ایک خاص مصالحہ یا سامان کا مارکیٹ میں توڑا پڑ جائے تو ہماری کاریں بننی بند ہو جائیں یا اس وجہ سے کار کے بنانے کی لاگت بڑھ جائے۔ اس لئے ہم نے لگ بھگ سب چیزوں کے جو کار کے بنانے میں استعمال ہوتی ہیں بدل ڈھونڈھ رکھے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم فولادوں میں سب سے زیادہ وینا ڈیم فولاد استعمال کرتے ہیں۔ یہ وزن میں سب سے کم اور مضبوطی میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن ہماری بیوپار کے لحاظ سے یہ بڑی بھاری غلطی ہو گی اگر ہم اپنا سارا کام صرف اُس کے بھروسے پر چھوڑ دیں اور کارخانہ کی جان ایک طرح سے اس کے ہاتھ میں سونپ دیں۔ اس لئے ہم نے اس کا بھی ایک بدل تلاش کیا ہوا ہے تا کہ وقت بے وقت کام دے سکے۔ ہمارے تمام فولاد خاص ہیں مگر ان میں سے ہر ایک کا کم سے کم ایک اور بہت سی حالتوں میں کئی بدل ہم نے ڈھونڈھ کر نکالے ہوئے ہیں ان کا ہم نے اچھی طرح سے امتحان کیا ہوا ہے کہ وہ بخوبی کام دے سکیں گے اسی طرح ہم نے استعمال ہونے والے تمام مصالحوں اور سامانوں کے اور کار کے سب پرزوں کے بدل دریافت کئے ہوئے ہیں۔ شروع میں ہم اپنے بہت کم پُرزے بنایا کرتے تھے اور موٹر تو بالکل نہیں بنایا کرتے تھے لیکن اب ہم اپنی تمام موٹریں اور بہت سارے پُرزے خود ہی تیار کرنے لگ پڑے ہیں۔ کیونکہ تجربہ نے ہمیں سکھلا دیا ہے کہ اس طرح سے بہت بچت رہتی ہے۔ مگر اس کے علاوہ ہم ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہم ہر ایک پرزہ تھوڑی یا بہت تعداد میں خود بھی ضرور تیار کرتے رہا کریں تا کہ اگر کسی وقت مارکیٹ میں اُن کا ملنا مشکل ہو جائے یا جن دوسری فرموں کو ہم نے ان کے آرڈر دئے ہوئے ہیں اُن میں سے کوئی اگر کسی وقت سپلائی نہ کر سکے تو ہم منہ دیکھنے کے دیکھتے نہ رہ جاویں۔ جنگ کے دنوں میں شیشہ کی قیمتیں حد سے زیادہ اونچی چڑھ گئی تھیں۔ اپنے ملک کے اندر ہم شیشہ کے سب سے زیادہ استعمال کرنے والوں میں سے ایک ہیں۔ اب ہم اپنا شیشہ کا کارخانہ کھولنے لگے ہیں۔ اگر ہم نے اپنی یہ ساری طاقت اور لیاقت جو شئی ہم تیار کرتے ہیں اُس میں صرف تبدیلیاں پیدا کر دینے میں خرچ کر دی ہوتی تو آج ہمیں سر چھپانے کو بھی کہیں جگہ نہ ملتی۔ لیکن اپنی شئی کو نہ بدل کر ہمیں اس کی بجائے اپنی

پوری طاقت اور لیاقت مال کو تیار کرنے کے عملوں اور طریقوں کو بہتر بنانے میں خرچ کرنے کا اس طرح سے موقع مل گیا۔

چھینی کا سب سے ضروری حصہ اُس کی تیز دھار ہے۔ بس یہی ایک قاعدہ ہمارے سارے کاروبار کی کنجی ہے۔ ان باتوں سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ ایک چھینی کی وضع قطع نہایت عمدہ ہے یا اُس کی فولاد نہایت اعلےٰ ہے۔ یا اُس کی گھڑت کمال درجہ کی ہے۔ اگر اس کی تیز دھار نہیں تو یہ ہرگز چھینی نہیں بلکہ محض دھات کا ٹکڑا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ ایک شے جیسا کام واقعی میں دیتی ہے اس کے مطابق اُس کی قدر اور قیمت پڑتی ہے نہ کہ اُس کی صرف شکل وصورت دیکھ کر یا اُس کی جھوٹی تعریفیں کرنے سے زیادہ دام ملتے ہیں۔ ایک کند چھینی سے کام لینے کے لئے اُس کے سر پر نہایت زور کے ساتھ ہتھوڑا مارنے کا کیا فائدہ ہے جبکہ وہی کام ایک تیز دھار والی چھینی کے سر پر معمولی چوٹ لگانے سے سہج میں ہو سکتا ہے۔ چھینی کا اصلی کام ہی کاٹنا اور سہج میں نہ کہ بھاری ہتھوڑوں کی چوٹ کھا کر اس کے سر پر جو چوٹ لگائی جاتی ہے وہ تو اس سے کام لینے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ اس لئے ہم نے اگر کام کرنا ہے تو کیوں نہ دل لگا کر کریں۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکے اُسے جلدی ختم کرنے کی کوشش کریں۔ بیوپار میں چھینی کی تیز دھار ہے شے کا گاہک کے دل کو پسند آنا۔ اگر شے غیر تسلی بخش ہے تو دھار کند سمجھنی چاہیے اور اُس کو مارکیٹ میں چالو کرنے کے لئے بہت بیکار کوشش خرچ کرنی پڑے گی۔ کارخانہ میں چھینی کی تیز دھار ہے کامگار اور کام کرنے والی مشین۔ اگر کامگار نالائق ہے تو مشین کچھ نہیں کر سکتی اور اگر مشین خراب ہے تو آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ میں اس خیال کا آدمی ہوں کہ ایک آدمی کے ہاتھ میں جو کام ہے اس کو کرنے کے لئے جتنی طاقت بالکل ضروری درکار ہے۔ اُس سے اگر اُسے تولہ بھر بھی زیادہ خرچ کرنی پڑتی ہے تو وہ فضول ہے اور رائیگاں جاتی ہے۔

ان ساری باتوں کے کہنے سے اصلی مراد یہ دکھانا ہے کہ خلقت کی اصلی خدمت کرنے یعنی لوگوں کے مفید مطلب چیز بنانے کے راستے میں دو سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔ ایک شے کا ضائع ہونا اور دوسرے لالچ عام طور پر شے کے ضائع ہونے کی وجہ یہ ہوا کرتی ہے کہ ایک آدمی کو اپنے کام کی نسبت پوری واقفیت نہیں ہوتی یا وہ اپنے کام کو بڑی لاپرواہی سے کرتا ہے۔ لالچ اصل میں لمبی سوچ نہ کرنے کی محض ایک اور شکل ہے میں نے مال تیار کرنے میں ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ مال کی تیاری میں استعمال ہونے والے سامان اور مصالحے اور کام کرنے والوں کی لیاقت اور طاقت دونوں کو جہاں تک ممکن ہو سکے کم سے کم ضائع ہونے کا موقع دیا جائے۔ اور

پھر تھوڑے سے تھوڑے منافع کی شرح پر زیادہ سے زیادہ تعداد میں مال فروخت کر کے بھاری نفع پیدا کیا جائے
میں مال بناتے وقت اپنے کامگاروں کو زیادہ سے زیادہ تنخواہیں بانٹنا چاہتا ہوں۔ یعنی اُس حد تک
جہاں تک کہ مارکیٹ ہماری شی کے متعلق دام ادا کرنا خوشی سے برداشت کر سکتا ہو اور کیونکہ اس طرح سے
ہماری لاگت کم سے کم اُٹھتی ہے اور ہم کم سے کم منافع کی در پر مال بیچتے ہیں اس لئے ہمارا مال لوگوں کے
خریدنے کی طاقت کے موافق ہونے کی وجہ سے خوب فروخت ہوتا ہے۔ اور خریدار کو اکھرتا نہیں جس کا نتیجہ یہ ہے
کہ ہمارے ساتھ جس کسی کا بھی تعلق ہے ایک منیجر کے طور پر یا کامگار یا خریدار کی حیثیت سے سبھی کو ہمارا کارخانہ
ہونے کی وجہ سے بہت آرام اور فائدہ ہے۔ ہم نے جو یہ کام جاری کیا ہے اس سے خلقت کی بھاری خدمت
سرانجام ہو رہی ہے اور صرف یہی وجہ ہے کہ میں اس کا لوگوں کے سامنے ذکر کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اس
خدمت کو سرانجام دینے کے لئے ہم نے جو اپنے لئے اصول مقرر کئے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) آگے کا خیال کر کے نہ گھبرانا اور پچھلی کامیابی پر پھولا نہ سمانا ــــ جو آگے کی سوچ کر کے ڈرتا ہے جس کو
فیل ہو جانے کا خوف ہے۔ وہ ایک طرح سے اپنے چاروں طرف حلقہ سا ڈال کر اپنے آپ کو بند کر لیتا ہے
کسی کام میں فیل ہو جانے کا صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ انسان کو دوبارہ اُس کام کو زیادہ عقل کے ساتھ
شروع کرنے کا اس طرح سے موقع ہاتھ آتا ہے۔ ایمانداری کے ساتھ محنت کرتے ہوئے کسی کام میں فیل
ہو جانے میں کوئی بدنامی نہیں۔ بدنامی فیل ہو جانے سے خوف کھانے میں ہے۔ ایک آدمی نے جو پچھلے تجربہ
سے سبق حاصل کیا ہے۔ اُس کا صرف اتنا ہی فائدہ ہے کہ وہ اس کو اپنے سامنے رکھ کر اپنے لئے آئندہ ترقی کرنے
کا راستہ اور تجویزیں ڈھونڈے۔

(۲) دوسروں کے مقابلہ بازی یعنی کمپٹیشن کی پرواہ نہ کرنا:۔ ایک کام کو جو سب سے بہتر کرتا ہے
یا ایک مال کو جو سب سے عمدہ تیار کرتا ہے اُس کو کھلی چھٹی ہونی چاہیئے۔ جو اُس کا مقابلہ کرنا چاہتے ہوں اُن کو
دانائی کے ساتھ یعنی اُس سے بہتر کام کر کے یا مال بنا کر اُس کے ساتھ ٹکر لینی چاہیئے۔ نہ کہ زبردستی۔ دھینگا
مشتی سے نہ کہ اوچھی چالیں چل کر کسی کا رزق مارنا بڑا جرم ہے۔ کیونکہ اپنے ذاتی منافع کی خاطر دوسرے کی
چلتے کام کو اس طرح سے تباہ کرنا گویا اپنے بھائی بندوں کے منہ سے روٹی چھیننے کی کوشش کرنے کے
برابر ہے اور یہ پاپ ہے۔

(۳) پبلک کی خدمت کرنے کے خیال کو سب سے مقدم رکھنا اور اس کے بعد اپنے منافعوں کی فکر کرنا:۔ منافع کے

بغیر ایک کاروبار کبھی بڑھ نہیں سکتا۔ منافع کرنا کوئی پاپ نہیں ہے۔ اگر ایک کاروبار مناسب طریقے اور انتظام کے ساتھ کیا جائے تو اس میں ضرور منافع ہوگا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان کو یہ منافع پبلک کی اچھی خدمت کرنے کی وجہ سے بطور انعام ملنا چاہیئے اور لازمی طور پر ملے گا۔ مگر کوئی کاروبار صرف منافع کمانے کی نیت سے چلایا ہوا کامیاب نہیں ہوسکتا۔ منافع پبلک کی اچھی خدمت کرنے کے انعام ہیں۔ اور اچھے منافع صرف اسی طریقہ سے حاصل ہوسکتے ہیں۔

(۴) مال تیار کرنا اس کا نام نہیں کہ اس کے بناتے میں سستے کچے مصالحے یا سامان جوڑ دیئے جائیں اور تیار مال خوب اونچی قیمت پر مارکیٹ میں بیچا جائے۔ مال تیار کرنے کا یہ مطلب ہے کہ مناسب کچے مصالحے یا سامان اس مال کے بنانے کے لیے خریدے جائیں اور کم سے کم لاگت لگا کر ان کچے مصالحوں کو ایک ایسی شکل میں تبدیل کرکے پبلک کے سامنے پیش کیا جائے جس سے یہ لوگوں کے استعمال کی ایک چیز بن جائے اور پھر مارکیٹ میں اسے بیچا جائے۔ جوئے بازی۔ سٹہ بازی اور چال بازیوں سے اس قسم کی ترقی کرنے کے راستے میں بھاری رکاوٹ پڑتی ہے۔

یہ سب اصول کیونکر پیدا ہوئے اور چلنے میں کیسے ثابت ہوئے اور کس طرح سے یہ عام ہر جگہ اور ہر موقع پر استعمال کیئے جاسکتے ہیں۔ اس کتاب کے اگلے صفحوں میں انہیں باتوں پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بیان ایک (۱)

کاروبار کا شروع

۳۱ مئی سنہ ۱۹۲۱ء کو فورڈ موٹر کمپنی نے جو کار تیار کی۔ وہ پچاس لاکھویں تھی۔ یہ میرے عجائب گھر میں رکھی ہوئی ہے اور اُس کے ساتھ گیسولائن کی بگھی بھی موجود ہے جس پر میں نے تیس سال پہلے کام شروع کیا تھا اور جو اول مرتبہ سنہ ۱۸۹۳ء کے موسم بہار میں بہت اچھی چلی تھی۔ اُن دنوں ہر سال کی طرح ڈیربورن کے باغوں میں کوئلیں کوک رہی تھیں۔ دونوں گاڑیوں کی شکلوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اُنکی بناوٹ اور سامان میں بھی بہت زیادہ فرق ہے لیکن حیرانی ہے کہ دونوں کے بنیادی اصول ایک جیسے ہیں سوائے اس بات کے کہ گیسولائن کی بگھی کے جسم پر کچھ جھرّیاں پڑی ہوئی ہیں جو ہماری موجودہ زمانہ کی کاروں میں موجود نہیں۔ حالانکہ اس پہلی کار یا بگھی میں صرف دو سلنڈر تھے تو بھی یہ ایک گھنٹے میں بیس میل چلی جاتی تھی اور تین گیلن گیس پر جو اس کے چھوٹے سے ٹینک کی سمائی تھی ساٹھ میل کا سفر کر لیتی تھی۔ اور آج بھی یہ اتنا اچھا کام دینے کے قابل ہے جتنا کہ پہلے روز جب بنی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہماری کار کے تیار کرنے میں آج تک اس کے بنیادی ڈیزائن کو بہتر بنانے کی نسبت زیادہ توجہ اس کے بنانے کے طریقوں اور سامانوں کی ترقی کی طرف دی گئی ہے۔ کار کے سارے ڈیزائن کو ایک طرح سے پورا بدل ڈالا گیا ہے موجودہ فورڈ کار کے جو کہ ماڈل ٹی (T) ہے چار سلنڈر ہیں اور سیلف سٹارٹر یعنی بغیر ہینڈل مارے چلنے والی ہے اور اس وجہ سے دوسری کاروں کے مقابلہ میں اس کا چلانا بہت آرام کا اور آسان کام ہے۔ یہ پہلی کار کی نسبت بہت سادہ ہے۔ لیکن لگ بھگ تمام باتیں جو اس میں پائی جاتی ہیں

وہ پہلی کار میں بھی موجود تھیں اور جو تبدیلیاں اس میں نظر آتی ہیں وہ کسی بنیادی اصول میں فرق پڑ جانے کی وجہ سے نہیں بلکہ کار کے بنانے میں تجربہ سے بہتر ثابت ہونے پر کی گئی ہیں اور میری نگاہ میں یہ ضروری اور خاص بات ہے کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس خیال کو لے کر کوئی کام شروع کیا جائے تو کسی اور اچھے خیال کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کی نسبت اسی کو بہتر بنانے اور مکمل کرنے کی ہردم دل وجان سے کوشش کرتے رہنا کہیں زیادہ اچھا ہے۔ ایک آدمی ایک وقت میں کبھی ایک سے زیادہ خیال یا کام کے پیچھے لگنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

کھیت پر کام کرنے کی زندگی نے مجھے بار برداری کے بہتر طریقے اور راستے ڈھونڈھنے پر مجبور کر دیا میں ۳۰ جولائی ۱۸۶۳ء کو علاقہ مشگین کے مقام ڈیربورن میں پیدا ہوا تھا اور سب سے پہلے جس بات کی مجھے ہوش ہے وہ یہ ہے کہ جتنی ہمیں کھیت سے آمدنی ہوتی تھی اس کے مقابلہ میں ہمیں کہیں زیادہ کام کرنا پڑتا تھا اور اب بھی کاشت کے متعلق میری یہی رائے ہے۔ میں نے لوگوں کے منہ سے سنا ہے کہ میری ماں باپ بڑے غریب تھے اور انہوں نے میرے بچپن کے زمانہ میں بہت سختیاں جھیلی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کو امیر نہیں کہا جا سکتا تھا مگر وہ غریب بھی نہ تھے مشگین کے علاقہ میں جو کسانوں کی عام طور پر حالت تھی اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ہمارا کنبہ کافی خوشحال تھا جس گھر میں میں پیدا ہوا تھا وہ اب بھی موجود ہے اور وہ اور اس کے ساتھ کے کھیت اب بھی میری ملکیت میں ہیں۔

اس زمانہ میں نہ صرف ہمارے کھیتوں پر بلکہ ہر جگہ کسانوں کو حد سے زیادہ اور سخت ہاتھ کی کار کرنی پڑتی تھی۔ میں جب بہت چھوٹا تھا تبھی سے میرے دل میں یہ آواز اٹھتی تھی کہ اگر سارا نہیں تو کم سے کم بہت سے کاشت کے کاموں کو کرنے کا کوئی نہ کوئی بہتر طریقہ ضرور ڈھونڈھ کر نکالا جا سکتا ہے۔ یہ وجہ تھی کہ مجھے مشینوں کے بنانے اور چلانے کا علم یعنی کل شاستر سیکھنا پڑا۔ گو میری ماں ہمیشہ یہ کہا کرتی تھی کہ مجھے پیدائش سے پہلے ہی یہ سب علم آتا تھا۔ میرے پاس جب کچھ نہ تھا تب بھی میں نے دھاتوں کے کئی عجیب وغریب اور ٹیڑھے میڑھے ٹکڑوں کو اوزاروں کے طور پر جمع کر کے اپنی ایک طرح کی ورکشاپ کھڑی کر لی تھی۔ اس زمانہ میں آج کل کی طرح کے کھلونے نہیں چلے تھے اور تمام کھلونے اُن لوگوں کو گھروں میں خود ہی بنانے پڑتے تھے۔ اس وقت جو میں کھلونے گھر پر تیار کرتا تھا وہ یہی اوزار ہوا کرتے تھے اور آج بھی یہی میرے کھلونے ہیں! اور اس وقت میں مشین کے ایک ایک پرزے اور ٹکڑے کو اس طرح

بہت اچھا ہو۔ انہیں کیا خبر تھی کہ دُنیا میں خوب روپیہ پیدا کرنے کا سب سے سہل گر جو ہے وہ ہے اپنے کام میں دل لگانا محنت کرنا۔

اب کمپٹیشن (مارکیٹ میں مقابلہ بازی) کی بات لیجیے۔ میں نے دیکھا کہ لوگ کمپٹیشن کو ہوّا سمجھ رہے ہیں۔ اور بیوپار میں ہوشیار صرف اُس کو مانتے ہیں جو ہیرا پھیری سے اُس کام کا سارا ٹھیکہ اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنے کمپٹیشن کرنے والوں کو جھانسا دے سکے۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ کیونکہ خریدنے والوں کی ہمیشہ ایک خاص تعداد ہوا کرتی ہے اس لئے کمپٹیشن کرنے والوں سے اوپر ہی اوپر اپنے مال کو بیچ لینے کا انتظام کرنا ضروری ہوتا ہے۔ شاید کسی کو یاد ہو کہ کچھ سال پہلے موٹر گاڑیوں اور کاروں کے بنانے والوں نے سٹیڈن پیٹنٹ کے ماتحت ایک ایسوسی ایشن قائم کی تھی تاکہ انہیں قانونی طور پر موٹر گاڑیوں اور کاروں کی قیمتوں کی تعداد میں گھٹانے بڑھانے کا اختیار مل جانے سے یہ کاروبار پورے طور پر اُن کے قبضہ میں آجائے اُن کا بھی عین وہی خیال تھا جو کہ بہت سی تجارتی سبھاؤں (ٹریڈ یونینیں) کا ہے یعنی یہ بے ہودہ وہم کہ اس طریقہ سے بیوپاری لوگ زیادہ کی نسبت آگے سے تھوڑا کام کر کے زیادہ منافع اُٹھا سکتے ہیں میری رائے میں یہ ترکیب بہت پُرانی ہو چکی ہے۔ اور اب بالکل ناکارہ ہو گئی ہے۔ میں نہ اُس وقت مانتا تھا نہ اب کہ کام کرنے والے کو ہمیشہ کافی اُجرت نہیں ملتی بلکہ میرا کہنا تو یہ ہے کہ کمپٹیشن کا مقابلہ کرنے میں جو وقت خرچ ہوتا ہے وہ بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔ اس سے تو ہزار درجہ یہ بہتر ہے کہ یہ وقت اچھی طرح کام کرنے میں لگایا جائے۔ اگر ایک شخص پبلک کی ضرورتوں کے مطابق مال تیار کرنے والا ہو اور واجبی قیمت پر بیچا کرے تو اُس کو خریداروں کی کبھی کمی نہیں رہے گی بلکہ لوگ ہمیشہ اُس کا مال شوق سے خریدنے کے لئے تیار رہیں گے۔ اور یہی بات خریدار کی خدمت کرنے یعنی اُس کو سہولیت پہنچانے کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔

جن دنوں میں ان باتوں پر سوچ وچار کرتا تھا۔ میں خالی نہیں بیٹھا رہتا تھا۔ میں زور شور کے ساتھ چار سلنڈر والی موٹر اور تیز رفتاری کے مقابلہ میں حصہ لینے والی دو بڑی کاریں بنانے میں جٹا ہوا تھا میرے پاس کافی وقت رہتا تھا کیونکہ میں نے اپنے کاروبار کی فکر کرنا پل بھر کے لئے بھی کبھی نہیں چھوڑا۔ غور سے دیکھا جائے تو ایک انسان کے لئے اپنے کاروبار کی کبھی پل بھر کے لئے بھی فکر چھوڑ دینا ناممکن ہے۔ اُسے دن میں جاگتے ہوئے ہر دم اس کی بابت سوچتے رہنا چاہیے۔ اور رات کو اس کے ہی سپنے دیکھنے چاہئیں اس میں شان تو بڑی ہے کہ ایک آدمی اپنے کام کو صرف دفتر کے مقررہ گھنٹوں میں آکر کرے یعنی صبح کام پر آئے

اور شام پڑنے پر دفتر سے اُٹھ کر گھر چل دے۔ بس پھر اگلی صبح دفتر آنے تک چھٹی ہی چھٹی منائے۔ ایسی صورت پیدا کرنا عین ممکن ہے بشرطیکہ انسان ساری عمر دوسروں کے اشارے پر چلنے۔ ماتحت رہ کر کام کرنے یا ملازم (ممکن ہے کسی بڑے ذمہ دار عہدے پر) رہنے کے لئے تیار ہو اور اُس کے دل میں کسی کمپنی کے منیجر یا ڈائرکٹر بننے کی کبھی خواہش پیدا نہ ہو۔ ایک ہاتھ کی کار کرنے والے کیلئے کام کرنیکے گھنٹوں کی تعداد ضرور مقرر ہونی چاہیئے ورنہ وہ جلدی ختم ہو جائے گا اس لئے اگر ایک آدمی نے ساری عمر ہاتھ کی کار کرنے والے کاریگر یا کامگار کے طور پر زندگی بسر کرنی ہے تب تو اُسے شام کو کارخانہ کی گھنٹی یا بھونپو بجنے کے ساتھ ہی اپنے کام کے متعلق سب کچھ بھول جانا چاہیئے۔ لیکن اگر اس نے کچھ آگے بڑھنا ہے اور ترقی کرنی ہے تب اُسے شام کو کارخانہ کی گھنٹی یا بھونپو بجنے کے وقت سے لے کر اگلی صبح تک اپنے کام کے متعلق ہی سوچتے رہنا چاہیئے کہ میں آج کی نسبت کل کو کس طرح سے زیادہ اور بہتر کام کر سکتا ہوں۔

جس کے پاس کام کی کرنے کی سب سے زیادہ ہمت اور عقل ہے وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ دنیا میں دو طرح کے انسان ہیں۔ ایک سدا کام کرتا رہتا ہے۔ اپنے کام کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ ہمیشہ ترقی کرنے کی تن من کے ساتھ کوشش کرتا رہتا ہے اور اس لئے ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ اور دوسرا صرف دفتر کے مقررہ وقتوں میں کام کرتا ہے اور دن کے ۲۴ گھنٹوں میں صرف اتنا عرصہ ہی اپنے دماغ اور ہاتھوں سے کام لیتا ہے ان دونوں میں کون زیادہ خوش رہتا ہے۔ یہ میرے لئے کہنا ذرا مشکل ہے۔ کیونکہ مجھے خود اس بات کا پختہ علم نہیں مگر کسی شخص کے لئے اس سوال کا فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ ایک دس گھوڑے کی طاقت والا انجن بیس گھوڑے کی طاقت والے انجن کے برابر کام نہیں دے سکتا۔ جو آدمی اپنا دماغ صرف دفتر کے گھنٹوں ہی میں استعمال کرتا ہے وہ اپنی طاقت اور ہمت کو پھولنے پھلنے نہیں دیتا۔ اگر دفتر کے وقت میں جتنا کام وہ کرتا ہے اُس سے اس کی تسلی ہو جاتی ہے تب تو بہت اچھا اور دوسروں کو اس سے کچھ سروکار نہیں لیکن اگر کوئی دوسرا آدمی اُس سے زیادہ کام کر کے بازی لے جاوے تو پھر اُسے شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ کام اور آرام طلبی دونوں سے الگ الگ نتیجے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ایک آدمی آرام طلبی چاہتا ہے اور اُسے وہ حاصل کر لیتا ہے تو پھر اُسے شکایت کا کوئی موقع نہیں۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ کرے تو وہ آرام طلبی اور ڈھونڈے کام کے انعام یعنی نتیجے۔ دونوں چیزیں ایک ساتھ کبھی نہیں مل سکتیں۔

اُس سال کاروبار میں رہ کر جن چند مقدّم سچائیوں کو میں نے سیکھا۔ اور جن میں — گو اس قسم کی

سچائیوں کی تعداد ہر سال بڑھتی چلی جاتی ہے۔ آج تک بالکل کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہے ہیں۔

(۱) دُنیا کام کے مقابلہ میں روپیہ کو بہت اونچا درجہ دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کام کی کوالٹی دن بدن گھٹتی جاتی ہے اور لوگوں کے دل سے خریدار کی خدمت کرنے کا خیال دور ہوتا جا رہا ہے۔

(۲) کام سے پہلے دام کا فکر کرنے سے کاروبار میں فیل ہو جانے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ خطرہ کاروبار کے تمام راستوں میں موٹی دیوار کھڑی کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان مارکیٹ میں اپنے ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ مقابلہ میں کھڑا ہونے۔ ضرورت کے مطابق نئے طریقے اختیار کرنے اور کوئی ایسی چال چلنے سے جس سے ممکن ہے اُس کی عادت بہتر بن سکے خوف کھاتا ہے۔

(۳) ہر شخص کے لئے جس کے دل میں پبلک کی خدمت کرنے (جس کا مطلب ہے لوگوں کو سہولیت اور آرام پہنچانے) کی اُمنگ ہے یعنی دُنیا میں جو اپنے کام کو ممکن سے ممکن بہتر طریقے سے کرتا ہے راستہ بالکل سیدھا اور صاف ہے۔ وہ ضرور کامیاب ہوگا۔

بیان تیسرا

اصل کاروبار شروع

مجھے اپنی چھوٹی سی اینٹوں کی بنی ہوئی پختہ دوکان میں نئی کار کے ڈیزائن کی نسبت اور مال تیار کرنے کے کچھ نئے قاعدوں کے تجربے کرنے کا کافی موقع ملا۔ میں ایک ایسی کمپنی کھڑی کرنی چاہتا تھا جس میں سب سے زیادہ توجہ اور مقدم دھیان اچھی طرح سے کام کرنے اور پبلک کو سہولیت دینے کا رکھا جائے۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ میری اس خواہش کے عین موافق اس قسم کی کمپنی بنانا ممکن تھا تو بھی مجھے یہ بات جلدی ظاہر ہو گئی کہ جن خشک اور نپے تلے قاعدوں کے مطابق آج کل کارخانوں میں کام ہو رہا ہے اُن پر چل کر میں ایک واقعی عمدہ کار بنانے میں جو کم قیمت پر مارکیٹ میں بک سکتی ہو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ایک کام کو پہلے کی نسبت دوسری بار بہتر کرنا ہمیشہ ممکن ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس وقت اس سادے اصول کو عام طور پر کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کارخانہ داروں کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ مال تیار کر کے بیچنے کی پڑی رہتی تھی اور اس لئے اُنہیں تیاری کرنے کے واسطے کافی وقت اور موقع نہیں ملتا تھا۔ زیادہ تعداد میں مال تیار کرنے کی بجائے صرف اتنا مال تیار کرنا جتنے کا آرڈر ہاتھ میں ہو۔ یہ عادت میرے خیال میں شاید لوگوں کو اُس زمانے سے پڑی ہوئی ہے اور دنیا میں تب سے اس کا رواج ہوا ہے جب ہر کام ہاتھ کی محنت کر کے کرنا پڑتا تھا۔ اگر سو آدمیوں سے پوچھا جائے کہ وہ فلاں چیز کو کس طرح سے بنوانا چاہتے ہیں تو اُن میں سے لگ بھگ اسّی ایسے ملیں گے جو یہ جواب دیں گے کہ ہمیں پتہ نہیں۔ جیسے تمہارے دل میں آئے بنا لو۔ پندرہ کے قریب بنا سوچے سمجھے جو منہ میں آئے گا کہہ دیں گے اور صرف پانچ ایسے نکلیں گے جو واقعی ٹھیک بتا سکیں گے کہ ہمیں اس قسم کی چیز درکار ہے

اور کیوں۔ ایک مال کو بیچنے کا مارکیٹ اصل میں یہی پچانوے فی صدی لوگ ہیں جنہیں اس چیز کی نسبت کچھ واقفیت نہیں۔ مگر ان میں سے اسّی یہ اپنی بے علمی مانتے ہیں اور پندرہ منہ سے نہیں مانتے۔ باقی کے پانچ جو اپنی مرضی کے موافق مال تیار کروانا چاہتے ہیں ممکن ہے یہ خاص کام کرانے کے دام ادا کرنے کے قابل نہ ہوں۔ اگر اُن کے پاس اتنے دام ہوئے تب تو وہ کام کرالیں گے مگر اس قسم کے خاص خریداروں کی تعداد بڑی تھوڑی ہوا کرتی ہے۔ پہلے پچانوے آدمیوں میں سے شائد دس پندرہ کوالٹی کی قیمت ادا کرنے والے ہوں باقی کوالٹی کی پرواہ نہ کرکے صرف سستے داموں کی چیز ڈھونڈھنے والے ہوں گے یہ ٹھیک ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد دن بدن کم ہو رہی ہے۔ کیونکہ خریداروں کو اب مال خریدنے کی عقل آہستہ آہستہ آ رہی ہے۔ خریداروں کی زیادہ تعداد اب کوالٹی کے پیچھے جاتی ہے اور لوگ اپنے روپیہ کے کوالٹی کے لحاظ سے مارکیٹ میں زیادہ سے زیادہ دام جو مل سکیں وصول کرنا سیکھ گئے ہیں۔ اس لئے اگر آج ایک آدمی کو ایک ایسی چیز کا پتہ لگ جائے جو ان پچانوے فی صدی آدمیوں کی ضرورت کو خوب پورا کرنے والی ہو اور اُس چیز کو بڑھیا سے بڑھیا کوالٹی کا تیار کرکے ممکن سے ممکن سستی قیمت پر بیچنے کا وہ انتظام کرلے تو اُس کا کاروبار اتنا چمکیگا جس کی کچھ حد نہیں۔

یہ مال کو سکّہ بند کرنا نہیں کہلاتا۔ سکّہ بند مال تیار کرنے سے بہت گڑبڑی پھیلنے کا اندیشہ ہے کیونکہ عام طور پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آئندہ کو وہ مال اور بھی بہتر ڈیزائن کا تیار کرنے اور اُس کی تیاری میں آگے سے بھی بہتر عمل اور طریقے استعمال کرنے کا سارا کام ایک طرح سے ٹھپ ہو جاتا ہے اور کارخانہ دار اکثر اپنے لئے ایک ایسی چیز پسند کر لیتا ہے جس کے بنانے میں اُسے سب سے زیادہ آسانی ہو۔ اور جس کو بیچ کر اُسے سب سے زیادہ منافع ملتا ہو اُس چیز کا ڈیزائن یا قیمت مقرر کرتے وقت پبلک کے فائدے یا سہولیت کا بالکل لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ عام طور پر سکہ بند مال تیار کرنے میں بس ایک ہی خیال ہوا کرتا ہے اور وہ یہ کہ اس طرح چل کر اور بھی زیادہ منافع ہوگا۔ نتیجہ یہ ہے کہ صرف ایک چیز تیار کرنے سے لازمی طور پر جو لاگت میں کافی بچت ہوتی ہے اُس کی وجہ سے کارخانہ دار کے منافع دن بدن زیادہ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اُس کے تیار مال کی تعداد بھی بڑھتی رہتی ہے کیونکہ زیادہ سہولیت ملنے سے وہ زیادہ مال تیار کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اُس سے پہلے کہ اُسے اس کی کچھ سُدھ ملے اُس کے پاس اتنی زیادہ تعداد میں مال تیار ہو جاتا ہے کہ اُس کو بیچکر نکالنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ البتہ اگر کارخانہ دار اس مال کو کم دام پر بیچنے کے لئے رضامند

ہو جائے تو بے شک اُس کا مال بک سکتا ہے۔ خریدار تو ہر صورت میں کوئی نہ کوئی نکل آتا ہے لیکن یہ لازمی نہیں کہ قیمت گھٹا دینے سے ہمیشہ ضرور ہی کوئی خریدار مل جائے گا۔ اگر ایک چیز پہلے حد سے زیادہ اونچے دام پر بکتی رہی ہے اور کیونکہ اب اُس کا کاروبار ٹھنڈا پڑ گیا ہے اس لیے اُس کے دام اگر ایک دم گھٹا دئے جائیں تو پھر بھی کئی بار سخت مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اور اس کی بڑی معقول وجہ ہے اور وہ یہ کہ پبلک بھی چوکنی ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو خیال ہو جاتا ہے کہ داموں میں یہ کمی بھی کوئی دھوکے کی چال ہے اور اصل میں ابھی اور دام ضرور گھٹیں گے۔ اس لئے تب تک چپ بیٹھے رہنا چاہیئے۔ پچھلے سال ہمیں اس کا کافی تجربہ ہو چکا ہے لیکن اگر اس کی بجائے مال کے تیار کرنے کی لاگت میں جو بچت نکلے اُس کے حساب سے داموں میں فوراً کمی کر دی جائے اور اگر پبلک کو اس بات کا پختہ یقین ہو کہ کارخانہ دار کی سچ مچ یہی پالیسی ہے تو پبلک کے دل میں کارخانہ دار کا اعتبار جم جائے گا اور بکری میں ہرگز کمی نہیں ہوگی بلکہ ترقی ہوگی۔ کیونکہ لوگوں کو بھروسہ ہوگا کہ اُس کارخانہ دار سے چیزیں خریدنے میں روپیہ کے پورے سولہ آنے ملیں گے۔ اس لئے اگر یہ کارخانہ دار یا بیوپاری اپنے مال کے دام آہستہ آہستہ لگاتار کم کرنے کو تیار نہیں تو اُس کا سکہ بند مال تیار کرنا گھاٹے کا سودا ہے۔ اور داموں میں کمی مال تیار کرنے کی لاگت میں بچت ہونے کی وجہ سے اُس کو کرنی چاہیئے۔ نہ کہ اس لئے کہ مارکیٹ میں اب یہ چیز آگے سے کم بکنے لگی ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اُس چیز کے دام کارخانہ دار نے تیز رکھے ہوئے تھے مطلب یہ ہے کہ سکہ بند مال صرف اُس صورت میں خوب چلتا ہے جبکہ پبلک لگاتار اس چکر میں پڑی رہا کرے کہ اتنے تھوڑے پیسوں میں ایسی عمدہ اور اتنی زیادہ چیز کارخانہ دار کیونکر دے رہا ہے۔

سکہ بند مال کا مطلب جیسا کہ میں سمجھتا ہوں یہ نہیں ہے کہ کارخانہ دار اپنی سب سے زیادہ بکنے والی ایک چیز کو پکڑ لے اور اپنا سارا زور اُسی کے اوپر لگا دے۔ سکہ بند مال بنانا وہ کہلاتا ہے کہ کارخانہ دار پہلے اُس چیز کا ڈیزائن رات دن بلکہ برسوں تک سوچ سمجھ کر ایسا نکالے کہ پبلک کی ضرورت کے عین موافق ہو اور پھر اُس کے بنانے کا بہتر سے بہتر طریقہ تلاش کرے۔ اس کے بعد اس مال کو تیار کرنے میں جن جن عملوں کی ضرورت پڑے گی اُن کی شکل اور ترتیب کا فیصلہ اپنے آپ موقع اور حالت کے مطابق ہوتا چلا جائے گا۔ تب اگر ہم منافع کا خیال چھوڑ کر پبلک کی خدمت کرنے کی نیت سے مال تیار کرنا شروع کر دیں تو ہمارا کام سچے معنوں میں کاروبار کہلانے کے لائق ہو جائے گا اور اس سے اتنا منافع نکلے گا کہ جی بھر جائے گا۔

مجھے تو یہ سب باتیں اتنی سچی لگتی ہیں کہ ان کو ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں جو کارنہ بار نسا ئی

کے بچاؤ سے فی صدی لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے جاری کیا جائے گا اُس کی تہہ میں ان معقول سچے اصولوں کا ہونا نہایت لازمی ہے۔ ایک سوسائٹی کے پاس اپنی خدمت کرانے کا اس سے بہتر اور کوئی معقول ذریعہ نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عام طور پر کیوں کاروبار اس اصول پر نہیں چلایا جاتا اس اصول کو اختیار کرنے کے لئے بس اتنا ہی تو کرنا ہے کہ انسان جھٹ پٹ منافع حاصل کرنے کے پیچھے اس طرح سے ہڑبڑا کر پڑنے کی عادت چھوڑ دے جیسے کل کو دنیا سے روپیہ کا نام ونشان اُٹھ جائے گا۔ شکر ہے کہ لوگوں کی یہ عادت آہستہ آہستہ چھوٹ رہی ہے۔ ملک کے اندر تمام بڑی اور کامیاب پرچون کی دوکانوں پر "ایک دام" سے کام ہونے لگا ہے۔ اب اگلا قدم اُٹھانا یہ باقی رہتا ہے کہ کاروبار کے اندر سے یہ خیال نکل جائے کہ لوگوں سے ایک شے کے اتنے دام چارج کرنے بالکل واجب ہیں جتنے وہ خوشی سے برداشت کر سکیں اور اُس کی بجائے یہ سادہ قاعدہ چل پڑے کہ ایک شے کے دام جتنی اُس کے بنانے میں لاگت آتی ہے اُس کے حساب سے مقرر ہونے چاہئیں اور پھر بنانے والا ہمیشہ یہ کوشش کرتا ہے کہ یہ لاگت اور یہی دن بدن کم ہوتی جائے۔ اگر ایک شے کا ڈیزائن کافی سوچ سمجھ کر قائم کیا گیا ہو تو اُس میں آگے چل کر بہت کم تبدیلیاں کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر اُس کے بنانے کے عملوں اور طریقوں میں ضرور جلدی جلدی تبدیلیاں ہوتی رہیں گی اور ایسا ہونا بالکل قدرتی ہے۔ آج تک جتنے کاموں میں بھی ہم نے ہاتھ ڈالا ہے اُن سب میں ہمارا یہی تجربہ ہے۔ مگر یہ سب کس طرح سے عین قاعدے میں اپنے آپ ہوتا چلا گیا۔ یہ قصہ میں آگے چل کر تفصیل سے بیان کروں گا۔ لیکن جس بات کو میں یہاں پر زور دے کر ظاہر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب تک کام کو شروع کرنے سے پہلے کافی عرصہ تک خوب سوچ بچار کر نہ دیکھ لیا جائے تب تک ایسی بڑھیا چیز تیار کرنا ناممکن ہے جو اس قابل ہو کہ انسان دل اور جان سے اُس میں جُٹ جائے۔ یہ نہیں کہ اِدھر سوچا اور اُدھر کام شروع کر دیا۔ ایسا کرنا کاروبار نہیں بلکہ مخول بازی ہے۔

جس سال میں تجربے کر رہا تھا اُس عرصے میں میرے یہ خیال آہستہ آہستہ پختہ ہو رہے تھے۔ میرے تجربے زیادہ تر مقابلہ کی دوڑ میں حصہ لینے والی کاروں کے بنانے کے متعلق ہوتے تھے۔ بات یہ تھی کہ سب لوگوں کے دلوں میں یہ خیال جما ہوا تھا کہ اوّل درجہ کی کار وہی ہے جو مقابلہ کی دوڑ میں سب سے بازی لے جائے یعنی خوب تیز رفتار ہو۔ میں نے اس بات کی کبھی بھی خاص پرواہ نہیں کی۔ لیکن بائیسکل کی طرح موٹر گاڑی اور کاروں کے بنانے والوں کو بھی یہ وہم ہو گیا تھا کہ مقابلہ کی دوڑ میں جو کار یا گاڑی بازی لے جائے گی اُس کی پبلک میں دھاک بندھ جائے گی گو میری اپنی رائے یہ ہے کہ ایک کار یا گاڑی کی کوالٹی اور پائیداری کا اندازہ

کرنے کے لئے مقابلہ کی دوڑ سے بڑھ کر اور ردّی امتحان کوئی نہیں ہو سکتا۔
مگر چونکہ میری لائن میں سبھی ایسا کام کرنے لگ پڑے تھے اس لئے مجبور ہو کر مجھے بھی اُن کے پیچھے چلنا پڑا
چنانچہ سن ۱۹۰۱ء میں ٹام کوپر کے ساتھ مل کر میں نے صرف تیز رفتاری کے خیال کو سامنے رکھتے ہوئے دو کاریں تیار
کیں۔ وہ دونوں بالکل ایک جیسی تھیں۔ ایک کا نام "۹۹۹" اور دوسری کا "ایرو" یعنی تیر رکھا گیا۔ میں نے سوچا کہ
اگر موٹر کار اور گاڑیاں صرف تیز رفتار ہونے کی وجہ سے مشہور ہو سکتی ہیں تو کیوں نہ میں ایک ایسی کار بناؤں جس کی
رفتار دیکھ کر دنیا دنگ رہ جائے۔ یہ کاریں بالکل اسی مطلب کی بنائی گئی تھیں۔ میں نے ان میں چار بڑے بڑے
سیلنڈر لگائے تھے جو اسی گھوڑوں کی طاقت پیدا کر دیتے تھے اس سے پہلے اتنی طاقت والی کار کوئی نہیں جانتا
تھا۔ اس کار کے چلتے ہوئے صرف ان سیلنڈروں کا زبردست شور ہی ایک انسان کو ادھ مرا کرنے کے لئے کافی
تھا۔ اس میں بیٹھنے کے لئے صرف ایک آدمی کی سیٹ تھی۔ ایک کار میں صرف ایک آدمی چڑھ سکتا تھا۔ میں نے
ان کاروں کی آزمائش کی۔ کوپر نے بھی کی۔ ہم نے ان کو پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔ بس ہماری تو گویا جان ہی سی نکل
گئی اس کار میں بیٹھ کر چلانے کے مقابلہ میں نیاگرا کے جھرنے سے چھلانگ لگانا محض کھیل تماشہ لگتا تھا۔ سب سے
پہلے ہم نے "۹۹۹" کو باہر نکالا مگر اس کو مقابلہ کی دوڑ میں دوڑانے کی ذمہ داری لینے کو میں تیار نہ تھا اور نہ کوپر
لیکن کوپر نے مجھے بتلایا کہ وہ ایک ایسے آدمی کو جانتا ہے جو تیز رفتاری کا نہایت شوقین ہے اور ایک کار خواہ
وہ کتنی ہی تیز چلنے والی کیوں نہ ہو وہ بالکل نہیں گھبراتا۔ چنانچہ اس نے سالٹ لیک (SALT LAKE) شہر
کو تار دیدی اور وہاں سے بارنے اولڈ فیلڈ نام کا ایک شخص آ گیا جس نے بائیسکل کی دوڑ میں حصہ لینا اپنا پیشہ
بنایا ہوا تھا۔ اُسے موٹر کار چلانے کا بالکل تجربہ نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کار کو چلا کر دیکھنے پر رضامند ہو گیا۔ وہ کہنے
لگا کہ خواہ کتنا بھی سخت اور خطرناک کوئی کام کیوں نہ ہو ایک بار تو وہ ضرور اُس کو کر کے دیکھ ہی لے گا۔
ہم نے ایک ہفتہ کے اندر اُس کو کار چلانا سکھلا دیا۔ وہ آدمی جانتا نہ تھا کہ خوف کس بلا کا نام ہے۔ بس اسکو
صرف اتنا ہی سیکھنا تھا کہ اس بھیانک کار کو کس طرح سے قابو میں رکھنا ہے۔ اُس کار کے مقابلہ میں آج کل
کی تیز سے تیز کار کو قابو میں رکھنا کچھ چیز نہیں۔ ابھی تک کاروں میں اسٹیرنگ وہیل (STEERING WHEEL)
یعنی گھمانے والا پہیہ لگنا شروع نہیں ہوا تھا۔ اور تب تک جتنی کاریں میں نے بنائی تھیں اُن سب میں صرف
ہتھا لگا ہوتا تھا۔ مگر اس کار میں میں نے دو ہاتھوں سے پکڑنے والا ہتھا لگایا تھا کیونکہ اس کار کو راستے پر
سیدھا رکھنے کے لئے ایک طاقتور آدمی کو اپنا پورا زور لگانے کی ضرورت تھی۔ جب دوڑ میں سٹرک پر ہم نے

(سائبان) میں اسے کھڑا کر لیا۔ اس بجلی گھر میں پہلے چند مہینے میری رات کی ڈیوٹی تھی اس لئے مجھے ان دنوں تجربہ کرنے کا بالکل وقت نہیں ملتا تھا۔ لیکن اس کے بعد میری دن کی ڈیوٹی ہو گئی اور میں ہر رات اور ہر سنیچر کی تمام رات وہاں بیٹھ کر اپنی نئی موٹر تیار کیا کرتا تھا۔ میں یہ کہنے کو تیار نہیں کہ یہ کام بہت سخت تھا کیونکہ جس کام کے کرنے میں آدمی کو مزا آتا ہو وہ اسے کبھی سخت نہیں لگتا اور پھر مجھے اپنے کامیاب ہونے کا پورا یقین تھا کیونکہ جب آدمی دل لگا کر خوب محنت کرتا ہے تو وہ ضرور کامیاب ہوتا ہے لیکن اس سے بڑھ کر مجھے ایک اور بڑا فائدہ یہ تھا کہ مجھ سے زیادہ میری بیوی کو میرے کامیاب ہونے کا پورا یقین تھا۔ یہی تو اس کی ہمیشہ خوبی رہی ہے۔

اس کام میں مجھے شروع سے چلنا پڑا یعنی گو میں جانتا تھا کہ اس وقت بہت سے آدمی بلا گھوڑے کی گاڑی بنانے کی کوششیں کر رہے ہیں لیکن میں کسی طرح سے یہ پتہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اس کام میں کہاں تک پہنچے ہیں۔ میرے سامنے سب سے بڑی دو دقتیں یہ تھیں کہ اس انجن کے اندر آگ کا چنگارہ پیدا کرنے اور ہٹانے کا کیا انتظام رکھا جائے اور اس کا فالتو وزن کس طرح اڑایا جائے۔ اس کے اندر بجلی کی کرنٹ گزارنے اور انجن کو چالو کرنے والے دندانہ دار پہیئے کا ٹھیک ٹھیک بندوبست کر دینے و اس کی عام بناوٹ کے متعلق مجھے سٹیم ٹریکٹروں کے تجربوں سے کافی واقفیت حاصل ہو چکی تھی ۱۸۹۲ء میں میری پہلی موٹر کار مکمل تیار ہو گئی لیکن اگلے سال کے موسم بہار سے پہلے یہ میری مرضی اور خواہش کے مطابق کچھ کچھ ٹھیک چلنے کے قابل نہیں بنی تھی۔ اس پہلی کار کی ایک بگی کے ساتھ کافی شکل ملتی تھی۔ اس میں دو سلنڈر ساتھ ساتھ پچھلے دھرے کے اوپر لگے ہوئے تھے جس کے پسٹن ڈھائی انچ موٹے اور ۶ انچ لمبے تھے۔ ان کو میں نے ایک خریدے ہوئے سٹیم انجن کے باہر ہوا پھینکنے والے پائپ (EXHAUST PIPE) میں سے تیار کیا تھا ان سے لگ بھگ چار گھوڑوں کی طاقت پیدا ہو جایا کرتی تھی اور یہ طاقت ایک پٹے کے ذریعہ موٹر سے کاؤنٹر شافٹ (COUNTER SHAFT) میں پہنچائی جاتی تھی اور وہاں سے ایک زنجیر کے ذریعہ پچھلے دھرے تک لے جائی جاتی تھی۔ اس کار میں دو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ بیٹھنے کی سیٹ دو بلیوں پر ٹکی ہوئی تھی اور باڈی کے نیچے بیضوی کمانیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ انجن دو رفتاروں پر چل سکتا تھا ایک دس میل دوسری بیس میل فی گھنٹہ۔ آخری رفتار حاصل کرنے کے لئے پٹے کو کلچ لیور (CLUTCH LVER) کے ذریعہ جو ڈرائیور کی سیٹ کے سامنے لگا ہوتا تھا فوراً اٹھا دینا پڑتا تھا جب لیور کو آگے کی طرف کر دیا جاتا تو رفتار تیز

ہو جاتی تھی اور جب اُسے پیچھے کھینچتے تھے تو ہلکی رفتار ہو جاتی تھی اور جب اُسے بالکل سیدھا کھڑا کر دیتے تھے تو انجن اپنے مزے سے چلنے لگتا تھا۔ کار کو چلانے کے لیے کلچ (CLUTCH) کو کھلا چھوڑ کر ہینڈل مارنے کی ضرورت تھی۔ کار کو ٹھہرانے کے لئے صرف کلچ کو ڈھیل دے کر فٹ بریک لگانی پڑتی تھی یہ گاڑی پیچھے کی طرف نہیں چلائی جا سکتی تھی اور پٹہ کی رفتاروں کے علاوہ باقی رفتاریں تھراٹل کے ذریعہ حاصل ہوتی تھیں۔ میں نے اس گاڑی کی باڈی کے لئے لوہے کا سامان سیٹ اور کمانیاں خریدیں۔ اس کے پہیے ۲۸ انچ تار والے بائسکل کے پہیے تھے جن پر ربڑ کے ٹائر چڑھے ہوئے تھے۔ چال ٹھیک رکھنے والے پہیے یعنی بیلنس وہیل کو میں نے پیٹرن (PATTERN) یعنی ڈھانچہ بنا کر ڈھالا اور اسی طرح اس گاڑی کے تمام باریک پُرزے میں نے اپنے ہاتھ سے بنائے۔ مجھے اس کو بناتے وقت یہ نقص نظر آیا کہ اس کے اندر ایک ایسا دندانہ دار پہیّہ بھی ضرور لگنا چاہیئے جس کے ذریعہ موڑ پر گھمانے وقت پچھلے دونوں پہیوں پر برابر کا زور پڑے۔ ساری گاڑی کا وزن سوا چھ من کے قریب تھا سیٹ کے نیچے ایک ٹینک لگایا گیا تھا جس میں تین گیلن گیسو لائن آجاتی تھی جو ایک چھوٹے سے پائپ اور ایک ڈھبنی کے ذریعہ موٹر میں پہنچتی رہتی تھی۔ اس میں آگ بجلی کے چنگارے کے ذریعہ پیدا کی جاتی تھی۔ پہلے اس کا انجن چلتے ہوئے کبھی گرم نہیں ہوتا تھا۔ ہاں یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی موٹر ٹھنڈا کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ لیکن بعد میں تجربے سے یہ پتہ چلا کہ ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ چل کر موٹر گرم ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں نے جلدی ہی سلنڈروں کے اردگرد پانی رکھنے کے لئے ایک غلاف سا چڑھا دیا اور ایک پائپ کے ذریعہ اس کو کار کی پچھلی طرف سلنڈروں کے اوپر ایک حوض کے ساتھ جوڑ دیا۔

کار کے اندر ان تمام خوبیوں کو ڈالنے کے لئے میں نے بہت عرصہ پہلے سے تجویزیں سوچ رکھی تھیں میرا کام کرنے کا ہمیشہ یہی طریقہ رہا ہے میں پہلے ایک تجویز اپنے دماغ میں بنا لیتا ہوں پھر اس چیز کے بنانے یا کام کرنے سے پہلے اس کے ایک ایک انگ اور کونے کی اچھی طرح سے چھان بین کرتا ہوں۔ ورنہ کام کو کرتے کرتے بیچ میں کئی طرح کی ادلا بدلی ٹھوپ چند کرنے کی خاطر کرنی پڑتی ہیں جس کی وجہ سے جب چیز بن کر تیار ہوگی تو اُس کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور نکما یا کمزور رہ جائے گا اور تمام پُرزے ایک دوسرے سے میل کھانے والے ہرگز نہیں ہوں گے۔ بہت سے ایجاد کرنے والے اسی وجہ سے رہ جاتے ہیں کہ وہ ایک تجویز دماغ میں آنے پر بلا غور کئے اُس پر فوراً تجربے کرنے شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے کسی شے کے

بنانے میں سب سے بڑی دِقّت اُس کے لئے معقول سامان حاصل کرنے میں پڑتی تھی۔ اس سے اُتر کر دوسری بڑی دِقّت مناسب اوزاروں کو تلاش کرنے میں ہوتی تھی۔ یہ درست ہے کہ ڈیزائن کے اندر بھی کچھ ہیر پھیر اور تبدیلیاں کرنی لازمی تھیں لیکن جس بات نے میرے کام میں سب سے بڑی رُکاوٹ ڈالی وہ یہ تھی کہ میرے پاس کار کے پُرزے اور حصّے بنانے کے واسطے بہتر سے بہتر فولاد اور سامان ڈھونڈنے کے واسطے نہ کافی وقت تھا نہ روپیہ۔ تو بھی ۱۸۹۳ء کے موسم بہار تک یہ کم سے کم اتنا اچھا چلنے کے قابل تیار ہو گئی جس سے میری کچھ کچھ تسلّی ہونے لگی اور مجھے آئندہ ترقی کرنے کے لئے اس کے ڈیزائن سامان اور پرزوں کا یہ امتحان کرنے کا موقع مل گیا کہ یہ سڑک پر استعمال کرنے سے کیسا کام دیتے ہیں۔

بیان دوسرا

میں نے کاروبار کے متعلق کیا سیکھا

میری "گیسولائن بگھی" ملک کے اندر سب سے پہلے اور بہت مدّت تک ڈیٹرائے میں اکیلی کار تھی۔ لوگ اسے ایک طرح کی آفت خیال کرتے تھے۔ کیونکہ چلتے وقت اس کا کھڑکا بہت ہوتا تھا۔ اور اس کو آتا دیکھ کر گھوڑے بدکنے لگتے تھے۔ اس کے علاوہ اس سے لوگوں کے آنے جانے میں بھی کاوٹ پڑتی تھی کیونکہ شہر میں جہاں کہیں بھی میں اسے کھڑا کرتا تھا لوگوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی تھی اور جب تک میں وہاں سے چل نہ پڑوں ہٹتی نہ تھی۔ اگر میں اس کو ایک منٹ کے لئے بھی اکیلا چھوڑ کر ادھر اُدھر چلا کرتا تھا تو کوئی نہ کوئی شوقین پٹھا خود ہی اس میں چڑھ بیٹھتا اور اسے چلانے کی کوشش کرتا۔ آخر ہار کر میں نے ایک زنجیر لے لی اور اس کے بعد جہاں میں جاتا اس کو چھوڑتے وقت زنجیر لگا کر ایک کھمبے کے ساتھ باندھ دیا کرتا۔ اُدھر پولیس نے الگ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ پتہ نہیں کیوں۔ کیونکہ جہاں تک میرا خیال ہے اُس وقت قانون کے ذریعہ رفتار کی کوئی حد بندی نہیں مقرر کی گئی تھی۔ خیر کچھ بھی ہو مجھے علاقہ کے مجسٹریٹ سے ایک خاص لائسنس حاصل کرنا پڑا اور اس طرح سے مجھے کافی عرصہ تک امریکہ کے اندر اکیلا کار کا لائسنس دار ڈرائیور ہونے کی عزت حاصل رہی۔ ۱۸۹۵ء اور ۱۸۹۶ء میں میں نے اس کار پر لگ بھگ ایک ہزار کا میل سفر کیا ہوگا۔ اس کے بعد میں نے اسے چھ سو روپے میں ڈیٹرائے کے چارلس اینسلے کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ یہ میری پہلی بکری تھی۔ مگر میں نے یہ کار بکری کی غرض سے نہیں بلکہ صرف تجربہ کرنے کی نیت سے بنائی تھی۔ میں اب ایک اور کار بنانی شروع کرنا چاہتا۔ اسلئے یہ کار خریدنا چاہتا تھا اور مجھے روپیہ کی ضرورت تھی۔ اسلئے

سودا ہونے میں دیر نہ لگی۔

یہاں پر میں یہ کہہ دوں کہ میں گھٹیا پیمانے پر کاروں کا کام ہرگز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں یہ اُمید لگائے بیٹھا تھا کہ دھڑا دھڑ کاریں بناؤں گا مگر یہ حالت پیدا ہونے سے پہلے میرے ہاتھ میں ایک ایسی چیز بھی تو ہونی چاہیئے تھی جو واقعی بنانے کے قابل ہو کیونکہ جلد بازی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میں نے ۱۸۹۶ء میں دوسری کار بنانی شروع کردی۔ اس کی بناوٹ بھی پہلی کار جیسی تھی مگر وزن میں ہلکی تھی۔ یہ بھی پٹہ کے ذریعہ چلتی تھی اور اس طریقہ کو اس کے بعد بھی میں نے کچھ عرصہ تک ترک نہیں کیا تھا۔ یہ پٹے گرمی کے موسم کے سوائے سارا سال اچھا کام دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ بعد میں ان کی بجائے میں نے دندانہ دار پہیوں کو استعمال کرنا شروع کردیا۔ مجھے اس کار کو بنانے سے کافی واقفیت حاصل ہوئی۔ اُس وقت تک دوسرے لوگوں نے بھی اس ملک کے اندر اور باہر کاریں بنانی شروع کردی تھیں اور ۱۹۰۰ء میں میں نے سُنا کہ نیویارک میں جو نمائش ہو رہی ہے اُس میں مَیسی کمپنی کے اسٹال پر جرمنی سے آئی ہوئی ایک بینیز (BENRY) کار دکھائی جارہی ہے۔ میں فوراً اُس کو دیکھنے چل پڑا مگر مجھے اُس کے اندر خاص کوئی خوبی نظر نہیں آئی۔ یہ بھی پٹہ کے ذریعہ چلتی تھی مگر میری کار کے مقابلہ میں بہت بھاری تھی میری کوشش یہ تھی جہاں تک ممکن ہو سکے ہلکی کار بناؤں۔ مگر یورپی بنانے والوں نے چیز بناتے وقت وزن کو ہلکا رکھنے کی قدر کبھی نہیں پہچانی۔ میں نے کل تین کاریں اپنے گھر کے ورکشاپ میں تیار کیں اور یہ تینوں ہی کافی سال تک ڈیٹرائٹ میں چلتی رہیں۔ میرے پاس اب بھی پہلی کار موجود ہے۔ کچھ سال بعد میں نے اسے اس آدمی کے پاس سے واپس خرید لی تھی جس کے ہاتھ مسٹر اینسلے نے اس کو بیچا تھا۔ میں نے اس کی قیمت تین سو روپے ادا کی تھی۔

مگر یہ تمام عرصہ میں نے بجلی کمپنی کے ساتھ اپنی نوکری نہیں چھوڑی اور آہستہ آہستہ میں بڑھتے بڑھتے تین سو پچھتر روپیہ ماہوار پر اس کمپنی میں چیف انجینیر کے عہدے پر پہونچ گیا لیکن کمپنی کے پریزیڈنٹ کو میرے گیس انجن کے تجربے اسی طرح ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے جیسے میرے باپ کو پہلے پہل میری کل شناسی کی طرف رغبت سخت ناپسند تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ انہیں میرے تجربے کرنے پر کچھ اعتراض تھا بلکہ اُنکی ناراضگی صرف گیس انجن پر میرے تجربوں کی وجہ سے تھی کہ میں کیوں اس طرح فضول وقت ضائع کر رہا ہوں اُن کی یہ آواز اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے کہ آنے والے زمانہ میں بجلی کا ہی چاروں طرف راج ہوگا

مگر گیس کے کامیاب ہونے کا قطعی کوئی چانس نہیں"۔ ایک طرح دیکھا جائے تو اُن کا یہ اندیشہ بلا وجہ نہ تھا عملی طور پر کسی کو بھی اُس وقت یہ خواب میں بھی اُمید نہیں ہو سکتی تھی کہ اندرونی سُلگتا انجن کبھی اتنی ترقی کر جائے گا کیونکہ تب بجلی کی سائنس دن دونی رات چوگنی بڑھ رہی تھی جیسا کہ عام طور پر ہر نئی چیز کے متعلق بڑی بڑی اُمیدیں باندھی جاتی ہیں۔ بجلی کی نسبت بھی اُس زمانہ میں ایسی باتیں کہی جاتی تھیں جن کے پورے ہونے کی آج بھی کوئی آس نظر نہیں آتی۔ مجھے اپنا مطلب حل کرنے کے واسطے بجلی کے ساتھ تجربے کرنے میں کوئی فائدہ معلوم نہیں پڑتا تھا۔ خواہ ٹرالی کھینچنے والی بجلی کی موٹی تاریں اور بھی سستی کیوں نہ ہو جائیں تو بھی سڑک پر استعمال ہونے والی کار ٹرالی کے موافق ہرگز نہیں چل سکتی۔ کیونکہ اُس کا کافی وزن بڑھائے بغیر اُس کے اندر مناسب مقدار میں بیٹری جمع رکھنے کا عملی طور پر کوئی طریقہ نظر نہیں آتا تھا۔ بجلی سے چلنے والی کار کا ایک تو سائز (قد) لازمی طور پر چھوٹا ہوتا تھا اور دوسرے اُس کے چلانے کے واسطے جتنی طاقت درکار ہے اُس کو حاصل کرنے کے لئے اس میں بجلی پیدا کرنے والی کافی مشینری بھی ضرور ساتھ میں رکھنی پڑتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے دل میں اُس وقت بجلی کی کچھ قدر نہ تھی یا اب نہیں میرا کہنا صرف یہ ہے کہ ابھی تک ہمیں بجلی کا صحیح استعمال کرنا نہیں آیا مگر ہے یہ بڑے کام کی چیز، اور اپنی جگہ پر اندرونی سُلگتا انجن بھی بڑے کام کی چیز ہے۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ ایک کا کام دوسرے سے نہیں نکل سکتا۔

میرے پاس اب بھی وہ ڈنیامو موجود ہے جو سب سے اول ڈیٹرائے ایڈیسن کمپنی میں میرے سپرد ہوا تھا۔ جب میں نے اپنا کینیڈا والا کارخانہ جاری کیا تھا تو میں نے اسے ایک سرکاری سامان بیچنے والی کمپنی سے جس کے ہاتھ اُس بجلی کمپنی نے بیچ دیا تھا خرید لیا تھا۔ میں نے اسے تھوڑی مرمت کر کے پھر کام دینے کے قابل بنا لیا۔ اور اس نے کینیڈا کے کارخانہ میں بہت سالوں تک خوب کام دیا جب ہمیں اس کی جگہ طاقت پیدا کرنے کا ایک نیا بڑا کارخانہ لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں نے یہ پرانی موٹر وہاں سے اُٹھوا کر اپنے عجائب گھر میں بھجوا دی۔ یہ عجائب گھر ڈیر بارن میں میرے مکان کے ایک کمرے کا نام ہے جس میں میری جمع کی ہوئی کل شاستر کی بے شمار قیمتی چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔

ایڈیسن کمپنی مجھے اپنا جنرل سپرنٹنڈنٹ مقرر کرنا چاہتی تھی مگر صرف اس شرط پر کہ میں اپنے گیس انجن کے تجربوں کو بالکل بند کر دوں اور آئندہ کسی واقعی مفید مطلب کام میں اپنا وقت خرچ کرنے کا وعدہ کروں۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنے کے سوائے اور کچھ چارہ نہیں رہا کہ مجھے اپنی نوکری اور گیس انجن دونوں میں سے جو زیادہ

پسند ہو اُسے لے لوں اور دوسری سے ہاتھ دھو لوں۔ میں نے گیس انجن کو لینا ہی پسند کیا بلکہ یوں کہیئے کہ میں نے نوکری چھوڑ دی کیونکہ اصل میں میرے لئے نوکری اور گیس انجن کے درمیان ایک چیز کو پسند کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ مجھے بہت عرصہ پہلے یہ پتہ لگ گیا تھا کہ میری کار ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہو کر رہے گی چنانچہ میں نے ۱۵ اگست ۱۸۹۹ء کو اپنی نوکری سے استعفا دیدیا۔ اور کاریں بنانے کا کام شروع کر دیا۔

میرے لئے ایسا قدم اٹھانا کوئی معمولی بات نہ تھی کیونکہ میرے پاس اپنا بالکل کچھ روپیہ نہ تھا۔ جو کچھ گھر کا خرچ چلانے کے بعد بچا تھا میں نے سب تجربے کرنے میں ختم کر دیا۔ مگر میری بیوی بھی یہ مانتی تھی کہ ہمیں اس کار کا بنانا ہرگز نہ چھوڑنا چاہیئے۔ اور ہم اسے یا تو بنا کر چھوڑیں گے یا خود کوشش میں مر مٹیں گے اُس زمانہ میں اس قسم کے کاروں کی بالکل "مانگ" نہ تھی۔ ہر نئی چیز کی پہلے کبھی مانگ نہیں ہوا کرتی اس لئے شروع میں لوگوں نے ان کاروں کو قریب قریب آج کل کے ہوائی جہازوں کی طرح صرف ایک فیشن کی چیز سمجھکر خریدا۔

پہلے پہل لوگوں نے اس بلا گھوڑے کی گاڑی کو محض ایک عجوبہ خیال کیا اور ان دنوں بہت سے دانا آدمی بڑی شان کے ساتھ یہ کہا کرتے تھے کہ یہ کار کچھ نہیں محض ایک کھلونا ہے۔ اور ہمیشہ کھلونا ہی رہے گی۔ کسی مالدار آدمی کو یہ خواب میں بھی اُمید نہ تھی کہ اس چیز کی کبھی تجارت بھی چل سکتی ہے مجھے سمجھ نہیں آتی کہ بار برداری کے ہر نیا ذریعہ نکلنے پر اتنی سخت مخالفت کیوں کی جاتی ہے۔ آج بھی ایسے آدمیوں کی کمی نہیں جو کار کا نام سُن کر سر ہلا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ صرف عیش کی چیز ہے۔ البتہ دبی زبان سے موٹر ٹرک (چھکڑا) کی بابت اتنا ضرور مان لیتے ہیں کہ ممکن ہے یہ چاہے کچھ کام کی چیز ہو لیکن شروع میں یہ کسی کو بھی اُمید نہ تھی کہ اس قسم کی موٹر گاڑیاں کبھی صنعت کے کام میں خوب استعمال ہوا کریں گی اور نہایت خوش اُمید ہونے والا آدمی بھی بس اتنا کہہ سکتا تھا کہ کسی دن ان کا زیادہ سے زیادہ بائیسکل کے برابر اس کا رواج ہو جائے گا۔ مگر جب لوگوں نے دیکھا کہ یہ گاڑیاں خوب چلتی ہیں اور بہت سے دوسرے کارخانوں میں بھی یہ بننے لگ پڑی ہیں۔ تو پھر فوراً ہی یہ سوال پیدا ہوا کہ ان میں سے کون سب سے تیز چلتی ہے۔ تب گو ظاہری طور پر یہ عجیب لگتا ہے مگر اس سوال کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ ان کاروں میں تیز رفتاری کا مقابلہ ہو۔ میں جانتا تھا کہ اس رفتار کے مقابلہ میں شامل ہونے کا کچھ فائدہ نہیں۔ مگر لوگ ان گاڑیوں کو صرف تیز دوڑنے والا کھلونا سمجھتے تھے۔ اور ان کو یہ رفتار کا مقابلہ کرانے کا گویا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اس لئے مجبور ہو کر ہمیں بھی اس مقابلہ میں حصہ لینا پڑا۔ اس رفتار کے مقابلہ کی وجہ سے شروع میں موٹر گاڑیوں کی صنعت کو کافی دھکا لگا۔ کیونکہ اس وجہ سے بنانے والوں کی تمام توجہ اچھی کار

کی نسبت تیز چلنے والی بنانے کی طرف ہوگئی اور اس طرح سے یہ کاروبار سٹہ بازوں کا اڈا بن گیا۔
چنانچہ جوں ہی میں بجلی کمپنی کی ملازمت سے ہٹا۔ سٹہ بازوں کی ایک ٹولی نے میری کار کی آڑ میں لوگوں کو لوٹنے کی نیت سے ایک کمپنی قائم کر دی۔ جس کا نام ڈیٹرائٹ آٹو موبائل کمپنی رکھا گیا۔ اور میں اس کا چیف انجینیر مقرر ہوا۔ اس حیثیت میں میرے پاس کچھ اسٹاک بھی رہا کرتا تھا۔ تین سال تک متواتر ہم لوگ میری پہلی کار کے ماڈل سے قریب قریب ملتی جلتی کاریں بناتے رہے مگر ان میں سے بہت کم فروخت ہوئیں مجھے لوگوں کے پاس زیادہ تعداد میں بہتر کاریں بنا کر بھیجنے کا حوصلہ کرنے کی کسی طرح سے دلیری نہیں ملی۔ ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ کاریں جتنے آرڈر ملیں اُن کے مطابق بنائی جائیں۔ اور ہر کار کی جتنی زیادہ سے زیادہ قیمت مل سکے حاصل کی جائے۔ گویا اس کمپنی کی تہ میں ساری غرض یہ کام کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی کہ ہر حیلہ سے جتنا زیادہ روپیہ مل سکے حاصل کیا جائے۔ اور کیونکہ یہاں میرا چیف انجینیر کے عہدے سے زیادہ زور نہیں چل سکتا تھا میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس کمپنی میں رہ کر میری دلی منشا کبھی پوری نہیں ہوگی کیونکہ یہ تو صرف روپیہ بٹورنے کا ڈھونگ ہے اور اسی لئے یہ کبھی زیادہ منافع نہیں دے گی۔ میں نے مارچ ۱۹۰۲ء میں اس کمپنی سے استعفا دیدیا اور دل میں یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ آئندہ کسی کے ماتحت رہ کر کام نہیں کروں گا۔ کچھ عرصہ بعد یہ ڈیٹرائٹ آٹو موبائل کمپنی لمیٹڈ نام کے مالکوں کے پاس جو پیچھے سے آکر اس میں شامل ہوئے تھے کیڈیلاک کمپنی کا نام بدل کر چلی گئی۔

میں نے نمبر اکیاسی پارک پلیس میں ایک دوکان کرایہ پر لے لی۔ یہ ایک منزلہ پکی اینٹوں کا چھوٹا سا ایک شیڈ تھا اور یہاں پر میں نے اپنے تجربے کرنے شروع کر دیئے۔ اور ساتھ میں یہ بھی دیکھنے لگا کہ تجارت کے اصلی اصول کیا ہیں۔ کیونکہ مجھے یہ بھروسہ تھا کہ کاروبار کا جو رنگ ڈھنگ میں نے ڈیٹرائٹ آٹو موبائل کمپنی میں رہ کر دیکھا ہے۔ اصل تجارت ضرور اُس سے کوئی مختلف چیز ہوگی۔

۱۹۰۲ء سے لے کر فورڈ موٹر کمپنی کے قائم ہونے تک سارا عرصہ عملی طور پر میرے کھوج کرنے اور تجربوں میں ختم ہوگیا۔ میں اپنی اینٹوں کے بنے ہوئے اس چھوٹے کمرے میں رات دن چار سلینڈر کی موٹر بنانے میں لگا رہتا تھا اور وہاں سے نکل کر باہر مارکیٹ میں یہ پتہ کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ اصل تجارت کس کو کہتے ہیں اور کیا یہ لازمی ہے کہ یہ واقعی ایسی خود غرضی سے بھری ہوئی روپیہ کے پیچھے چھینا جھپٹی کرنے والی چیز کا نام ہے جیسا کہ مجھے پہلے پہل اس معمولی تجربے سے ظاہر ہوا ہے۔ پہلی کار کے بنانے کے وقت سے لیکر

جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں موجودہ کمپنی کے قائم ہونے تک میں نے لگ بھگ پچیس کاریں بنائیں جنہیں سے اُنیس یا بیس میں نے ڈیٹرائے آٹو موبائل کمپنی میں رہتے ہوئے بنائی تھیں۔ موٹر گاڑیوں کا بنانا اب پہلی منزل سے نکل کر جہاں ہر ان کا صرف چلنے کے قابل ہونا ہی کافی تھا اُس مقام پر پہونچ چکا تھا جہاں ہر ان کا تیز رفتار ہونا بھی لازمی تھا کلیولینڈ کے الیگزینڈر ونٹن کار کے بانی تھے اُس وقت ملک کے اندر اس دوڑ میں سب کو جیت چکے تھے اور ہر کسی سے مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔ چنانچہ میں نے پہلے سے بھی زیادہ گٹھیلا دو سلینڈروں میں جکڑا ہوا ایک انجن ڈیزائن کیا اور اُسے ایک ہوا کے ڈھانچہ پر فٹ کیا اور جب میری پوری تسلی ہوگئی کہ یہ خوب تیز رفتار ہے تو میں نے ونٹن کو چیلنج دے دیا۔ یہ دوڑ ڈیٹرائے کے گروس پارک کے چوگان میں ہوئی اور میں جیت گیا۔ یہ میری پہلی دوڑ تھی اور اس سے میری کار کی لوگوں کے عین مذاق کے مطابق پبلک کے اندر کافی اشتہار بازی ہوگئی۔

جب تک ایک موٹر دوسری موٹر گاڑیوں کو چلنے میں پیچھے چھوڑ جانے کے قابل نہ ہو اور خوب تیز رفتار نہ ہو تب تک پبلک اُسے بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ اس لیے سب سے تیز رفتار کار بنانے کی خواہش نے مجھے چار سلینڈر والی موٹر بنانے پر مجبور کر دیا لیکن اس بات کا آگے چل کر مفصل ذکر کروں گا۔

جس طریقہ پر اس وقت موٹر گاڑیوں کا کاروبار چلتا تھا اُس کا سب سے زیادہ حیران کرنے والا پہلو یہ تھا کہ لوگوں کے فائدے کی چیز بنانے کے مقابلہ میں آمدنی بڑھانے کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی تھی میرے خیال کے مطابق یہ قدرتی اصول کا عین اُلٹ تھا جو یہ ہے کہ پہلے کام پھر دام نہ کہ پہلے دام اور پھر کام دوسرا بڑا نقص یہ تھا کہ اُس زمانہ میں جب تک روپیہ سے کام نکلتا رہتا تھا اور کام کرنے سے روپیہ آتا رہتا تھا تب تک مال تیار کرنے کے بہتر طریقے سوچنے اور نکالنے کی طرف عام طور سے لاپرواہی برتی جاتی تھی۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ ایک شے اس خیال سے بالکل نہیں بنائی جاتی تھی کہ اُس سے پبلک کو کتنا فائدہ پہونچے گا بلکہ صرف اس نیت سے کہ اُس کے دام کتنے زیادہ سے زیادہ اُٹھ سکتے ہیں۔ خریدار بھاڑ میں جائے کہ اُسے شے پا کر اطمینان ہوا یا نہیں، اُس کے ہاتھ محض بیچ دینا کافی تھا۔ اگر خریدار سودے سے تسلی پائے بغیر چلا گیا ہے تو یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اُس کی امانت میں کوئی خیانت ہوئی ہے بلکہ یا تو مفت کا جنجال خیال کیا جاتا تھا یا اس کی جیب سے یہ کہکر اور روپیہ نکالنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ اچھا اگر ہمارا پہلا کام پسند نہیں تو لاؤ اور روپیہ۔ اب کی بار ٹھیک کام ہوگا۔ مثال کے طور پر اس کاروبار میں یہ حالت تھی کہ جیوں ہی ایک

دفعہ کوئی موٹر گاڑی بک جاتی پھر بیچنے والے کو ذرا پرواہ نہ رہتی تھی کہ وہ چلتی ہے یا چلاتے ہی گڑبڑ ہو گئی۔ کسی کو فکر نہ تھی کہ ایک کار میں فی میل کتنا گیسولائن جلتا ہے نہ کوئی یہ حساب رکھتا تھا کہ ایک کار چلتی کتنے عرصہ ہے اور اگر یہ ٹوٹ گئی اور اس کے پرزوں کی مرمّت کرانی پڑی تو یہ خریدار کی اپنی بدقسمتی بتلائی جاتی تھی۔ اور خریدار سے پُرزوں کے کسکر دام چارج کرنے کے بارے میں یہ دلیل پیش کی جاتی تھی کہ کیونکہ وہ کار پہلے ہی خرید چکا ہے اس لیئے اپنی غرض کو وہ یہ پُرزے خریدے گا اور منہ مانگے دام دے گا۔

اُس وقت موٹر گاڑیوں کے کاروبار میں میرے خیال کے مطابق بڑی بے ایمانی چل رہی تھی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ مال تیار کرنے والوں کی بہتری کے لحاظ سے یہ سارا کام بالکل بے اصولے پن سے ہو رہا تھا۔ مگر یہی گندی حالت دوسرے تمام بیوپاروں کی تھی۔ پڑھنے والوں کو شاید یاد ہو گا کہ یہ وہ زمانہ تھا جب بہت سی نئی کمپنیاں کھلی اور جاری ہوئی تھیں۔ وہ مہاجن لوگ جنہوں نے پہلے صرف ریلوے میں اپنا روپیہ لگایا ہوا تھا اب صنعت کے کاموں میں بھی پاؤں پھیلانے لگے۔ میرا خیال اُس وقت بھی یہ تھا اور اب بھی ہے کہ اگر آدمی اپنا کام اچھی طرح سے کرتا جائے تو اُس کو کیئے ہوئے کام کے ضرور اچھے دام ملیں گے اور منافع اپنے آپ نکلتے آویں گے اور روپیہ پیسہ کا خود بخود معقول انتظام ہوتا چلا جائے گا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ہر کام چھوٹے پیمانہ پر شروع کرنا چاہیئے اور پھر اس سے جو کمائی نکلے صرف اُس کے سہارے اس کو اوپر اٹھانا اور بڑھانا چاہیئے۔ اگر اس کے اندر کمائی نہیں تو مالک کو یہ نوٹس سمجھنا چاہیئے کہ وہ محض اپنا وقت برباد کر رہا ہے اور اس کام کو کرنے کے لائق نہیں۔ مجھے اپنے ان خیالوں میں تبدیلی کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی مگر میں نے تجربہ سے یہ دیکھا کہ اس زمانہ میں اس سادہ قاعدہ کو کہ "اچھا کام کرو اور اچھے دام حاصل کرو" بیوپاری لوگ گھٹیا درجہ کا اصول سمجھتے تھے۔ اُس وقت تجارت کرنے کا سب سے زیادہ یہ قاعدہ پسند تھا کہ نہایت بھاری سرمایہ کے نام پر ایک کمپنی کھولی جائے اور پھر پبلک کے مابین اس کے جتنے حصّے اور اسٹاک کے ہنڈی پرچے وغیرہ بک سکیں بیچ دیئے جاویں اور پھر ان حصوں اور ہنڈی پرچوں بیچنے کے خرچے سے اور کمپنی چلانے والوں کی اپنی فیس وصول کر لینے کے بعد جو بقایا رقم بچے اُس کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے طریقہ میں کاروبار شروع کیا جاتا تھا۔ وہ بیوپار اچھا نہیں گنا جاتا تھا جس میں صرف اچھا کام کرنے سے معقول منافع ملے۔ بلکہ اچھا بیوپار وہ مانا جاتا ہے جس کو جاری کرنے سے اونچی قیمتوں پر اسٹاک اور ہنڈی پرچوں کو بڑی تعداد میں بیچنے کا موقع ملتا ہے۔ گویا بیوپار کام کرنے کو نہیں کہتے تھے بلکہ ان اسٹاک اور ہنڈی پرچوں کا نام تھا۔ یہ بات میرے دماغ میں نہیں آتی تھی کہ جو نیا یا پُرانا بیوپار ان

اسٹاک اور ہنڈی پرچوں کے بھاری سودا کرے گا وہ کس طرح سے مارکیٹ میں اپنا مال واجب داموں پر بیچنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔

میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ ایک کاروبار کو جاری کرنے میں جتنا سرمایہ لگانا پڑتا ہے وہ کون سے اصول اور قانون کے مطابق اس کاروبار کے سر پر ایک طرح کا قرض یا چارج فرض کر لیا جاتا ہے۔ وہ بیوپاری جو اپنے آپ میں بڑے مہاجن بنے پھرتے ہیں کہتے ہیں کہ روپیہ کی ہر رقم خواہ چھوٹی ہو یا بڑی پانچ یا ۶ فی صدی یا کچھ نہ کچھ ضرور اپنی "قیمت" رکھتی ہے اور اگر ایک کاروبار جاری کرنے میں تین لاکھ روپے لگائے تو جس آدمی نے یہ رقم دی ہے وہ اس پر سود لینے کا پورے طور پر حقدار ہے کیونکہ اگر وہ کاروبار میں روپیہ لگانے کی بجائے یہ رقم کسی سیونگ بنک میں جمع کرا دیتا یا آڑ رہن رکھنے اور ضمانتیں خریدنے کے کام میں لگا دیتا تو اس کی ایک بندھی بندھائی آمدنی بنی تھی اس لئے ان کا کہنا ہے کہ کاروبار کو چلانے کے واسطے روپیہ اکٹھا کرنے کی محنت کے طور پر اگر وہ اس رقم پر سود وصول کرتا ہے تو یہ بالکل جائز ہے۔ اس دلیل نے بہت سی کمپنیوں کا بیڑا غرق کیا ہے اور کئی ایک کو پبلک کے فائدے کی شے تیار کرنے کے ناقابل بنا دیا ہے روپیہ کی اپنی نجی کوئی مقررہ قیمت نہیں۔ صرف روپیہ کی شکل میں اس کی کچھ بھی قیمت نہیں کیونکہ یہ اپنے آپ کچھ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ روپیہ کا صرف اتنا ہی فائدہ ہے کہ اس سے انسان کام کرنے کے وسیلے "اوزار" اور ان اوزاروں کی مدد سے تیار کیا ہوا مال خرید سکتا ہے۔ اس لئے صرف روپیہ کی اتنی قیمت ہے جتنا اس کے ذریعہ ایک آدمی مال تیار کر سکتا ہے یا خرید سکتا ہے بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر ایک شخص کو یہ خیال ہے کہ اس کو اس کی رقم پر پانچ یا ۶ فی صدی سود مل سکتا ہے تو اس کو اپنا روپیہ وہاں رکھنا چاہیئے جہاں سے اس کو یہ آمدنی ہو جائے لیکن کاروبار میں لگایا ہوا روپیہ اس کاروبار کے سر پر ہرگز قرض یا چارج نہیں یا کم سے کم ہونا نہیں چاہیئے۔ کاروبار میں پڑ کر یہ رقم روپیہ نہیں رہتی بلکہ مال تیار کرنے کا ایک وسیلہ بن جاتی ہے یا بن جانی چاہیئے۔ اور اس لئے اس کی مدد سے جتنا مال تیار ہوتا ہے وہی اس کا مول ہے نہ کہ کسی خاص "قاعدے" یا شرح کے مطابق (جس کا اس کاروبار سے جس میں روپیہ لگا ہوا ہے کچھ تعلق نہیں) کوئی مقررہ رقم۔ سچا اصول یہ ہے کہ روپیہ سے کام لینے کے بعد نتیجہ دیکھ کر آمدنی کا فیصلہ کرنا چاہیئے نہ کہ پہلے۔

بیوپاریوں کو یہ پختہ یقین تھا کہ کوئی ایسا کاروبار نہیں جو روپیہ لگانے سے نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک بار روپیہ لگانے سے کام نہیں چلا تو اس میں اور روپیہ لگانے سے ضرور کام چل نکلے گا مگر اس کا نتیجہ صرف یہی ہوا

کرتا ہے کہ پہلی ڈوبی ہوئی رقم کو نکالنے کی کوشش میں حلال کی کمائی بھی برباد کر دی جائے۔ دوبارہ روپیہ لگانے کی ضرورت صرف اس صورت میں ہوا کرتی ہے جبکہ کام میں چاروں طرف بدانتظامی پھیلی ہو اور اس کا محض اتنا اثر ہوا کرتا ہے کہ منیجر لوگ وغیرہ مزے سے اپنی تنخواہیں کھانے کی غرض سے اپنی کمپنیوں کو بدستور بدانتظامی میں کچھ عرصہ اور گھسیٹتے رہتے ہیں۔ مگر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ ہاں اس سے اتنا ضرور فرق پڑ جاتا ہے کہ خاتمہ ہونے کی تاریخ ذرا لمبی پڑ جاتی ہے اور کچھ نہیں بات یہ ہے کہ پھر سے روپیہ لگانے کی ترکیب محض سٹہ باز مہاجنوں کی ایک چال ہے۔ اُن کے روپیہ کمانے کا ڈھنگ ہی یہ ہے کہ جہاں پر واقعی کچھ کام ہو رہا ہو وہاں پر وہ اپنا روپیہ کسی نہ کسی طرح ضرور اُڑا دیتے ہیں لیکن اگر وہاں پر کچھ بدانتظامی نہ ہو تو وہ اپنی اس کوشش میں کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ بس اس دھوکے میں رہ کر یہ سٹہ باز مہاجن سمجھتے ہیں کہ ہم اپنا روپیہ جائز طریقہ سے استعمال کر رہے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے وہ اپنا روپیہ صرف برباد کرنے کو لگا رہے ہیں۔

میں نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ میں کبھی ایسی کمپنی میں پاؤں نہیں رکھوں گا جہاں کام کی جگہ روپیہ کی زیادہ پرواہ کی جاتی ہو۔ یا جس میں بینکروں اور مہاجنوں کا بہت زور ہو اور اس لئے ساتھ ہی میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ یا تو میں اس طریقہ سے کاروبار کروں گا جس طرح سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ پبلک کی بھلائی اور خدمت کرنے کے خیال سے چلایا جا سکتا ہے ورنہ میں بالکل نہیں کروں گا کیونکہ میں نے اپنے تھوڑے سے تجربہ سے اور جو کچھ میرے چاروں طرف ہو رہا تھا اُس کو دیکھ کر مجھے بخوبی ثابت ہو گیا تھا کہ صرف کمانے کی غرض سے کاروبار کرنا کوئی اتنی قابل قدر چیز نہیں اور دنیا میں جس آدمی نے واقعی کچھ کر کے دکھانا ہو اُس کے لئے بالکل نہیں۔ اس کے علاوہ میں اس کو روپیہ کمانے کا بھی درست طریقہ نہیں سمجھتا تھا کیونکہ اصلی کاروبار کی صرف ایک ہی بنیاد ہے اور وہ ہے پبلک کی خدمت کرنا۔

مال تیار کرنے والے کا یہ کام نہیں کہ جیوں ہی ایک سودا ختم ہوا اُس نے خریدار سے چھٹی پائی بلکہ اصل میں اُس وقت سے اُس کا خریدار کے ساتھ کام شروع کرتا ہے۔ موٹر گاڑیوں کے کاروبار میں ایک گاڑی یا کار کا بکنا ایک طرح سے مال تیار کرنے والے کی خریدار کے ساتھ جان پہچان کرانے کا ایک وسیلہ سمجھنا چاہیئے اگر وہ گاڑی یا کار کام نہیں دیتی تو یہ اچھا ہوتا کہ مال تیار کرنے والا اس کو خریدار کے ہاتھ نہ بیچتا کیونکہ ایک سوداگر یا کارخانہ دار کی لوگوں کے درمیان سب سے زیادہ بدنامی تسلی نہ پائے ہوئے خریدار کے ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ شروع میں جب موٹر گاڑیوں کا رواج ہوا تو ایک گاڑی یا کار کو بیچ لینا ایک بڑی بھاری فتح سمجھی جاتی تھی اور پیچھے سے یہ ہرگز

پرواہ نہیں کی جاتی تھی کہ خریدار کے ساتھ کیا گزرتی ہے جب ایک ایجنٹ کو جو مال وہ بیچتا ہے صرف اسی پر کمیشن ملتا ہے تو اس صورت میں یہ کیسے اُمید رکھی جا سکتی ہے کہ وہ خریدار کے دل پر اپنے مال کا سکّہ جمانے کی کوئی خاص کوشش کرے گا جبکہ ایسا کرنے سے اُسے کچھ اور کمیشن نہیں ملتا۔ بس اسی ایک بات کو لے کر اپنی فورڈ کاروں کی بکری مارکیٹ میں سب سے زیادہ ہم نے کر لی اس میں شک نہیں کہ قیمت اور کوالٹی کی وجہ سے بھی ہماری کاروں کی ضرور بکری ہوئی اور خوب ہوئی لیکن ہم اس سے بہت زیادہ آگے بڑھ گئے میری رائے میں جو شخص ہماری کار خریدتا ہے اُس کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ہماری کار سے متواتر کام لیتا رہے اور اس لئے وہ کار اگر کبھی بگڑ جاتی ہے تو ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اُسے ممکن سے ممکن تھوڑے عرصہ میں مرمت کر کے ٹھیک کر دیں۔ فورڈ کار کو جتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے اُس کی ایک بھاری وجہ یہ ہے کہ ہم نے کار بنانے کے بعد بہت جلدی یہ خدمت کرنے یعنی خریدار کو یہ سہولیت پہنچانے کا قاعدہ جاری کر دیا تھا۔ اُس زمانہ میں ملک کے اندر بہت سی مہنگی قسم کی کاریں بنانے والوں کے اپنے بہت تھوڑے سروس اسٹیشن (SERVICE STATIAN) یعنی اپنی کار کو بگڑ جانے پر مرمت کر کے یا پرزے بدل کر ٹھیک کر دینے والے چھوٹے ورکشاپ کھلے ہوئے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر ایک کار کہیں بگڑ گئی تو لوکل مرمّت کرنے والے کے بس میں پڑنے کے سوائے اور کوئی چارہ نہ تھا حالانکہ کار کے خریدار مالک کو یہ کام اُس کار کے بنانے والے سے لینے کا پورا پورا حق تھا۔ اگر لوکل مرمّت کرنے والا قسمت سے کچھ سمجھدار آدمی ہوا اور اُس کے پاس پرزوں کا کافی اسٹاک موجود ہوا (گو اُس وقت بہت سی کاریں ایسی چل رہی تھیں جن کے پرزے ایک دوسری میں فٹ نہیں آتے تھے) تب تو خیر ورنہ کار کے مالک کا اللہ بیلی تھا۔ کیونکہ اگر لوکل مرمت کرنے والا کوئی بھوندو میاں ہوا جس کا موٹر کار اور گاڑیوں کا علم بہت معمولی ہے اور جس کی ہمیشہ یہ ناجائز خواہش رہتی ہے کہ جو کار اُس کی دوکان پر مرمت ہونے کو آئیں صرف اُن پر تجربہ کر کے وہ کچھ واقفیت حاصل کرے تو تھوڑا سا نقص پڑ جانے پر بھی وہ کار کئی کئی ہفتہ اُس کی دُکان پر پڑی ہوئی خراب ہوتی رہتی تھی اور پھر ایک لمبا چوڑا مرمت کا بل ادا کرنے کے بعد ہی مالک کو وہاں سے کار لے جانے کی اجازت ملتی تھی۔ سچ مچ کچھ عرصہ کے لئے ان مرمت کرنے والوں کی وجہ سے موٹر کار اور گاڑیوں کے کاروبار کو نہایت بھاری خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ بلکہ سنہ ۱۹۱۰ء اور سنہ ۱۹۱۱ء تک بھی موٹر کار یا گاڑی کے مالک کو لازمی طور پر ایک بڑا امیر آدمی سمجھا جاتا تھا جس کی جیب سے روپیہ نکالنا کچھ بُرائی کی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ لیکن ہمارا اس بات سے بالکل اتفاق نہیں تھا چنانچہ ہم نے اس خیال کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور شروع

دن سے۔ بھلا ہم یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ بے وقوف لالچی آدمیوں کی وجہ سے ہماری بڑھتی بکری میں
رکاوٹ پڑے۔

مگر یہ حالت کئی سال پیچھے جا کر ہوئی تھی۔ اس لیے یہاں پر کھول کر لکھنے کی ضرورت نہیں ہم
یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ جو کاروبار صرف دولت پیدا کرنے کی نیت سے چلایا جاتا ہے وہ پبلک کی
کرنے کے ہرگز قابل نہیں۔ کیونکہ صرف اُتنا ہی کام دے گا یا کرے گا جس کی اُجرت اُس کو ہاتھ کی
ملتی ہے جب کاروبار کرنے میں روپیہ کمانا سب سے مقدم غرض ہو اُس صورت میں اگر قسمت سے کا چال
خوب چل گیا اور دو پیسے منافع کے زیادہ نکلتے رہے جن کے حوصلے سے ملازموں کو پبلک کی خدمت کر
کی تنخواہ یا اُجرت ملتی رہی تب تو علٰحدہ بات ہے ورنہ ہاتھ کے ہاتھ نقد دام وصول کرنے کی بھاگ دوڑ
آگے کا سارا کام چوپٹ ہو جائے گا۔

اس کے علاوہ میں نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سے بیوپاریوں کو یہ وہم ستا رہا ہے کہ یہ کوئی ہماری
کھوٹی کرنی ہے جو اس کام میں پھنس گئے ہیں کیونکہ یہاں تو وقت آجانے پر بھی پچھلی کمائی پر چین سے
بسر کرنے اور روزمرہ کے لڑائی جھگڑوں سے چھوٹنے کا کبھی موقع نہیں ملتا۔ اُن کے خیال کے مطا
زندگی ایک جنگ ہے اور اس جنگ کو جلدی ہی سے جلدی ختم کر دینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ بات
بھی میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی کیونکہ میری عقل یہ کہتی تھی کہ ہماری زندگی میں صرف ایک ہی جنگ
اور وہ ہے "چین سے زندگی بسر کرنے" کے گھٹیا ارادے سے ڈھیلے اور سست پڑ جانے کی طرف
دل کے جھکاؤ کو مارنے کی ہر دم زبردست کوشش کرتے رہنا اور یہ بالکل ٹھیک بات ہے۔ اگر ہاتھ پاؤں
نہ ہلا کر مردے کی طرح پڑے رہنے کا نام کامیابی ہے تو اس کی سہل ترکیب یہ ہے کہ انسان حرام خور
کرنے پر کمر باندھ لے لیکن اگر اس نے اوپر اُٹھنا ہے اور سچے معنوں میں کامیابی حاصل کرنی ہے تو اُسے
تازہ جوش و خروش کے ساتھ کام میں جُتنا ہوگا اور ہر دم آنکھیں کھول کر چلنا ہوگا۔ میں نے دیکھا
بہت سی کمپنیاں اس وجہ سے اندر ہی اندر گل سڑ کر بالکل کھوکھلی ہوگئیں۔ کیونکہ اس کے چلانے والوں
یہ سمجھا کہ جس طرح آج تک کام ہوتا آیا ہے اُسی طرح آگے کو بھی چل سکتا ہے۔ اور اس کا انتظام پیچھے کو
اچھا کیوں نہ رہا ہو اُس کی تعریف صرف اس وجہ سے تھی کیونکہ وہ موقع اور وقت کے مطابق تھا۔
پرانے قاعدوں اور رواجوں میں جکڑا ہوا نہیں تھا۔ میں تو یہ مانتا ہوں کہ زندگی ایک پڑاؤ نہیں بلکہ

لگاتار سفر ہے۔ وہ آدمی جو اپنے آپ کو چین کی زندگی بسر کرتے ہوئے سمجھتا ہے اصل میں غلطی پر ہے۔ وہ شائد نیچے کی طرف جا رہا ہے۔ دُنیا کی ہر چیز لگاتار حرکت میں ہے اور بنی بھی اسی لئے ہے۔ زندگی ہمیشہ دریا کے پانی کی طرح بہتی رہتی ہے۔ گو یا مکان وہی رہتا ہے صرف اس میں رہنے والے سدا بدلتے رہتے ہیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ اس وہم میں پھنس کر کہ زندگی ایک جنگ ہے جس میں صرف ایک اُلٹی چال چلنے سے آدمی کی ہار ہو سکتی ہے۔ لوگوں کے اندر ایک بندھے ہوئے قاعدے میں زندگی بسر کرنے کی طرف طبیعت بہت جھک جاتی ہے اور وہ سچّے ہوئے دل کے ساتھ پُرانی لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں۔ یہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی موچی نے اپنی مرضی سے جوتوں کے تلے لگانے کا نیا طریقہ پکڑ لیا ہو یا کسی کاریگر نے خوشی کے ساتھ اپنی لائن میں نئے نکلے ہوئے طریقوں کو اختیار کرنا پسند کیا ہو۔ عادت بھی انسان کے اندر ایک طرح کی کاہلی پیدا کرنے والی چیز ہے۔ اور جب اس میں ذرا بھی تبدیلی کرنی پڑتی ہے تو طبیعت کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے والے شائد بھولے نہیں ہوں گے کہ جب کارخانوں میں کام کرنے کے قاعدوں کی اس خیال سے جانچ پڑتال کی گئی تھی کہ کامگاروں کو ایسے طریقے سکھائے جائیں جن سے انہیں مال تیار کرنے میں بیکار محنت نہ کرنی پڑے اور فضول تھکنا نہ پڑے تو اس کی سب سے بڑی مخالفت خود کامگاروں نے کی تھی ایک تو انہیں یہ شک تھا کہ یہ صرف اُن سے زیادہ کام کرانے کی چالیں ہیں مگر جو بات اُن کو سب سے زیادہ اکھرتی تھی وہ یہ تھی کہ جس طرح سے آج تک چلتے آئے ہیں اُس میں اس کی وجہ سے فرق جا پڑے گا۔ بیوپاریوں کے بہت سے کاروبار فیل ہی اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ ان کو اپنے پُرانے طریقے اور ڈھنگ اتنے زیادہ پسند ہوتے ہیں کہ وہ ان کو چھوڑنے پر کسی صورت میں بھی رضامند نہیں ہوتے۔ ایسے بیوپاری ہر جگہ پائے جاتے ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ کل کا دن جو آج سے پہلے تھا گزر چکا ہے اور وہ آج بھی ترک کئے ہوئے پچھلے سال کے قاعدوں اور رواجوں کے سپنے لے رہے ہیں۔ یہ بات پتھر کی لکیر کے طور پر پختہ مان لینی چاہیئے کہ جب انسان کو یہ خیال ہونے لگے کہ اب اُسے اپنے کام کی پوری سمجھ آ گئی ہے اور اس کے لئے آگے کو کچھ اور سیکھنا باقی نہیں رہا تو بہتر ہے کہ وہ فوراً اُس وقت اپنی نہایت باریکی کے ساتھ یہ دیکھنے کے لئے چھان بین کرنی شروع کر دے کہ سچ مچ کہیں اُس کے دماغ کو گہری نیند تو نہیں آ گئی۔ ایک آدمی کے لئے یہ فرض کر لینا بہت خطرناک ہے کہ

جتنا اُس نے سیکھ لیا ہی عمر بھر کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ترقی کے چکّر کا اگلا دھکّا اُسے اٹھا کر پرے پھینک دے گا۔

اس کے علاوہ لوگوں کو یہ بھی بڑا خطرہ لگا رہتا ہے کہ کہیں دُنیا اُنہیں بے وقوف نہ سمجھنے لگے۔ بے شمار آدمیوں کی جان اس خوف کے مارے سدا ختنک ہوتی رہتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ بہت سے آدمیوں پر جنھیں اس کی ضرورت ہو پبلک کی رائے کا بڑا بھاری اثر پڑتا ہے اور شاید یہ بھی درست ہے کہ اکثر آدمیوں کو نیک چلن رکھنے کے لئے پبلک رائے کے دباؤ کی ضرورت رہتی ہے۔ پبلک رائے کے خوف سے آدمی کا چال چلن چاہے نہ سنورتا ہو مگر اُسے اتنی عقل ضرور آجاتی ہے کہ دُنیا میں دوسروں کے ساتھ کیسے مل کر رہا جاتا ہے۔ سچّائی کی خاطر احمق کہلانا کوئی عیب کی بات نہیں۔ آخر ایک دن لوگ اپنے آپ دیکھ دیں گے کہ یہ احمق کہلانے والے آدمی واقعی احمق نہیں تھے یا جن کاموں میں اُنہوں نے ہاتھ ڈالا تھا وہ احمقانہ تھے

یہ سچائی مجھ پر کئی شکلوں میں ظاہر ہوگئی کہ لوگوں کے اوپر جو روپیہ کا رعب چھایا ہوا ہے اور اُنہیں کاروبار میں لگائی ہوئی رقم پر منافع کمانے کی جو اتنی فکر لگی رہتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کام بڑی لاپرواہی سے کیا جاتا ہے بلکہ ہمیشہ دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور کام کو کسی طرح اوپر نیچے کر کے ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج کل تجارت میں جو ہمیں بہت سی مشکلیں اور تکلیفیں نظر آتی ہیں اُن کی تہ میں اس کے سوائے اور کوئی سبب نہیں اسی وجہ سے لوگوں کو تھوڑی تنخواہیں ملتی ہیں کیونکہ جب کام کا انتظام معقول نہ ہو تو بڑی تنخواہیں کہاں سے نکلیں۔ اور اگر کام میں پوری توجہ نہ دی جائے تو کام کا انتظام معقول کیسے ہو۔ اکثر آدمی کام اپنی پوری مرضی کے مطابق کرنا چاہتے ہیں لیکن موجودہ سسٹم میں ان کو اپنی پوری مرضی کے مطابق کام کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ جب میں نے پہلی بار تجارت کے اندر قدم رکھا تھا تو میں اپنی پوری مرضی کے مطابق کام نہ کر پایا تھا۔ کیونکہ حکم یہ تھا کہ ہر کام اس نیت سے کرو کہ اس سے روپیہ پیدا کرنا ہے۔ کام کی کوالٹی یعنی عمدگی کی بالکل پرواہ نہیں کی جاتی تھی اور سب سے بڑی حیرانی کی بات یہ ہے کہ چاروں طرف یہی ڈھول پیٹا جاتا تھا کہ دنیا میں جس چیز کی قدر ہے وہ صرف روپیہ ہے۔ کام کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اس اصول کو کہ روپیہ پہلے اور کام پیچھے کوئی بھی نامعقول نہیں کہتا تھا۔ گویہ بات سبھی مانتے تھے کہ آمدنی آخر کام میں سے نکلتی ہے۔ کہیں باہر سے نہیں آئے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ہر شخص کے دل میں اس خواہش نے گھر کیا ہوا تھا کہ بلا محنت کئے اگر خوب روپیہ پیدا کرنے کا کوئی سہل گُر مل جائے تو

بہت اچھا ہو۔ انہیں کیا خبر تھی کہ دُنیا میں خوب روپیہ پیدا کرنے کا سب سے سہل گُر جو ہے وہ ہے اپنے کام میں دل لگانا محنت کرنا۔

اب کمپٹیشن (مارکیٹ میں مقابلہ بازی) کی بات لیجیے۔ میں نے دیکھا کہ لوگ کمپٹیشن کو ہوّا سمجھ رہے ہیں۔ اور بیوپار میں ہوشیار صرف اُس کو مانتے ہیں جو ہیرا پھیری سے اُس کام کا سارا ٹھیکہ اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنے کمپٹیشن کرنے والوں کو جھانسا دے سکے۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ کیونکہ خریدنے والوں کی ہمیشہ ایک خاص تعداد ہوا کرتی ہے اس لئے کمپٹیشن کرنے والوں سے اوپر ہی اوپر اپنے مال کو بیچ لینے کا انتظام کرنا ضروری ہوتا ہے۔ شاید کسی کو یاد ہو کہ کچھ سال پہلے موٹر گاڑیوں اور کاروں کے بنانے والوں نے سیلڈن پیٹنٹ کے ماتحت ایک ایسوسی ایشن قائم کی تھی تاکہ اُنہیں قانونی طور پر موٹر گاڑیوں اور کاروں کی قیمتوں کی تعداد میں گھٹانے بڑھانے کا اختیار مل جانے سے یہ کاروبار پورے طور پر اُن کے قبضہ میں آجائے اُن کا بھی عین وہی خیال تھا جو کہ بہت سی تجارتی سبھاؤں (ٹریڈ یونینیں) کا ہے یعنی یہ بے ہودہ وہم کہ اس طریقہ سے بیوپاری لوگ زیادہ کی نسبت آگے سے تھوڑا کام کر کے زیادہ منافع اُٹھا سکتے ہیں۔ میری رائے میں یہ ترکیب بہت پُرانی ہو چکی ہے۔ اور اب بالکل ناکارہ ہو گئی ہے۔ میں نہ اُس وقت مانتا تھا نہ اب کہ کام کرنے والے کو ہمیشہ کافی اُجرت نہیں ملتی بلکہ میرا کہنا تو یہ ہے کہ کمپٹیشن کا مقابلہ کرنے میں جو وقت خرچ ہوتا ہے وہ بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔ اس سے تو ہزار درجہ یہ بہتر ہے کہ یہ وقت اچھی طرح کام کرنے میں لگایا جائے۔ اگر ایک شخص پبلک کی ضرورتوں کے مطابق مال تیار کرنے والا ہو اور واجبی قیمت پر بیچا کرے تو اُس کو خریداروں کی کبھی کمی نہیں رہے گی بلکہ لوگ ہمیشہ اُس کا مال شوق سے خریدنے کے لئے تیار رہیں گے۔ اور یہی بات خریدار کی خدمت کرنے یعنی اُس کو سہولیت پہنچانے کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔

جن دنوں میں ان باتوں پر سوچ وچار کرتا تھا۔ میں خالی نہیں بیٹھا رہتا تھا۔ میں زور شور کے ساتھ چار سلینڈر والی موٹر اور تیز رفتاری کے مقابلہ میں حصہ لینے والی دو بڑی کاریں بنانے میں جٹا ہوا تھا میرے پاس کافی وقت رہتا تھا کیونکہ میں نے اپنے کاروبار کی فکر پل بھر کے لئے بھی کبھی نہیں چھوڑا۔ غور سے دیکھا جائے تو ایک انسان کے لئے اپنے کاروبار کی کبھی پل بھر کے لئے بھی فکر چھوڑ دینا ناممکن ہے۔ اُسے دن میں جاگتے ہوئے ہر دم اس کی بابت سوچتے رہنا چاہیئے۔ اور رات کو اس کے ہی سپنے دیکھنے چاہیئیں اس میں شان تو بڑی ہے کہ ایک آدمی اپنے کام کو صرف دفتر کے مقرر گھنٹوں میں آ کر کرے یعنی صبح کام پر آ

اور شام پڑنے پر دفتر سے اُٹھ کر گھر چل دے۔ بس پھر اگلی صبح دفتر آ نے تک چھٹی ہی چھٹی منائے۔ ایسی صورت
عین ممکن ہے بشرطیکہ انسان ساری عمر دوسروں کے اشارے پر چلنے۔ ماتحت رہ کر کام کرنے یا ملازم (ممکن
بڑے ذمہ دار عہدے پر) رہنے کے لئے تیار ہو اور اُس کے دل میں کسی کمپنی کے مینیجر یا ڈائرکٹر بننے کی کبھی خوا
پیدا نہ ہو۔ ایک ہاتھ کی کار کرنے والے کیلئے کام کرنیکے گھنٹوں کی تعداد ضرور مقرر ہونی چاہیئے ورنہ وہ جلدی ختم ہو جا
اس لئے اگر ایک آدمی نے ساری عمر ہاتھ کی کار کرنے والے کاریگر یا کامگار کے طور پر زندگی بسر کرنی ہے تو
اُسے شام کو کارخانہ کی گھنٹی یا بھونپو بجنے کے ساتھ ہی اپنے کام کے متعلق سب کچھ بھول جانا چاہیئے۔ لیکن اگر
نے کچھ آگے بڑھنا ہے اور ترقی کرنی ہے تب اُسے شام کو کارخانہ کی گھنٹی یا بھونپو بجنے کے وقت سے
اگلی صبح تک اپنے کام کے متعلق ہی سوچتے رہنا چاہیئے کہ میں آج کی نسبت کل کو کس طرح سے زیادہ اور بہتر
کر سکتا ہوں۔

جس کے پاس کام کی کرنے کی سب سے زیادہ ہمت اور عقل ہے وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ دنیا میں
دو طرح کے انسان ہیں۔ ایک سدا کام کرتا رہتا ہے۔ اپنے کام کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ ہمیشہ ترقی کرنے کی
من کے ساتھ کوشش کرتا رہتا ہے اور اس لئے ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ اور دوسرا صرف دفتر کے مقررہ وقت
میں کام کرتا ہے اور دن کے ۲۴ گھنٹوں میں صرف اتنا عرصہ ہی اپنے دماغ اور ہاتھوں سے کام لیتا ہے۔
ان دونوں میں کون زیادہ خوش رہتا ہے۔ یہ میرے لئے کہنا ذرا مشکل ہے۔ کیونکہ مجھے خود اس بات کا تجربہ
نہیں مگر کسی شخص کے لئے اس سوال کا فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ ایک دس گھوڑے کی طاقت والا انجن
گھوڑے کی طاقت والے انجن کے برابر کام نہیں دے سکتا۔ جو آدمی اپنا دماغ صرف دفتر کے گھنٹوں ہی
استعمال کرتا ہے وہ اپنی طاقت اور ہمت کو پھولنے پھلنے نہیں دیتا۔ اگر دفتر کے وقت میں جتنا کام وہ
ہے اُس سے اس کی تسلی ہو جاتی ہے تب تو بہت اچھا اور دوسروں کو اس سے کچھ سروکار نہیں لیکن اگر
دوسرا آدمی اُس سے زیادہ کام کر کے بازی لے جاوے تو پھر اُسے شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ کام اور آرام
دونوں سے الگ الگ نتیجے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ایک آدمی آرام طلبی چاہتا ہے اور اُسے وہ حاصل کر لیتا ہے
تو پھر اُسے شکایت کا کوئی موقع نہیں۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ کرے تو وہ آرام طلبی اور ڈھونڈے
کے انعام یعنی نتیجے۔ دونوں چیزیں ایک ساتھ کبھی نہیں مل سکتیں۔

اُس سال کاروبار میں رہ کر جن چند مقدم سچائیوں کو میں نے سیکھا۔ اور جن میں ــــ گو اس قسم کی

سچائیوں کی تعداد ہر سال بڑھتی چلی جاتی ہے۔ آج تک بالکل کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ یہ ہیں۔

(۱) دُنیا کام کے مقابلہ میں روپیہ کو بہت اونچا درجہ دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کام کی کوالٹی دن بدن گھٹتی جاتی ہے اور لوگوں کے دل سے خریدار کی خدمت کرنے کا خیال دور ہوتا جا رہا ہے۔

(۲) کام سے پہلے دام کا فکر کرنے سے کاروبار میں فیل ہو جانے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ خطرہ کاروبار کے تمام راستوں میں موٹی دیوار کھڑی کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان مارکیٹ میں اپنے ہم پیشہ والوں کے ساتھ مقابلہ میں کھڑا ہونے۔ ضرورت کے مطابق نئے طریقے اختیار کرنے اور کوئی ایسی چال چلنے سے جس سے ممکن ہے اُس کی عادت بہتر بن سکے خوف کھاتا ہے۔

(۳) ہر شخص کے لئے جس کے دل میں پبلک کی خدمت کرنے (جس کا مطلب ہے لوگوں کو سہولیت اور آرام پہنچانے) کی اُمنگ ہے یعنی دُنیا میں جو اپنے کام کو ممکن سے ممکن بہتر طریقے سے کرتا ہے راستہ بالکل سیدھا اور صاف ہے۔ وہ ضرور کامیاب ہو گا۔

بیان تیسرا

اصل کاروبار شروع

مجھے اپنی چھوٹی سی اینٹوں کی بنی ہوئی پختہ دوکان میں نئی کار کے ڈیزائن کی نسبت اور مال تیار کرنے کے کچھ نئے قاعدوں کے تجربے کرنے کا کافی موقع ملا۔ میں ایک ایسی کمپنی کھڑی کرنی چاہتا تھا جس میں سب سے زیادہ توجہ اور مقدم دھیان اچھی طرح سے کام کرنے اور پبلک کو سہولیت دینے کا رکھا جائے۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ میری اس خواہش کے عین موافق اس قسم کی کمپنی بنانا ممکن تھا تو بھی مجھے یہ بات جلدی ظاہر ہوگئی کہ جن خشک اور نپے تلے قاعدوں کے مطابق آج کل کارخانوں میں کام ہو رہا ہے اُن پر چل کر میں ایک واقعی عمدہ کار بنانے میں جو کم قیمت پر مارکیٹ میں بک سکتی ہو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ایک کام کو پہلے کی نسبت دوسری بار بہتر کرنا ہمیشہ ممکن ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس وقت اس سادے اصول کو عام طور پر کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کارخانہ داروں کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ مال تیار کر کے بیچنے کی پڑی رہتی تھی اور اس لئے اُنہیں تیاری کرنے کے واسطے کافی وقت اور موقع نہیں ملتا تھا۔ زیادہ تعداد میں مال تیار کرنے کی بجائے صرف اُتنا مال تیار کرنا جتنے کا آرڈر ہاتھ میں ہو۔ یہ عادت میرے خیال میں شاید لوگوں کو اُس زمانے سے پڑی ہوئی ہے اور دنیا میں تب سے اس کا رواج ہوا ہے جب ہر کام ہاتھ کی محنت کر کے کرنا پڑتا تھا۔ اگر سو آدمیوں سے پوچھا جائے کہ وہ فلاں چیز کو کس طرح سے بنوانا چاہتے ہیں تو اُن میں سے لگ بھگ اسّی ایسے ملیں گے جو یہ جواب دیں گے کہ ہمیں پتہ نہیں۔ جیسے تمہارے دل میں آئے بنا لو۔ پندرہ کے قریب بنا سوچے سمجھے جو منہ میں آئے گا کہہ دیں گے اور صرف پانچ ایسے نکلیں گے جو واقعی ٹھیک بتا سکیں گے کہ ہمیں اس قسم کی چیز درکار ہے

اور کیوں۔ ایک مال کو بیچنے کا مارکیٹ اصل میں یہی پچانوے فی صدی لوگ ہیں جنہیں اس چیز کی نسبت
کچھ واقفیت نہیں۔ مگر ان میں سے اسّی یہ اپنی بے علمی مانتے ہیں اور پندرہ منہ سے نہیں مانتے۔ باقی کے
پانچ جو اپنی مرضی کے موافق مال تیار کروانا چاہتے ہیں ممکن ہے یہ خاص کام کرانے کے دام ادا کرنے کے قابل
نہ ہوں۔ اگر اُن کے پاس اتنے دام ہوئے تب تو وہ کام کرا لیں گے مگر اس قسم کے خاص خریداروں کی تعداد
بڑی تھوڑی ہوا کرتی ہے۔ پہلے پچانوے آدمیوں میں سے شائد دس پندرہ کوالٹی کی قیمت ادا کرنے والے
ہوں باقی کوالٹی کی پرواہ نہ کرکے صرف سستے داموں کی چیز ڈھونڈھنے والے ہوں گے یہ ٹھیک ہے کہ ایسے
لوگوں کی تعداد دن بدن کم ہو رہی ہے۔ کیونکہ خریداروں کو اب مال خریدنے کی عقل آہستہ آہستہ آ رہی ہے۔
خریداروں کی زیادہ تعداد اب کوالٹی کے پیچھے جاتی ہے اور لوگ اپنے روپیہ کے کوالٹی کے لحاظ سے مارکیٹ
میں زیادہ سے زیادہ دام جو مل سکیں وصول کرنا سیکھ گئے ہیں۔ اس لئے اگر آج ایک آدمی کو ایک ایسی
چیز کا پتہ لگ جائے جو ان پچانوے فی صدی آدمیوں کی ضرورت کو خوب پورا کرنے والی ہو اور اُس چیز کو
بڑھیا سے بڑھیا کوالٹی کا تیار کرکے ممکن سے ممکن سستی قیمت پر بیچنے کا وہ انتظام کرے تو اُس کا کاروبار اتنا چمکیگا
جس کی کچھ حد نہیں۔

یہ مال کو سکّہ بند کرنا نہیں کہلاتا۔ سکّہ بند مال تیار کرنے سے بہت گڑبڑی پھیلنے کا اندیشہ ہے کیونکہ
عام طور پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آئندہ کو وہ مال اور بھی بہتر ڈیزائن کا تیار کرنے اور اُس کی تیاری میں
آگے سے بھی بہتر عمل اور طریقے استعمال کرنے کا سارا کام ایک طرح سے ٹھپ ہو جاتا ہے اور کارخانہ دار اکثر
اپنے لئے ایک ایسی چیز پسند کر لیتا ہے جس کے بنانے میں اُسے سب سے زیادہ آسانی ہو۔ اور جس کو بیچ کر اُسے
سب سے زیادہ منافع ملتا ہو اُس چیز کا ڈیزائن یا قیمت مقرر کرتے وقت پبلک کے فائدے یا سہولیت کا
بالکل لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ عام طور پر سکّہ بند مال تیار کرنے میں بس ایک ہی خیال ہوا کرتا ہے اور وہ یہ
کہ اس طرح چل کر اور بھی زیادہ منافع ہوگا۔ نتیجہ یہ ہے کہ صرف ایک چیز تیار کرنے سے لازمی طور پر جو لاگت
میں کافی بچت ہوتی ہے اُس کی وجہ سے کارخانہ دار کے منافع دن بدن زیادہ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اُس
کے تیار مال کی تعداد بھی بڑھتی رہتی ہے کیونکہ زیادہ سہولیت ملنے سے وہ زیادہ مال تیار کرنے کے قابل ہو جاتا
ہے اور اُس سے پہلے کہ اُسے اس کی کچھ سُدھ ملے اُس کے پاس اتنی زیادہ تعداد میں مال تیار ہو جاتا ہے کہ
اُس کو بیچ کر نکالنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ البتہ اگر کارخانہ دار اُس مال کو کم دام پر بیچنے کے لئے رضامند

ہو جائے تو بے شک اُس کا مال بک سکتا ہے۔ خریدار تو ہر صورت میں کوئی نہ کوئی نکل آتا ہے لیکن یہ لازمی نہیں کہ قیمت گھٹا دینے سے ہمیشہ ضرور ہی کوئی خریدار مل جائے گا۔ اگر ایک چیز پہلے حد سے زیادہ اونچے دام پر بکتی رہی ہے اور کیونکہ اب اُس کا کاروبار ٹھنڈا پڑ گیا ہے اس لیے اُس کے دام اگر ایک دم گھٹا دیے جائیں تو پھر بھی کئی بار سخت مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اور اس کی بڑی معقول وجہ ہے اور وہ یہ کہ پبلک بھی چوکنی ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو خیال ہو جاتا ہے کہ داموں میں یہ کمی بھی کوئی دھوکے کی چال ہے اور اصل میں ابھی اور دام ضرور گھٹیں گے۔ اس لئے تب تک چپ بیٹھے رہنا چاہیے۔ پچھلے سال ہمیں اس کا کافی تجربہ ہو چکا ہے لیکن اگر اس کی بجائے مال کے تیار کرنے کی لاگت میں جو بچت نکلے اُس کے حساب سے داموں میں فوراً کمی کر دی جائے اور اگر پبلک کو اس بات کا پختہ یقین ہو کہ کارخانہ دار کی سچ مچ یہی پالیسی ہے تو پبلک کے دل میں کارخانہ دار کا اعتبار جم جائے گا اور بکری میں ہرگز کمی نہیں ہوگی بلکہ ترقی ہوگی۔ کیونکہ لوگوں کو بھروسہ ہوگا کہ اُس کارخانہ دار سے چیزیں خریدنے میں روپیہ کے پورے سولہ آنے ملیں گے۔ اس لئے اگر یہ کارخانہ دار یا بیوپاری اپنے مال کے دام آہستہ آہستہ لگاتار کم کرنے کو تیار نہیں تو اُس کا سکہ بند مال تیار کرنا گھاٹے کا سودا ہے۔ اور داموں میں کمی مال تیار کرنے کی لاگت میں بچت ہونے کی وجہ سے اُس کو کرنی چاہیے۔ نہ کہ اس لئے کہ مارکیٹ میں اب یہ چیز آگے سے کم بکنے لگی ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اُس چیز کے دام کارخانہ دار نے تیز رکھے ہوئے تھے مطلب یہ ہے کہ سکہ بند مال صرف اُس صورت میں خوب چلتا ہے جبکہ پبلک لگاتار اس چکر میں پڑی رہا کرے کہ اتنے تھوڑے پیسوں میں ایسی عمدہ اور اتنی زیادہ چیز کارخانہ دار کیونکر دے رہا ہے۔

سکہ بند مال کا مطلب جیسا کہ میں سمجھتا ہوں یہ نہیں ہے کہ کارخانہ دار اپنی سب سے زیادہ بکنے والی ایک چیز کو پکڑ لے اور اپنا سارا زور اُسی کے اوپر لگا دے۔ سکہ بند مال بنانا وہ کہلاتا ہے کہ کارخانہ دار پہلے اُس چیز کا ڈیزائن رات دن بلکہ برسوں تک سوچ سمجھ کر ایسا نکالے کہ پبلک کی ضرورت کے عین موافق ہو اور پھر اُس کے بنانے کا بہتر سے بہتر طریقہ تلاش کرے۔ اس کے بعد اس مال کو تیار کرنے میں جن جن عملوں کی ضرورت پڑے گی اُن کی شکل اور ترتیب کا فیصلہ اپنے آپ موقع اور حالت کے مطابق ہوتا چلا جائے گا۔ تب اگر ہم منافع کا خیال چھوڑ کر پبلک کی خدمت کرنے کی نیت سے مال تیار کرنا شروع کر دیں تو ہمارا کام سچے معنوں میں کاروبار کہلانے کے لائق ہو جائے گا اور اس سے اتنا منافع نکلے گا کہ جی بھر جائے گا۔

مجھے تو یہ سب باتیں اتنی سچی لگتی ہیں کہ ان کو ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں جو کارو بار سادی

کے پچانوے فی صدی لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے جاری کیا جائے گا اُس کی تہہ میں ان معقول سچے اصولوں کا ہونا نہایت لازمی ہے۔ ایک سوسائٹی کے پاس اپنی خدمت کرانے کا اس سے بہتر اور کوئی معقول ذریعہ نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عام طور پر کیوں کاروبار اس اصول پر نہیں چلایا جاتا اس اصول کو اختیار کرنے کے لئے بس اتنا ہی تو کرنا ہے کہ انسان جھٹ پٹ منافع حاصل کرنے کے پیچھے اس طرح سے ہڑبڑا کر پڑنے کی عادت چھوڑ دے جیسے کل کو دُنیا سے روپیہ کا نام و نشان اُٹھ جائے گا۔ شکر ہے کہ لوگوں کی یہ عادت آہستہ آہستہ چھوٹ رہی ہے۔ ملک کے اندر تمام بڑی اور کامیاب پرچون کی دوکانوں پر "ایک دام" سے کام ہونے لگا ہے۔ اب اگلا قدم اُٹھانا یہ باقی رہتا ہے کہ کاروبار کے اندر سے یہ خیال نکل جائے کہ لوگوں سے ایک شے کے اتنے دام چاہئے کرنے بالکل واجب ہیں جتنے وہ خوشی سے برداشت کر سکیں اور اُس کی بجائے یہ سادہ قاعدہ چل پڑے کہ ایک شے کے دام جتنی اُس کے بنانے میں لاگت آتی ہے اُس کے حساب سے مقرر ہونے چاہئیں اور پھر بنانے والا ہمیشہ یہ کوشش کرتا رہے کہ یہ لاگت اور بھی دن بدن کم ہوتی جائے۔ اگر ایک شے کا ڈیزائن کافی سوچ سمجھ کر قائم کیا گیا ہو تو اُس میں آگے چل کر بہت کم تبدیلیاں کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر اُس کے بنانے کے عملوں اور طریقوں میں ضرور جلدی جلدی تبدیلیاں ہوتی رہیں گی اور ایسا ہونا بالکل قدرتی ہے۔ آج تک جتنے کاموں میں بھی ہم نے ہاتھ ڈالا ہے اُن سب میں ہمارا یہی تجربہ ہے۔ مگر یہ سب کس طرح سے عین قاعدے میں اپنے آپ ہوتا چلا گیا۔ یہ قصہ میں آگے چل کر تفصیل سے بیان کروں گا۔ لیکن جس بات کو میں یہاں پر زور دے کر ظاہر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب تک کام کو شروع کرنے سے پہلے کافی عرصہ تک خوب سوچ بچار کر نہ دیکھ لیا جائے تب تک ایسی بڑھیا چیز تیار کرنا ناممکن ہے جو اس قابل ہو کہ انسان دل اور جان سے اُس میں جُٹ جائے۔ یہ نہیں کہ اِدھر سوچا اور اُدھر کام شروع کر دیا۔ ایسا کرنا کاروبار نہیں بلکہ مخول بازی ہے۔

جس سال میں تجربے کر رہا تھا اُس عرصے میں میرے یہ خیال آہستہ آہستہ پختہ ہو رہے تھے۔ میرے تجربے زیادہ تر مقابلہ کی دَوڑ میں حصہ لینے والی کاروں کے بنانے کے متعلق ہوتے تھے۔ بات یہ تھی کہ سب لوگوں کے دلوں میں یہ خیال جما ہوا تھا کہ اوّل درجہ کی کار وہی ہے جو مقابلہ کی دَوڑ میں سب سے بازی لے جائے یعنی خوب تیز رفتار ہو۔ میں نے اس بات کی کبھی بھی خاص پرواہ نہیں کی لیکن بائیسکل کی طرح موٹر گاڑی اور کاروں کے بنانے والوں کو بھی یہ وہم ہو گیا تھا کہ مقابلہ کی دَوڑ میں جو کار یا گاڑی بازی لے جائے گی اُس کی پبلک میں دھاک بندھ جائے گی گو میری اپنی رائے یہ ہے کہ ایک کار یا گاڑی کی کوالٹی اور پائداری کا اندازہ

کرنے کے لئے مقابلہ کی دَوڑ سے بڑھ کر اور کوئی امتحان کوئی نہیں ہو سکتا۔

مگر چونکہ میری لائن میں سبھی ایسا کام کرنے لگ پڑے تھے اس لئے مجبور ہو کر مجھے بھی اُن کے پیچھے چلنا پڑا چنانچہ سنہ ۱۹۰۲ء میں ٹام کو پر کے ساتھ مل کر میں نے صرف تیز رفتاری کے خیال کو سامنے رکھتے ہوئے دو کاریں تیار کیں۔ وہ دونوں بالکل ایک جیسی تھیں۔ ایک کا نام "۹۹۹" اور دوسری کا "ایرو" یعنی تیر رکھا گیا۔ میں نے سوچا کہ اگر موٹر کار اور گاڑیاں صرف تیز رفتار ہونے کی وجہ سے مشہور ہو سکتی ہیں تو کیوں نہ میں ایک ایسی کار بناؤں جس کی رفتار دیکھ کر دنیا دنگ رہ جائے۔ یہ کاریں بالکل اسی مطلب کی بنائی گئی تھیں۔ میں نے ان میں چار بڑے بڑے سیلنڈر لگائے تھے جو اسی گھوڑوں کی طاقت پیدا کر دیتے تھے اس سے پہلے اتنی طاقت والی کار کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کار کے چلتے ہوئے صرف ان سیلنڈروں کا زبردست شور ہی ایک انسان کو ادھ مرا کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس میں بیٹھنے کے لئے صرف ایک آدمی کی سیٹ تھی۔ ایک کار میں صرف ایک آدمی چڑھ سکتا تھا۔ میں نے ان کاروں کی آزمائش کی۔ کوپر نے بھی کی۔ ہم نے ان کو پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔ بس ہماری تو گویا جان ہی سی نکل گئی اس کار میں بیٹھ کر چلانے کے مقابلہ میں نیاگرا کے جھرنے سے چھلانگ لگانا محض کھیل تماشہ لگتا تھا۔ سب سے پہلے ہم نے "۹۹۹" کو باہر نکالا مگر اس کو مقابلہ کی دَوڑ میں دَوڑانے کی ذمہ داری لینے کو میں تیار نہ تھا اور نہ کوپر لیکن کوپر نے مجھے بتلایا کہ وہ ایک ایسے آدمی کو جانتا ہے جو تیز رفتاری کا نہایت شوقین ہے اور ایک کار خواہ وہ کتنی ہی تیز چلنے والی کیوں نہ ہو وہ بالکل نہیں گھبراتا۔ چنانچہ اس نے سالٹ لیک (SALT LAKE) شہر کو تار دیدی اور وہاں سے بارنے اولڈ فیلڈ نام کا ایک شخص آگیا جس نے بائیسکل کی دَوڑ میں حصّہ لینا اپنا پیشہ بنا یا ہوا تھا۔ اُسے موٹر کار چلانے کا بالکل تجربہ نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کار کو چلا کر دیکھنے پر رضامند ہو گیا۔ وہ کہنے لگا کہ خواہ کتنا بھی سخت اور خطرناک کوئی کام کیوں نہ ہو ایک بار تو وہ ضرور اُس کو کر کے دیکھ ہی لے گا۔

ہم نے ایک ہفتہ کے اندر اُس کو کار چلانا سکھلا دیا۔ وہ آدمی جانتا نہ تھا کہ خوف کس بلا کا نام ہے۔ بس اُسکو صرف اتنا ہی سیکھنا تھا کہ اس بھیانک کار کو کس طرح سے قابو میں رکھنا ہے۔ اُس کار کے مقابلہ میں آج کل کی تیز سے تیز کار کو قابو میں رکھنا کچھ چیز نہیں۔ ابھی تک کاروں میں اسٹیرنگ وہیل (STEERING WHEEL) یعنی گھمانے والا پہیہ لگنا شروع نہیں ہوا تھا۔ اور تب تک جتنی کاریں میں نے بنائی تھیں اُن سب میں صرف ہتھا لگا ہوتا تھا۔ مگر اس کار میں میں نے دو ہاتھوں سے پکڑنے والا ہتھا لگایا تھا کیونکہ اس کار کو راستے پر سیدھا رکھنے کے لئے ایک طاقت ور آدمی کو اپنا پورا زور لگانے کی ضرورت تھی۔ جس دَوڑ میں سڑک پر کسی نے

کے واسطے ہم تیاریاں کر رہے تھے وہ گراس پوائنٹ کے چوگاں میں تین میل کا چکر تھا۔ ہم نے اپنی اس
کار کی بالکل باہر خبر نہیں نکالی۔ اور لوگ اور اور کاروں کی نسبت قیاس لگاتے رہے کہ کون کی کار اس
دوڑ میں سب سے آگے نکلے گی۔ اُس زمانہ میں گھوڑ دوڑ کے چوگان علم اور قاعدے کے ساتھ نہیں بنائے
جاتے تھے کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ ایک کار زیادہ سے زیادہ کتنی تیز چلائی جا سکتی ہے۔ راستے میں جو موڑ
پڑتے تھے اُن پر خوب تیز رفتاری سے کار کو چلانا اولڈ فیلڈ سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ دوڑ
شروع ہوتے وقت کار کو چھوڑنے کے لئے جب میں ہینڈل مار رہا تھا اُس وقت اُس نے کار میں بیٹھکر
ہنستے ہوئے مجھ سے کہا کہ لو میں تو چلا۔ ممکن ہے تمہاری کار آج مجھے ختم کر دے لیکن پیچھے سے لوگ یہ تو کہا
کریں گے کہ کبھی اولڈ فیلڈ نے چلانے میں کمال کر دیا۔ اُس کی کار تو ہوا سے باتیں کرتی جاتی تھی۔

سچ مچ وہ ہوا میں اُڑا جاتا تھا۔ کار کے چلنے کے وقت سے لے کر دوڑ کے ختم ہونے تک اُسے ایک
بار بھی اِدھر اُدھر دیکھنے کی جرات نہیں ہوئی اور اُس کی نظر ہر وقت سامنے رہی۔ اُس نے موڑوں پر بھی کار
کی چال کو دھیما نہیں کیا۔ اُس نے کار کو سڑک کے موڑوں پر بھی پوری رفتار سے چلنے دیا اور کار بھی ایسی چلی
کہ کیا کہنے! اس دوڑ میں جو دوسرے نمبر پر کار آئی تھی اُسے وہ آخر میں جا کر لگ بھگ آدھا میل پیچھے چھوڑ
آیا تھا۔

جس مطلب کے لئے ہم نے "۹۹۹" کار بنائی تھی وہ پورا ہو گیا۔ چاروں طرف میرا نام مشہور ہو گیا کہ میں
تیز رفتار موٹر بنا سکتا ہوں۔ اس دوڑ کے ایک ہفتہ بعد فورڈ موٹر کمپنی کی بنیاد پڑی۔ میں اس کا وائس پریسیڈنٹ
کار کا ڈیزائن بنانے والا سب سے بڑا میکینک یعنی کل شاستروں کا دھارنی سپرنٹنڈنٹ اور جنرل منیجر مقرر ہوا
اس کمپنی کا سرمایہ تین لاکھ روپیہ تھا جس میں میرا حصہ ساڑھے پچیس فی صدی تھا۔ کل نقد روپیہ جو جمع ہوا
تھا اُس کی میزان چوراسی ہزار روپیہ تھی۔ اور سرمایہ کے طور پر اس سے زیادہ روپیہ جمع کرنے کی ہمیں آج تک
کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ البتہ جو ہم نے اس میں سے کما کر پھر لگا دیا وہ علحدہ رقم ہے۔ گو مجھے اس کا پہلے تلخ تجربہ
ہو چکا تھا پھر بھی شروع میں میرا یہ خیال تھا کہ میں ایک ایسی کمپنی میں رہ کر کام کر سکوں گا جس کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ
میں رکھنے کے لائق میرے حصہ خواہ نہ بھی ہوں مگر میں نے جلدی ہی دیکھ لیا کہ باگ ڈور ہاتھ میں لئے بغیر گزارہ
نہیں۔ اس لئے جو کچھ میں نے اس کمپنی کے ذریعہ اُس وقت تک کمایا تھا اُس سے میں نے ۱۹۰۶ء میں اور حصے
خرید کر اکیاون فی صدی تک بڑھا لئے اور اس کے کچھ عرصہ کے بعد جلدی ہی ساڑھے اٹھاون فی صدی تک

کر لئے۔ میرا ہمیشہ یہ قاعدہ رہا کہ کمپنی کے اندر سے جو منافع نکلتا صرف اُس میں سے ہی مناسب رقم نکالکر کمپنی میں جو نیا ساز و سامان لانا ضروری ہو خریدا جائے اور تیاری مال میں جو ترقی کی جائے وہ بھی تمام اسی طریقہ سے کی جائے مطلب یہ کہ باہر سے لاکر کوئی رقم نہ خرچ کرنی چاہیئے۔ ۱۹۱۹ء میں میرے لڑکے ایڈسل نے باقی کے ساڑھے اکتالیس فی صدی حصّے بھی خرید کر لئے۔ کیونکہ کمپنی کے چند حصّہ داروں کو میری پالیسی پر سخت اعتراض تھا۔ ان حصّوں کے لئے اُس نے قیمت کی شکل میں ہر سیکڑے کا بارہ ہزار پانچسو روپیہ دیا اور اس طرح سے کل ساڑھے بائیس کروڑ روپیہ ادا کیا۔

قدرتی طور پر یہ کمپنی شروع میں بڑے چھوٹے پیمانہ پر جاری ہوئی تھی اور اس کے پاس ساز و سامان بہت معمولی تھا۔ ہم نے چوک میاک ایونیو میں سٹرِیو کا بڑھئی خانہ کرایہ پر لے لیا میں نے مال کے ڈیزائن بنانے کے ساتھ ساتھ ان کے بنانے کے طریقے بھی خود ہی مقرر کیئے۔ مگر چونکہ اُس وقت ہمارے پاس مشینری خریدنے کے لئے روپیہ نہ تھا اس لئے ساری کار میرے ڈیزائن کے مطابق کئی کارخانوں میں بن کر تیار ہو کر آتی تھی۔ اور ہمارا کام صرف اُس کے حصوں کو جوڑ دینے۔ پُرزے فٹ کر دینے۔ پہیئے لگا دینے اور اُن پر ٹائر چڑھا دینے اور کار کو ہودا پہنا دینے کا ہوتا تھا۔ اگر ایک آدمی کو یہ یقین ہو جائے کہ ان پُرزوں اور حصوں کے بنانے کا کام عین اُس طریقے کے مطابق ہو رہا ہے جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے تو سچ مچ اُس سے بڑھ کر کسی صورت میں بچت نہیں نکل سکتی۔ آنے والے زمانہ میں مال تیار کرنے واسطے سب سے سب سے عمدہ بچت کا طریقہ یہ ہوگا کہ ایک چیز اگر وہ بالکل ہی سادی نہ ہو تو اُس کے سارے حصّے سب ایک ہی جگہ پر نہ بنائے جائیں۔ اس ترقی کے زمانہ میں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ آئندہ استعمال کرنے کے لئے سب سے نفیس طریقہ یہ ہے کہ ایک چیز کا جو حصّہ جس جگہ سب سے بہتر بن سکے صرف وہاں پر بنایا جائے اور پھر جس جگہ اُس مال کے کھپنے کی اُمید ہو اُس مقام پر اُن سب حصّوں کو اکٹھا کر کے مکمّل چیز بنا کر مارکیٹ میں بیچ دیا جائے بس اسی طریقہ پر آج کل ہم کام کر رہے ہیں اور اسی کو بڑھاتے چلے جا رہے ہیں اگر جن کارخانوں میں ایک چیز کے مختلف حصّے تیار ہوتے ہیں وہ سب پبلک کی سہولیت اور فائدے کا دھیان رکھتے ہوئے چلائے جائیں تو اس بات سے بالکل کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اُن سب کا مالک ایک ہی ہے۔ یا اُن کے الگ الگ مالک ہیں۔ اگر ہمیں ایک پُرزہ یا حصّہ کافی تعداد میں مناسب قیمت پر باہر سے بن کر مل سکتا ہو تو ہم اُس پُرزے کو خود تیار کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ البتہ اگر کہیں سخت ضرورت آ پڑے تو الگ بات ہے

بلکہ اصل میں تو ایک شے کے حصّے جتنے زیادہ مختلف مالکوں کے کارخانوں میں بن کر تیار ہوں گے اُتنا ہی اچھا ہے
میں اپنی کاروں کو اور بھی ہلکا وزن کا بنانے کے خیال سے اکثر تجربے کیا کرتا تھا۔ فالتو وزن ہر قسم
اپنی طاقت سے چلنے والی کار یا گاڑی کو ناکارہ بنا دیتا ہے۔ مگر وزن کے متعلق لوگوں میں طرح طرح کے بیہودہ
خیال پھیلے ہوئے ہیں۔ آج کل معمولی بول چال میں کئی ایسے لفظ استعمال ہو رہے ہیں جن کو سُن کر سچ مچ بہت
تعجب ہوتا ہے۔ ایک لفظ ہے "بھاری دماغ"، جو آج کل ایک آدمی کی تیز عقل کے بارے میں عام طور پر سننے
میں آتا ہے۔ اب ذرا غور کرو کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ جب کوئی آدمی جسم کا بھاری اور موٹا ہونا پسند نہیں کرتا
تو وہ اپنا دماغ کیوں بھاری بنانا یا کہلانا پسند کرے گا۔ کسی بھدّے سبب کے چکر میں پھنس کر ہم نے لفظ
"وزن" کو "طاقت" کے ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پُرانے زمانے میں جن بھونڈے طریقوں سے چیزیں
تیار کی جاتی تھیں اُس کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ اُس وقت ایک بیل گاڑی کا وزن ایک ٹن
(سوا ستائیس من کے قریب) ہوتا تھا۔ اور کیونکہ وہ اتنی بھاری تھی اس لئے اصل میں کمزور تھی۔ نیویارک سے
شکاگو تک مسافروں کی ایک معمولی تعداد کو جس کا کل بھار مل ملا کر چند ٹن سے زیادہ نہ ہوگا لے جانے کے
لئے ریلوے نے ایک سواری گاڑی بنائی جن کے ڈبوں کا وزن سیکڑوں ٹن ہوگا۔ ذرا سوچئے اس طرح کتنی
اصل "طاقت" کا یوں ہی ضائع چلے جانے سے نقصان ہوا اور کروڑوں من بجلی کی طاقت ان ڈبوں کو کھینچنے میں
بے کار صرف ہوگئی۔ اصول یہ ہے کہ ایک چیز کے اندر جس مقام پر آکر "وزن" "طاقت" شمار ہونے لگتا ہے اُس
سے آگے اُس میں اُسی حساب سے کمی اور کمزوری آنی شروع ہو جاتی ہے۔ ایک اسٹیم رولر جتنا وزنی ہوگا
ممکن ہے اُتنا ہی اچھا کام دینے والا ہو اور یہ قاعدہ کسی اور جگہ یا چیز میں نہیں چل سکتا۔ طاقت کا وزن کے
ساتھ بالکل کچھ لگاؤ نہیں۔ دُنیا میں کامیاب ہونے والے آدمی ہمیشہ چست چالاک اور ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔
دُنیا کے اندر سب سے خوبصورت چیزیں وہی ہیں جن کے جسم میں سے تمام افزوں وزن خارج ہو گیا ہو۔ انسان
میں یا چیزوں میں طاقت وزن کے حساب سے کبھی نہیں ہوا کرتی جب کوئی شخص مجھے اپنی کار کا وزن یا اس
کے اندر ایک اور نیا پرزہ بڑھانے کی صلاح دیتا ہے تو میں اُلٹا کار کے موجودہ وزن کو اور بھی کم کرنے کا رستہ
ڈھونڈا کرتا ہوں اور یہ سوچا کرتا ہوں کہ جتنے پُرزے میں اس وقت کار میں لگا رہا ہوں کیا ان میں سے ایک
اور کم نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی تک مارکیٹ میں جتنی کاریں آئی تھیں اُن میں میری سب سے زیادہ ہلکی تھی۔ اگر مجھے
طریقہ آتا ہوتا تو میں اُسے اور بھی ہلکا بناتا مگر اس کے کچھ عرصہ بعد میرے ہاتھ ایسے سامان (کچے مصالحے) لگ گئے

جن کو استعمال کرنے سے میری کار اور بھی ہلکی تیار ہونے لگی۔

پہلے سال ہم نے ماڈل "اے" تیار کیا اور اس کار کے انجن اور ہودے کی قیمت دو ہزار پانچسو پچاس روپیہ
کی۔ اور اس کی پچھلی سیٹ کے تین سو روپیہ علیحدہ چارج کیئے۔ اس ماڈل میں دو سیلنڈر آمنے سامنے لگے ہوئے ہوتے تھے
جن سے آٹھ گھوڑوں کی طاقت پیدا ہوتی تھی۔ ان کے پہیوں کو کھینچنے کے لئے زنجیر سے کام لیا جاتا تھا اور ایک پہیے
کی چوڑائی بہتر انچ ہوتی تھی جو کہ اس وقت بہت بڑی مانی جاتی تھی۔ اس میں پانچ گیلن تک پٹرول وغیرہ جمع کرنے
کی جگہ رکھی گئی تھی۔ پہلے سال ہم نے سترہ سو آٹھ کاریں فروخت کیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ پبلک نے ہماری خوب
قدر کی۔

ماڈل "اے" کی ہر ایک کار کا شاندار ریکارڈ موجود ہے۔ مثال کے طور پر چار سو بیسویں کار کو لیجیے ۱۹۰۴ء
میں کیلی فورنیا کے کرنل ڈی۔ سی کولیر نے اس کو خریدا اور چند سال استعمال کرنے کے بعد اس کو بیچکر ایک نئی فورڈ
کار خرید لی۔ اس کے بعد اس کے جلدی جلدی مالک بدلتے رہے۔ ۱۹۰۷ء میں اسے ایک شخص نے جو عین پہاڑ
کے بیچ میں راموناکے قریب رہتا تھا خرید لیا۔ اس کا نام ایڈمنڈ جیکب تھا۔ اس نے کئی سالوں تک اسے خوب
رگڑا اور اس سے سخت سے سخت کام لیا۔ تب اسے بیچ کر اس نے ایک نئی فورڈ کار خرید لی۔ ۱۹۱۵ء میں اس
چار سو بیسویں کار کا مالک کنٹیلو نام کا ایک شخص تھا جس نے اس کی موٹر نکال کر اسے پانی کے پمپ کے ساتھ
جوڑ دیا اور ہودے کے ساتھ دو بم لگا دئے۔ چنانچہ موٹر سے پانی کا پمپ فٹافٹ چلنے لگا اور بم لگے ہوئے ہودے
کو اس نے بڑے مزے کے ساتھ ایک چھکڑے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس سے بخوبی ثابت ہوگیا
کہ ایک فورڈ کار کے چاہے ٹکڑے ٹکڑے کر دو مگر وہ کبھی ہلاک نہیں ہو سکتی۔

ہم نے پہلے اشتہار میں یہ مضمون دیا تھا:۔

ہم پبلک کی خدمت میں ایک ایسی کار بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں جو خاص طور پر روزمرّہ بیوپاری۔ ڈاکٹر
انجنیئر وغیرہ سبھی پیشہ لوگوں کے استعمال کرنے کی چیز ہو۔ جس کی رفتار اتنی ہو جس سے عام آدمیوں کی تسلّی ہو سکے
مگر جو اتنی تیز رفتار نہ ہو کہ اس میں بیٹھنے والے کو اپنی گردن ٹوٹنے کا ڈر ہو۔ اور اس وجہ سے ہر جگہ اس کی بدنامی
ہو۔ ہماری کار ایسی ہوگی جس کی گٹھی ہوئی شکل وصورت اور سادگی حفاظت اور ہر پہلو سے آرام دینے والی
صفتیں دیکھ کر اس پر آدمی۔ عورتیں اور بچے سبھی لٹو ہو جائیں گے اور جس کی اس کے علاوہ ایک بڑی خوبی
یہ بھی ہوگی کہ دام نہایت واجبی ہوں گے اور اس لیئے اس کو ہزاروں آدمی ـــــ جو دوسری کاروں کو جنکی

قیمتیں چھوٹ موٹ نہایت اونچی ہیں خریدنے کا کبھی حوصلہ نہیں کر سکتے تھے ــــ بڑی آسانی سے خرید سکیں گے۔

اس اشتہار میں جو باتیں ہم خاص طور پر ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ یہ تھیں:۔

ــــ کار کے بنانے میں اچھے اور مضبوط سامان کا استعمال۔

ــــ سادگی۔ اس زمانہ کی بہت سی کاروں کو چلانے اور قابو میں رکھنے کے لئے کافی لیاقت کی ضرورت رہتی تھی۔

ــــ انجن۔

ــــ آگ پکڑنا۔ چھ ڈرائی سیل بیٹریوں کی دو جوڑیوں سے چنگاری پیدا کی جاتی تھی۔

ــــ اپنے آپ پرزوں میں تیل کا دیا جانا۔

ــــ طاقت کو کار کے ایک حصّے سے دوسرے حصّے تک ستاروں کی کشش کی طرح پہونچا دینا اور معمولی طریقہ سے قابو میں کرنا۔

ــــ عمدہ کاریگری۔

ہم نے اس اشتہار میں یہ کہیں نہیں کہا کہ اس کار کو خریدنے سے آدمی زندگی کا اور بھی زیادہ لطف اُٹھا سکے گا۔ ــــــــــــ ہم نے اُلٹا اپنے پہلے اشتہار میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہماری کار بڑے کام اور فائدہ کی چیز ہے، اور لکھا:۔ یہ پُرانی کہاوت کہ "وقت روپیہ ہے" ہمارے اکثر سننے میں آتی ہے مگر ایسے بیوپاریوں اور پیشہ ور لوگوں کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جا سکتی ہے جو زندگی اس طریقہ پر گزار رہے ہوں گویا وہ واقعی اس کو سچّا مانتے ہیں۔ ہائے رے بدقسمتی وہ لوگ جو سدا اس امر کی شکایت کرتے رہتے ہیں کہ اِن کے پاس وقت نہیں اور ایک ہفتہ میں صرف سات دن ہونے کو کوستے ہیں جن کا ایک ایک منٹ قیمتی ہے اور جن کے صرف پانچ منٹ وقت سے بچھڑنے سے سیکڑوں روپیہ پر پانی پھر جاتا ہے اُن کو مجبور ہو کر آج کل کی نکمّی بے ہنگم اور تکلیف دینے والی چند کاروں اور گاڑیوں میں سفر کرنا پڑتا ہے حالانکہ اُنہیں نہایت واجبی اور کم قیمت پر ایک ایسی کار مل سکتی ہے جو ہر لحاظ سے مکمل۔ نہایت پائدار اور عمدہ ہو۔ جس کو خرید کر اُن کو سفر کا فکر اور وقت سے بچھڑنے کا ڈر جاتا رہے اور اُن کے قبضہ میں ایک ایسی چیز ہو جائے جو اشارہ کرنے پر خدمت کرنے کے لئے ہر وقت حاضر رہے اور جس میں سفر کر کے دل باغ باغ

ہو جائے۔

— نوکری کرنے کو ہر دم حاضر اور اپنے مالک کی سچی خیر خواہ۔

— نہایت مضبوط اور پائدار جس سے آگے کو آپ کا قیمتی وقت اور روپیہ بچے۔

— جہاں جی میں آئے گھماتے پھرو اور وقت پر گھر واپس پہونچ جاؤ۔

— اس کو استعمال کرنے سے آپ کی بہت شہرت ہو جائے گی کہ آپ وقت کے بہت پابند ہیں اس وجہ سے آپ کے خریدار ہمیشہ آپ سے خوش رہیں گے اور آپ سے ہر وقت مال خریدنے کو تیار رہیں گے۔

— خواہ اس سے دفتر یا بیوپار کا کام لو۔ چاہے اس کو گھر پر استعمال کرو۔

— اس سے آپ کی صحت کو فائدہ پہونچے گا کیونکہ اس پر چڑھ کر آپ کچی پکی سڑکوں پر بھی بڑے مزے کے ساتھ سفر کر سکیں گے۔ اور باہر کھلے میدانوں میں گھومنے سے آپ کا دماغ بھی ہر دم تازہ رہے گا اور آپ کے پھیپھڑوں کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی دوائی یعنی کھلی "تازہ ہوا" ملے گی۔

— اس کی رفتار بھی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ دل میں آئے تو سایہ دار درختوں کے تلے سڑک پر دھیرے دھیرے چلاؤ اور اگر مرضی ہو تو پاؤں سے ذرا لیور (LEVER) دباؤ اور کار ہوا سے باتیں کرنے لگے گی۔ یہاں تک کہ آپ کی اپنے ارد گرد کے نظاروں پر نظر نہیں ٹھہر سکے گی۔ اور نہایت تیزی کے ساتھ ایک کے بعد دوسرا میل پتھر گذرتا چلا جائے گا۔

میں اس اشتہار کا خلاصہ یہ ظاہر کرنے کے واسطے دے رہا ہوں کہ ہم نے شروع سے ہی پبلک کی خدمت کرنے کے خیال کو سب سے آگے رکھا ہے اور موج بہار اڑانے کی خاطر کار بنانے کی کبھی پرواہ نہیں کی ہمارا کاروبار آن کی آن میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ ہماری کاریں پائداری میں مشہور ہونے لگیں وہ نہایت مضبوط سادہ اور عمدہ بنی ہوئی تھیں۔ مگر میں رات دن اپنے مختلف ڈیزائنوں پر اس نیت سے تجربے کر رہا تھا کہ میرے ہاتھ ایک ایسا ماڈل لگ جائے جو سب جگہ کام دے سکے لیکن میری سمجھ میں اس قسم کے ماڈل کا ڈیزائن ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اور نہ میرے پاس اس طرح کا ماڈل تیار کرنے کے لئے کارخانہ کھولنے۔ اور مناسب ساز و سامان اکٹھا کرنے کے لائق روپیہ جمع تھا۔ میرے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا کہ میں اپنی کاروں میں استعمال کرنے کے واسطے بڑھیا سے بڑھیا اور نہایت ہلکے سامانوں (مصالحوں) کی کھوج کر سکوں ہمیں جس قسم کے اچھے برے سامان مارکیٹ سے ملتے تھے انہیں کو لے کر گذارہ کرنا پڑتا تھا۔ البتہ اتنی بات ضرور تھی کہ ان میں سے ہم ہمیشہ اول درجہ کا سامان چھانٹ لیا

کرتے تھے مگر ہمیں ان سامانوں یا کار کے ڈیزائن کے بارے میں علمی تجربے کرنے کے لئے بالکل کوئی سہولیت حاصل نہ تھی۔

میرے ساتھیوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ ہم کبھی صرف ایک ماڈل کی کار بنا کر ہی کامیاب ہوسکیں گے اُس زمانہ میں موٹر کاروں کی تجارت بائیسکل کے بیوپار کے اصولوں پر چلتی تھی۔ اور ہر بنانے والا اپنی کار کا ہر سال اس قسم کا ایک نیا ماڈل نکالنا لازمی خیال کرتا تھا جو پہلے تمام ماڈلوں سے بالکل مختلف ہوتا کہ جن کے پاس پہلے ماڈلوں کی کاریں خریدی ہوئی ہوں اُن کو پہلی کار سے کسی طرح پلّہ چھڑا کر اُس نئے ماڈل کے خریدنے کا زبردست شوق پیدا ہو۔ اس کو تجارت کرنے کا بالکل جائز اور اچھا اصول مانا جاتا تھا۔ گویا جس طرح عورتیں کپڑے اور گہنوں کے نئے نئے فیشنوں کے پیچھے ہر دم دوڑی پھرتی ہیں وہی بیماری یہاں بھی آ گئی تھی۔ مگر اسے پبلک کی خدمت کرنا ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ یہ تو صرف ایک نئی چیز ——— نہ کہ ایک بہتر چیز ——— مارکیٹ میں لاکر پیش کر دینا ہوا۔ اور کچھ نہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بیوپار یعنی لگاتار مال بیچتے رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ خریدار کے ہاتھ پہلی مرتبہ ہی ایسی چیز نہیں بیچ دینی چاہیے جس کو پاکر اُس کی پوری تسلی ہوجائے بلکہ کوشش یہ رہنی چاہیے کہ خریدار جب ایک بار چیز خرید چکے تو پھر اُس کو نئے اور مختلف ڈیزائن میں اُسی چیز کا ایک اور عدد خریدنے پر لُبھایا جائے۔ یہ نامعقول خیال لوگوں کے دلوں میں اتنا گھر کر گیا ہے کہ دیکھ کر سچ مچ تعجب ہوتا ہے۔ اُس وقت جو اسکیم میرے دماغ میں گھوم رہی تھی اور جس کے مطابق کام کرنے کی ہمیں تب تک پوری عقل نہیں آئی تھی۔ یہ تھی کہ جب ایک بار ماڈل کا فیصلہ ہوگیا اُس کے بعد پھر جو اس میں تبدیلی یا ترقی کی جائے ایسی ہو جو اُس ماڈل میں بالکل فٹ ہوجائے تاکہ کار کبھی بھی پرانے فیشن کی ہو جانے کی وجہ سے ترک نہ کرنی پڑے۔ میری اُمنگ تو یہ ہے کہ میں اپنی مشینری کا ہر ایک حصہ اور پرزہ یا ڈھانچہ کا دوسرا سامان جو میں بناتا ہوں اس قدر مضبوط اور عمدہ بناؤں کہ جو اسے ایک مرتبہ لے لے اُسے دوبارہ خریدنے کی ضرورت نہ پڑے۔ ایک اچھی گھڑی کی طرح ایک کار کی بھی عمر لمبی ہونی چاہیے۔

اگلے برس ہم نے تین ماڈل کی کاریں تیار کرنی شروع کر دیں۔ ہم نے چار سلنڈر والی سفری کار بنائی جو ماڈل بی کہلاتی تھی اور جس کا دام ہم نے چھ ہزار روپیہ رکھا تھا۔ ماڈل سی کار ماڈل اے سے قدرے بہتر بنی ہوئی ہوتی تھی اور اس لئے اُس کے دام ڈیڑھ صد روپیہ زائد تھے۔ تیسرا ماڈل ایف کہلاتا تھا جو تین ہزار روپیہ پر بکنے والی سفری کار تھی مطلب یہ کہ ہم نے اپنا کام کافی پھیلا لیا اور قیمتیں بڑھا دیں جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اُس سال کاریں کم فروخت

ہوئیں یعنی کل سولہ سو پچانوے عدد۔

ماڈل بی عام سڑک استعمال کے واسطے پہلی کار تھی جس میں چار سلنڈر استعمال کئے گئے تھے اور یہ ضروری تھا کہ اسے چالو کرنے کے لئے اس کی لوگوں میں مشہوری کی جائے۔ اُس زمانے میں ایک کار کو مشہور کرنے کا سب سے بڑھیا طریقہ یہ تھا کہ وہ مقابلہ کی دَوڑ میں بازی لے جانے والی یا تیز رفتاری میں اُس نے ریکارڈ مات کیا ہوا ہو چنانچہ اس کام کے لئے میں نے اپنی "۹۹۹" کی بہن "ایرو" کو چُنا اور اُسے ایک طرح سے عملی طور پر دوبارہ بنایا اور نیویارک کی نمائش موٹر گاڑی سے ایک ہفتہ پہلے میں نے اسے برف پر پورا ایک میل ناپ کر دَوڑایا۔ مجھے وہ مقابلہ کی دوڑ کبھی نہیں بھولے گی۔ راستے پر برف کی سطح بالکل ایکسار جمی ہوئی نظر آتی تھی۔ ایسی ایکسار کہ اگر میں نے اپنی کار کو چلانے کی اس پر ایک بار پہلے مشق نہ کی ہوتی تو مشہوری ہونے کی بجائے ہمارے ماتھے پر بدنامی کا ایسا ٹیکہ لگتا جو سیکڑوں بار دھونے پر بھی شاید مشکل سے اُترتا۔ کیونکہ برف اوپر سے جمی ہوئی نظر آتی تھی لیکن نیچے پھوٹ کر اُس کے اندر بڑے بڑے دراڑ ہو گئے تھے جن کی وجہ سے میں جانتا تھا کہ جوں ہی میں کار کی تیز رفتار کروں گا ضرور دقت پڑے گی لیکن مقابلہ کی دَوڑ میں شریک ہوئے بغیر ہمارا کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس لئے بھگوان کا نام لیکر میں نے "ایرو" کو پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔ ہر دراڑ پر کار ہوا میں اچھلتی تھی اور مجھے خود پتہ نہیں تھا کہ آیا وہ پھر لوٹ کر زمین پر نیچے پہنچے گی یا وہیں ختم ہو جائے گی جب کار اوپر ہوا میں نہ ہوتی تھی تو یہ گویا برف پر پھسلتی جاتی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ کسی طرح یہ کار راستہ میں کہیں نہ اُلٹ کر دَوڑ کے آخر تک صحیح سلامت پہنچ گئی اور تیز رفتاری میں ایسا ریکارڈ قائم کیا کہ دُنیا کے چاروں کونوں میں اس کی دھوم مچ گئی۔ ہر ملک میں ماڈل بی کا نام مشہور ہو گیا۔ مگر زیادہ قیمت ہونے کی وجہ سے پھر بھی اس کی بکری کافی بڑھ نہ سکی۔ بات یہ ہے کہ ہیرا پھیری کر کے یا اشتہار بازی کے زور سے ایک شے ہمیشہ فروخت نہیں کی جا سکتی۔ بیوپار جوا نہیں۔ لوگوں پر یہ سچائی آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہی ہو۔

کام بہت بڑھ جانے کی وجہ سے ہماری چھوٹی سی لکڑی کی دوکان بالکل ناکافی ثابت ہونے لگی۔ اس لئے ہم نے اپنے چالو سرمایہ میں سے ایک خاص رقم نکال کر سنہ ۱۹۰۶ء میں پکٹ اور بوبین کوچوں کے نکڑ پر ایک تین منزلہ عمارت بنالی۔ جہاں جا کر ہمیں مال تیار کرنے میں پوری سہولیت اور آزادی کے ساتھ کام کرنے کا پہلی بار موقع ملا۔ وہاں پہونچکر ہم نے کار کے بہت سے حصّے اور پُرزوں کو خود ہی بنانا اور جوڑنا شروع کر دیا مگر ہم نے اپنا اصلی کام صرف جوڑنے کا ہی رکھا۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں ہم نے محض دو ماڈل کی کاریں تیار کیں۔ ایک چار

سیلنڈر والی کار جو ہم چھ ہزار روپیہ میں بیچتے تھے اور دوسری سفری کار جس کا دام ہم نے تین ہزار روپیہ رکھا تھا۔ یہ دونوں ماڈل پچھلے سال والے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال ہماری بکنے والی کاروں کی تعداد گھٹ کر صرف ۱۵۹۹ رہ گئی۔

کئی لوگ اس کی یہ وجہ بتاتے تھے کہ ہم نے نئے ماڈل نکالنے بند کر دئے تھے۔ مگر میرے اپنے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری کاروں کی قیمتیں بہت زیادہ تھیں اور وہ اُن پچانوے فی صد لوگوں کے حال اور پسند کے مطابق نہ تھیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ میں نے اگلے سال اپنی پالیسی بدل دی مگر اس سے پہلے جو اسٹاک موجود تھا اُس کو اوڈل اپنے ہاتھ تلے کیا۔ ۱۹۰۶-۷ء میں ہم نے سفری کاروں کا بنانا قطعی بند کر دیا اور چھوٹے موٹے کام کرنے والی اور عام سڑکوں پر چلنے والی کاروں کے تین ماڈل نکالے۔ ان تینوں ماڈلوں کے بنانے کا طریقہ بالکل ایک جیسا تھا اور ان کے پُرزے بھی یکساں تھے۔ لیکن ان کی شکلیں مختلف تھیں۔ بڑی بات یہ تھی کہ ان میں سب سے سستی کار کے دام اٹھارہ سو اور مہنگی کے صرف ساڑھے بائیس سو روپیہ تھے ان کے مارکیٹ میں آتے ہی مکمل طور سے ثابت ہو گیا کہ قیمت کا بکری پر بہت اثر پڑتا ہے اُس سال ہم نے ۸۴۲۳ کاریں بیچیں۔ اب تک کسی سال میں ہماری زیادہ سے زیادہ جو بکری ہوئی تھی اُس سے یہ تعداد لگ بھگ ۵ گنا زیادہ تھی۔ ہمارا سب سے شاندار ہفتہ ۱۵ مئی ۱۹۰۸ء والا تھا جب ہم نے چھ دنوں میں ۳۱۱ کاریں مکمل تیار کر کے مارکیٹ میں بھیجیں۔ تیار مال کی اس بھرمار سے گویا ہمارا ناک میں دم آگیا۔ ہر کار مکمل ہو جانے پر دیکھ ریکھ کے لئے بھیجی جاتی تھی، اور حساب رکھنے کی خاطر فوراً میں اُس کو ایک بڑے بورڈ پر درج کر لیتا تھا لیکن بورڈ پر ان ناموں کے لکھنے کے لئے بالکل جگہ نہ رہی۔ اگلی جون کے مہینے میں ہم نے صرف ایک دن میں حصّے اور پُرزے جوڑ کر ایک صد کاروں کو مکمل کیا تھا۔

اگلے برس ہم نے اپنے اس کامیاب پروگرام کو ترک کر دیا اور میں نے۔ ۵ گھوڑوں کی طاقت رکھنے والی ایک بڑی کار ڈیزائن کی جس میں چھ سلنڈر لگے ہوئے تھے اور جو چلتے وقت سڑک پر اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہم چھوٹی کاریں بھی ساتھ ساتھ بناتے رہے لیکن ۱۹۰۷ء کی بھگدڑ اور دہشت کے مارے اور زیادہ قیمتی کاروں کی طرف توجہ دینے کی وجہ سے ہماری بکنے والی کاروں کی تعداد گھٹ کر ۶۳۹۸ رہ گئی۔

ہمیں تجربہ کرتے ہوئے ۵ سال گزر چکے تھے۔ کاریں یورپ میں بھی بکنی شروع ہو گئی تھیں۔ اُس وقت جتنے لوگ بھی موٹر کار اور گاڑیوں کی تجارت کرتے تھے ان سب میں ہمارا کام اوّل درجہ پر مانا جاتا تھا ہماری پاس

بہتیرا روپیہ جمع ہوگیا تھا بلکہ عملی طور پر ہمارے پاس کام شروع کرنے سے ایک سال کے بعد سے لے کر ہمیشہ
کی لہر بہر رہی ہے۔ ہم مال نقد داموں پر بیچا کرتے تھے۔ کبھی قرض نہیں لیا اور ہم خود خریدار کے ہاتھ سیدھا بیچ
ہماری کسی کی طرف ڈوبنے والی رقم نہ رہتی تھی اور ہم کبھی بھی اپنی حیثیت سے بڑھ کر قدم نہیں مارتے تھے
ہمیشہ اپنی آمدنی کے اندر خرچ کیا۔ اس وجہ سے مجھے روپیہ کی کبھی کمی نہیں رہی کیونکہ اگر ایک آدمی سچے دل کے
پبلک کی خدمت کرنے کی نیت سے کام کرتا ہے تو اس کی آمدنی ہمیشہ لازمی طور پر جس تیزی سے بڑھتی
جائے گی اتنی ہی جلدی وہ اسے خرچ کر کے ہرگز ختم نہیں کر سکتا۔

ہم نے آرڈر حاصل کرنے کے لئے اپنے ایجنٹوں کو مقرر کرنے میں خاص احتیاط سے کام لیا۔ پہلے پہل
اچھے ایجنٹ حاصل کرنے میں کافی دقت اٹھانی پڑی تھی۔ کیونکہ موٹر کار اور گاڑیوں کی تجارت کو کوئی پکا کام نہیں سمجھا جاتا
تھا۔ ہر شخص کا یہی خیال تھا کہ موٹر کار اور گاڑیاں صرف عیش کا سامان ہیں۔ خیر ہم نے اچھے سے اچھے آدمی جو مل
سکتے تھے چن کر اپنے ایجنٹ مقرر کئے اور ان کو اتنی بڑی تنخواہیں دینی شروع کر دیں کہ اگر وہ کسی اور کام میں
تو اس قدر روپیہ کمانے کی وہ ہرگز امید نہ کر سکتے تھے۔ شروع میں یہ تنخواہوں کی رقم بہت بڑی نہ تھی۔ ہم
دیکھ رہے تھے کہ ہمیں کس ڈھنگ سے آگے بڑھنا چاہیئے۔ اور جب ہم نے سب طرف سے غور
کر کے اپنے لئے ایک راستہ مقرر کر لیا تو پھر ہم نے پبلک کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے پر زور دینا شروع
کر دیا۔ چنانچہ ہم اپنے ہر ملازم اور ایجنٹ کو اس کی نسبت سخت تاکید کرتے رہتے تھے اور اس بات کا خیال
دھیان رکھتے تھے کہ وہ اس قاعدہ پر سختی کے ساتھ عمل کرتے رہیں۔

ہم نے ایک ایجنٹ میں جن صفتوں کا ہونا لازمی قرار دیا تھا ان میں سے چند یہ ہیں:-

۱۔ ہمیشہ ترقی کرنے کی سچی لگن کا ہونا۔ اپنی لائن میں زمانے کی رفتار سے پورے طور پر واقف ہونا
اور اس امر کا علم ہونا کہ ابھی اس کام کے بڑھنے کی بہت گنجائش ہے۔

۲۔ کام کرنے کے لئے مناسب جگہ مقرر کرنا۔ جو صاف ستھری ہو اور دیکھنے میں شاندار معلوم ہو۔

۳۔ موٹر کار اور گاڑیوں کے حصوں اور پرزوں کا کافی اسٹاک رکھنا تا کہ ضرورت پڑنے پر ردی یا بیکار
ہوئے حصوں اور پرزوں کو نکال کر ان کو فوراً ان کی جگہ لگا دیا جائے اور اپنے علاقے میں جتنی بھی فورڈ
موجود ہوں ان سب کو چالو حالت میں رکھنا۔

۴۔ ایک ورکشاپ کا ہونا جس میں ضروری مرمت اور ادلا بدلی کرنے کے لئے ہر قسم کی مناسب مشینیں ہوں

ور سامان کافی تعداد میں ہمیشہ موجود رہتا ہو۔

۵۔ کل شاستر کا علم ہونا تاکہ ان کو فورڈ کار کے پرزوں اور بناوٹ سے پوری پوری واقفیت ہو۔

۶۔ بہی کھاتہ رکھنا اچھی طرح سے جاننا اور اپنے پرانے نئے اور آگے کو بننے والے خریداروں کی ہمیشہ مکمل فہرست تیار رکھنا تاکہ جب چاہیں فوراً پتہ لگ سکے کہ اُس کے کاروبار کے ہر ایک مدّ کی مالی حالت کیا ہے، کس ماڈل کی کتنی کاریں اسٹاک میں اس وقت موجود ہیں اور ان کی کیا حالت ہے۔ ہماری کاروں کے موجودہ مالکوں کے کیا نام ہیں اور آئندہ کن کن شخصوں کے ہاتھ ہماری کاروں کے بکنے کی اُمید ہے۔

۷۔ اپنی دوکان میں ہر جگہ اور ہر مدّ میں پوری صفائی رکھنا۔ یعنی کھڑکیوں کے شیشوں پر گرد و غبار کو کبھی جمنے نہ دینا اور نہ دروازوں کے تختوں کو میلے کچیلے رکھنا۔

۸۔ دوکان کے باہر اپنے مال کی نمائش کا کوئی عمدہ نمونہ یا اشتہار لگانا جو پبلک کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکے۔

۹۔ کاروبار میں لوگوں کے ساتھ اس طرح سے برتاؤ کرنا کہ اپنی ایمانداری اور ساکھ کے نام کو کبھی بٹہ نہ لگے۔

اس سلسلہ میں ہم نے جو عام ہدایت جاری کی تھی یہ ہے:-

ہمارے ہر سوداگر اور ایجنٹ کو ایک ایسی فہرست اپنے پاس ہمیشہ تیار رکھنی چاہئے جس میں اس کے علاقہ کے اُن تمام آدمیوں کے نام درج ہوں جن کے ہاتھ ہماری کار فروخت ہونے کی کچھ اُمید ہو۔ اور اس میں اُن لوگوں کے نام بھی لکھے جا دیں گے جو ایک کار خریدنے کے قابل تو ہیں مگر جن کا اس طرف کبھی دھیان نہیں گیا۔ پھر اگر ممکن ہو سکے تو وہ اس فہرست کے ہر شخص سے جا کر خود ملے یا کم سے کم خط و کتابت ضرور کرے۔ اور اُس کے متعلق اس فہرست میں رپورٹ درج کرے کہ اُس نے کیا کہا۔ اور اس کی جگہ کار خریدنے کے بارے میں کیا رائے ہے۔ اگر ایک سوداگر یا ایجنٹ اپنے علاقہ کی نسبت یہ اطلاع مکمل طور پر حاصل نہیں کر سکتا تو سمجھنا چاہئے کہ اُس کے پاس جتنا علاقہ کہ وہ سنبھال سکتا ہے اُس سے زیادہ ہے۔

ہم نے اپنے لئے جو راستہ تجویز کیا تھا اُس پر چلنا اتنا آسان نہ تھا۔ ہماری کمپنی کے خلاف ایک بڑا مشہور مقدمہ اس غرض سے کھڑا کر دیا گیا تاکہ ہمیں خوب تنگ کر کے موٹر کار اور گاڑیوں کے بنانے والوں

کی ایک ایسی ایسوسی ایشن کے قاعدوں کے مطابق کام کرنے پر زبردستی مجبور کیا جائے جو اس جھوٹے
پر چل رہی تھی کہ موٹر کار اور گاڑیوں کے بیوپار کی مارکیٹ بہت معمولی ہے اس لئے اس کا کل
بن کر سارا بیوپار اپنے ہاتھ تلے رکھنا نہایت لازمی ہے۔ یہ وہی مقدمہ ہے جو پیچھے جا کر مقدمہ سیلڈن
کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ اس مقدمہ کے دوران میں ہمیں پیروی کرنے کے لئے کئی مرتبہ روپیہ اکٹھا کر
خاطر بہت پریشانی اٹھانی پڑی تھی لیکن مسٹر سیلڈن کا جن کی ابھی حال میں ہی موت ہوئی ہے کوئی
نہ تھا۔ یہ سب کارروائی کرنے والی وہ ایسوسی ایشن تھی جو اس پیٹینٹ کے ماتحت اس تجارت کی کل
ٹھیکہ دار بننا چاہتی تھی۔

اس مقدمہ کے حالات یوں ہیں :- بہت عرصہ پہلے یعنی ۱۸۷۹ء میں ایک شخص نے جس کا نام
بی سیلڈن تھا جو ٹریڈ مارک اور پیٹینٹ کام کرنے والا وکیل تھا ایک درخواست پیٹینٹ حاصل کرنے کے
گورنمنٹ میں دی تھی جس کا منشا اس درخواست میں یہ درج کیا گیا تھا "سڑک پر چلنے والا ایک سستا
سادہ لوکوموٹو (انجن) تیار کرنا جس کے چلانے میں کسی قسم کا خدشہ نہ ہو۔ جو وزن میں ہلکا ہو جس سے کام
آسان ہو۔ اور جو چھوٹی موٹی چڑھائی اُترائی میں بھی کام دینے کی اپنے اندر طاقت رکھتا ہو" یہ درخواست
پیٹینٹ محکمہ میں کئی قانونی کارروائیوں کے ذریعہ جو بالکل جائز تھیں ۱۸۹۵ء میں پیٹینٹ کو منظور ہونے تک چلتی رہی جب یہ درخواست
کی گئی تھی اس وقت عام پبلک نے اچھی طرح سے آٹو موبائل (موٹر کار اور گاڑیوں) کا نام بھی نہیں
لیکن جب یہ پیٹینٹ منظور ہوا۔ اُس وقت تک لوگ اس قسم کی خود بخود چلنے والی کار اور گاڑیوں سے
واقف ہو چکے تھے اور ایسے آدمیوں کی ایک بھاری تعداد کو جو کئی سالوں سے موٹر کی طاقت سے کار
کو کھینچنے کے تجربے کر رہے تھے اور جن میں میں بھی شامل تھا۔ یہ سُن کر بہت اچنبھا ہوا تھا کہ جس کام کو
عملی شکل پہنائی ہے اس کے متعلق کسی دوسرے آدمی کی بہت مدت پہلے درخواست گزری ہوئی ہے
درخواست دینے والے نے ابھی تک اسے محض اپنے دماغ کے اندر ہی رکھا ہوا تھا۔ اور اس کو عملی جامہ
دیکھنے کے لئے رتی بھر بھی کوشش اب تک نہ کی تھی۔

اس پیٹینٹ کے ماتحت جو مطالبہ کئے گئے تھے اُن کو چھ قسموں میں تقسیم کیا گیا تھا اور میری
میں ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس کی بابت ۱۸۷۹ء میں جب یہ درخواست دی گئی تھی
جا سکتا ہو کہ سچ مچ یہ ایک نیا خیال ہے پیٹینٹ دفتر نے مختلف حصوں یا پُرزوں کے کچھ جوڑ کو د

تسلیم کرلیا اور فیصلہ دیدیا کہ اوّل ایک گاڑی کا اپنی اندرونی مشینری کے ساتھ اور دوسرے گھمانے والے پہیئے کا گاڑی کو دھکیل کر چلانے والے پُرزوں سے مُتّحد۔ اور دانتے والے پہیئے کے ساتھ میل جول ہونے اور تیسرے اس کے علاوہ انجن ہونے کی وجہ سے یہ پیٹینٹ بالکل جائز اور واجب ہے۔

مگر ہمیں ان سب باتوں سے کچھ واسطہ نہ تھا مجھے پکّا یقین تھا کہ جو سیلڈن کی اسکیم تھی اُس سے میرا انجن بالکل مختلف ہے۔ ہماری لائن کے جو کارخانہ دار اُس پیٹینٹ کے ماتحت کام کرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو لائیسنس دار بیان کرتے تھے اُن کے زبردست گٹھ (ایسوسی ایشن) نے جیوں ہی ہماری کریٹ میں تھوڑی بہت مشہوری ہوئی ہمارے خلاف یہ مقدمہ ٹھونک دیا۔ یہ مقدمہ مدت تک چلتا رہا۔ اس کی غرض صرف یہ تھی کہ ہم میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں مگر ہم بھی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۰۹ء کو جب جج ہونے یونائیٹڈ اسٹیٹ ضلع کچہری میں ہمارے خلاف فیصلہ سنایا ہم پہ پہلی بار زبردست وار ہوا۔ اس فیصلے کے ملتے ہی فوراً ہی لائیسنس داروں کی اس ایسوسی ایشن نے لوگوں کو ہمارے خلاف خوب بھڑکانا شروع کر دیا تاکہ آئندہ کسی کو ہماری کاریں خریدنے کا حوصلہ نہ پڑے سنہ ۱۹۰۳ء میں ہم پر جب یہ دعوے دائر ہوا تھا تب بھی اُنہوں نے اس اُمید سے اسی قسم کی کارروائیاں کی تھیں شائد ڈر کر ہم یہ کام چھوڑ بیٹھیں گے لیکن مجھے یہ پختہ یقین تھا کہ مقدمہ میں آخر جاکر ہماری ہی فتح ہوگی۔ میں جانتا تھا کہ ہم بالکل سچے ہیں لیکن پہلی عدالت میں مقدمہ کا ہمارے خلاف فیصلہ ہوجانے سے واقعی ہم پر گہری چوٹ پڑی چونکہ ہمیں یہ فکر ہوگیا کہ گو ہمارے نام کوئی مال کو بیچنے سے روک دینے کا حکم جاری نہیں ہوا تھا تو بھی یہ فیصلہ سُن کر بہت سے لوگ اس خوف کے مارے ہماری کاریں خریدنے سے باز رہیں گے کہ اس خریداری کے "جرم" میں اُن کے خلاف بھی مقدمے نہ چل پڑیں۔ لوگوں میں یہ مشہور کیا گیا کہ اگر سب سے بڑی عدالت میں جاکر مقدمہ ہمارے خلاف فیصلہ ہوگیا تو پھر سب فورڈ کار رکھنے والوں کا چالان ہوگا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے دشمنوں میں سے جو چند بہت تیز تھے چوری اور چھپ کر یہ افواہ پھیلانی شروع کردی تھی کہ ہر فورڈ کار خریدنے والے کو جیل خانے کی ہوا ضرور کھانی پڑے گی۔ ہم نے اس قسم کی افواہوں کا اثر دور کرنے کی غرض سے ایک زبردست اشتہار نکالا جو ہم نے ملک کے تمام بڑے بڑے اخباروں کے چار صفحوں پر چھپوایا ہم نے اُس میں اس مقدمہ کا سارا حال کھول کر بیان کیا اور یہ بھی ظاہر کیا کہ ہمیں مقدمہ جیتنے کی پکّی اُمید ہے چنانچہ ہم نے ان لفظوں کے ساتھ اشتہار کے مضمون کو ختم کیا:-

اگر ہمارے دشمنوں کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈر کر کوئی شخص ہماری کار خریدنے سے ہٹ رہا ہو تو اُس کی تسلی کے لئے ہم اعلان کرتے ہیں کہ جو لوگ ہماری کار خریدیں گے اُن پر اگر کسی قسم کی آفت آئے گی تو ہم اُن کی مدد کرنے اور اُن کو بچانے میں اپنی کمپنی کی جائداد اور سرمایہ میں سے اٹھارہ کروڑ روپیہ تک خرچ کر دینے کو تیار ہیں اور ہم اپنی کار کے ہر خریدار کو ایک تمسک الگ لکھ کر دیں گے کہ اگر اُس کا کچھ نقصان ہوگا تو ہم اٹھارہ کروڑ روپیہ تک اُس کا ہرجہ اس کے علاوہ اپنی ذاتی جائداد سے پورا کرنے کی شرط کرتے ہیں گویا فورڈ کار کے ہر خریدار کو یہ ایک گارنٹی ملے گی کہ جب تک کمپنی کا ۳۶ کروڑ روپیہ ختم نہیں ہو جاتا تب تک وہ لٹیرے جو اس نرالی صنعت کے کل مختار ٹھیکہ دار بن کر اس پر پورا قبضہ جمانا چاہتے ہیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے

ہماری کار خریدنے پر یہ گارنٹی اور تمسک آپ کی خدمت میں فوراً پیش کر دیا جائے گا اس لئے اُن لوگوں کے پھندے میں نہ آیئے جو اپنے آپ کو خدا سمجھ کر من مانی کارروائیاں کر رہے ہیں اور نامناسب اونچی قیمتوں پر گھٹیا کاریں بیچ کر پبلک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا چاہتے ہیں۔

نوٹ:۔ فورڈ موٹر کمپنی یہ مقدمہ دُنیا کے تمام قابل سے قابل پیٹنٹ کے وکیلوں کی صلاح اور مشورہ کے مطابق لڑ رہی ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ اس تمسک اور گارنٹی سے خریداروں کی تسلی ہو جائے گی اور دشمنوں کے پروپیگنڈا کی وجہ سے مارکیٹ میں جو ہمارا اعتبار اُٹھ گیا ہے وہ پھر سے جم جائے گا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ ہمیں ان دونوں میں سے ایک چیز کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ ——— اس سال ہم نے اٹھارہ ہزار سے بھی زیادہ کاریں فروخت کی تھیں اور یہ تعداد پچھلے سال سے لگ بھگ دوگنی تھی۔ مگر میرے خیال میں شاید پچاس کے قریب بلکہ اس سے بھی کم ایسے خریدار ہوں گے جنھوں نے ہم سے یہ تمسک اور گارنٹی طلب کی ہو۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس مقدمہ کی بدولت فورڈ کار اور فورڈ موٹر کمپنی کو جتنی شہرت حاصل ہوئی اتنی کسی اور ذریعہ سے نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پبلک ہمیں ظلم کا شکار سمجھتی تھی اور اس لیے لوگوں کو ہمارے ساتھ ہمدردی ہو گئی تھی۔ ایسوسی ایشن کے فنڈ میں اُس وقت ۲ کروڑ دس لاکھ روپیہ جمع تھا۔ ہمارے پاس شروع میں ایک لاکھ روپیہ بھی پورا نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ مجھے اپنے کامیاب ہونے کی نسبت کبھی بھی شک نہ تھا۔ لیکن پھر بھی سر پر اس تلوار کے لٹکتے رہنے سے ہماری جان سدا نکلتی رہتی تھی

میں سمجھتا ہوں کہ اس مقدمہ کو لڑنے سے بڑھ کر امریکہ کے بیوپاریوں کے کسی کٹھ نے آج تک اتنی بڑی حماقت نہیں کی۔ اگر اس پر ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ چند لوگوں کا آپس میں مل کر نادانی سے ایک بیوپار کو ہلاک کر دینے کی ایک نہایت بڑھیا مثال ہے میں ملک میں موٹر کار اور گاڑیاں بنانے والوں کے لئے یہ ایک نہایت نیک شگون سمجھتا ہوں کہ آخر میں جا کر یہ مقدمہ ہمارے حق میں فیصلہ ہو گیا اور یہ بیوپار اس نمائشی ایسوسی ایشن کے چنگل سے نکل گیا۔ تو بھی اس مقدمہ کے دوران میں ہی ۱۹۰۸ء میں ہم یہ اعلان کرنے کے قابل ہو گئے کہ جس قسم کی کار بنا کر ہم مارکیٹ میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس کو بنانا ہم نے شروع کر دیا ہے۔
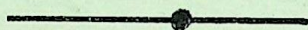
بیان چوتھا

مال تیار کرنے اور خدمت کرنیکا بھید

یاد رہے کہ فورڈ موٹر کمپنی کی ترقی کی کہانی کو تفصیل سے بیان کرنے میں میری کوئی ذاتی غرض نہیں اور سب لوگوں کو میں یہ نصیحت نہیں دینا چاہتا کہ تم بھی میری نقل کرو۔ ہاں اس بات کو لوگوں کے دل پر ضرور بٹھانا چاہتا ہوں کہ موجودہ عام طریقہ بیوپار کرنے کا سب سے بہتر طریقہ ہرگز نہیں ہے میں اب آپ کو یہ سنانا چاہتا ہوں کہ کس طرح سے میں نے بیوپار کے موجودہ عام طریقہ کو بالکل ترک کر دیا۔ اور اصل پوچھو تو یہیں سے ہماری بے نظیر کامیابی کی شروعات ہوتی ہے۔

ابھی تک ہم بھی پُرانے موجودہ عام طریقہ سے اپنا کاروبار چلا رہے تھے۔ دوسرے کارخانوں کی بنی ہوئی موٹروں کی نسبت ہماری موٹر کی مشین کم پیچیدہ تھی۔ اور ہماری کمپنی میں کسی باہر کے آدمی کا روپیہ لگا ہوا نہ تھا۔ بس ان دو باتوں کو چھوڑ کر دوسری موٹر کمپنیوں سے اور کسی لحاظ سے لمبا چوڑا فرق نہ تھا۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ ہم دوسروں کی نسبت زیادہ کامیاب ہو گئے تھے۔ اپنی ضرورت کے تمام مصالحے اور مال نقد دام ادا کر کے سستے سے سستے بھاؤ پر خرید لیا کرتے تھے۔ اور ہمیشہ ہاتھ میں کافی روپیہ پیسہ رکھتے تھے۔ ہم اپنی کاریں ہر موٹر دوڑ میں مقابلہ پر دوڑایا کرتے تھے۔ خوب اشتہار دیتے تھے۔ اور اپنی بکری بڑھاتے تھے ایک تو ہماری کار کی بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کی بناوٹ نہایت سادہ تھی لیکن دوسروں کی کاروں سے ہماری کار کے ڈھانچے کی تجویز میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ ہماری کار میں کوئی ایسی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی جسکی وجہ سے اس کو محض "تفریحی کار" کہا جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ مارکیٹ میں دوسری کاروں کی طرح ہماری کار

سے بھی پورا لطف اور مزہ اُٹھایا جا سکتا تھا۔ مگر ہم نے کار کا ڈھانچہ تجویز کرتے وقت صرف تفریح کی خاطر کوئی سامان یا پُرزہ لگانے یا نہ لگانے کا قطعی کبھی خیال نہیں کیا۔ البتہ اگر کوئی خریدار اپنے لئے کوئی خاص چیز یا سامان کار میں لگوانا چاہتا۔ تو شاید ہم اُس کے علحدہ دام چارج کر کے سپیشل کار بھی بنا کر دے سکتے تھے ہماری کمپنی خوب روپیہ کما رہی تھی۔ اس لئے ہم مزے کے ساتھ یہ کہہ کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ سکتے تھے کہ "بس بھیّا! جتنی آج تک ترقی کر لی ہے اُتنی ہی بہت ہے۔ اب اس سے اور آگے بڑھنے کی بالکل کوئی ضرورت نہیں"۔

سچ پوچھو تو اُس وقت اس قسم کا تھوڑا بہت لالچ آ بھی گیا تھا جب ہم نے روز کی ایک سو کاریں بالکل تیار کر کے نکالنی شروع کر دیں۔ تو ہماری کمپنی کے کئی حصہ دار بہت چونک اُٹھے اور سخت پریشان ہو گئے۔ ان کو اب اس فکر نے گھیر لیا کہ کونسا ذریعہ یا ترکیب استعمال کریں جس سے مجھے کمپنی کو یوں بربادی کے گڑھے میں دھکیلنے سے باز رکھا جا سکے جب میں نے اُن کو اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ روز کی ایک سو کار تو کوئی چیز نہیں۔ میں تو بہت جلد ایک ہزار کاریں روز کی تیار کر کے مارکیٹ میں دینے کا ارادہ کر رہا ہوں تو یہ سُن کر اُن کی گویا جان نکل گئی۔ اور مجھے پتہ لگا ہے کہ انہوں نے تب یہ پختہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے عدالت کے ذریعہ اس حرکت سے روکا جائے۔ میرے ساتھی حصہ داروں کی کثرت رائے میرے خلاف تھی۔ اور اگر میں ان کی بات مان لیتا تو جیسے اُس زمانہ میں بیوپار ہو رہا تھا اُسی ڈھنگ اور وطیرے سے میں اپنا کاروبار بھی چلنے دیتا۔ یعنی اپنے عملہ اور دفتروں کی شان بان میں عالی شان اور اونچی اونچی عمارتیں کھڑی کرنے میں کمپنی کا روپیہ اُڑا دیتا۔ اور ہمارے ساتھ مقابلہ کرنے والی دوسری کمپنیوں سے جن سے ہمیں یہ خطرہ تھا کہ وہ ہمیں پچھاڑ دیں گی۔ رضی نامہ کر لیتا۔ یا تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد نئی نئی قسم کی کاریں بنا کر پبلک کے سامنے پیش کرتا رہتا تاکہ لوگ ہماری جانب جھکے رہیں۔ غرضیکہ میں اس قسم کی سب حرکتیں اور کام کرتا ہوا ایک شریف عزت دار شہری کا رتبہ حاصل کر لیتا جس کا کاروبار بھی شریف اور عزت دار ہے۔

انسان میں یہ ایک قدرتی خاصہ ہے کہ جو کچھ اُس کے پاس ہوتا ہے وہ اُسی پر صبر و قناعت کر کے بیٹھ جانے میں بہت خوش ہوتا ہے۔ ہر آدمی کا دل یہ چاہتا ہے کہ اُس کو کام کاج کرنا نہ پڑے۔ اور اسکا بنا ہاتھ پاؤں ہلائے مزے سے روٹی کپڑا پورا پورا ملتا رہے۔ میرے اندر کبھی اس قسم کی خواہش پیدا نہیں ہوئی۔ مگر میں من ہی من میں یہ اندازہ ضرور لگا سکتا ہوں کہ یہ خواہش کیا ہوتی ہے۔ گو میرا اپنا یہ خیال ہے کہ

جو شخص خود کام نہ کر کے آرام کی زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے اُس کو چاہیئے کہ اپنے کاروبار سے پھر قطعی تعلق نہ رکھے۔ مگر عام طور پر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ ویسے تو انسان اپنے دماغ اور ہاتھ سے کام میں حصہ لینا چھوڑ کر آرام کی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ لیکن ساتھ میں یہ بھی ضرور چاہتا ہے کہ تب بھی اُس کے کام کاج میں حکومت اُسی کی پہلے کی طرح چلتی رہے۔ مگر میں نے اپنے لئے جو سکیم تجویز کر رکھی تھی اُس میں اس قسم کی قطعی گنجائش نہ تھی۔ میں اپنی ترقی کو آئندہ پہلے سے بھی زیادہ اور بہتر کام کر کے دکھانے کا سگنل سمجھتا تھا۔ یا یوں کہیے کہ میں اسے ایک ایسے مقام پر پہونچ جانے کی نشانی سمجھتا تھا۔ جہاں سے ہماری پبلک کی سچی خدمت کرنی شروع ہوتی ہے۔ میں ان تمام سالوں میں ہر روز ایک ایسی کار نکالنے کی فکر میں ڈوبا رہتا تھا۔ جو ہر خاص و عام کے بڑے فائدے کی چیز ہو۔ مارکیٹ میں جتنی قسم کی ماڈلوں کی کاریں چل رہی تھیں۔ پبلک ان سے بیزار ہو رہی تھی۔ پائیداری موٹر دوڑ اور کچی پکی سڑکوں پر ان کاروں سے کام لینے سے ہمیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ کاروں میں کس قسم کی اور کیا کیا تبدیلیاں کرنے کی اس وقت ضرورت ہے۔ سنہ ۱۹۰۵ء سے کچھ پہلے ہی میں نے اپنے دل میں یہ نقشہ قائم کر لیا تھا کہ میں کس قسم کی کار بناؤں گا مگر ابھی تک میرے ہاتھ ایسے سامان اور دھات وغیرہ نہ لگے تھے۔ جو مضبوط تو خوب ہوں مگر وزن میں ہلکے ہوں۔ مگر محض اتفاق سے مجھے ان کا پتہ چل گیا۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں مقام پام بیچ پر ایک موٹر دوڑ ہو رہی تھی جس کو میں دیکھنے چلا گیا۔ وہاں پر ایک بھاری حادثہ ہونے کی وجہ سے ایک فرنچ کار بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اس موٹر دوڑ میں ہم نے اپنی بہت طاقتور ۶ سلنڈر والی ماڈل K کار مقابلہ میں شامل کی ہوئی تھی۔ میرا خیال تب تک یہ تھا۔ کہ بدیسی کاروں کے پرزے ہمارے پرزوں کی نسبت سائز میں بہت چھوٹے اور کوالٹی کے لحاظ سے بہتر ہوں گے۔ چنانچہ اُس حادثہ کے بعد گھومتے پھرتے میں نے زمین پر گرا ہوا ایک چھوٹا ڈھبنی کی ڈنڈی کا ٹکڑا پایا۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس دھات کا بنا ہوا ہے مگر کوئی نہیں بتا سکا۔ میں نے اپنے نائب کو وہ ٹکڑا دے کر ہدایت کی کہ وہ اس کے متعلق پوری تحقیقات کر کے سراغ لگائے کیونکہ اسی قسم کی دھات کو ہماری کاروں میں استعمال کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

آخر کار میرے نائب نے پتہ ڈھونڈ نکالا کہ یہ ایک فرنچ فولاد ہے۔ اور اس میں ونا ڈیم کا جُز ہے۔ ہم نے امریکہ کے ہر کارخانہ فولاد میں بہت کوشش کی۔ مگر ایک بھی یہ ونا ڈیم فولاد نہ بنا سکا۔ میں نے

انگلینڈ سے ایک ایسے آدمی کو بلوایا جس کو تجارتی پیمانہ پر یعنی خرچ میں کفایت سے بڑھیا اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں یہ وناڈیم فولاد بنانے کی ترکیب آتی تھی۔ اب اتنی کمی اور باقی رہ گئی کہ اس فولاد کو بنانے کے لئے کہیں سے مشینری حاصل کی جائے۔ یہ بھی ایک ٹیڑھا سوال تھا۔ وناڈیم تین ہزار ڈگری فارن ہیٹ پر تیار ہوتا ہے۔ عام بھٹیوں کا تاؤ ستائیس سو ڈگری فارن ہیٹ سے اوپر نہیں چڑھتا۔ تلاش کرتے کرتے میں مجھے پتہ چلا کہ اوہاؤ کے پرگنہ میں مقام کینٹن میں فولاد بنانے والی ایک معمولی چھوٹی کمپنی ہے۔ میں نے اُس کے مالکوں کو یہ پیشکش کی کہ وہ ہمارے لئے وناڈیم بنا دیں۔ اور اگر اس وجہ سے بھٹی کو تیز تاؤ پر چلانے کے سبب ان کا جتنا ہرجہ و نقصان ہو گا تو وہ سب میں اپنی گرہ سے دینے کو تیار ہوں۔ وہ یہ بات مان گئے۔ پہلی مرتبہ ہمیں ناکامیابی ہوئی۔ اور فولاد میں وناڈیم بہت کم بچا۔ میں نے ان کو دوبارہ کوشش کرنے کو کہا۔ اس بار فولاد بالکل ٹھیک بن کر نکلا۔ ابھی تک ہمیں مجبوراً اُس فولاد سے گزارہ کرنا پڑتا تھا جو اپنے اندر زیادہ سے زیادہ ساٹھ اور ستر ہزار پونڈ کے درمیان کھنچاؤ کی طاقت رکھتا ہو لیکن وناڈیم کے استعمال سے یہ طاقت بڑھ کر ایک لاکھ ستر ہزار پونڈ تک پہنچ گئی۔

جب وناڈیم بنانے میں ہم کامیاب ہو گئے تو میں نے اپنے تمام ماڈلوں کو بالکل کھول کر پورے غور اور تفصیل سے یہ جانچنا شروع کر دیا۔ کہ ان کے ہر ایک پُرزے اور ٹکڑے کے واسطے کس قسم کی فولاد یعنی سخت ملائم یا لچکدار درکار ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم سے پہلے بھاری تعداد میں مال تیار کرنے والی کسی بڑی کمپنی نے آج تک فولاد کی بالکل ٹھیک کوالٹی جانچنے کے لئے اس قسم کی سائنس کے اصولوں کے مطابق گہری تحقیقات نہیں کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنی کاروں کے پُرزوں اور ٹکڑوں کے واسطے بیس قسم کے مختلف فولاد چُنے ان میں سے دس کے قریب وناڈیم تھے۔ جہاں کسی پُرزے یا ٹکڑے کو مضبوط مگر وزن میں ہلکا رکھنا درکار ہوتا تھا وہاں پر ہم وناڈیم استعمال کرتے تھے۔ لیکن خیال ہے کہ ہر جگہ ایک ہی قسم اور درجہ کا وناڈیم استعمال نہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ہم اس امر کا بھی لحاظ رکھتے تھے کہ کام میں آتے وقت اس پرزہ پر کتنا زور پڑے گا۔ اور کس قدر گھسے گا۔ اور آیا کہ یہاں پر لچک دینے کی ضرورت ہے یا نہیں غرضیکہ جیسی اور جتنی ضرورت ہوتی تھی اُسی انداز سے اُس میں وناڈیم کی مقدار اور کوالٹی مقرر کی جاتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ان تجربوں سے پہلے موٹریں اور کاریں بنانے میں صرف چار مختلف درجوں کے فولاد استعمال میں لائے جاتے تھے۔ لگاتار تجربے کرتے ہوئے۔ خاص کر بھٹی کا تاؤ بڑھانے کے سلسلہ میں۔ ہم فولاد کی طاقت کو اور بھی

زیادہ بڑھانے اور اس وجہ سے کاروں کا وزن اور بھی ہلکا بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں وز
کے محکمہ کامرس اور انڈسٹری نے ہماری کاروں کی موٹر چلانے والے پہئے کو حرکت میں لانے والی ڈنڈے
شکل کی زنجیر کو تجربہ کرنے کی غرض سے یہ فیصلہ کر لینے کے بعد چُنا۔ کہ ہر کار کا سب سے ضروری اور بنیادی حص
یا پُرزہ یہی ہوتا ہے اور اس کو فرانس کی بنی ہوئی بہتر سے بہتر کاروں سے اسی قسم کی ایک زنجیر کے مقابلہ پر رکھ کر
جانچ پڑتال کی۔ اور ہر جانچ اور تجربہ میں ہمارا فولاد زیادہ مضبوط اور طاقتور پایا گیا۔

وناڈیم فولاد کے استعمال کرنے سے ہماری کاریں وزن میں بہت ہلکی ہوگئیں۔ مقبول عام اور امیر و
سب کے یکساں فائدہ کی کار کے دوسرے پُرزوں اور ٹکڑوں کی بابت میں دل میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا
اور ان میں سے بہترین تجویزوں کو میں اب تک عملی جامہ بھی پہنا چکا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ کار کے ڈھانچے (ڈیزائن)
میں تمام ٹکڑے اور پُرزے ایک دوسرے کے پورے مددگار اور تناسب سے ہونے چاہئیں۔ انسان کے
مرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُس کے جسم کا کوئی حصہ بالکل ناکارہ ہو جاتا ہے۔ عین یہی حالت مشینوں کی ہے
اور جب اُن کے کچھ حصے اور پُرزے دوسرے حصوں اور پُرزوں کی نسبت کمزور یا ڈھیلے پڑ جاتے ہیں تو وہ
چلنے اور کام کرنے سے بالکل رہ جاتی ہیں۔ اس لیئے یہ مقبول عام کار کا ڈھانچہ تجویز کرتے وقت یہ احتیاط رکھنی
لازمی تھی۔ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اس کے تمام حصے اور پرزے اپنے اپنے کام اور ضرورت کے مطابق ایک جیسے
مضبوط ہوں تا کہ کار تو معمولی داموں میں تیار ہو جائے۔ مگر ضرورتیں سب پوری کرنے والی ہو اس کے علاوہ اس
یہ بھی خوبی ہونی چاہئے۔ کہ اگر اس کو ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور ہچکولے دینے والے رستوں پر چلایا جائے۔ یا غلط طریق
سے چلایا جائے تو بھی یہ بگڑنے نہ پائے اور خراب نہ ہو۔ یہ ذرا مشکل بات تھی کیونکہ گیسولین موٹر لازمی طور پر ایک بڑی
نازک مشین ہوتی ہے۔ اور جو چاہے اس کو بڑی آسانی سے بگاڑ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے یہ ٹھان لی کہ جب کوئی
میری کار بگڑے گی تو میں فوراً یہ مان لوں گا کہ ایسا میری غلطی اور نالائقی کی وجہ سے ہوا ہے۔

جس دن سے میری پہلی کار تیار ہو کر مارکیٹ میں آئی۔ تب ہی سے مجھ پہ ظاہر ہو گیا تھا کہ کار کے
اندر ان خوبیوں کا ہونا نہایت لازمی ہے۔ جب ایک بار میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی اور مجھے اس کا
یقین ہو گیا تو پھر مجھے صرف ایک ہی لگن تھی۔ کہ میں ایک ایسی کار بنا کر چھوڑوں گا جو عام خلقت کی ضرورتوں
کو پورا کر سکے بس اس کے بعد میری تمام توجہ اور کوشش لگاتار ایک ہی قسم کی کار یعنی صرف ایک ماڈل کی کار
تیار کر کے مارکیٹ میں دینے کی طرف لگی رہی۔ اور آج بھی اسی طرف لگی ہی ہے۔ اور جوں جوں سال گزرتے

جاتے ہیں۔ میں اس فکر میں رات دن رہتا ہوں۔ کہ آج سے کل اور کل سے پرسوں میری یہ کار اور بھی عمدہ اور بہتر بنے۔ اور ساتھ ہی اسی تناسب سے اس کی قیمت کم کرتا چلا جاؤں۔ اس مقبول عام کار کے اندر نیچے لکھی ہوئی خوبیوں کا ہونا لازمی تھا۔

(۱) تمام ساز و سامان وھات وغیرہ اوّل درجہ کی کوالٹی کے ہونے چاہئیں۔ تاکہ کار پائیدار ہو۔ اور عرصہ تک عمدہ کام دے سکے۔ ونا ڈیم فولاد تمام فولادوں میں سب سے زیادہ مضبوط۔ ملائم اور پائیدار ہے۔ یہی ہماری کاروں کی بنیاد اور عمدہ بناوٹ کی جان ہے۔ اگر قیمت کا خیال نہ کیا جائے تو اس لحاظ سے ونا ڈیم دنیا کا سب سے بہتر اور بڑھیا فولاد ہے۔

(۲) کار کو چلانے کا سادہ طریقہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ عام طور پر لوگ مشینوں کی بناوٹ اور اُن کو چلانے کے طریقوں سے واقف نہیں ہوتے۔

(۳) کار کا انجن کافی طاقت پیدا کرنے والا ہونا چاہیئے۔

(۴) کار ہر لحاظ سے پوری معتبر چیز ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اس سے کئی قسم کے کام لئے جاویں گے اور اس کو ہر طرح کی سڑکوں اور راستوں پر استعمال کیا جاوے گا۔

(۵) وزن کا ہلکا ہونا۔ فورڈ کی کاریں جب چلتی ہیں تو اُن کے پسٹن کو فی مکعب انچ حرکت کرتے ہوئے صرف ۹۵ء۷ پونڈ کے حساب سے گاڑی کا وزن کھینچنا پڑتا ہے۔ اور خوبیوں کے ساتھ ایک یہ بھی بڑی بھاری صفت ہے جس کی وجہ سے ہماری کاریں کبھی نہیں بگڑتیں۔ اور ہمیشہ کام دیتی رہتی ہیں۔ خواہ آندھی جائے یا موسلا دھار بارش ہو رہی ہو ہر موسم میں اور ہر جگہ ریت۔ کیچڑ۔ دلدل۔ برف۔ ندی۔ ندلے۔ پہاڑی ٹیلوں۔ کھیتوں اور بے سڑک کے میدانوں میں یہ اُڑاتے لئے پھرتی ہیں۔

(۶) کنٹرول۔ یعنی اس کی رفتار پر ہمیشہ قابو رکھنا۔ بغیر کسی گھبراہٹ کے اور سلامتی کے ساتھ ہر نازک موقع پر اور ہر خطرہ کے مقام سے صاف بچ کر نکل جانا۔ خواہ کار شہروں کی بھیڑ میں سے گزر رہی ہو۔ یا کسی خطرناک راستہ پر چل رہی ہو۔ فورڈ کار کو چلانے میں تمام حصّوں اور پُرزوں کو ایک چال ڈھال اور رُخ میں لگانے کے سسٹم پر جو حرکت پیدا کی جاتی ہے اس سے یہ کنٹرول حاصل ہو گیا ہے۔ اور یہ کنٹرول ہر شخص کر سکتا ہے اسی لئے تو لوگوں کی زبان پر یہ چڑھ گیا ہے کہ فورڈ کار کو ہر کوئی چلا سکتا ہے۔" یہ کار ہر جگہ بڑی آسانی کے ساتھ گھمائی اور پھرائی جا سکتی ہے۔

(۷) جتنی کار وزنی ہوگی۔ قدرتی طور پر اس کے چلانے میں اُتنا ہی پیٹرول وغیرہ اور مشینری میں دینے والے
چکنے تیل اور چربی کا خرچ زیادہ ہوگا۔ اور جتنا وزن کم ہوگا۔ اُتنا ہی یہ خرچ بھی کم ہو جائے گا۔ شروع شروع میں
اکثر کہا جایا کرتا تھا۔ کہ کیونکہ فورڈ کار وزن میں ہلکی ہے اس لئے یہ ضرور نکمّی چیز ہوگی۔ مگر اب کسی میں یہ دلیل پیش
کرنے کی ہمت یا جرأت نہیں۔

جس ڈھانچہ کو بنانے کا آخر کار میں نے فیصلہ کیا اُس کا نام ماڈل ٹی (T) رکھا گیا۔ اس نئے ماڈل کی
سب سے لازمی خوبی اس کی سادگی تھی۔ اور میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اگر جیسی کہ مجھے اُمید ہے۔ یہ ماڈل چل
نکلا۔ تو میں دھڑا دھڑ اسی ماڈل کی کاریں بناؤں گا۔ اس کار کے بنانے میں صرف چار بڑے بڑے حصّے یعنی
انجن۔ فریم۔ اگلا دُھرا۔ پچھلا دُھرا۔ یہ سبھی آسانی سے دستیاب ہونے والی چیزیں تھیں۔ اور ان کو اس ترکیب سے
بنایا جاتا تھا کہ ان کو مرمت کرنے یا پرانے کی جگہ نیا فٹ کرنے کے واسطے کسی خاص کاریگری یا لیاقت کی
ضرورت نہ تھی۔ مجھے اُس وقت بھی پختہ یقین تھا کہ کار کے حصّے اور پُرزے اتنے سادہ اور سستے بنائے جائیں
گے کہ ہاتھ سے کرنے والی مہنگی مرمّت کے خرچ کا خطرہ اور ڈر بالکل جاتا رہے گا۔ پرزے اور حصّے اس قدر سستے
بنائے جا سکتے ہیں کہ پُرانوں کی مرمّت کرانے کی بجائے اُن کی جگہ نئے فٹ کرا لینے میں کہیں کم خرچ ہوگا۔ جس
طرح لوہے کی دوکانوں پر میخیں اور چٹخنیاں رکھی رہتی ہیں اُسی طرح یہ پُرزے اور حصّے بھی وہاں پر پڑے رہا کریں
میں نے یہ دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ کیونکہ اس کار کا ایجاد کرنے والا میں ہوں اس لئے اس کار کو اتنا مکمل طور
پر سادہ بنانا میرا فرض ہے کہ ہر شخص اس کی بناوٹ کو اچھی طرح سے ضرور سمجھ سکے۔

اس اصول کے ماتحت مال تیار کر کے دینے میں ہر پہلو سے فائدہ رہتا ہے۔ کیونکہ ایک مال کی بناوٹ
جتنی کم پیچیدہ ہوگی اُتنی ہی آسانی سے وہ تیار ہوگی۔ اور اُتنی ہی سستی بھی فروخت ہو سکے گی۔ اور اس
بہت زیادہ تعداد میں فروخت ہوگی۔

کار کی بناوٹ کے بارے میں علمی نگاہ سے تفصیل کے ساتھ چھان بین کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔
یہاں پر میں اپنے تمام ماڈلوں کی بابت چند موٹی موٹی باتوں کا ذکر کر دینا مناسب خیال کرتا ہوں۔
میرا ماڈل ٹی (T) سب سے آخری ماڈل تھا۔ اور اس ماڈل کو بنانے کے ساتھ ہمیں جس طرز اور ڈھنگ
پر لازمی طور سے چلنا پڑا اس نے ہمارے کاروبار کی ایک سرے سے کایا پلٹ دی اور ہم ترقی کے آسمان پر
لگے۔ خواہ کوئی کیسا بیوپار یا کام کیوں نہ ہو جس کسی میں اس اصول کی پیروی کی جاوے گی اور اس پر عمل

کیا جاوے گا وہی خوب چمکنے لگے گا۔

ماڈل ٹی (T) سے پہلے میں نے آٹھ ماڈل نکالے اور تیار کئے تھے۔ ان کے نام یہ تھے۔ ماڈل A ماڈل B۔ ماڈل C۔ ماڈل F۔ ماڈل N۔ ماڈل R۔ ماڈل S اور ماڈل K۔ ان میں سے ماڈل A۔ C اور F میں دو سیلنڈر والی موٹریں عین ایک دوسرے کے آمنے سامنے لگی ہوتی تھیں۔ ماڈل A میں ڈرائیور کی گدی کے پیچھے موٹر لگی ہوتی تھی۔ باقی سب ماڈلوں میں موٹر سامنے کی طرف ایک ٹپ میں فٹ کی ہوئی ہوتی تھی۔ ماڈل B۔ N۔ R اور S میں موٹریں چار سیلنڈر والی کھڑی شکل میں لگائی جاتی تھیں ماڈل K کی موٹر چھ سیلنڈر والی تھی۔ ماڈل A کا انجن آٹھ ہارس پاور کا تھا۔ ماڈل B کا انجن جس کا سیلنڈر ساڑھے چار انچ اور سٹروک پانچ انچ تھا۔ چوبیس ہارس پاور کا تھا۔ سب سے زیادہ ہارس پاور کا انجن چھ سیلنڈر والی ماڈل K کا تھا۔ جو چالیس ہارس پاور کا تھا۔ سب سے بڑے سیلنڈر ماڈل B کے تھے اور سب سے چھوٹے ماڈل N۔ R اور S کے تھے۔ جن کا قطر پونے چار انچ اور سٹروک ۳⅜ انچ تھا۔ ماڈل T کا سیلنڈر پونے چار انچ اور سٹروک چار انچ تھا۔ ماڈل B کے علاوہ باقی سب ماڈلوں میں چلاتے وقت ڈرائی بیٹریوں کے استعمال سے چنگاری پیدا کی جاتی تھی۔ ماڈل B میں سٹوریج بیٹری سے یہ کام لیا جاتا تھا۔ ماڈل کے میں بیٹری اور میگنیٹو دونوں ہوتے تھے۔ موجودہ ماڈل T میں میگنیٹو انجن کا گویا ایک حصہ ہے اور اس کے اندر بنا دیا گیا ہے۔ پہلے چار ماڈلوں میں ٹھ گاؤ دم شکل کی لگائی گئی تھی پچھلے چار ماڈلوں اور موجودہ (ماڈل T میں یہ کنڈل میں کنڈل ڈالے ہوئے حلقہ دار ہوتی تھی۔ ماڈل A زنجیر کے دھکے سے چلتی تھی۔ ماڈل بی دھرے کے دھکے سے۔ اس سے بعد کے دو ماڈلوں میں زنجیر کے دھکے سے چلنے کی ترکیب رکھی گئی تھی مگر اُن کے بعد تمام کاروں میں دھرے کے دھکے سے ہی گاڑی کے چلائے جانے کا انتظام رکھا جاتا ہے۔ ماڈل A کے پہیوں پر گاڑی کی بیٹھک بہتر انچ رکھی گئی تھی۔ ماڈل B میں جو کہ ایک نہایت نفیس کار تھی۔ بانوے انچ بیٹھک رکھی گئی تھی۔ ماڈل K میں ایک سو بیس انچ۔ ماڈل C میں ۷۸ انچ اور باقی سب میں ۸۴ انچ۔ مگر نئے ماڈل T میں یہ ایکسو انچ تھی۔ پہلے پانچ ماڈلوں کو بیچتے وقت تمام ساز و سامان کے دام علیحدہ چارج کئے جاتے تھے۔ اگلے تین ماڈلوں میں کچھ ساز و سامان ساتھ دیا جاتا تھا۔ مگر موجودہ نئی ماڈل T کار پورے ساز و سامان کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے۔ ماڈل A کا وزن ۱۲۵۰ پونڈ تھا۔ سب سے ہلکی کاریں ماڈل N اور R کی تھیں جن کا وزن صرف ۱۰۵۰ پونڈ ہوتا تھا۔ مگر دونوں چھوٹے موٹے کاموں کے

لئے بہت کار آمد تھیں۔ سب سے وزنی کار چھ سیلنڈر والی تھی جس کا وزن دو ہزار پونڈ تھا۔ موجودہ کار (ماڈل T) کا وزن بارہ سو پونڈ تھا۔

ماڈل T میں کوئی خاص ایسی صفت نہ تھی۔ جو کہ پہلے کسی ایک نہ ایک ماڈل کے اندر نہ تھی کار کے چپّا چپّا حصہ اور ایک ایک پُرزے کی جب تک مکمل امتحان کرکے پوری تسلی نہ کر لی جاتی تھی استعمال میں نہ لایا جاتا تھا۔ ہمیں اس ماڈل کی کامیابی میں رتی بھر بھی شبہ نہ تھا۔ اس کی کامیابی لازمی تھی۔ اس کے ناکامیاب ہونے کی کوئی وجہ ہی نہ تھی کیونکہ یہ ماڈل ایک دن میں تو بنایا ہوا نہیں تھا۔ یہ میری برسوں کی محنت کا نتیجہ تھا۔ اور اس کے بنانے میں جو کچھ میں نے اب تک سیکھا تھا وہ سارا علم اس میں خرچ کر دیا تھا۔ اور اُس وقت جو بہتر سے بہتر سامان و دھات دستیاب ہوتے تھے وہ میں نے اس میں استعمال کئے۔ ہم نے پہلی مرتبہ ۹-۱۹۰۸ء کے تجارتی موسم کے لئے ماڈل T کار بنا کر مارکیٹ میں پیش کی۔

اس وقت کمپنی کو جاری ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے۔ شروع میں فیکٹری نے اٹھائیس ایکڑ زمین گھیری ہوئی تھی۔ پہلے سال اس میں ۳۱۱ ملازم کام کرتے تھے۔ ۱۷۰۸ کاریں بنائی گئیں اور ہم نے ایک برانچ کھولی ۹-۱۹۰۸ء میں فیکٹری کا احاطہ پھیل کر ۲۶۵ ایکڑ زمین میں ہو گیا۔ اور اس میں جتنی عمارتیں کھڑی تھیں وہ سب کی سب ہماری ملکیت تھیں۔ فیکٹری میں کام کرنے والے ملازموں کی اوسط تعداد ۱۹۰۸ تک پہونچ گئی۔ ۶۱۸۱ کاریں کاریں بنائی گئیں۔ اور ۱۴ برانچیں کھولیں۔ ہمارا کام خوب چل نکلا تھا۔

۹-۱۹۰۸ء کے تجارتی موسم میں ہم چار سیلنڈر والی ماڈل R اور S بناتے چلے گئے۔ یہ کاریں چھوٹے موٹے کاموں کے کرنے کے لئے بہت کار آمد تھیں اور سڑکوں پر خوب چلتی تھیں۔ اب تک ان دونوں ماڈلوں کی بہت شہرت تھی اور ان کو ہم اکیس سو اور ساڑھے بائیس سو روپیہ میں فروخت کر رہے تھے مگر ماڈل T کے نکلتے ہی یہ دونوں ماڈل مات پڑ گئے۔ ہم نے ۱۰۶۰۷ کاریں فروخت کیں۔ آج تک کسی کمپنی نے اتنی بھاری تعداد میں کاریں نہ بیچی تھیں۔ سفری کار کی قیمت ساڑھے پچیس سو روپیہ تھی۔ ہم نے اس گاڑی کی بیٹھک پر فٹ کر کے ایک شہری کار تین ہزار روپیہ میں سڑک پر چلنے والی ۲۲۷۵ روپیہ کیں دو سیٹوں والی ۲۸۵۰ روپیہ میں اور ایک چھوٹی لینڈو نما کار بھی ۲۸۵۰ روپیہ میں بیچنا شروع کر دیا۔

اس تجارتی سال کی بکری نے مجھ پر یہ خوب ظاہر کر دیا کہ اب نئی پالیسی کو جاری کرنے کا وقت آگیا ہے۔ میرے اس نئی پالیسی کے اعلان کرنے سے پہلے ہی ایجنٹوں کو ہماری بھاری بکری دیکھ کر یہ خیال

پیدا ہو گیا تھا۔ کہ اگر ہم چند اور ماڈل نکال ڈالیں تو بکری اور بھی بڑھائی جاسکتی ہے کیسی عجیب بات ہے کہ جونہی ایک شے مارکیٹ میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ کسی کے دماغ میں یہ خیال چلکر کھانے لگ جاتا ہے کہ اگر اس میں ذرا سا فلاں فرق کر دیا جائے تو پھر یہ اور بھی زیادہ کامیاب ہوجاوگی لوگوں کو ایک شے کی وضع قطع کو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد خواہ مخواہ چھیڑتے رہنے میں اور اچھی بھلی شے کو ردوبدل کر کے بگاڑ دینے میں خاص مزہ آتا ہے۔ ہمارے ایجنٹ اور نئے ماڈل نکالنے کے لئے شور غل مچا رہے تھے۔ وہ پانچ فی صدی بڑھیا قسم کی کاریں خریداروں کو خوش کرنے کی سوچ رہے تھے۔ جو یہ صاف صاف ہدایت دے سکتے تھے کہ ہمیں کار کے اندر یہ خوبی اور فلاں صفت چاہیئے۔ مگر وہ باقی بیچارے پچانوے فی صدی عام گاہکوں کی مانگ کو بالکل بھلا ہی بیٹھے تھے۔ جو من میں ذرا بھی اندیشہ نہ لاکر پورے اطمینان کے ساتھ ہماری کاریں خرید رہے تھے۔ کوئی کاروبار اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ اپنے بارے میں شکایتوں اور آئندہ کی ترقی کے واسطے نئی تجویزوں پر پورے غور سے توجہ نہیں دیتا۔ اگر شے میں استعمال کرنے پر کوئی نقص ظاہر ہوتا ہی تو اس کی فوراً اور زبردست تحقیقات کرنی چاہیئے۔ لیکن جب کوئی اس شے کی صرف وضع قطع بدلنے کی نئی تجویز پیش کرتا ہے تو پہلے ہمیں اس امر کی تسلی کرلینی چاہیئے کہ آیا اس تجویز کو پیش کرنے والے کا یہ کہیں محض ذاتی وہم تو نہیں ایجنٹوں کو خریداروں کے وہم کو پورا کرنے کی بڑی فکر لگی رہتی ہے۔ لیکن اس کی بجائے یہ بہت بہتر ہوگا کہ ایجنٹ اپنے مال کی بابت کم سے کم اتنی واقفیت ضرور حاصل کرلیں جس سے کہ وہ اپنے وہمی خریداروں کی یہ تسلی کراسکیں کہ جو مال وہ ان کے ہاتھ بیچنا چاہتے ہیں اس سے ان کی وہم سمیت تمام ضرورتیں پوری ہوجاوینگی۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ مال واقعی خریداروں کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہو۔

اس لئے میں نے بغیر کوئی نوٹس دئے ۱۹۰۹ء کی ایک صبح کو یہ اعلان کردیا کہ ہم آئندہ صرف ایک ماڈل کی کاریں بنایا کریں گے اور یہ ماڈل T ہوگا۔ اور کہ تمام کاروں کی بیٹھک بالکل ایک جیسی ہوگی۔ ساتھ میں میں نے یہ بھی کہدیا کہ "ہم خریدار کی مرضی کے موافق کار کا رنگ بھی پینٹ کرکے دینے کو تیار ہیں بشرطیکہ وہ رنگ کالا ہو"

میرا خیال ہے کہ میری یہ سکیم کسی کے بھی پسند نہیں آئی۔ قدرتی طور پر ایجنٹ لوگوں کے دماغ میں یہ بات کبھی نہیں آسکتی تھی کہ صرف ایک ماڈل کی کاریں تیار کرنے کی وجہ سے ہمارے تیار مال کی

تعداد بہت بڑھ جائے گی اور اس کے علاوہ ہمیں اور بھی بہت سے فائدے حاصل ہوں گے مگر بڑی بات تو یہ تھی کہ اُن کو اس کی چنداں پرواہ بھی نہ تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ جتنی تعداد میں ہم مال اس وقت تیار کر رہے ہیں وہی بہت کافی ہے۔ دوسرے بات یہ تھی کہ تمام ایجنٹوں کو یہ پختہ یقین تھا کہ اگر کاروں کی قیمتوں میں کوئی کمی کی تو ہماری بکری بھی کم ہو جائے گی۔ اور جو بڑھیا کوالٹی کی کاروں کے گاہک ہیں وہ ہم کو چھوڑ دیں گے۔ اور پھر ہم ہمیشہ کے لئے ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ اس وقت لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ موٹر انڈسٹری اصل میں کہتے کس کو ہیں۔ تب بھی لوگ موٹر کاروں کو ایک تفریح کی شئے سمجھا کرتے تھے۔ موٹر کاروں کے بنانے والوں نے بھی اس خیال کو لوگوں کے دلوں میں بھرنے کی خوب کوشش کی۔ چند چالاک آدمیوں نے "تفریحی کار" کا نام بھی گھڑ مارا۔ اور اشتہاروں میں بھی کار کی اس صفت کی بہت زور شور سے تعریف ہونے لگی۔ کہ اس کار میں چڑھ کر سیر سپاٹا کرنے میں جو مزا اور لطف آتا ہے وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی حالت میں ہمارے بیچارے ایجنٹ مجھ پر اعتراض کرنے میں سچے تھے۔ خاص کر جب میں نے یہ اعلان نکالا۔

میں عام خلقت کے استعمال کے واسطے ایک کار بناؤں گا جو ایک کنبہ کے گزارہ کیلئے کافی بڑی ہوگی مگر تو بھی اتنی چھوٹی ہوگی کہ اکیلا آدمی اس کو آسانی سے چلا سکے گا۔ اور اس کی دیکھ بھال کر سکے گا۔ اب تک سائنس اور انجینیرنگ نے جہاں تک ترقی کی ہے اُس کی روشنی میں اور اُن کے قاعدوں کے مطابق اس کار کے ڈھانچہ کی وضع قطع اور مشینری کے فٹ کرنے کی ترکیب کو جہاں تک ممکن ہوگا سادہ سے سادہ تجویز کیا جاوے گا اور پھر اس کو بہتر سے بہتر ساز و سامان و دھات حاصل کر کے لائق سے لائق کاریگروں کے ہاتھوں سے تیار کرائی جاوے گی۔ مگر یہ اس قدر سستے داموں پر فروخت کی جاوے گی کہ ہر معقول تنخواہ پانے والا شخص اس کو خوشی سے خرید سکے گا اور کہہ سکے گا۔ اور اپنے کنبہ کے ساتھ مالک دو جہاں کی اس کھلی دنیا میں خوب مزے اور لطف اُٹھا سکے گا۔"

میرے اس اعلان پر خاصکر ہمارے مقابلہ بازوں کو بہت خوشی ہوئی کیونکہ ہر شخص کی یہی رائے تھی کہ "اگر فورڈ نے یہ راستہ اختیار کیا تو چھ ماہ کے اندر اس کا کاروبار بالکل چوپٹ ہو جائے گا۔"

عام خیال یہ ہے کہ ایک عمدہ کار سستے داموں پر ہرگز تیار نہیں کی جا سکتی۔ اور اگر یہ ممکن ہو تو بھی سستے داموں کی کاریں بنانے میں فائدہ کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ کاروں کے گاہک صرف

مالدار لوگ ہوا کرتے ہیں۔ مگر جب ۹-۱۹۰۸ء کے تجارتی سال میں ہماری دس ہزار سے بھی زائد کاریں فروخت ہو گئیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب ایک اور نئی فیکٹری لگائے بنا ہمارا گزارہ نہیں۔ ہمارا ایکپٹ سٹریٹ کا کارخانہ پہلے ہی سے چل رہا تھا۔ اور یہ فیکٹری کافی بڑی اور موجودہ نئے ڈھنگ کی تھی۔ میرے خیال میں یہ ملک کے اندر باقی سب موٹر فیکٹریوں سے چھوٹی تو کسی صورت میں نہ تھی۔ شاید کچھ بڑی اور بہتر ہو تو ہو۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ جس تیز رفتار سے ہماری بکری بڑھ رہی ہے اور جس کو کسی طرح سے روکا نہیں جا سکتا۔ اُتنی تیزی سے اور اُتنی زیادہ تعداد میں اکیلی اس فیکٹری سے مال تیار کرا کے کیسے دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے ہائی لینڈ پارک میں ساٹھ ایکڑ زمین جو اس زمانہ میں ڈیٹرائے سے کافی دور مفصل میں خیال کی جاتی تھی خرید لی۔ اتنی بھاری قیمت کی زمین مول لینے اور جتنی فیکٹریاں آج تک دُنیا میں لگی ہیں اُس سے بھی ایک بڑی فیکٹری لگانے کی اسکیم پر میری چاروں طرف سے بہت مخالفت ہوئی۔ اور ہر شخص کو یہ اُمید تھی کہ فورڈ کا کاروبار بس اب چند دنوں کا ہی مہمان ہے۔ بھگوان ہی جانتا ہوگا کہ اُس وقت سے لے کر آج تک کتنی ہزار بار یہ اُمید ظاہر کی جا چکی ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی کہ میرے کاروبار کی تہہ میں ایک اصول نہ کہ کسی انسان کا ہاتھ کام کر رہا ہے اور یہ اصول اتنا سادہ ہے کہ اس کی "تاثیر دیکھ کر اس کے طلسمی ہونے کا گمان پڑتا ہے۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں نئی زمین کی قیمت نکالنے اور عمارتوں کا خرچ پورا کرنے کی غرض سے میں نے کاروں کی قیمتیں تھوڑی سی اونچی کر دیں۔ ہماری یہ کارروائی بالکل جائز ہے۔ اور اس کی وجہ سے خریدار کو کبھی نقصان نہیں ہوتا۔ بلکہ فائدہ پہونچتا ہے۔ چند سال پہلے بھی میں نے ایک ایسی ہی کارروائی کی تھی۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ جیسا کہ میرا ہر سال قاعدہ رہا ہے اُس بار میں نے اپنا ریور رُو کا کارخانہ کھڑا کرنے اور بنانے کا خرچ نکالنے کی غرض سے کاروں کی قیمتوں میں کوئی کمی نہیں کی۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں حالتوں میں زائد روپیہ جو خرچ ہوا وہ قرض لے کر بھی کام نکالا جا سکتا تھا مگر اس صورت میں ہمیں متواتر سود کی چپت سہنی پڑتی۔ اور تب سے جتنی کاریں تیار کرتے اُن سب کی گلے یہ یہ رقم مڑھ کر وصول کرنی پڑتی۔ چنانچہ ہم نے یہ طریقہ چھوڑ کر اپنے سب ماڈلوں کی قیمتوں میں ۱۰۰ روپیہ کا اضافہ کر دیا۔ مگر سڑک پر چلنے والی کاریں صرف ۲۲۵ روپیہ اور چھوٹی لینڈو نما کاریں ساڑھے چار سو

اور شہری کار کی قیمت میں چھ سو روپیہ بڑھا دیے۔ اس سال ہماری ۱۸۶۶۴ کاریں فروخت ہوئیں۔ بہت سی نئی سہولتیں مل جانے کی وجہ سے ہم نے اگلے سال سفری کار کی قیمت ۲۸۵۰ روپے سے گھٹا کر ۲۳۴۰ روپیہ کر دی۔ اور ہم نے ۳۴۵۲۸ کاریں فروخت کیں۔ اور اس وقت سے لے کر آج تک ساز و سامان کی قیمتیں روز بروز مہنگی ہونے اور ملازموں کی تنخواہیں اور اُجرتیں لگاتار اونچی ہو جانے کے باوجود ہم اپنی کاروں کی قیمتوں کو متواتر کم کرتے چلے آئے ہیں۔

ذرا سال ۱۹۰۸ء کا سال ۱۹۱۱ء سے مقابلہ کیجیے۔ جب ہماری فیکٹری کا رقبہ ۲.۶۵ ایکڑ سے بڑھ کر ۳۲ ایکڑ ہو گیا تھا ملازمین کی تعداد ۱۹۰۸ سے بڑھ کر ۴۱۱۰ ہو گئی تھی۔ اور تیار کاروں کی تعداد چھ ہزار اور کچھ سیکڑہ سے بڑھتے بڑھتے پینتیس ہزار کے لگ بھگ پہنچ گئی تھی۔ یہاں پر یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ جس تیز رفتار سے ہماری تیار کاروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اُس تناسب سے ہمارے ملازموں اور کاری گروں کی تعداد نہیں بڑھ رہی تھی۔

ان ترقی کے قدم اُٹھانے کی برکت سے ہمارا کاروبار گویا دیکھتے دیکھتے تھوڑے عرصہ میں معمولی درجہ سے اُٹھ کر بہت بڑے اور اونچے پیمانہ پر چلنے لگا۔ اور ہم دھڑا دھڑ کاریں تیار کر کے مارکیٹ میں بھیجنے لگے۔ آخر کار اتنی بھاری کامیابی ہمیں کیونکر ہوئی؟

محض ایک اٹل اصول پر جم کر چلنے کی بدولت۔ بجلی کی طاقت اور مشینری کے صحیح اور دانائی کے ساتھ استعمال کی بدولت کسی اُجڑے سے کوچہ کی ایک تنگ اور اندھیری دکان میں ایک آدمی ایک چھوٹا سا ورکشاپ لگا کر کلہاڑیوں کے دستے بنانے کا کام کیا کرتا تھا اور وہ ایک رندا۔ ایک چھینی اور کچھ ریگ مال کی مدد سے بہت عمدہ خشک کی ہوئی لکڑی کے دستے بنایا کرتا تھا۔ ہر ایک دستے کو وہ بڑی ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ ناپ تول کر اور پاسنگ رکھ کر تیار کیا کرتا تھا تو بھی کوئی دو دستے بالکل ایک جیسے نہیں اترتے تھے اور فرق رہ جاتا تھا۔ دستے میں خم ایسا ہونا چاہیئے کہ ہاتھ کی مٹھی میں بالکل ٹھیک بیٹھے۔ اور وہ لکڑی کے ریشہ کے عین مطابق کاٹا جائے۔ صبح سے شام تک وہ بیچارا بڈھا اس کام میں جتنا پسینہ بہایا کرتا تھا اور اس کی اوسط ایک ہفتہ میں آٹھ دستے تیار کرنے کی ہوا کرتی تھی جس کے اُس کو ساڑھے چار روپے یعنی نگ کے حساب سے دام مل جایا کرتے تھے مگر اتنی محنت کرنے کے بعد بھی عام طور پر ان میں سے چند دستے ایسے نکل آتے تھے جو فروخت ہونے کے قابل نہ تھے کیونکہ اُن کا پاسنگ ٹھیک نہ تھا۔

آج آپ اس سے کہیں زیادہ بہتر مشینری سے تیار کیا ہوا ایک دستہ چند ٹکوں میں خرید سکتے ہیں۔ اور مزہ یہ ہے۔ کہ اس کا پاسنگ ٹھیک ہونے کی نسبت آپ کو ذرا بھی فکر و تشویش کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب دستوں کا بالکل ایک جیسا پاسنگ ہے اور ان میں سے ہر ایک بالکل صحیح و درست ہے موجودہ نئے طریقوں کے مطابق بڑے پیمانے پر بھاری تعداد میں مال تیار کرنے نے کلہاڑوں کے دستوں کو نہ صرف آگے کی نسبت بہت ہی کم لاگت پر یعنی روپے کی جگہہ صرف پائیوں کے خرچ سے تیار کر کے سپلائی کرنا ممکن بنا دیا ہے بلکہ اُن کی حیثیت اور کوالٹی کو بھی بہت اونچا کر دیا ہے۔

فورڈ کار کے بنانے میں بھی انہی قاعدوں اور طریقوں پر چلنے کی بدولت ہم شروع سے ہی اپنی کاروں کی قیمتوں میں کمی کرنے اور کوالٹی کو متواتر بڑھیا بنا کر دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ محض ایک خیال کو پال پوس کر بڑا کرنے کی برکت تھی۔ بہت بار محض ایک خیال ہی ایک کاروبار کا جنم داتا ہوتا ہے جیسے کہ کسی نئی چیز کے ایجاد کرنے والے یا سمجھدار کاریگر نے انسان کے کوئی واقعی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ایک نیا اور بہتر طریقہ نکالا جو سب کے پسند آیا اور لوگ اب اس کو استعمال کرنا اور اس کا پورا فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ اس طرح سے وہ شخص اپنے ایک خیال یا ایجاد کے ذریعے ایک کاروبار کا جنم داتا بنتا ہے۔ لیکن اس کاروبار کو مناسب وضع قطع دینے اور رنگ ڈھنگ سے سے چلانے میں ان سبھی کا حصہ ہے جن کا اس کے ساتھ کسی شکل میں تھوڑا یا بہت واسطہ ہے کمپنی کارخانہ دار جس کا کارخانہ ہزاروں کاریگروں اور ملازموں کے سر پر چل رہا ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اکیلا میں اس کاروبار کو اتنا بڑا بنانے والا ہوں۔ یہ کام سب نے مل جل کر کیا ہے۔ اور ہر شخص نے جو اس کارخانہ میں کام کرتا تھا۔ اس کاروبار کو بنانے اور بڑھانے میں اپنی حیثیت اور قابلیت کے مطابق ضرور مدد دی ہے۔ ان کاریگروں اور ملازموں کے پرتاپ سے ہی یہ ممکن ہوا ہے کہ جن گاہکوں کو اس قسم کے مال کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کارخانہ کے پاس دوڑے آتے ہیں اور اس طرح سے اُنہوں نے ایک ایسا رواج بیوپار۔ یا سلسلہ قائم کرنے میں مدد دی ہے جس سے اُن کے روزگار کی صورت نکل آئی ہے ہماری کمپنی اسی طریقہ سے پھلی اور پھولی پھلی۔ مگر کس طرح سے! اس کا ذکر میں اگلے بیان میں کھول کر کروں گا۔

اس دوران میں ہماری کمپنی تمام دنیا میں پھیل گئی۔ ہماری لندن اور آسٹریلیا کے اندر برانچیں قائم

ہو گئی تھیں۔ دُنیا کے ہر حصّہ میں ہم اپنی کاریں بھیج رہے تھے۔ اور خاص کر انگلینڈ میں تو ہمارا نام اتنا ہی مشہور ہو گیا تھا جتنا کہ امریکہ میں۔ امریکن بائیسکل کے فیل ہو جانے کی وجہ سے ہماری کاروں کو انگلینڈ میں چالو کرانا اور بیچنا کافی مشکل کام تھا۔ کیونکہ امریکن بائیسکل انگریزوں کی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکا تھا۔ اس لئے یہ مان لیا گیا تھا اور موٹر کار کے بیوپاریوں نے یہ شور مچانا شروع کر دیا تھا کہ امریکہ کی کوئی گاڑی یا کار انگلینڈ کی مارکیٹ میں کبھی پسند اور چالو نہ ہو سکے گی۔ جب ۱۹۰۳ء میں ہماری ماڈل A کی دو کاریں انگلینڈ لائی گئیں تو وہاں کے اخباروں نے اس کا ذکر تک کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور موٹر کاروں کے ایجنٹوں نے ان کی طرف بالکل کوئی توجہ نہ دی اور ان میں ذرا بھی دلچسپی ظاہر نہ کی۔ بلکہ اس کی بجائے لوگوں کی نظروں میں اُن کو گرانے کی نیت سے یہ افواہ پھیلائی گئی کہ یہ کاریں زیادہ تر دھات کے رسّوں اور چھلّے دار تاروں کی بنی ہوئی ہیں۔ اور اگر کوئی کار زیادہ سے زیادہ پندرہ دن بھی نکال جائے تو یہ اس کے خریدار کا بڑا اچھا بھاگ سمجھا چاہیئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اُس سال انگلینڈ میں ہماری صرف ایک درجن کے قریب کاریں فروخت ہوئیں۔ اگلے سال تھوڑی سی اور زیادہ۔ حالانکہ ہماری ان ماڈل A کی کاروں کی پائیداری کا حال یہ ہے کہ گو ان کو استعمال ہوتے ہوئے بیس سال سے اوپر ہو گئے ہیں تو بھی آج تک ان سے انگلینڈ میں کچھ نہ کچھ کام برابر لیا جا رہا ہے۔

۱۹۰۵ء میں ہمارے ایجنٹوں نے سکاٹ لینڈ کی آزمائش پائیداری کی دوڑ میں مقابلہ کرنے کے لئے ہماری ماڈل سی (C) کار کو داخل کیا۔ اُس زمانہ میں انگلینڈ کے اندر موٹر دوڑوں کی نسبت ان پائیداری کی دوڑ کا بہت رواج چل پڑا تھا۔ شاید لوگوں کو ابھی تک یہ یقین اور اعتبار نہ آتا تھا کہ موٹر کاریں اور گاڑیاں محض کھلونا نہیں ہیں۔ اس سکاٹ لینڈ کی آزمائشی دوڑ کے لئے آٹھ سو میل کی پہاڑی اور ٹوٹی پھوٹی سڑکیں مقرر کی گئی تھیں۔ فورڈ کی کار تمام راستہ میں صرف ایک جگہ رُکی اور وہ بھی زبردستی۔ بس پھر کیا تھا تب سے انگلینڈ میں ہماری کاریں دھڑا دھڑ فروخت ہونی شروع ہو گئیں۔ اُسی سال ہماری ٹیکسی گاڑیاں پہلی مرتبہ لندن لائی گئیں۔ اگلے چند سالوں میں ہماری بکری آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ ہم اپنی کاریں مقابلہ کرنے کے لئے مضبوطی اور پائیداری کی ہر آزمائشی دوڑ میں شامل کیا کرتے تھے اور ہر دوڑ میں وہ جیت کر آتی تھیں۔ شہر برائیٹن کا ایک بیوپاری ساؤتھ ڈاؤن کے پہاڑی علاقہ میں دس فورڈ کاریں باری باری سے دو دن تک متواتر جانچ اور مقابلہ کرنے کے لئے دوڑاتا رہا اور ان میں سے ہر ایک امتحان میں پوری اُتری

نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال انگلینڈ میں ہماری چھ سو کاریں فروخت ہوئیں۔ ۱۹۱۱ء میں ہنری الیگزینڈر ہمارے ماڈل T کی کار کو چلاتا ہوا بین نیویس کی پہاڑی کی چار ہزار چھ سو فٹ اونچی چوٹی تک سلامتی سے لے گیا۔ اس سال انگلینڈ میں ہماری چودہ ہزار ساٹھ کاریں فروخت ہوئیں۔ اور اس کے بعد پھر کبھی ہمیں اپنی کاروں کے ایسے کارنامے دکھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ آخرکار ایک دن ایسا آیا جب ہمکو انگلینڈ میں اپنی کاروں کی بڑھتی مانگ کو پورا کرنے کے لئے مانچسٹر میں فیکٹری لگانی پڑی۔ جہاں پر پہلے پہل امریکہ سے پرزوں اور حصّوں کو منگوا کر کاروں کو صرف جوڑ کر کھڑا کر دینے کا کام کیا جاتا تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ ہم یہیں پر پرزے اور حصّے بنا کر ہر سال آگے سے زیادہ تعداد میں تیار کرنے لگ گئے ہیں۔

بیان پانچ

تیاری مال

اگر کسی ترکیب سے سو گھنٹوں کے پیچھے دس کی بچت وقت میں ہو سکتی ہے یا دس فی سیکڑہ کام
زیادہ نکل سکے تو اس کو استعمال نہ کرنا ہمیشہ ایک طرح سے دس فی صدی اپنے اوپر جرمانہ سمجھنا چاہیے۔ اگر
کسی شخص کا وقت فی گھنٹہ ۵ قیمتی ہے تو دس فی صدی کی بچت سے فی گھنٹہ ایک آنہ بچا۔ اگر ایک بہت
بڑے شہر میں رہنے والے شاندار عمارتوں یا دوکانوں کے مالک کو ایسی کوئی ترکیب ہاتھ آجائے۔
جس سے اُس کی آمدنی دس فی صدی بڑھ سکے۔ تو وہ اس کے بتانے والے کو بڑی خوشی سے اس
بڑھتی کا آدھا حصہ بطور انعام دینے کو تیار ہو جائے گا۔ اُس نے یہ شاندار عمارتیں یا دوکانیں بنائی
ہی اس حوصلہ پر تھیں کہ سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر چند مسالے خاص طریقے سے برتے جائیں
تو ان سے جگہ کافی نکل آسکتی ہے اور کرایہ کی آمدنی بڑھ سکتی ہے۔ ایک تیس منزلہ عمارت کے لئے بھی اتنی
ہی جگہ درکار ہے جتنی کہ پانچ منزلہ کے لئے۔ پُرانے طریقے سے عمارت بنانے میں پانچ منزلہ مکان پُرانی ہی
لاگت آجائے گی جتنی کہ نئے طریقے سے بناکردہ پچیس منزلہ مکان سے کرایہ وصول کرسکتا ہے۔ اسی طرح
اگر کارخانوں میں بارہ ہزار کاریگروں میں سے ہر ایک کو اپنا کام پورا کرنے کے لئے روز کے صرف دس قدم
ہی کم چلنے کی سہولیت ہو جائے تو انہیں جو مفت میں پچاس میل کی روزانہ بھاگ دوڑ کرکے جان توڑنی
پڑتی تھی۔ اُس آفت سے چھوٹ جائیں۔

یہ ہیں وہ اصول جن پر میں نے اپنے کارخانہ کو چلا کر مال تیار کرنا شروع کیا۔ اصل میں یہ سب اصول
اپنے آپ ایک دوسرے کے پیچھے قائم ہوتے چلے گئے۔ شروع شروع میں ہم نے مشین چلانیوالوں

بھرتی کیا۔ مگر جوں جوں ہماری تیار مال کی تعداد بڑھتی گئی ہمیں صاف نظر آنے لگا کہ اول تو ضرورت کے مطابق مشین چلانے والے ملتے نہیں۔ اور دوسرے مال تیار کرنے کے لئے ایسے کاریگروں کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ جان کر تب میں نے اپنے لئے ایک اور اصول قائم کیا جس کا آگے چل کر میں کھول کر ذکر کروں گا۔

یہ سب پرورشن ہے کہ دنیا میں زیادہ کر کے ایسے لوگ بستے ہیں جن کے جسم اگر قابل ہوں بھی تو بھی اُنہیں اتنی عقل نہیں کہ اپنا گزارہ اچھی طرح کر سکیں۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کچھ ایسی چیزیں تیار نہیں کر سکتے جن کی دنیا کو ضرورت ہو اور جن کے بدلے میں دُنیا ان کو کچھ ایسی شَی دے سکے جن سے ان کا کام چل جائے۔ میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہی بلکہ میرا یقین ہے کہ آج کل ہر جگہ یہی خیال ہو رہا ہے کہ ہماری مہربانی سے کاری گروں کی روزی ماری گئی۔ بالکل جھوٹ۔ اُلٹا ہم نے کاری گری کی قدر بڑھا دی ہے۔ ہم نے اپنے کام کی چال ڈھال قائم کرنے بندوبست کرنے اور اوزار بنانے میں آگے سے زیادہ کاری گروں کو اپنے کارخانہ میں ملازم رکھا ہے۔ اور اس کا فائدہ وہ لوگ اُٹھا رہے ہیں۔ جن کے پاس خود کوئی ہنر نہیں۔ خیر آگے چل کر میں اس معاملہ پر اور بحث کروں گا۔

ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ دنیا میں سبھی لوگوں کو خدا نے ایک جیسی عقل و لیاقت نہیں دی۔ اگر ہمارے کارخانہ کے اندر ہر کام ایسا ہوتا۔ جو صرف کاریگر کے کرنے کا ہوتا تو کارخانہ چلنے سے رہ جاتا کاری گروں کی کام کرنے کے لائق تعداد ہم سو سال بھی سکھا کر پوری نہ کر سکتے تھے۔ ہاتھ سے کام کرنے والے دس لاکھ مزدور جتنا ہم آج کل ایک دن میں مال تیار کر رہے ہیں اُس مقدار کے پاس تک پھٹک نہیں سکتے پھر دس لاکھ آدمیوں کا انتظام کرنا بھی کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر ضروری سوال یہ تھا کہ ان مزدوروں کے ہاتھ کا بنا ہوا مال اتنا مہنگا پڑتا تھا کہ مارکیٹ میں اس کے اتنے دام نہ اُٹھتے تھے۔ اوّل تو اتنے آدمیوں کا اکٹھا کرنا ممکن نہیں لیکن اگر ان کو کسی طرح ہو بھی جائیں تو بھی ان سے انتظام کرنے میں اور ہر ایک سے پورا پورا کام کرانے میں کتنی دقّت ہوگی اور پھر اس کے علاوہ یہ سوچو کہ اتنی بڑی تعداد کے لئے کتنی لمبی چوڑی جگہ درکار ہوگی۔ بے شمار آدمی تو صرف وہ مال ڈھونے کو لگانے پڑیں گے جو دوسرے تیار کر رہے ہوں گے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی حالت میں کس طرح سے ایک مزدور کو دو یا تین آنے سے زیادہ دہاڑی ادا کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ تنخواہیں کبھی مالک اپنے پاس سے

نہیں نکالتا۔ وہ تو محض روپیہ کا خزانچی ہے۔ تنخواہیں تو مال نے ادا کرنی ہوتی ہیں۔ اور مال کی تیاری انتظام کے ہاتھ میں ہے کہ اتنا اچھا ہو جس سے مال کے اندر تنخواہیں نکالنے کی ہمّت ہو۔

ہمارے کارخانہ میں بچتیں نکالنے کے طریقے سب ایک ہی بار شروع نہیں ہو گئے تھے۔ جیسے جیسے ہم اپنی کاروں کے حصّے اور پُرزے بناتے چلے گئے اُسی رفتار سے آہستہ آہستہ یہ طریقے بھی آتے گئے۔ ماڈل T ہماری پہلی کار تھی جس کو ساری ہم نے خود بنایا۔ بڑی بچتیں پہلے کار کے حصّوں کے جوڑنے میں شروع ہوئیں اور وہاں سے دوسرے محکموں میں پھیلیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج گو ہمارے پاس لائق کاریگروں کی کافی تعداد موجود ہے۔ وہ آٹو موبائل نہیں بناتے۔ البتہ دوسروں کو ان کے تیار کرنے میں کافی مدد دیتے ہیں۔ ہمارے لائق کاریگر کون ہیں؟ صرف اوزار بنانے والے۔ تجربے کرنے والے کامگار، مشین چلانے والے اور سانچے بنانے والے۔ یہ اور لوگوں سے کوئی خاص زیادہ لائق نہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے اندر جو لیاقت ہے اُس کو خواہ مخواہ اس کام میں لگا کر کیوں برباد کیا جائے جو مشینوں کے ذریعے جنہیں وہ بنائیں گے مزے سے ہو سکتا ہے۔ عام طور پر جو لوگ بھرتی ہوتے آتے ہیں اُنہوں نے کچھ سیکھا ہوا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ اپنا کام چند گھنٹوں یا دنوں میں سیکھ لیتے ہیں۔ اگر اس عرصہ میں وہ نہیں سیکھ سکتے تو وہ ہمارے کسی کام کے نہیں۔ ان لوگوں میں زیادہ تعداد اکثر پردیسیوں کی ہوا کرتی ہے اور ان کو بھرتی کرنے سے پہلے صرف اپنی اتنی تسلی کر لینی چاہیئے کہ کیا یہ کم سے کم اپنی تنخواہ لائق ہم کو کام کر کے دے سکیں گے یا نہیں۔ ان آدمیوں کا خوب ہٹے کٹے ہونا لازمی نہیں کیونکہ ہمارے پاس ایسے کام بھی ہیں جن میں جسم کی خوب طاقت درکار ہے۔ لیکن ایسے کاموں کی تعداد آہستہ آہستہ گھٹتی جاری ہے۔ اور باقی کام ایسے ہیں جن کے لئے ذرا بھی طاقت کی ضرورت نہیں اور جنہیں طاقت کے لحاظ سے ایک تین سال کا بچّہ بھی بڑی آسانی سے کر سکتا ہے۔

تیاری مال کے ٹیکنیکل عملوں کو کھول کر بیان کیے بغیر یہ ظاہر کرنا مشکل ہے کہ پہلے ہم کار کا فلاں پُرزہ کیسے بناتے تھے۔ پھر ہم نے اس کے عمل میں کیا تبدیلی کی۔ اور اسی طرح آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے آج اس شکل میں وہ پُرزہ بننے لگا ہے۔ مگر میری سمجھ میں یہ کام ناممکن ہے۔ کیونکہ ہر روز کچھ نہ کچھ نئی بات نکلتی آتی ہے اور اس کا ریکارڈ رکھنا مشکل ہے۔ کام کرنے کے ڈھنگ میں ہم نے جو تبدیلیاں داخل کی ہیں ان میں سے کوئی بھی چند پکڑ لو۔ ان پر غور کرنے سے اندازہ چل جائے گا کہ دنیا میں جب

دھڑا دھڑ مال بننے لگے گا تو کیا حالت ہوگی۔ دوسرے یہ کہ ہم اس وقت چیزوں کی مناسب قیمت سے کہیں زیادہ دام ادا کر رہے ہیں۔ تیسرے کہ آج کل لوگوں کو مناسب سے بہت تھوڑی تنخواہیں مل رہی ہیں اور چوتھے کہ ابھی تک انڈسٹری کے میدان میں بہت ساری ایسی باتیں ہیں جو پتہ لگانے سے رہتی ہیں۔ اس سلسلہ میں فورڈ کمپنی جو کچھ کر سکتی ہے وہ محض آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

ایک فورڈ کار میں کابلے ڈھبریاں وغیرہ ملا کر سب پانچ ہزار کے قریب پرزے ہوتے ہیں۔ کچھ پرزے کافی بڑے ہوتے ہیں مگر باقی سائز میں لگ بھگ گھڑی کے پرزوں کے برابر ہوتے ہیں۔ پہلے پہل ہم فرش پر اپنی کاریں جوڑ لیا کرتے تھے۔ اور جس طرح کہ عمارت بناتے وقت چونا گارا وغیرہ ڈھویا جاتا ہے اسی طریقے سے ہمارے کامگار جس جس پرزے کی ضرورت پڑتی تھی وہاں لا لا کر اکٹھا کرتے جاتے تھے لیکن جب ہم نے پرزے خود بنانے شروع کر دیے تو ان کے لئے فیکٹری میں ایک علحدہ محکمہ قائم کرنا ضروری تھا۔ مگر وہاں بھی عام طور پر ایک کاریگر کو ایک چھوٹا سا پرزہ تیار کرنے میں سارے عمل خود اکیلے پورے کرنے پڑتے تھے۔ جب مال کے جلدی جلدی بنانے کا زور پڑا تو تیاری مال کی کوئی ایسی ترکیب نکالنے کی فکر پڑی جس سے کام جھٹ پٹ ہوتا چلا جائے اور بھاگڑ میں کامگار بھی ایک دوسرے کے ساتھ نہ ٹکرائیں۔ انجان کامگار کام کرنے کی نسبت اپنا زیادہ وقت مسالے اور اوزار اکٹھا کرنے میں خرچ کر دیتا ہے۔ اس کو تنخواہ تھوڑی ملتی ہے کیونکہ اس کا کام تھوڑا ہوتا ہے صرف ادھر ادھر گھومنے پھرنے سے کسی کو بڑی تنخواہ نہیں ملا کرتی۔

جوں ہی ہم نے آدمی کو کام کے پاس لے جانے کی بجائے آدمی کے پاس کام کو پہونچانے کا سلسلہ جاری کیا۔ ہماری کاروں کی جڑائی کے کام میں بہتری شروع ہوگئی۔ اب ہم تمام عملوں میں کاریگروں سے کام کراتے وقت دو اصولوں کو عام طور پر اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر ممکن ہو سکے تو کسی کاریگر کو اپنا کام پورا کرنے میں ایک قدم سے زیادہ ہلنا نہیں پڑے گا۔ اور دوسرے اس کو کسی حالت میں کام جھک کر کرنا نہیں ہوگا۔

جڑائی کے اصول یہ ہیں:۔

(۱) اوزاروں اور آدمیوں کو عملوں کا لحاظ رکھ کر نمبروار اس طریقے سے جماؤ جس سے کار کے جوڑنے میں ہر حصے و پرزہ کو اپنی جگہ پر بٹھانے کے لئے کم سے کم حرکت ہو۔

(۲) پُرزوں کو لُڑھکانے یا ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پر لے جانے کے لئے کچھ ایسا سلسلہ تختوں وغیرہ کے ذریعہ سے باندھا جائے جس سے جوں ہی ایک کامگار اپنا عمل ختم کر چکے وہ اُس پُرزہ کو وہیں ہمیشہ ایک جگہ پر چھوڑ دیا کرے۔ اور یہ جگہ ایسی ہونی چاہیئے۔ جہاں پر چھوڑنے میں اُس کے ہاتھ کو سب سے زیادہ آرام ہو۔ اور اگر ممکن ہو سکے کہ تب پُرزہ ڈھال کی وجہ سے لڑھک کر اپنے آپ اگلے کامگار کے پاس اُس کے عمل کے لئے پہنچ جائے تو بہت اچھا ہے۔

(۳) جوڑائی کا کام ڈھال میں قطاریں قائم کر کے کرو جس سے جوڑنے والے پُرزوں کو اُٹھانے اور لگانے میں لمبا ہاتھ پسارنا نہ پڑے۔

ان اصولوں پر چلنے کا خاص نتیجہ یہ ہوا کہ کامگار کو پُرزہ ڈھونڈنے اور عمل سوچنے کی ضرورت نہیں اور اس کو ہلنا جلنا بھی کم پڑا۔ جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے اُس کو ایک وقت میں صرف ایک حرکت سے محض ایک ہی کام کرنا پڑتا ہے۔

دستکاری سے اناڑی لوگوں کو ہمارا نچلا حوا جوڑنے کا کام سب سے زیادہ مزیدار اور مشہور عمل دکھائی پڑتا ہے۔ اور ایک زمانہ میں واقعی یہ بھی ہمارے نہایت ضروری عملوں میں ایک شمار ہوا کرتا تھا مگر اب ہم اپنے تمام پُرزے کار جوڑنے کے لئے بکری والے مقام پر ہی بھیج دیتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم نے یکم اپریل ۱۹۱۳ء کے لگ بھگ جوڑائی کا کام ڈھال میں قطاریں قائم کر کے کرنے کا تجربہ کیا۔ اور کار میں فلائی ویل میگنٹو (Fly Wheel Magnito) کو اس طرح پر جوڑنا شروع کیا۔

ہم پہلے ہر کام چھوٹے پیمانہ پر شروع کر کے دیکھتے ہیں۔ اور جوں ہی ہمیں کوئی بہتر طریقہ مل جاتا ہے۔ ہم پہلے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن جب تک ہم کو بالکل "پکا" یقین نہیں ہو جاتا کہ نیا طریقہ پہلے سے اچھا ہے۔ ہم پرانے کے اندر ہرگز کوئی بھاری تبدیلی کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے کسی نے سرکتی قطار میں اس طرح سے کام کرنے کا سسٹم جاری نہیں کیا تھا۔ شکاگو کے نانبائی جس طرح سے بیف (گائے بیل کا گوشت) پکا کر "ڈبوں" میں بھرنے کے لئے اوپری ٹرالیاں برتتے ہیں انہیں دیکھ کر ایک بار میرے دماغ میں یوں ہی یہ خیال آ گیا۔ کہ ہم بھی کیوں نہ یہ طریقہ برتیں۔ پہلے ہم فلائی ویل میگنیٹو کو معمولی طریقے سے جوڑا کرتے تھے۔ ایک کامگار دن میں ۹ گھنٹہ کام

کام کر کے پینتیس سے لے کر چالیس تک پورے میگنیٹو اکیلا جوڑ سکتا تھا یعنی بیس منٹ کے قریب اُس کے ایک
میگنیٹو کے جُڑنے میں خرچ ہوتے تھے جو کام وہ سارا اکیلا کرتا تھا اُس کو اب ہم نے اُنتیس الگ الگ عملوں
میں بانٹ دیا۔ اور اس سے فی جوڑائی صرف تیرہ منٹ دس سیکنڈ میں ہونے لگی۔ اس کے بعد ہم نے ۱۹۱۴ء
میں سرکتی قطار آٹھ انچ اور اوپر کر دی۔ اور تب یہ وقت گھٹ کر صرف سات منٹ رہ گیا۔ پھر ہم نے
اپنی رفتار تیز کرنے کے تجربے شروع کئے جس سے وقت صرف پانچ منٹ خرچ ہونے لگا۔ ساری بات کہنے
کا مطلب یہ ہے کہ علمی اصول کے مطابق چل کر ایک آدمی آج لگ بھگ اتنا کام کر سکتا ہے جتنا کچھ سال
پہلے چار آدمی کیا کرتے تھے۔ اس سرکتی قطار نے ہمارے سسٹم کی بڑائی کو ثابت کر دیا۔ اور اب ہم یہ طریقہ ہر
جگہ استعمال کرنے لگے ہیں۔ پہلے موٹر کی ساری جوڑائی کا کام ایک آدمی کیا کرتا تھا۔ اب ہم نے یہ کام
چوراسی عملوں میں بانٹ دیا ہے جس سے پہلے کی نسبت صرف ایک تہائی آدمیوں کی تعداد اب یہ کام
کر لیتی ہے۔ تھوڑے عرصہ بعد ہم نے یہی ترکیب نچلا حودا تیار کرنے میں بھی شروع کر دی۔

اس سے پہلے بڑی ہمّت کرنے پر بھی ایک نچلا حودا جوڑنے میں ہمارے بارہ گھنٹے اٹھائیس منٹ
سے کم اوسط نہ بیٹھتی تھی۔ ہم نے نچلے حودے کو ایک رسّے اور گراری کے ذریعہ ایک ڈھائی سو فٹ لمبی
قطار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھینچنے کا تجربہ کیا۔ چھ جوڑیئے (جوڑنے والے) نچلے
حودے کے ساتھ ساتھ چلے جاتے تھے۔ اور قطار کے ساتھ لگائے ہوئے ڈھیروں میں سے پُرزے
اُٹھا اُٹھا کر جڑتے جاتے تھے۔ اس معمولی تجربہ سے وقت فی نچلا حودا گھٹ کر صرف پانچ گھنٹہ پچاس منٹ
رہ گیا۔ ۱۹۱۴ء کے شروع شروع میں ہم نے اس جوڑنے والی قطار کو اونچا کر دیا۔ ہم نے آدمی کے قد کے
برابر کام رکھ کر کام کرانے کی پالیسی اختیار کی۔ الگ الگ قدّوں کے لحاظ سے ہم نے دو قطاریں قائم
کیں۔ ایک فرش سے پونے ستائیس انچ اونچی اور دوسری ساڑھے چوبیس انچ ایسا انتظام کر دینے سے
جس سے کام کرنے وقت جھکنا نہ پڑے اور ہر کام کو اور زیادہ حصّوں میں بانٹ دینے سے جس کی وجہ
سے ہر آدمی کو اپنی ڈیوٹی پوری کرنے میں آگے سے کم حرکت کرنی پڑتی تھی ایک نچلا حودا اب صرف ایک گھنٹہ
اور سینتیس منٹ میں تیار ہونے لگا۔ اس وقت صرف یہ نچلا حودا ہی اس سرکتی قطار پر تیار ہوا کرتا تھا۔ باقی حودا
جون آر سٹریٹ نام کی مشہور گلی میں جو ہمارے ہائی لینڈ پارک کے کارخانوں میں سے ہو کر گزرتی ہی بنا کرتا
تھا۔ اب ساری کار ہی اس طرح سرکتی قطار پر جوڑی جاتی ہے۔

مگر اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ کام جتنا دیکھنے میں آسان لگتا ہے۔ اتنی جلدی ہو بھی گیا تھا۔ سرکتی قطار کی رفتار کو بڑی دیکھ بھال کے بعد مقرر کرنا تھا۔ فلائی ویل میگنیٹو میں پہلے ہماری رفتار فی منٹ ساٹھ انچ ہوا کرتی تھی یہ نہایت زیادہ تھی۔ تب ہم نے فی منٹ اٹھارہ انچ رکھی۔ یہ بالکل سست ہو گئی۔ آخر ہم نے فی منٹ ۴۴ انچ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ منشا یہ ہے کہ کامگار کو اُتاولی میں کام نہ کرنا پڑے۔ جتنا لازمی ہے اتنا وقت اُس کو ضرور ملے مگر فالتو ایک سکنڈ بھی نہیں۔ ہم نے تجربے کر کے ہر ایک جوڑائی کی رفتار ریٹ قائم کر لی ہیں۔ کیونکہ نچلے جوڑ کی جوڑائی میں کامیابی پا کر ہم نے تیاری مال کا اپنا سارا طریقہ ہی ایک سرے سے بدل ڈالا۔ اور اب ہر جوڑائی کا کام مشینوں کی طاقت سے چلنے والی سرکتی قطاروں پر ہونے لگا ہے۔ مثال کے طور پر نچلے حودے کی جوڑائی والی قطار ایک منٹ میں چھ فٹ چلتی ہے۔ اور سامنے والے دھرے کی جوڑائی والی قطار ایک منٹ میں نواسی انچ۔ نچلے حودے کی جوڑائی میں پینتالیس الگ الگ عمل یا چوکیاں ہیں۔ پہلے کامگار نچلے حودے کے فریم میں لگا دیتے ہیں۔ تب تک موٹر دسویں عمل تک پہنچ لی ہوتی ہے۔ اور بس اسی طرح اور آگے چیزیں اس میں لگتی جاتی ہیں۔ کچھ کامگاروں کو محض ایک یا دو معمولی سے عمل کرنے پڑتے ہیں باقیوں کو کچھ زیادہ۔ جو کامگار ایک پرزہ اس میں رکھتا ہے وہ اسے جوڑتا نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ پرزہ کئی عملوں کے بعد اپنی اصلی جگہ ٹھیک آ کر بیٹھے گا۔ جو کامگار ایک کابلہ لگاتا ہے وہ اس کی ڈھبری نہیں لگاتا۔ اور جو ڈھبری لگاتا ہے وہ اسے کستا نہیں۔ چونتیسویں عمل پر تیار ہونے والی موٹر میں گیسولین ڈالی جاتی ہے۔ پرزوں میں تیل یا چربی پہلے سے دی ہوئی ہوتی ہے۔ چوالیسویں عمل پر ریڈیٹر میں پانی بھرا جاتا ہے۔ اور پینتالیسویں عمل پر موٹر تیار ہو کر چلتی ہوئی کارخانہ جون آر سٹریٹ میں داخل ہو جاتی ہے۔

آہستہ آہستہ لگ بھگ یہی قاعدے اور اصول کل موٹر کو جوڑنے میں برتے جانے لگے۔ ماہ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں کامگاروں کے ایک موٹر جوڑنے میں نو گھنٹے اور پچاس منٹ خرچ ہوا کرتے تھے چھ مہینے بعد سرکتی قطار کے طریقہ پر چل کر یہ کام صرف پانچ گھنٹے اور چھپن منٹ میں ہونے لگا۔ موٹر کا ہر کام یعنی ہر ایک پرزہ یا حصہ جو کسی محکمہ میں بھی تیار ہوتا ہے۔ سرکتا رہتا ہے۔ یا تو وہ سر پر لٹکتی زنجیروں کے ساتھ لگے ہوئے کنڈوں میں لٹک کر کار کی جوڑائی کے لئے ضرورت کے موافق عین اپنی اپنی باری پر محکمہ جوڑائی میں پہنچ جاتا ہے یا وہ سرکتے پلیٹ فارم پر چلتا ہے اور زیادہ ڈھال ہونے کی وجہ سے اوپر سے نیچے کی طرف چلتا ہے۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ سوائے مسالوں کے کسی اور چیز کو ہمارے کارخانہ کے اندر اُٹھانا یا ڈھلینا

نہیں پڑتا۔ چھوٹے چھوٹے ٹھیلوں پر یا گاڑیوں کے ذریعہ جن کو ناقص نچلے حودوں میں سے نکالا ہوا ہوتا ہے
اور جو کافی تیزی سے اِدھر اُدھر پھرائی اور چلائی جا سکتی ہیں۔ اور ہر چھوٹے موٹے راستے سے جہاں اُنہیں پہنچنا
ہوتا ہے بڑی پھرتی سے آجا سکتی ہیں۔ مسالے ڈھوئے جاتے ہیں کسی کاریگر کو کوئی شے ہلانے یا اُٹھانے کی
ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ کام ایک علیحدہ محکمہ میں ہوتا ہے جس کا نام محکمہ بار برداری ہے۔

شروع شروع میں ہم ساری کار جوڑنے کا کام ایک ہی کارخانہ کے اندر کیا کرتے تھے۔ مگر جب ہم
نے پرزے بنانے شروع کئے تو ہم الگ الگ محکمے قائم کرنے لگے تاکہ ایک محکمہ میں صرف ایک کام ہو۔ اس وقت
ہمارے سارے کارخانہ میں تمام کام اس ڈھنگ پر ہو رہا ہے کہ ایک محکمہ میں یا ایک خاص پرزہ بنتا ہے۔ یا وہاں
پر صرف ایک پرزہ کی جوڑائی ہوتی ہے۔ ہر ایک محکمہ اپنے اندر گویا خود ایک چھوٹی سی فیکٹری ہے۔ جہاں پر ایک
پرزہ کچے مسالے کی شکل میں یا ڈھلا ہوا داخل ہوتا ہے۔ باری باری سے کئی مشینوں پر چڑھتا ہے اور گرم کیا جاتا ہے
یا کوئی اور دوسرا عمل جو مناسب ہو کیا جاتا ہے اور تب صرف بالکل تیار ہو کر ہی اپنے محکمہ سے باہر نکلتا ہے۔
محض بار برداری کا کافی انتظام ہونے کی وجہ سے ہم نے جب کاریں بنانی شروع کی تھیں۔ یہ سب محکمے
پاس پاس بنائے گئے تھے۔ اُس وقت مجھے کیا خبر تھی کہ ان کے بیچ میں سے اتنے محکمے اور نکل آئیں گے۔
لیکن جوں جوں مال زیادہ بننے لگا۔ اور محکموں کی تعداد بڑھنے لگی۔ توں توں ہم آٹوموبائلوں کا بنانا چھوڑ کر
صرف پرزے بنانے لگے۔ تب ہم نے دیکھا کہ ہم نے ایک نئی بات دریافت کی ہے۔ اور وہ یہ کہ تمام
پرزوں کو صرف ایک فیکٹری میں بنانا ہرگز لازمی نہیں ہے حقیقت میں یہ کوئی نئی دریافت نہ تھی۔ کچھ کچھ
یہ گھوم پھر کر وہیں پہنچنے والی بات تھی۔ جہاں سے میں شروع میں چلا تھا۔ جب میں موٹریں اور لگ بھگ نوے
فی صدی پرزے خرید کر پہلے پہل بنانے کا کام جاری کیا تھا۔ مگر جب ہم اپنے پرزے خود بنانے لگے۔ تو ہم نے عملی
طور پر گھر بیٹھے ہی یہ فرض کر لیا کہ ان تمام کو ایک ہی فیکٹری میں بنانا لازمی ہے۔ اور ساری کار کو صرف ایک
ہی جگہ بنانے میں کوئی خاص فائدہ رہتا ہے۔ اب ہم سمجھ گئے ہیں کہ یہ محض وہم ہے۔ اور اگر ہم آئندہ کوئی اور بڑی
فیکٹریاں کھڑی کریں گے۔ تو صرف اس لئے کہ ہمیں ایک ایک پرزے کی ضرورت اتنی بڑی تعداد میں پڑے گی
کہ ہر پرزہ بنانے کے لئے ایک علیحدہ بڑی فیکٹری درکار ہو گی مجھے اُمید ہے کہ وقت آئے گا جب ہمارے ہائی لینڈ
پارک کے کارخانہ میں صرف ایک یا دو کام ہی ہوا کریں گے۔ ڈھلائی کا کام تو ابھی سے یہاں سے ہٹ کر
دریا روژ (River Rouge) کے کارخانہ میں چلا گیا ہے۔ سو دھیرے دھیرے جہاں سے ہم چلے تھے وہیں

آ گئے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے ہم پرزے باہر سے خرید کیا کرتے تھے۔ اب ہم پرزے اپنی فیکٹریوں میں بنانے لگے ہیں۔ جو باہر بکھری ہوئی ہیں۔

ان بہتری کے عملوں کو مال تیار کرنے کے واسطے کام میں لانے سے آنے والے زمانے میں نہایت شاندار نتیجے نکلینگے۔ کیونکہ عام طور پر تمام بڑے کارخانوں میں بار برداری اور کامگاروں کی رہائش کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونے کی دقت سدا بنی رہتی ہے جس کی وجہ سے اُن میں پوری تعداد میں اور جتنا اچھا مال بن سکتا ہے تیار ہونے نہیں پاتا۔ مگر جیسا کہ میں اس کتاب میں آگے چل کر کسی بیان میں مفصل بتاؤں گا ہمارے ان مفید تجربوں نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ نہایت کاریگری و علمی لیاقت سے بھرپور بہت سے حصّوں اور پرزوں کو جوڑ کر (کاروں کی طرح کے) مرکب مالوں کو تیار کرنے کے واسطے بڑے بڑے کارخانے کھولنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ان نئے طریقوں سے مال جب کارخانوں میں تیار ہونے لگے گا تو یہ بار برداری اور کامگاروں کی رہائش کے انتظام کی سب تکلیفیں اور رکاوٹیں بالکل جاتی رہیں گی۔ میرے خیال میں ایک فیکٹری کے اندر کام کرنے کے واسطے پانچسو یا حد ایک ہزار آدمی کافی ہیں۔ اتنے آدمیوں کو ان کے گھروں سے فیکٹری تک کام پر لانے اور واپس لے جانے کے لئے نہ کوئی خاص تردّد کرنا پڑے گا اور نہ ان کامگاروں کے رہنے کے لئے گندی سڑی جگہوں میں تنگ کوارٹر بنا کر دینے پڑینگے۔ اور نہ ہی اُن کو صحت کے اور دوسرے قدرتی اصولوں کے خلاف رہنے سہنے پر مجبور ہونا پڑے گا لیکن جب بڑے کارخانے ہوں گے تو وہاں پر یہ سب نقص قدرتی طور پر ضرور موجود رہیں گے۔ کیونکہ اگر اُن میں کام کرنے والے کامگاروں نے کارخانوں کے آس پاس ہی رہنا ہے۔ تو لازمی طور پر بہت بھیڑ ہو جائے گی اور رہائش کی سخت تنگی ہوگی۔

اس وقت ہائی لینڈ پارک کے کارخانہ میں پانچسو محکمے ہیں۔ پکٹ کارخانہ میں صرف اٹھارہ ہوتے تھے۔ اور پہلے ہائی لینڈ پارک کے کارخانہ میں صرف ڈیڑھ سو۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے پرزوں کے بنانے میں کتنی ترقی کی ہے۔

ہر ہفتہ یا تو عمل میں یا مشین میں کہیں نہ کہیں کوئی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اور مزہ یہ ہے کہ کئی مرتبہ اُس تبدیلی لانے سے پہلے سبھی کا یہ خیال ہوتا ہے کہ جس طریقہ سے اب تک کام چلتا آیا ہے اُس سے بہتر کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک خاص مشین بنانے کے واسطے ہم نے

ایک میشین بنانے والے کو بات چیت کرنے کے لئے بلایا ہم نے اُس کو ایک ایسی میشین بنانے کے لئے خواہش ظاہر کی جو فی گھنٹہ دو سونگ تیار کر سکے۔

میشین بنانے والے نے یہ سُن کر کہا کہ آپ کو کچھ غلطی لگ رہی ہے۔ شاید آپ کا مطلب دو سونگ فی دن سے ہے۔ کیونکہ کوئی میشین بھی دو سونگ فی گھنٹہ نہیں نکال سکتی۔

ہماری کمپنی کے افسروں نے اُس آدمی کو طلب کیا جس نے اُس میشین کا ڈھانچہ تیار کیا تھا۔ اور انہوں نے اُس سے بھی یہی خواہش ظاہر کی۔ اُس نے سن کر کہا۔ اچھا تو پھر کیا؟ میشین بنانے والے نے چھاتی ٹھونک کر کہا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی میشین اتنا کام نہیں دے سکتی۔ یہ ناممکن ہے۔

ہمارے انجینیر نے مسکرا کر کہا۔ کیا کہا کہ یہ ناممکن ہے! اچھا ذرا میرے ساتھ بڑے فلور (منزل) تک آؤ تاکہ تمہیں وہاں ایک ایسی میشین چلتی دکھاؤں۔ ہم نے وہاں ایک ایسی میشین لگا رکھی ہے کہ دیکھیں چلتی بھی ہے یا نہیں۔ ہم کو اب اس قسم کی بہت سی اور میشینیں درکار ہیں۔

ہماری فیکٹری ایسے تجربوں کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھتی۔ فورمینوں اور سپرنٹنڈنٹوں کو ہی ایسی باتیں یاد رہتی ہیں۔ اگر ایک طریقہ جو پہلے چلتا تھا اور ناکارہ ثابت ہوا۔ تو وہ کسی نہ کسی کو یاد رہا ہوگا لیکن مجھے اس بات کی کوئی خاص فکر نہیں ہوتی کہ ہمارے کامگاروں کو یہ یاد رہے کہ فلانے آدمی نے فلاں طریقہ پیچھے چلایا تھا۔ مگر چلا نہیں۔ کیونکہ اس طرح کرنے سے دماغ کے اندر اتنی باتیں گھسیڑنی پڑینگی کہ عقل ہی ماری جائے۔ لمبے چوڑے ریکارڈ رکھنے کا ایک یہ بھی بڑا گھاٹا ہوا کرتا ہے۔ جو جو طریقے تم نے آج تک برتے اور بعد میں نکمے ثابت ہوئے اگر تم ان سب کا ریکارڈ بنا کر رکھتے جاؤگے تو تھوڑے عرصہ میں تمہارے پاس ایک ایسی لمبی چوڑی فہرست تیار ہو جاوے گی۔ جسے دیکھ کر تم کہوگے کہ بس ہمارا زور لگ لیا۔ اب اور کچھ کرنا باقی نہیں رہا۔ لیکن یہ ہے بالکل غلط اور جھوٹ۔ کیونکہ اگر ایک آدمی ایک طریقہ پر چلنے سے فیل ہوا ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دوسرا آدمی بھی کامیاب نہیں ہوگا۔

ہمیں بتایا گیا کہ ہم اپنے بے ٹوٹ زنجیر والے طریقہ کے ذریعہ دیگ ہرگز ڈھال نہیں سکتے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس طریقہ پر چلنے سے ہمیں واقعی بہت بار ناکامیابی بھی ہوئی لیکن آج ہم اسی طریقہ سے ڈھال رہے ہیں۔ ہمارے جس آدمی کو اس میں کامیابی ہوئی یا تو اس کو ہماری پچھلی ناکامیوں کی خبر نہ تھی یا اس نے ان کی پرواہ ہی نہیں کی۔ اسی طرح ہمیں کہا گیا تھا کہ بھکنے والی بھٹیوں سے گرم گرم لوہا

نکال کر سیدھا سانچوں میں ڈالنا بالکل ناممکن ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ پہلے کچے لوہے کو ڈلوں کی شکل میں گلا لیا جاتا ہے۔ پھر اس کو کچھ دیر پڑا رہنے دیا جاتا ہے۔ اور تب ڈھالنے کے لئے اس کو دوبارہ پگھلایا جاتا ہے۔ مگر روڑکی کے کارخانے میں ہم اب بھبکنے والی بھٹیوں سے گنبدوں میں بھرے ہوئے لوہے کو وہاں سے نکال نکال کر فوراً سیدھا ڈھالنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب اسی سے اندازہ کر لو کہ کس طرح ناکامیوں کے ریکارڈ کو دیکھ کر خاص کر جب وہ معتبر اور بالکل سچا ہو ایک نوجوان کا حوصلہ ٹوٹ جاتا ہے اور وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کئی بار بے سمجھ لوگوں نے ایسے اندھا دھند تجربے کر کے ہمیں کمال درجے کے فائدے پہنچائے ہیں جن کو کرنا تو دور رہا۔ اُن کے نام سے ہی عقل والے بھی کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔

ہمارے ہاں کوئی کام کے "پورے اُستاد" نہیں ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے تجربے نے ہمارے لئے یہ ضروری کر دیا ہے کہ جوں ہی کوئی آدمی اپنے آپ کو کام کا پورا اُستاد سمجھنے لگتا ہے۔ اس کو فوراً نکال دیا جاوے۔ کیونکہ جو آدمی اپنا کام ٹھیک طور پر جانتا ہے وہ کبھی اپنے آپ کو اُستاد نہیں سمجھتا۔ جو آدمی اپنے کام کی جانکاری رکھتا ہے۔ اُس کو جو کچھ وہ کر چکا ہے اُس سے آگے کرنے کو اتنا نظر آتا ہے کہ وہ سدا آگے بڑھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اور اُس ایک منٹ کے لئے بھی کبھی خیال نہیں آتا کہ وہ اتنا لائق اور ہوشیار ہو گیا ہے۔ اگر آدمی ہمیشہ آگے بڑھنے پر نظر رکھے۔ اور آگے کو اور بھی زیادہ کوشش کرنے کی ٹھان لے تو اُس کو ایسا لگے گا کہ دُنیا میں کوئی کام بھی ناممکن نہیں لیکن جوں ہی آدمی اپنے آپ کو "اُستاد" سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے لئے کرنے کو بہت سی باتیں ناممکن ہو جاتی ہیں۔

مجھے یہ ماننے سے انکار ہے کہ فلاں کام بالکل ناممکن ہے۔ میں جانتا ہوں کہ دُنیا میں کسی کو بھی کسی شے کی نسبت اتنی خبر نہیں ہو سکتی جو پختہ طور سے کہہ سکے کہ کیا کرنا ممکن ہے اور کیا نہیں۔ اگر صحیح طور پر تجربے کئے جاویں۔ اور ٹھیک طریقے پر ٹیکنیکل تعلیم دی جاوے تو اس سے انسان کا دماغ بڑھتا ہے۔ اور ایسے کاموں کی تعداد جن کو وہ پہلے ناممکن سمجھتا تھا گھٹنے لگتی ہے لیکن بد قسمتی سے ایسی تعلیم ملتی نہیں۔ عام طور پر جو ٹیکنیکل تعلیم دی جاتی ہے اور تجربے کئے جاتے ہیں وہ محض پچھلی ناکامیابیوں کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ اس سے کچھ سبق حاصل کیا جاوے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ یہ ریکارڈ اس بات کا پکا ثبوت ہے کہ آئندہ اس لائن میں اور ترقی ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ اگر کوئی آدمی جو اپنے آپ کو ایک کام

پورا اُستاد" سمجھتا ہے کہدیتا ہے کہ فلاں کام ہونا ناممکن ہے۔ تو اُس کے بہتیرے بے سمجھ چیلے چانٹے بھی ایک ساتھ چلانا شروع کر دیتے ہیں کہ فلاں کام ہونا ناممکن ہے۔

مثال کے طور پر ڈھالنے کی بات کو لو۔ ڈھالنے میں شروع سے بہت سی چیز ضائع چلی جاتی ہے۔ اور یہ عمل اتنا پرانا ہے۔ اور اس کے ارد گرد اتنے قاعدے بندھ گئے ہیں کہ ان کو توڑ کر اس میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنا خاص مشکل کام ہے میرا خیال ہے کہ سانچے کے کام کے ایک اُستاد نے یہ رائے ظاہر کی تھی۔ اور یہ رائے اُس نے ہمارے تجربے شروع کرنے سے پہلے ظاہر کی تھی۔ کہ اس کام کے کرنے میں جو آدمی چھ مہینے کے اندر اندر لاگت گھٹا دینے کا اقرار کرتا ہے اول درجہ کا دھوکہ باز ہے۔

ہماری فونڈری بھی بہت حد تک اوروں جیسی ہوا کرتی تھی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں جب ہم نے پہلے پہل ماڈل ٹی (T) کے سیلنڈر ڈھالے۔ تو سارا کام ہاتھ سے کیا جاتا تھا اور چاروں طرف کڑچھے اور ایک پہیئے کی گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ اس وقت کام کرنے والے یا تو جانکار کامگار ہوتے تھے یا اناڑی یعنی تب ہمارے ہاں صرف سانچے بنانے والے اور مزدور لوگ کام کیا کرتے تھے۔ اس وقت ہمارے پاس پانچ فی صدی تو پکے جانکار سانچے بنانے والے اور درمیانی باری جمانے والے ہیں مگر باقی پچانوے فی صدی اناڑی ہیں۔ یا صاف صاف یوں کہو کہ باقی پچانوے فی صدی ایسے لوگ ہیں جن کو صرف ایک عمل میں جسے بدھو سے بدھو بھی دو دن کے اندر اچھی طرح سے سیکھ سکتا ہے۔ خوب پکی جانکاری لازمی طور پر حاصل کرنی پڑتی ہے۔ سانچے بنانے کا سارا کام مشینوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ہر ایک پرزہ کے جو ہم نے ڈھالنا ہوتا ہے اپنی تیار مال کی سکیم کے مطابق جتنی تعداد درکار ہوتی ہے ہم ایک یا زیادہ حصے بنا لیتے ہیں۔ ہر حصے کی مشینری اُس کے ڈھالنے کے عین مطابق بنی ہوتی ہے اور اُس حصے کے تیار کرنے والوں میں سے ہر آدمی کو ہمیشہ صرف ایک ہی عمل کرنا پڑتا ہے۔ ایک حصے میں سر کے اوپر چلنے والی ایک ریل گاڑی ہوتی ہے جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سانچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے پلیٹ فارم لٹکائے ہوئے ہوتے ہیں۔ گہری ٹیکنیکل باتوں میں نہ پڑ کر صرف اتنا کہہ دیتا ہوں کہ سانچوں اور ان کی درمیانی باری کا بنانا جمانا وغیرہ وغیرہ یہ سب کام پلیٹ فارموں پر حرکت کرتے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور کام چلتے چلتے میں ہی دھات ایک اور جگہ دھار میں ڈالی جاتی ہے۔ اور جب تک سانچہ جس میں دھات ڈالی گئی ہے اپنی آخری جگہ پر پہنچتا ہے

تب تک اتنا ٹھنڈا ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ کام کرنے والی مشینوں کے ذریعے یہ صاف ستھری ہو کر دوسری مشینوں پر چڑھنے اور کار کی جوڑائی میں کام آنے کے قابل بن جاتا ہے۔ ادھر وہ پلیٹ فارم گھوم کر اور بوجھ لانے کے لئے واپس ہوتا ہے۔

اسی طرح دیکھیے کہ پسٹن راڈ کی جوڑائی میں اب کتنا فرق ہو گیا ہے۔ پرانے طریقے کے مطابق بھی اس عمل کو کرنے میں صرف تین منٹ لگتے تھے۔ اور اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ اس مطلب کے لئے کل دو بنچیں اور اٹھائیس آدمی ہوتے تھے جو روزانہ نو گھنٹے کام کر کے ایک سو پچھتر پسٹن راڈ جوڑا کرتے تھے۔ یعنی ہر نگ کے لئے تین منٹ اور پانچ سیکنڈ خرچ ہوتے تھے۔ انکی کوئی جانچ نہیں ہوا کرتی تھی۔ اور بہت سے جڑے ہوئے پسٹن اور راڈ موٹر کار کی جوڑائی کے محکموں سے ناقص ہونے کی وجہ سے واپس آجاتے تھے۔ سارا عمل بہت سیدھا سادہ ہے۔ کامگار دھکا مار کر پسٹن سے پن کو باہر نکال دیتا ہے۔ پن کو تیل دیتا ہے۔ راڈ کو اپنی جگہ پر جما دیتا ہے اور پن کو راڈ اور پسٹن کے بیچ میں ڈال کر ایک پیچ کس دیتا ہے اور دوسرا ڈھیلا کر دیتا ہے۔ بس یہی سارا کام ہے لیکن جو فورمین اس کام کے چارج میں تھا اُس کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ اتنے ذرا سے کام کرنے میں تین منٹ کیوں لگ جاتے ہیں۔ اُس نے ایک سٹاپ واچ (ہر کام کا پورا پورا وقت ناپنے والی گھڑی) کے ذریعہ اس کام کی ایک ایک حرکت کی جانچ پڑتال کی اور دیکھا کہ دن کے نو گھنٹوں میں چار گھنٹے تو کامگاروں کے گھومنے پھرنے میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ جڑیئے کو کہیں آنا جانا نہیں پڑتا تھا۔ مگر اس کو اپنی چیزیں اکٹھی کرنے کے واسطے اور تیار مال کو اپنے سے ذرا فاصلہ پر رکھنے کے لئے کچھ ہاتھ پاؤں ہلانے پڑتے تھے سارا کام ختم کرنے کے لئے ہر آدمی کو چھ آدمی عمل کرنے پڑتے تھے۔ فورمین نے ایک نیا طریقہ نکالا اُس نے سارے عمل کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ بنچ پر ایک ڈھال لگا دی اور اُس کے دونوں طرف تین تین آدمی بٹھا دیئے۔ اور سرے پر ایک انسپکٹر مقرر کر دیا۔ اس طرح اب ایک آدمی کو سارا عمل خود کرنے کی بجائے صرف آگے کا ایک تہائی عمل کرنا ہوتا تھا۔ یعنی صرف اتنا کام جس کو وہ بنا پاؤں ہلائے کر سکے۔ اٹھائیس کی بجائے اب یہ دستہ صرف چودہ آدمیوں کا کر دیا گیا۔ آگے اٹھائیس آدمی ایک آدمی ایکسو پچھتر ایسی جڑائیاں کرتے تھے۔ اب سات آدمی آٹھ گھنٹے میں یہ چھبیس سو جڑائیاں کرتے ہیں۔ ہے کچھ ہماری بچت کا ٹھکانا!

کسی وقت ہم کو پچھلے دھرے والے حصے کو پینٹ کرنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اسکو ہاتھ سے پکڑ کر انیمل کے تالاب میں ڈبونا پڑتا تھا۔ یہ عمل کئی بار کرنا پڑتا تھا۔ اور یہ کام دو آدمی کیا کرتے تھے ہم نے اپنی فیکٹری میں ہی اس کام کے لئے ایک خاص مشین تیار کرکے بنوائی ہے۔ اور اب یہ سارا کام صرف ایک آدمی کے سپرد ہے۔ یہ آدمی اس حصے کو ایک گھومتی ہوئی زنجیر پر صرف ٹانگ دیتا ہے جس سے یہ حصہ انیمل کے تالاب کے عین اوپر پہونچ جاتا ہے۔ تب دو ڈنڈوں (LEVERS) کے ذریعہ اس کے لیڈل شافٹ (LEDIE SHEFT) کے کونوں پر پھانسیں جکڑ دی جاتی ہیں۔ پینٹ کا تالاب ہفٹ اونچا اُٹھتا ہے۔ اور دھرے کو ڈبو کر پھر اپنی اصلی پوزیشن (حالت) پر آجاتا ہے ادھر دھرا خشک کرنے والے چولھوں میں پہنچ جاتا ہے۔ اتنے سارے یہ سب کام کرنے کو اب کل تیرہ سکنڈ لگتے ہیں۔

ریڈیئیٹر کا بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے اور اس کو ٹانکا لگانا ایک زمانہ میں بڑی ہوشیاری کا کام ہوا کرتا تھا ایک ریڈیئیٹر میں پچانوے ٹیوبیں (نلکیاں) ہوتی ہیں۔ ہاتھ سے ان ٹیوبوں کو جڑنا اور ٹانکا لگانا لمبا عمل ہے۔ اور اس کے لئے بڑی لیاقت اور لمبا وقت دونوں درکار ہیں۔ اب یہ سارا کام ایک مشین کے ذریعہ ہونے لگا ہے جو آٹھ گھنٹے میں بارہ سو ریڈیئیٹر کی درمیانی باریاں تیار کر ڈالتی ہے۔ تب ان باریوں کو ٹھیلتے ہوئے ایک بھٹی کے بیچ میں سے گذار کر اپنی اپنی جگہوں پر ٹانکا لگا دیا جاتا ہے۔ نہ ٹانکا لگانے والے کی ضرورت نہ کوئی خاص لیاقت!

ہوا کی داب سے کام کرنے والے ہتھوڑوں کو سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔ ہم ان کے ذریعہ کرینک کیس کے بازوؤں کو کرینک کیس میں ٹھونکا کرتے تھے۔ چھ آدمی ہتھوڑے پکڑے رہتے تھے۔ اور چھ آدمی ان کیسوں کو۔ اور تب اتنا شور و غل ہوتا تھا۔ کہ کان پھٹے جاتے تھے۔ اب صرف ایک آدمی ایک اپنے آپ چلنے والے پریس کے ذریعہ ان بارہ آدمیوں سے پانچ گنا کام اکیلا ایک دن میں کر لیتا ہے۔ اور یہ آدمی سوائے اس پریس کو چلانے کے اور کچھ نہیں کرتا۔

پکیٹ کے کارخانہ میں سلنڈر کے کاسٹنگ کو تیار ہونے میں چار ہزار فٹ سرکنا پڑتا تھا اب یہ کام صرف تین سو فٹ سے کچھ اوپر میں ہی ہو جاتا ہے۔

مسالوں کے رکھنے یا اُٹھانے میں ہاتھ سے بالکل کام نہیں لیا جاتا۔ ہاتھ سے کرنے کا ایک بھی عمل نہیں۔ اگر ایک مشین ایسی بنائی جا سکتی ہے جو خود بخود کام کرتی چلی جائے تو یہ فوراً تیار کرا دی جاتی ہے

کسی بھی عمل کی بابت کبھی بھی یہ فرض نہیں کر لیا جاتا کہ یہ کام اس سے بہتر طریقہ اور لاگت میں نہیں ہو سکتا
ہمارے سو میں دس اوزار شاید خاص ہوں. باقی تمام اپنے اپنے کام کے مطابق معمولی مشینوں کی
طرح کام دینے والے اوزار ہوتے ہیں اوزار لگ بھگ پاس رکھے ہوئے ہوتے ہیں. دنیا میں
ہمارے کارخانہ جتنی زیادہ مشینری فی مربع فٹ کسی اور کارخانہ میں نظر نہیں آئیگی
کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ایک جگہ بھی خالی رہی تو مفت کا کارخانہ کے سر پر
افزودہ خرچہ چڑھ رہا ہے. ہم ایک دمڑی بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے. تو بھی ضرورت کے مطابق
ہمارے پاس کافی جگہ ہے. نہ کسی کامگار کے پاس فالتو جگہ بچتی ہے. نہ اُسے جگہ کی تنگی ہے. کام
کے عملوں کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا اور پھر ان ٹکڑوں کو اور چھوٹے کرتے جانا اور سدا کام کو حرکت میں رکھنا
یہ ہیں تیار مال کی تعداد بڑھانے کے اصلی گُر. مگر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ تمام پُرزوں کی شکل و
صورت ایسی ہونی چاہئے جو نہایت آسانی سے بن بھی سکیں. بس پھر بچت کا کیا ٹھکانا ہے! گو
مقابلہ کرنا مناسب نہیں. تو بھی ہماری یہ سب کچھ ترقی دیکھ کر آدمی کی عقل چکرا جاتی ہے جس تیز
رفتار سے ہم اس وقت اپنے کارخانوں میں مال تیار کر رہے ہیں. اُس کے لئے اگر ہم اُس حساب سے
ملازم رکھیں. جب ہم نے ۱۹۰۳ء میں کام شروع کیا تھا. اور وہ آدمی کار کے حصے اور پرزے بنایا
نہیں کرتے تھے بلکہ صرف ان کو جوڑ کر کاریں کھڑی کر دیتے تھے تو آج ہمیں دو لاکھ کامگاروں کی فوج
کو نوکر رکھنا پڑتا. لیکن ہم آج کل لگ بھگ چار ہزار کاریں روزانہ تیار کر رہے ہیں. اور ہمارے
کامگاروں کی تعداد پچاس ہزار سے بھی کم ہے!

بیان چھ

میشین اور کامگار

جہاں پر بہت سے آدمی ایک جگہ مل کر کام کرتے ہوں۔ وہاں سب سے زیادہ اس خدشہ سے بچنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے کہ کہیں یہاں پر بھی سرکاری دفتروں کی طرح عہدہ داروں کی بھرمار نہ ہو جائے۔ جن کے چکّر میں پھنسکر سب معاملے کھٹائی میں پڑ جاتے ہیں اور کوئی بات وقت پر طے نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں لمبے چوڑے قاعدے اور قانون بنانے کی "کمال قابلیت" بیوپار کو تباہ کرنے کے واسطے سب سے تیز زہر ہے۔ کیونکہ عام طور پر اس کا فائدہ صرف اتنا ہی ہوا کرتا ہے کہ کسی خاندان کے کرسی نامہ کی طرح ایک بڑا سا درخت جس کی ہر شاخ کے اندر سے پھوٹ پھوٹ کر عہدوں کی ٹہنیاں نکل رہی ہوں تیار ہو جاتا ہے۔ یہ درخت نفیس گول گول بیروں سے لدا کھڑا ہے۔ اس کے ہر بیر پر ایک نہ ایک عہدہ یا آدمی کا نام ہے۔ ہر آدمی کے عہدہ کا کھرا سا اک نام ہے۔ اور جتنا موٹا یا چھوٹا وہ بیر ہے اُس کے لحاظ سے اُس کے گلے کچھ کام مڑھ دیا گیا ہے۔

اگر ہتی پرال کے انچارج منشی نے جنرل سپرنٹنڈنٹ سے کوئی بات کرنی ہے تو اُس کے سندیسہ کو سب فورمین۔ فورمین۔ محکمہ کے افسر اور تمام اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹوں کے ہاں سے گزرنا پڑیگا تب کہیں جا کر اسے جنرل سپرنٹنڈنٹ کے درشن ہوں گے اور اس عرصہ میں شاید جس بات کا اس نے ذکر کرنا تھا اُس کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ ایک معمولی کامگار کے سندیسہ کو کمپنی کے بورڈ کے پریزیڈنٹ یا چیرمین کے پاس پہنچنے میں چھ ہفتے لگ جاتے ہیں۔ اوّل تو یہ پہنچتا ہی بہت کم ہے۔ اور اگر پہنچ بھی

جاوے۔ تو ان اونچے افسروں تک پہنچتے پہنچتے اس کے ساتھ آدھ سیر کے قریب اعتراض، نئی تجویزیں اور نکتہ چینیاں نتھی کی ہوئی ہوتی ہیں۔ بہت کم ایسے معاملے ہوتے ہوں گے جن پر وقت گزر جانے کے بعد ہی سرکاری طور پر غور نہ کیا جاتا ہو۔ اتنا عرصہ کاغذی گھوڑے ادھر سے ادھر دوڑتے رہتے ہیں۔ اور ہر آدمی دوسرے پر ذمہ داری ڈالنے کی کوشش میں مثل اپنی میز سے اٹھا کر دوسرے کے سامنے ڈالتا رہتا ہے۔ کیونکہ سب کے دل میں یہ واہیات خیال بیٹھا ہوا ہے کہ ایک کی بجائے دو آدمی ایک سوال کا فیصلہ کرنے کے لئے کہیں بہتر ہیں۔

مگر میری رائے میں بیوپار کوئی میٹنگ نہیں ہے۔ کارخانہ میں لوگ اسی لئے اکٹھے ہوتے ہیں کہ وہ کام کریں۔ نہ کہ ایک دوسرے کو چٹھیاں پرچے لکھتے رہیں۔ ایک محکمہ کو یہ جاننے کی بالکل کوئی ضرورت نہیں کہ کسی دوسرے محکمہ میں کیا ہو رہا ہے۔ اگر ایک آدمی اپنا کام کر رہا ہے تو اس کو کسی اور کام کرنے کی فرصت کہاں۔ یہ دیکھنا کہ سبھی محکمے اپنا اپنا کام ٹھیک اندازہ سے کر رہے ہیں ان لوگوں کا کام ہے جو کارخانہ کے تمام کام کی سکیم اور پالیسی مقرر کرتے ہیں۔ کامگاروں اور محکموں کے درمیان آپس میں پیار محبت ڈالنے کے لئے کانفرنسیں کرنا ضروری نہیں ہے۔ اکٹھے کام کرنے کے لئے کامگاروں کا ایک دوسرے کو پیار کرنا لازمی نہیں ہے۔ بلکہ اصل دیکھا جائے تو زیادہ دوستی ہونے سے کئی بار بہت برے نتیجے نکلتے ہیں۔ کیونکہ تب ایک کامگار اپنے یار کے قصوروں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں دونوں کا سخت نقصان ہے۔

اصول یہ ہونا چاہئے کہ جب کام کرو۔ تو خوب دل لگا کر کرو۔ اور جب کھیلو تو صرف کھیل میں اپنا دھیان لگاؤ۔ مگر دونوں چیزوں کو ہرگز کبھی مت ملاؤ۔ صرف غرض یہ ہونی چاہیئے کہ کامگار پورا پورا کام کریں۔ اور ان کو پوری محنت ملے۔ جب کام ختم ہو جائے تو پھر مزے کریں لیکن اس سے پہلے ہرگز نہیں۔ بس اس طرح فورڈ کے کارخانوں اور دھندوں میں نہ دفتر ہیں نہ خاص عہدے جن کے خاص خاص فرض ہوں۔ نہ یہ مقرر ہے کہ فلاں کے بعد فلاں کو یہ نوکری یا افسری ضرور ملے گی ہمارے ہاں بہت کم رعب دار ناموں کی نوکریاں ہیں۔ نہ کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ ہم صرف اتنے کلرک رکھتے ہیں جن کے بغیر گزارہ نہیں۔ ہم کوئی لمبا چوڑا ریکارڈ نہیں رکھتے اس لئے نہ مثلیں بنتی ہیں۔ نہ دیر ہوتی ہے۔

ہم ہر ملازم پر پوری ذمہ داری ڈال دیتے ہیں۔ کامگار اپنے کام کے لئے پورے طور پر ذمہ دار ہے گھاس پھوس کا منشی اپنے ماتحتوں کا ذمہ دار ہے۔ فورمین اپنے آدمیوں کا ذمہ دار ہے محکمہ کا افسر اپنے محکمہ کا ذمہ دار ہے جنرل سپرنٹنڈنٹ تمام فیکٹری کا ذمہ دار ہے۔ ہر آدمی کو اپنے حلقہ کی پوری پوری خبر ضرور رکھنی پڑتی ہے۔ میں نے اوپر جنرل سپرنٹنڈنٹ کہا ہے۔ لیکن اصل میں ہمارے ہاں ایسا کوئی خاص عہدہ نہیں ہے۔ ایک آدمی کے چارج میں فیکٹری ہے۔ اور کئی سالوں سے ہے اس کے نیچے دو آدمی اور ہیں جن کی کوئی خاص ڈیوٹی تو مقرر نہیں لیکن انہوں نے آپس میں سارے کام کو حصوں میں بانٹ لیا ہے۔ ان کے پاس مدد کرنے کو چھ اور نائب رہتے ہیں جن کے ذمہ الگ الگ خاص کوئی فرض نہیں۔ ان سب نے اپنے اپنے آپ کام مقرر کر لئے ہیں لیکن ان کے کاموں کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اپنے لائق جو کام دیکھتے ہیں سب کر لیتے ہیں۔ ایک آدمی سٹاک اور کچے مال کا خاص دھیان رکھتا ہے۔ دوسرا مال کی جانچ پڑتال پر توجہ دیتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک نے اپنی اپنی لائن بنائی ہوئی ہے دیکھنے میں یہ سلسلہ اوٹ پٹانگ سا نظر آتا ہے۔ مگر یہ بات نہیں۔ چند آدمیوں کے دستہ کامگاروں سے کام پورا کرانے کا دل میں ٹھان لیتے ہیں۔ اور وہ کام پورا کرا کے چھوڑتے ہیں۔ وہ افسری کی خالی شان میں آکر بیٹھے نہیں رہتے۔ کیونکہ انہیں عہدوں کا خیال نہیں ہوتا۔ اگر ان کے پاس بڑے بڑے عہدے ہوتے تو اب تک وہ کبھی کے اپنے دفتروں کی کرسیوں پر بیٹھ کر تھیٹی تیری وغیرہ لکھنے میں اپنا سارا وقت کھو دیا کرتے اور دن رات یہی سوچتے رہتے کہ میرا دفتر فلاں افسر کے دفتر سے بہتر کیوں نہیں بنا!

کیونکہ ہمارے ہاں کوئی عہدے نہیں نہ افسری کی شان۔ اس لئے نہ دفتری ہیرا پھیری کا کوئی سوال نہ کسی کا حق مارا جاتا ہے۔ ہر کامگار بڑے سے بڑے افسر کے پاس سیدھا پہنچ سکتا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہمارے کارخانہ میں اب اتنا پکا ہو گیا ہے کہ اگر کوئی کامگار اپنے فورمین کی شکایت کرنے کے لئے سیدھا فیکٹری کے منیجر کے پاس چلا جاتا ہے تو فورمین اس حرکت سے ناراض نہیں ہوتا۔ مگر کامگار کو ایسا کرنے کا بہت کم موقع ہوتا ہے۔ کیونکہ جس طرح فورمین کو اپنا نام یاد رہتا ہے۔ اسی طرح وہ یہ بات کبھی نہیں بھولتا کہ اگر اس نے اپنے ماتحت کے ساتھ بے انصافی کی ہوگی تو وہ جلدی پکڑا جائے گا اور تب وہ آئندہ فورمین نہیں رہ سکے گا۔ ہم ہرگز کسی قسم کی بے انصافی برداشت نہیں کرتے۔ جوں ہی ہمیں یہ پتہ لگتا ہے کہ فلاں آدمی کے

دماغ میں اب افسری کا نشہ چڑھنے لگا ہے۔ ہم فوراً اُس کو جواب دے دیتے ہیں۔ یا اُسے پھر کسی مشین پر کام کرنے کے لئے لگا دیا کرتے ہیں۔ اکثر کر کے مزدوروں میں جو ہلچل پیدا ہوا کرتی ہے۔ اُس کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کے منشی لوگ ان پر ناجائز رعب اور ہیکڑی جمانے لگتے ہیں۔ اور مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اکثر کر کے کارخانوں میں مزدوروں کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا۔

صرف کام ہی ہمارا افسر ہے جس کے ماتحت ہو کر ہم چلتے ہیں۔ اسی لئے ہمارے ہاں عہدوں کے کوئی شاندار نام نہیں۔ بہت آدمی کام کرنے میں بڑے لائق ہوتے ہیں لیکن جوں ہی ان کے نام کے پیچھے کسی شاندار عہدے کا دُم چھلّا لگا دیا جاوے ان کی ساری لیاقت دھری دھرائی رہ جاتی ہے۔ عہدے کے شاندار نام کا آدمی پر خاص اثر پڑتا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کام کرنے سے چھٹی پانے کا ٹکٹ ہے۔ یا یوں سمجھو کہ یہ ایک بلّہ ہے جس پر یہ لفظ لکھے ہوئے ہیں:- اس آدمی کو کچھ کام کرنے کی ضرورت نہیں مگر اس کو حق حاصل ہے کہ اپنے کو بڑا اور دوسروں کو چھوٹا سمجھے۔"

نہ صرف شاندار نام دھرانے والے کو اکثر نقصان پہنچاتا ہے۔ بلکہ اس کا اوروں پر بھی بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ کامگاروں کو ذاتی طور پر کسی اور بات سے اتنی جلن پیدا نہیں ہوتی جتنی یہ دیکھ کر کہ عام طور پر شاندار نام دھرانے والے اصل میں اُن کے لیڈر (یعنی افسر) کہلانے کے قابل نہیں ہوتے۔ اگر کسی میں افسر بننے کی اصل لیاقت ہے یعنی اُس کے اندر کام کی سکیم بنانے اور کام کرانے کی ہمّت ہے تو سبھی اُس کو مان لیں گے۔ جو واقعی لیڈر ہے۔ اور اُس کو ایک شاندار نام والا عہدہ بھی مل گیا ہے۔ وہ اس طرح سے کام کرتا ہے کہ جب تک بتلایا نہ جائے کسی کو اُس کے بڑے عہدے کا پتہ نہیں چلتا۔ کیونکہ وہ شیخی بگھارتا نہیں پھرتا۔

بیوپار میں شاندار ناموں کی بھرمار ہو گئی ہے۔ اور اس سے بیوپار کو بڑا دھکّا لگا ہے۔ اس کا ایک نقصان یہ ہے کہ عہدوں کے شاندار ناموں کے مطابق ذمہ داری تقسیم ہو جاتی ہے۔ اور یہاں تک کہ ذمہ داری بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ جب ذمہ داری کے بہت سارے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لئے جاتے ہیں اور اُس کو کئی محکموں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ اور ہر محکمہ کے اوپر ایک شاندار نام کے عہدیدار منشی رکھ دیا جاتا ہے جس کے ماتحت اور چند آدمی خوبصورت نام کے چھوٹے عہدوں پر مقرر ہوں تو ڈھونڈنے پر مشکل سے ایسا کوئی آدمی وہاں پر ملے گا جو اپنے سر ذرا بھی اصلی ذمہ داری لیتا ہو۔ امریکہ میں ایک کھیل ہے جس میں

ہر کھلاڑی اپنا قصور یا بوجھ دوسرے پر ڈال دیتا ہے۔ وہاں ہر آدمی اس کھیل کو جانتا ہے۔ میرا خیال ہے
کہ اس کھیل کے بنانے والے کو اس کا خیال اس قسم کے کارخانوں اور کمپنیوں کو دیکھ کر ہی پیدا ہوا ہوگا
جہاں ہر افسر یا ملازم ذمہ داری دوسرے پر جھٹ ڈال دیتا ہے۔ ہر کمپنی کی ترقی اسبات پر منحصر ہے۔ کہ اُس کا
ہر ایک ملازم خواہ چھوٹا ہو یا بڑا یہ محسوس کرے کہ جو کام اُس کے حلقہ میں یا اُس کے سامنے ہو رہا ہے۔ اُس کے بہتر
یا خراب ہونے کی ساری ذمہ داری اُس کے سر پر ہے (امریکہ کی) ریلوے کمپنی اسی وجہ سے فیل ہو گئی۔
کیونکہ جب کوئی بات ہوتی تھی تو اس کا ہر دفتر یہ لکھ کر معاملہ ٹال دیتا تھا کہ "ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں
فلاں محکمہ یا دفتر کے جو یہاں سے سو میل کے فاصلہ پر ہے یہ کام سپرد ہے۔"

افسروں کو بار بار یہ صلاح دی جایا کرتی تھی کہ اپنے عہدوں کی شان میں نہ رہا کرو۔ صرف اسی سے
ظاہر ہوتا ہے کہ حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ ایسی صلاح دینے سے مطلب حل ہوتا مشکل نظر آتا تھا۔ اسکا
اصلی علاج بس ایک ہی ہے کہ عہدوں کے شاندار ناموں کو بالکل اُڑا دیا جاوے۔ قانون کا پیٹ
بھرنے کے لئے شائد چند ضروری ہوں۔ اور ممکن ہے چند عہدوں کے نام کمپنی میں ہونے سے پبلک کو پتہ
لگانے میں بڑی سہولت ملتی ہو۔ کہ اس کمپنی سے کاروبار کرنے کے واسطے اور فلاں کام کرنے کے لئے کس
افسر کے پاس جانا چاہیئے۔ مگر باقی تمام عہدوں کے بارے میں سب سے عمدہ یہی سادہ اصول ہے۔ کہ
ان کو ایک دم موقوف کر دو۔

اصل بات یہ ہے کہ اگر آج کل کے سارے بیوپار کے ریکارڈ پر غور سے دیکھا جاوے تو پتہ چلے گا۔ کہ
اب عہدوں کے شاندار ناموں کی وہ پہلے والی قدر نہیں رہی۔ آج کوئی شخص ایک دیوالیہ بینک کا پریزیڈنٹ
کہلانے میں اپنی بڑائی نہیں سمجھے گا۔ کیونکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی تک کسی بیوپار یا دھندے کی کشتی اسی لیاقت
اور ہنر سے نہیں چلائی گئی ہے۔ جس پر اس کے ملاح بہت فخر کر سکیں۔ جو شاندار نام کے عہدوں پر مقرر
ہیں اور واقعی ان عہدوں کے قابل ہیں وہ وہ آدمی ہیں جو اپنے عہدوں کی شان میں نہیں رہتے۔ بلکہ
کوٹ پتلون پرے پھینک کر اپنے کارخانہ یا کمپنی کی جڑوں تک گھن کے کیڑوں کی طرح اپنے نقصوں اور
خرابیوں کو کھوجتے پھرتے ہیں۔ گویا اُنہوں نے جس چھوٹی نوکری پر وہ پہلے دن بھرتی ہوئے تھے۔ وہیں سے
پھر ڈٹ کر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اپنی فرم کو نیچے سے اوپر ابھارنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک
آدمی جب سچے دل سے ایک کام میں لگ جاتا ہے تو پھر اُسے کسی شاندار نام کے عہدہ کی پرواہ نہیں رہتی۔

اُس کا کام اپنے آپ اُس کو نشان دیتا ہے۔

ہماری فیکٹری یا دفتروں میں جتنے آدمی ملازم رکھے جاتے ہیں۔ ان سب کا پہلے ہمارے بھرتی کے محکموں میں باقاعدہ چناؤ ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ ہم کام کے اُستادوں کو ملازم بھرتی نہیں کرتے۔ نہ ہم نوکری دیتے وقت یہ خیال کرتے ہیں کہ اس شخص نے پہلے کام کتنا سیکھا ہوا ہے۔ اور کیا اور سب سے پہلے ہر شخص کو سب سے چھوٹی جگہ پر بھرتی ہونا پڑتا ہے۔ ہم کسی شخص کا پچھلا ریکارڈ دیکھ کر نوکری نہیں دیتے اور اس لئے پچھلے ریکارڈ کی وجہ سے کسی کو جواب نہیں دیتے۔ مجھے آج تک ایک بھی ایسا آدمی نہیں ملا جس کے اندر ایک بھی اچھی صفت نہ ہو۔ ہر ایک آدمی کے اندر ایک نہ ایک بات اچھی ضرور ہوتی ہے۔ صرف اُسے موقع ملنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایک آدمی کے پچھلے ریکارڈ کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ ہم آدمی کو نوکر رکھ رہے ہیں نہ کہ اُسکے پچھلے ریکارڈ کو۔ اگر ایک آدمی جیل میں رہ آیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ پھر قید ہونے کی کوشش کرے گا۔ بلکہ اُلٹا وہ ہر ممکن ذریعہ سے موقعہ ملنے پر یہی کوشش کرے گا کہ اُس کو پھر کبھی قید نہ ہو۔ ہمارا کوئی بھرتی کرنے کا محکمہ یا دفتر کبھی کسی آدمی کو اُس کے پچھلے ریکارڈ کی وجہ سے انکار نہیں کرتا۔ چاہے وہ کالا پانی رہ کر یا لمبی قید کاٹ کر آیا ہو۔ نہ ہم کبھی یہ پوچھنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں کہ تم نے بی۔ اے کہاں سے پاس کیا ہے۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ بھرتی ہونے والے میں کام کرنے کی خواہش ہو۔ اگر اُس کے اندر کام کرنے کی خواہش نہیں ہے تو وہ کسی بڑی نوکری کے لئے درخواست دینے کی جراٴت ہی نہیں کرے گا کیونکہ ہر شخص اچھی طرح سے جانتا ہے کہ فورڈ کے کارخانہ میں صرف اُسی کا گزارہ ہے جو کام کرے۔

مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس بات کی ذرا پرواہ نہیں ہوتی کہ ایک آدمی آج تک کیا کرتا رہا ہے۔ اگر اُس نے کسی کالج میں تعلیم حاصل کی ہوئی ہے تو اوروں کے مقابلہ میں اُسے جلدی بڑھنا چاہئے۔ لیکن اُسے کام پہلے درجہ سے ہی شروع کرنا پڑے گا۔ اور اُس کو اپنی لیاقت کا ثبوت دینا ہوگا۔ ہر شخص کی ترقی اُس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یہ کہنا کہ آج کل لیاقت کی قدر کہیں نہیں ہوتی۔ بالکل واہیات بات ہے۔ کم سے کم ہمارے کارخانہ میں ہر ملازم کو اس بات کا پورا بھروسہ ہے کہ جتنی اُس میں لیاقت ہو اُس کے بموجب ضرور اُس کی قدر ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ اپنی قدر افسروں کی نگاہ میں کروانے کی اس خواہش کی وجہ سے جلد

عیب بھی ضرور پیدا ہو گئے۔ جن سے احتیاط کرنا ہمارے لئے لازمی ہے۔ صنعت کے موجودہ سسٹم نے اتنا بد شکل بنا دیا ہے گویا یہ بھوت کی طرح تمام ملازموں اور کارخانوں میں کام کرنے والے کامگاروں کو چمٹ گئی ہے۔ پہلے ہر شخص کی ذاتی ترقی اس کا کام دیکھ کر ہوا کرتی تھی۔ اور کسی کی سفارش یا مہربانی کا اس معاملہ میں رتی بھر دخل نہ ہوتا تھا۔ لیکن آج کل زیادہ تر ترقی اُس خوش قسمت انسان کی ہوتی ہے جس کی مدد پر کوئی بڑا آدمی ہوتا ہے۔ مگر ہم نے یہ قاعدہ اپنے ہاں بالکل چلنے نہیں دیا۔ کیونکہ تب کامگاروں کی یہ خواہش ہی رہتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے افسر کی نگاہ میں چڑھ جائیں۔ اور وہ اس خیال سے کام کرتے ہیں کہ اگر جو کچھ وہ کرتے ہیں اُس کی ان کو شاباش نہ ملی۔ تو پھر چاہے کام بُرا کیا یا نہ کیا ایک برابر ہے۔ اس طرح بہت بار کامگار کے دل میں کام بڑھیا کرنے کا اتنا فکر نہیں ہوتا۔ اور اُس کا اصلی دھیان اپنی ڈیوٹی پوری کرنے میں یا پرزہ وغیرہ میں جسے بنانے کا کام اُس نے ہاتھ میں لے رکھا ہے نہیں لگتا۔ اسے رات دن صرف اپنی نجی ترقی کی دُھن لگی رہتی ہے کہ کس طرح وہ اپنے افسر کی نگاہ میں چڑھ سکتا ہے۔ بس جتنا بھی وہ تھوڑا بہت کام کرتا ہے۔ صرف اسی خیال سے کرتا ہے۔ مگر کام کے لحاظ سے اپنی اصل ڈیوٹی کو پیچھے ڈال کر یعنی بھول کر افسروں سے اپنی قدر کروانے کی صرف خواہش کو سب سے مقدم سمجھ کر کام کرنے کی عادت بہت بری ہے کیونکہ تب کامگار قدر پانے اور تعریف حاصل کرنے کو ہی اپنا اصل کام سمجھ لیتا ہے جس کا بدقسمتی سے کامگار پر بھی بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ اس سے ایک طرح کی خاص اُمنگ پیدا ہو جاتی ہے۔ جو نہ ہماری ہوتی ہے۔ نہ فائدہ مند۔ ایسی اُمنگ والا یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اپنے افسر کے منہ لگ کر وہ اب ترقی کے زینہ پر چڑھتا ہی چلا جائے گا۔ ہر کمپنی اور کارخانہ میں اس قسم کے آدمی پائے جاتے ہیں۔ اور سب سے بڑا دُکھ یہ ہے کہ ہمارے موجودہ صنعتی سسٹم کے اندر کچھ ایسی چیزیں آگھسی ہیں جن کو دیکھ کر دھوکا لگ جاتا ہے کہ سچ مچ دنیا کو اس طرح سے اُلو بنا کر اپنا کام نکالنا چاہئے۔ آخر فورمین بھی تو آدمی ہیں نہ جب انہیں بار بار یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ تم ہی کامگاروں کے مائی باپ ہو اور تمہارے ہاتھ میں ہی اُن کی قسمت کی باگ ڈور ہے۔ تو یہ سُن کر اُن کا پھول کر کُپا ہونا بالکل قدرتی امر ہے۔ اور یہ بھی بالکل قدرتی ہے کہ ان کے خوشامد پسند ہونے کی وجہ سے خود غرض ماتحت اپنا اُلو سیدھا کرنے اور روپیہ کمانے کی نیت سے اُن کی سفارش حاصل کرنے کے واسطے اُن کی خوب جی بھر کر خوشامد کریں۔ اسی لئے ہم ملازموں کی ترقی کا سوال کبھی کسی افسر کے ہاتھ میں نہیں چھوڑتا۔

جس آدمی کو یہ چالاکیاں نہیں آتیں۔ اُس کے لئے خاص کر ہمارے کارخانہ میں رہ کر ترقی کرنا آسان ہی کبھی آدمی محنتی بہت ہوتے ہیں۔ لیکن اُن میں سوچنے کا اور خاص کر سوچکر جھٹ پٹ فیصلہ کرنے کا مادہ نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کی ترقی اپنی لیاقت کی حد تک ہو جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک آدمی محنت کر کے ترقی پانے کا حقدار ہے۔ لیکن اگر اُس کے اندر دوسروں کا لیڈر یعنی افسر یا سردار بننے کا تھوڑا بہت مادہ نہیں۔ تو اُس کو ترقی نہیں مل سکتی۔ جس دُنیا میں ہم رہ رہے ہیں وہ محض خواب نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے کارخانہ میں اگر ایک ملازم کے اندر کافی لیاقت نہیں تو وہ آخر ایک دن اپنی ٹھیک جگہ پر آ کر ہی ٹک سکتا ہے۔

ہم اپنے کارخانہ میں کبھی یہ نہیں سمجھتے کہ جس طریقہ پر آج کوئی بھی کام کسی محکمہ میں ہو رہا ہے۔ اس میں اور ترقی کی گنجائش نہیں۔ ہماری ہمیشہ یہی کوشش رہتی ہے کہ آج سے کل اور کل سے پرسوں کام بہتر ہوتا چلا جائے اور سچ مچ ایک دن کام ضرور اچھا ہونے لگے گا۔

اچھے عہدے پر پہنچنے کے لئے سب کوئی ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور بھیڑ ہو جاتی ہے۔ لیکن جس کے اندر اس کے لائق صفتیں ہونگی بھیڑ کو چیر کر صرف وہی آخر اُس جگہ کو حاصل کرے گا۔ مگر جس کمپنی کا نظام جو اصل میں نظام کہلانے کا حقدار نہیں کھونٹے کی طرح سخت ہو جہاں کے قاعدے اور طریقے وہی پُرانے چلے آتے ہوں جن میں نہ جان ہے نہ حرکت۔ وہاں شاید ایسا ہونا ناممکن ہے۔ لیکن ہمارے ہاں شاندار ناموں کے عہدے اتنے تھوڑے ہیں کہ جس کام کو ایک آدمی جس طرح سے اب کر رہا ہے۔ اس نے اُس کو بہتر کرنا چاہئے۔ تو وہ خود ہی بہت جلدی اُسے بہتر کرنے لگے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جتنی مرضی ہو وہ ترقی کر سکتا ہے۔ کوئی حد مقرر نہیں۔ کیونکہ ہمارے کارخانہ میں کوئی خاص مقررہ عہدے نہیں ہیں نہ کوئی خاص آسانیاں ہیں۔ ہمارے لائق سے لائق آدمی کو اپنی جگہ آپ بنانی پڑتی ہے۔ اور اس میں کچھ خاص مشکل نہیں۔ کیونکہ کام سدا ہاتھ میں کافی رہتا ہے۔ اور جب ترقی کی خواہش والے آدمی کو شاندار نام کا عہدہ حاصل کرنے کی بجائے کام نکالنے کی فکر ہوتی ہے تو اُس کی ترقی اپنے آپ ہو جاتی ہے۔ اور یہ ترقی محض دکھاوا نہیں ہوتا۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ وہ آدمی جو کام آگے کرتا تھا اُس سے بڑھ کر کچھ اور کرنے لگ جاتا ہے جس سے اُسے زیادہ روپیہ ملنے لگتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ ہمارے کارخانہ میں سبھی لوگ نیچے سے اوپر کو چڑھے ہیں۔ آج کل جو ہمارے

کارخانہ کا سب سے بڑا افسر ہے۔ وہ ہمارے ہاں مستری بھرتی ہوا تھا۔ اسی طرح اور رُوک کے کارخانہ کا منیجر
شروع میں سانچے بنانے پر نوکر ہوا تھا۔ ایک آدمی نے جو اس وقت ایک بڑے محکمہ کے چارج میں ہے بھنگی
کے طور پر کام شروع کیا تھا۔ گویا سارے کارخانہ میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں ملے گا۔ جو معمولی درجہ سے
بڑھا نہ ہو۔ آج تک ہم نے جتنی ترقی کی ہے وہ سب ان لوگوں کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ جنہوں نے ہمارے
ہاں کام سیکھ کر اتنی لیاقت حاصل کی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے کارخانہ میں کوئی جدّی دستور نہیں۔ نہ ہم
آگے کے لئے کوئی چھوڑ جائیں گے۔ ہاں ہمارے ہاں اگر کوئی دستور ہے تو وہ یہ کہ "ہر کام جس طرح اس
وقت ہو رہا ہے اُس سے ہمیشہ بہتر کیا جا سکتا ہے"۔

کام کو آگے سے بہتر اور تیزی سے کرنے سے کارخانہ کی لگ بھگ ہر مشکل حل ہو جاتی ہے۔ ایک
محکمہ کارخانہ میں اپنے تیار مال کی رفتار کے مطابق درجہ یا قدر پاتا ہے۔ تیار مال کی تعداد اور تیار مال کی
لاگت یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ اگر فورمین اور سپرنٹنڈنٹ اپنے اپنے محکموں میں لاگت کا
حساب رکھنے لگیں تو وہ محض اپنا وقت ضائع کریں گے۔ چند خرچے ایسے ہیں۔ مثلاً تنخواہ کی شرح
افزوں خرچ۔ کچے مسالوں کے دام وغیرہ وغیرہ جو اُن کے بالکل بس کی باتیں نہیں۔ اس لئے ان پر
ان کا دماغ لڑانا فضول ہے۔ البتہ اپنے اپنے محکموں میں تیار مال کی رفتار کو باندھنا ضرور ان کے ہاتھ
میں ہے۔ ایک محکمہ میں جتنے پُرزے بنتے ہوں۔ ان کو جتنے آدمیوں نے بنایا ہو ان سے تقسیم کر دیا
جاوے۔ تو اُس محکمہ کی رفتار نکل آتی ہے۔ ہر ایک فورمین اپنا محکمہ کا حساب روزانہ اس طرح سے جانچتا ہے
اور اس تعداد کا ہر دم دھیان رکھتا ہے۔ یہ تمام حساب بن کر سپرنٹنڈنٹ کے پاس جاتے ہیں۔ جو ایک
بڑا نقشہ تیار کرتا ہے جس سے جس محکمہ کی تعداد یا رفتار تیار مال میں ذرا فرق پڑا فوراً پتہ چل جاتا ہے۔
سپرنٹنڈنٹ جھٹ اُس کی تحقیقات کرنی شروع کر دیتا ہے۔ اور فورمین کو بھی فکر پڑتی ہے کہ کہاں
خرابی آگئی ہے۔ تیار مال کی تعداد و رفتار کا حساب رکھنے کے اس نہایت سیدھے سادے طریقہ سے
ہمارے کارخانہ کے اندر بہتر اور زیادہ تیزی سے کام کرنے کے عملوں کو چالو کرنے میں ہمیں خاص کر
بہت مدد ملی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ فورمین کو لاگت کا حساب لگانا اور رکھنا بھی آتا ہو۔ اور اگر اُسے
یہ علم آتا ہے تو صرف اس کی وجہ سے وہ بہتر فورمین نہیں بن جائے گا۔ اس کو تو صرف اپنے محکمہ کی مشینوں
اور آدمیوں سے واسطہ ہے۔ اگر مشینیں بالکل ٹھیک چل رہی ہیں اور اُس کے آدمی پورے زور سے

کام کر رہے ہیں۔ تو بس اُس نے اپنا فرض پورا ادا کر دیا۔ اُس نے تو ہدایت اپنے تیار مال کی رفتار سے لینی ہے
اس کو دوسرے محکموں یا معاملوں کے بیچ میں پڑ کر اپنی طاقت اور لیاقت گنوانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں

یوں تیار مال کی رفتار کا حساب رکھنے کا قاعدہ باندھنے سے سب سے بڑا آرام یہ ہو گیا ہے کہ
فورمین اگر چاہے بھی تو بھی وہ کسی خاص شخص کا کوئی لحاظ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کو سوائے اپنے کام کے
اور کچھ نہیں سوجھتا۔ اگر وہ لحاظ میں پڑ کر کام اچھا کرنے والوں کی بجائے اپنی پسند کے آدمی بھرتی کرے
تو اُس کے محکمہ کا ریکارڈ جلدی ہی یہ پول کھول دے گا۔

ہر کام کے لئے مناسب آدمیوں کا چناؤ کرنے میں بھی کوئی خاص مشکل نہیں پڑنی چاہیئے۔ گو
آج کل یہ بات بہت سننے میں آتی ہے کہ اس زمانہ میں آدمی کے واسطے ترقی کرنے کے بہت تھوڑے مواقع
ہیں۔ تو بھی کام کرنے والا آدمی اپنے آپ نظر آ جاتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عام طور پر ایک کامگار کو کسی
نوکری حاصل کرنے کی جتنی خواہش ہوتی ہے اُتنی ترقی پانے کی فکر نہیں ہوتی۔ جو لوگ (کامگار)
تنخواہوں پر کام کرتے ہیں۔ وہ بھی اور روپیہ کمانا یعنی ترقی ضرور چاہتے ہیں۔ لیکن انہیں مشکل سے
پانچ فی صدی ایسے ملیں گے جو بڑی تنخواہوں والی نوکریوں کے ساتھ ساتھ اُن کی بڑی ذمہ داریاں لینے
اور بڑا کام کرنے کو بھی تیار ہوں۔ صرف پچیس فی صدی کے قریب گھاس پھوس کے منشی کے معمولی عہدہ
تک جانے کو تیار ہوں گے اور ان میں سے بھی بہتیرے اس عہدے کو اس وجہ سے قبول کرتے ہیں کہ
مشین پر کام کرنے کے بجائے اس طرح منشی بننے میں زیادہ پیسے ملتے ہیں۔ جن کامگاروں کو
مشینوں پر کام کرنے کا زیادہ شوق ہوتا ہے۔ مگر ذمہ داری سے بچنا چاہتے ہیں۔ وہ اوزار بنانے والے
محکموں میں چلے جاتے ہیں۔ جہاں پر تیار مال کرنے والے کامگاروں سے بھی انہیں زیادہ تنخواہیں
مل جاتی ہیں۔ مگر عام طور پر کامگاروں کی بہت بڑی تعداد ایک جگہ مستقل نوکری ڈھونڈھتی ہے وہ کسی کے
ماتحت رہ کر کام کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اُن کے لئے سب کام بنا بنایا آ جائے
اور ان کی ذمہ داری بالکل کچھ نہ ہو۔ اس لئے اتنے آدمیوں کا جمگھٹا ہونے کے باوجود ترقی کی خواہش
رکھنے والوں کو ڈھونڈھنا تو بہت آسان ہے۔ مگر ترقی لے کر زیادہ کام اور ذمہ داری بھی سر پر لینے والے
مشکل سے ہاتھ آتے ہیں۔

عام طور پر یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ سب لوگوں کو اپنی اپنی ترقی کی سب سے زیادہ فکر رہتی ہے

اور اسی خیال کی بنا پر بڑی بڑی سہاؤنی تجویزیں نکالی جاتی ہیں۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اپنے تجربہ میں یہ بات نہیں پائی۔ یہ درست ہے کہ ہمارے کارخانہ میں جو امریکن کام کرتے ہیں۔ وہ خوب اوپر بڑھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ہمیشہ چوٹی پر ہی پہونچنا چاہتے ہیں۔ اور پردیسی جو آتے ہیں وہ عام طور پر گھاس پھوس کے منشی کے عہدہ تک بڑھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ اور اس سے اوپر جانے کی ان کے اندر خواہش پیدا نہیں ہوتی۔ میں یہ نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہے۔ مگر یہی بات ہے۔

جیسا کہ میں نے آگے ذکر کیا ہے ہمارے ہاں ہر کام جس طرح سے ہو رہا ہے اس کی نسبت ہمارے کارخانہ کا ہر ایک ملازم ہمیشہ کسی دوسرے سے یا اور جگہ سے نئی بات یا بہتر طریقہ سیکھنے کو تیار رہتا ہے۔ پس ہم نے تو صرف ایک اصول پکڑا ہوا ہے اور اسی پر جمے ہوئے ہیں کہ ہر کام جیسا آج ہو رہا ہے اس میں ابھی ترقی کی گنجائش باقی ہے۔ کارخانہ کا سارا انتظام ہی ہر وقت بہتر تجویز پر عمل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اور ہم نے نئی تجویزیں حاصل کرنے کا ایسا سلسلہ بنایا ہوا بھی ہے جس کے ماتحت ہر ایک کامگار اپنا خیال یا نئی تجویز افسروں کے آگے رکھ سکتا ہے اور کارخانہ میں چالو کروا سکتا ہے۔

اگر ایک نگ پر دو پیسہ کی بھی بچت ہوتی ہو تو اتنی بھی کیوں چھوڑی جائے۔ جتنا آجکل ہمارے ہاں مال تیار ہوتا ہے۔ اگر اس کے حساب سے اکیلے ایک طرح کے پرزہ پر ہمیں دو پیسہ فی نگ کی بچت ہو تو سال میں جا کر یہ رقم چھبیس ہزار روپیہ ہو جاتی ہے۔ اور اگر تمام طرح کے پرزوں پر شمار کریں تو یہ رقم دس لاکھ کو پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے بچتوں کا اندازہ قائم کرتے وقت ہم تو حساب دمڑیوں اور کوڑیوں تک لگا کر دیکھتے ہیں۔ اگر نئے طریقے سے بچت نکلتی ہے اور اس تبدیلی کو عمل میں لانے کے واسطے جو لاگت اٹھے گی وہ مناسب وقت میں عام طور پر تین ماہ کے اندر سے نکل آئے گی۔ تو بغیر کچھ اور سوچے سمجھے یہ تبدیلی فوراً کر دی جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ تبدیلیاں صرف انہیں عملوں میں ہوتی ہوں جن سے تیار مال کی تعداد بڑھتی ہو۔ یا لاگت گھٹتی ہو بہت سی اور اکثر کر کے تبدیلیاں ایسی ہوتی ہیں جن سے کام کرنے میں آسانی پیدا ہو۔ ہم اپنے کارخانہ میں کہیں سخت یا جان توڑ کام نہیں چاہتے۔ اور اب تو ایسے کام ہی بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔ مزہ

یہ ہے کہ عام طور پر جن طریقوں سے آدمیوں کو کام کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ان کو برتنے سے لاگت بھی کم ہو جاتی ہے۔ سلیقہ اور سچے بیوپار کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ ہم تو دمڑی تک حساب لگا کر یہ دیکھا کرتے ہیں کہ آیا فلاں پرزے کو اپنے کارخانہ کے اندر تیار کرنے میں فائدہ ہے یا باہر سے خرید کر لانے میں۔

ہمارے پاس نئی تجویزیں چاروں طرف سے پہنچتی رہتی ہیں۔ اس کام کے لئے پردیسیوں میں پولینڈ کے کامگار سب پر بازی لے گئے ہیں۔ ایک کامگار نے جس کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ اشارا سے بتایا کہ اگر اس کے میشین کے اوزاروں کو ایک اور ڈھنگ و ڈھال پر رکھ کر کام کیا جاوے تو اس سے ان کی عمر لمبی ہو جائے گی۔ ابھی تک یہ اوزار صرف چار یا پانچ مرتبہ تیز کر لینے کے بعد خراب ہو جاتے تھے اور کام کرنے کے لائق وہ قطعی نہیں رہتے تھے۔ کیونکہ وہ بالکل گھس جاتے تھے۔ اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ اور اس کے کہنے پر چلنے سے ہمارا گھسائی کا خرچ بہت کافی گھٹ گیا۔ ایک پولینڈ کا باشندہ برما چلانے کی میشین پر کام کیا کرتا تھا۔ اس نے اس میشین میں ایک ایسی ترکیب جوڑ لی جس سے برما کرنے کے بعد پرزہ کو ہاتھ سے اٹھانا نہ پڑے۔ آہستہ آہستہ یہ ترکیب میشینوں پر استعمال ہونے لگی جس سے بہت بچت ہونے لگی۔ یہ بات اکثر دیکھی جاتی ہے کہ کام کرتے وقت اپنی عقل سے کچھ نہ کچھ جوڑ توڑ ضرور کرتے رہتے ہیں۔ اور کیونکہ ایک وقت میں تو وہ صرف ایک کام پر لگی ہوتی ہے۔ اس لئے اگر ان کا دل ہو تو عام طور پر وہ کوئی نہ کوئی اچھی ترکیب نکالنے میں ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ گو میشین کی صفائی کرنا کامگار کا فرض نہیں۔ تو بھی ایک کامگار اپنی میشین جتنی صاف ستھری رکھے گا۔ اس سے اس کی اکثر کر کے ہوشیاری کا تخمینہ جا سکتا ہے۔

جو اچھی تجویزیں اس طرح ہمارے ہاتھ لگیں ان میں سے چند یہ ہیں :-

ایک تجویز یہ تھی کہ فونڈری سے ڈھلے ہوئے لوہے کو میشنوں تک پہنچانے تک [illegible] استعمال ہوں وہ زمین سے اوپر ہی اوپر چلا کریں۔ اس ترکیب پر عمل کرنے پر بار برداری کی [illegible] میں ستر آدمیوں کی بچت ہوئی۔ جن دنوں ہمارا کام تھوڑا تھا۔ ہم دانتے دار گراریوں کی [illegible] اتارنے کو سترہ آدمی لگایا کرتے تھے۔ یہ بڑا سخت اور غلیظ کام ہے۔ اس کی نسبت ایک کارگیر [illegible]

نے یوں ہی بیٹھے بٹھائے ایک نقشہ سا کھینچ ڈالا اور اس کو سامنے رکھ کر ہم نے اس کام کے
لئے ایک خاص مشین تیار کر لی۔ جس سے اب صرف چار آدمی اُن سترہ آدمیوں سے کئی گنا زیادہ
کام کر لیتے ہیں۔ اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ بڑے آرام کے ساتھ اور محنت کئے بغیر۔ ہودہ کے
ایک حصہ میں ٹھوس کی بجائے صرف ویلڈ کیا ہوا ڈنڈا بدل دینے سے ہی ہمیں فوراً پندرہ لاکھ روپیہ
کے قریب بچت ہونے لگی۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب ہمارا آج کل جتنا کام نہ تھا۔ اسی طرح
ہم نے جب سے ایک خاص قسم کی نلکیوں (ٹیوبوں) کو عام طریقہ سے کھینچنا بند کر دیا ہے اور انہیں چورس
اوزاروں میں سے نکالنا شروع کیا ہے۔ تب سے یہاں بھی ہمیں بڑی بھاری بچت ہونے لگی ہے۔
آگے پرانے طریقے سے ایک خاص دانتے دار گراری کے تیار کرنے میں چار عمل درکار
ہوتے تھے۔ مگر اس طرح بارہ فی صدی فولاد ضائع ہو جایا کرتا تھا۔ یہ درست ہے کہ اب ہم اپنے پھوکٹ کا
ایک بہت بڑا حصہ کام میں لے آتے ہیں۔ اور ہماری زبردست کوشش ہے کہ ایک دن ہم یہ سارا
کا سارا اپنے استعمال میں لے آئیں۔ لیکن اس کا یہ بالکل مطلب نہیں کہ ہم پھوکٹ کو ہر دم
بڑھانے کی تاک میں نہ رہیں۔ اور دل میں یہ سوچ لیں کہ کیونکہ ساری پھوکٹ کا کچھ نہ کچھ حصہ
ضرور کام میں آجاوے گا۔ اس لئے اگر یہ ہوتی بھی رہی تو کیا ہوا۔ ہمارے ایک کامگار نے
اس دانتے دار پہیے کو بنانے کا ایک ایسا نیا مگر نہایت سادہ طریقہ نکالا جس کے ذریعہ فولاد صرف
ایک فی صدی ضائع ہوتا تھا۔ اسی طرح دانتے دار دھرے کی سطح کو سخت کرنے کے لئے اسے
آگ میں ضرور تپانا پڑا کرتا تھا لیکن ہمیشہ آگ سے باہر نکالنے پر اس کے دانت تھوڑے بہت
گڑے ہوئے پائے جاتے تھے اور ۱۹۱۸ء تک ہمیں انہیں سیدھا کرنے کے واسطے سینتیس آدمی
لگانے پڑتے تھے۔ ہمارے کئی آدمی اس کی نسبت لگ بھگ ایک سال لگاتار تجربہ کرتے
رہے اور آخر انہوں نے نئی طرز کا ایک ایسا چولھا تیار کر چھوڑا جس میں یہ دانتے بالکل
نہیں سکتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں ہمارے ہاں ۱۹۱۸ء سے کہیں زیادہ مال تیار ہونے لگا تھا۔
لیکن اس سارے عمل کو کرنے کے لئے ہم صرف آٹھ آدمی لگائے تھے۔

ان باتوں کے علاوہ ہم ہمیشہ ایسے راستے نکالنے کی دھن میں رہتے ہیں جس سے
کسی بھی کام کے لئے خاص کاریگر یا استاد کی ضرورت نہ رہے۔ پہلے اوزاروں کی طرفوں کو

سخت کرنے والا ایک خاص اُستاد ہوا کرتا تھا۔ اُس کو آگ کی ٹمپریچر جانچنی ہوتی تھی۔ اور اُس کا کام ایسا ہوتا تھا۔ کہ یا تیر نہیں تو تُکّا۔ حیرانی تو یہ ہے کہ اتنی بار اُس کا تیر نشانہ پر لگ کیسے جاتا تھا! فولاد کو سخت کرنے کے لئے بشرطیکہ ایک آدمی کو تپانے کے لئے بالکل ٹھیک درجہ کی حرارت دینے کی جانچ آتی ہو۔ آگ میں تپانا بہت اونچے درجہ کا کام ہے۔ مگر اس کے لئے کوئی خاص قاعدے بندھے ہوئے نہیں۔ سب کچھ عقل سے جانچنا پڑتا ہے۔ ہم نے ایک ایسا طریقہ نکالا جس سے بھٹی پر کام کرنے والے آدمی کو آگ کی ٹمپریچر لینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اُس کو پائرومیٹر جو ٹمپریچر ناپنے کا آلہ ہے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ رنگین بجلی کی بتیاں اس کو ساری حالت بتاتی رہتی ہیں۔

ہمارے ہاں کبھی کوئی مشین اچانک تیار نہیں ہوتی۔ ایک مشین پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہم اس تجویز کی ہر پہلو سے خوب چھان بین کرتے ہیں۔ اور اس کے اندر لگنے والے ایک ایک پُرزہ کی کڑی جانچ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں کبھی لکڑی کے ماڈل تیار کر لئے جاتے ہیں۔ اور کبھی پُرزوں کا پورے سائز میں خاکہ بلیک بورڈ پر کھینچ لیا جاتا ہے۔ ہم جو کچھ آج تک ہوتا رہا ہے اُس کے پابند ہیں لیکن ہم اپنا کوئی کام بھی قسمت کے حوالے نہیں چھوڑتے۔ ہم نے آج تک ایسی ایک بھی مشین نہیں بنائی۔ جس نے وہ کام جس کے لئے وہ بنائی گئی تھی نہ دیا ہو۔ ہمارے نوّے فی صدی کے قریب تجربے کامیاب ہوئے ہیں۔

دنیا میں کام کی اُستادی یا کمال کے نام پر جتنا دھوکا چل رہا ہے۔ یہ سب کاریگروں کی اپنی کارستانی ہے۔ اور میرا یہ خیال ہے کہ اگر ان کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالی جائے اور انہیں اس بات کا علم ہو جائے کہ وہ پبلک کی خدمت اور بھلائی کرنے کے واسطے کام کر رہے ہیں۔ تو وہ نہایت معمولی سے معمولی کاموں کو بھی ہمیشہ اپنا پورا تن اور من لگا کر کیا کرینگے

بیان سات

میشینوں کا خوف

ایک خاص طبیعتوں کے آدمیوں کو لگاتار وہی کام یعنی ایک ہی کام کو بار بار اسی طریقہ پر کرنے سے بہت خوف آتا ہے۔ میں خود اس بات سے بڑا گھبراتا ہوں۔ میں روز روز وہی ایک کام نہیں کر سکتا لیکن اور آدمی اور میرے خیال میں ایسے لوگوں کی تعداد کافی بڑی ہے جو وہی ایک کام روز روز کرنے سے ذرا خوف نہیں کھاتے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چند طبیعتیں ایسی واقع ہوئی ہیں جو اس قسم کا کام کرنا قطعی برداشت نہیں کر سکتے۔ جس میں دماغ لڑانے کی ذرا بھی ضرورت پڑتی ہو۔ ان کی خیال میں سب سے بڑھیا کام وہ ہے جس میں دماغ بالکل خرچ نہ کرنا پڑتا ہو۔ بہت کم ایسے آدمی نکلتے ہیں جو ان کاموں کو پسند کرتے ہیں جن میں جسم اور دماغ دونوں سے محنت کرنے کی ضرورت ہو ہمیں ایسے آدمیوں کی ہمیشہ مانگ رہتی ہے۔ جو ایک کام کو کرنا اس وجہ سے پسند کرتے ہوں کیونکہ وہ مشکل ہے مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اوسط درجہ کا کامگار ہمیشہ ایک ایسے کام یا نوکری کی تلاش میں رہتا ہے جس میں اسے زیادہ جسمانی محنت نہ کرنی پڑے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں پر اس کو دماغ سے کچھ کام نہ کرنا پڑے۔ جن کے دماغ میں ہمیشہ نت نئی باتیں اور تجویزیں گھومتی رہتی ہوں۔ اور جنہیں ایک مقام پر یا ایک حالت میں نچلا بیٹھے رہنے سے سخت نفرت ہو۔ ان کو ممکن ہے کبھی یہ خیال آتا ہو کہ ان کی طرح اور تمام لوگوں کو بھی ایسی ہی تلملاہٹ لگی رہتی ہوگی۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ اور اس لئے ایسے کامگاروں کے واسطے جو روز روز وہی ایک کام کرتے ہیں ان کے دل میں جو ہمدردی پیدا ہوتی ہے وہ بالکل فضول اور غیر ضروری ہے۔

اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو ہمیں پتہ چل جائے گا کہ زیادہ تر کام ایسے ہیں جنہیں بار بار اُسی طریقہ پر کرنا لازمی ہے۔ ایک بیوپاری کو اپنا ایک دستور عمل ضرور مقرر کرنا پڑتا ہے جس کی پابندی وہ بڑی سختی کے ساتھ کرتا رہتا ہے۔ ایک بینک کے پریزیڈنٹ کو اپنا تمام کام تقریباً ایک دستور عمل کے ماتحت اور مطابق چل کر کرنا پڑتا ہے۔ اور اسی طرح بینک کے دوسرے سبھی عہدے داروں اور کلرکوں کو ایک خاص دستور عمل پر ہمیشہ کاربند رہ کر کام کرنا ہوتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو بہت سے کاموں اور اکثر آدمیوں کے واسطے اس قسم کا دستور عمل مقرر کرنا اور بہت سی ضابطے کی کارروائیاں ایک ہی طریقہ پر بار بار اور ہمیشہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ کوئی شخص اپنی محنت اور لیاقت کے برابر کما نہ سکے گا۔ کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جس آدمی کا دماغ نت نئی باتیں اور تجویزیں نکالنے میں تیز ہو وہ کیوں کسی ایسے کام کو کرے جو ہمیشہ ایک ہی طریقہ پر بار بار کیا جانے والا ہو۔ کیونکہ دنیا میں ہر جگہ دماغ سے نئی نئی چیزیں نکالنے والوں کی بہت مانگ ہے۔ یہ درست ہے کہ فنی آدمیوں یعنی کاریگروں کے واسطے ہمیشہ بہت نوکریاں ہیں اور کبھی ان کی تلاش میں بھٹکنا نہیں پڑے گا۔ مگر ہیں ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ عام طور پر لوگوں کا فنی تعلیم یعنی ٹیکنیکل کام سیکھنے کو دل نہیں کرتا۔ اور اگر دل ہو بھی تو ٹریننگ کی تکلیف اور محنت کو سوچ کر سب جی چرانے لگتے ہیں۔ صرف چاہنے سے تو کوئی شخص فنی آدمی یا کاریگر بن نہیں جاتا۔

لوگوں کے اندر انسانی خصلت کے بارے میں کہ یہ کیسی ہونی چاہیئے بے شمار غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن ابھی تک اس سوال پر کہ دراصل انسانی خصلت ہے کیا چیز۔ بہت کم چھان بین کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک غلط فہمی یہ ہے کہ دماغ سے نئی نئی چیزیں خواب و خیال کی دنیا میں ہی پیدا کر کے دکھائی جا سکتی ہیں۔ ہم لوگ ہیں نئی نئی طرزیں اور الاپ نقاشی اور چترکاری میں نئے نئے ڈیزائن اور اسی قسم کے دوسرے ہنروں میں نئی راہیں اور ڈھنگ نکالنے والوں کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ لیکن اگر کوئی شخص دماغ اور عقل کا سچا اور اصلی کام دیکھنا چاہتا ہے۔ تو اس کو راگوں کے سروں، تصویروں کی لکیروں اور نشانوں یا رنگوں کو چھوڑ کر اس میدان میں قدم رکھنا چاہیئے جہاں پر اس کو ان سے کہیں اونچے قانون اور قاعدوں کے ساتھ واسطہ پڑیگا یعنی جہاں پر اس سے انسانی خصلت اور فطرت کی گہرائیوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ اور ان سے

ٹکر لینی پڑے گی۔ ہمیں صنعت اور بیوپار میں اس قسم کے ہنرمندوں اور گنی لوگوں کی بہت ضرورت ہے
ہمیں صنعت اور بیوپار کے اصولوں اور قاعدوں سے خوب واقف کار لوگوں کی سخت ضرورت
ہے۔ کیونکہ اس میں کارخانہ داروں اور تیار ہونے والے مالوں دونوں کا بہت فائدہ ہے۔ ہمیں ایسے
لائق اور ہوشیار آدمیوں کی سخت ضرورت ہے جو لوگوں کی پولیٹیکل۔ سماجی۔ صنعتی اور مذہبی خرابیوں
اور کمزوریوں کا سدھار کر کے ان کو سیدھے اور درست راستے پہ ڈالنے والے ہوں۔ ہم نے اپنی دماغی
قوت کو ابھی تک بہت جکڑ کر رکھا ہے۔ اور آج تک اس کو صرف نہایت معمولی اور فضول کاموں
میں استعمال کیا ہے۔ ہمیں ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو ہمیں اپنی زندگی کی تمام نیکیوں سچائیوں
اور حاصل کرنے کے لائق باتوں اور چیزوں کو پانے کے عملی طریقے اور راستے بنا کر دکھا سکیں
اگر ہمارے ارادے نیک اور صاف ہیں اور یہ طریقے اور راستے خوب سوچ سمجھ کر بنائے گئے
ہوں تو ہرگز کوئی وجہ نہیں کہ ان پر آدمی چل نہ سکے اور یہ کامیاب نہ ہوں۔ ایک کامگار
کو زیادہ سکھی کرنے کا اکیلا یہی طریقہ نہیں کہ ایسی ترکیبیں اور تجویزیں نکالی جائیں جس کے ذریعہ
اس کو آگے سے تھوڑا کام کرنا پڑے بلکہ اس کو آگے سے بھی اور زیادہ کام کرنے میں مدد اور سہولت
پہنچانے والے راستے ڈھونڈھ کر بھی ہم اس کے سکھ کو بڑھا سکتے ہیں۔ اگر دنیا ایسی تجویزوں اور طریقوں
کے نکالنے کی طرف جن سے ہر شخص کو اس کی حیثیت اور بساط کے مطابق فائدہ پہنچتا ہو۔ توجہ دے
ان میں دلچسپی لے اور اپنا پورا زور اور دماغ خرچ کرنے لگے تو ان تجویزوں اور طریقوں کو ضرور عملی
شکل میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ ایسی تجویزیں بہت کافی عرصہ تک کارآمد ثابت ہوتی رہیں گی اور ان
سے عام لوگوں کی بھلائی اور دھن دولت کی کمائی کے لحاظ سے اس قدر فائدہ ہوگا۔ جتنا آج تک
کبھی نہیں ہوا ہے۔ اس زمانہ میں لوگوں کے دلوں میں یہ یقین اور بھروسہ پیدا کرنے کی سخت ضرورت
ہے کہ انڈسٹری کو بھی نیکی انصاف اور شرافت کے اصولوں اور قاعدوں پر عمل کر کے خوب کامیاب
بنایا جا سکتا ہے۔ اگر انڈسٹری میں یہ صفتیں موجود نہیں تو انڈسٹری کا نہ ہونا ہی بھلا ہے۔ بلکہ سچی
بات تو یہ ہے کہ اگر ہم انڈسٹری کے اندر یہ صفتیں پیدا نہیں کر سکتے تو انڈسٹری کا خاتمہ بالکل قریب
ہے لیکن انڈسٹری کے اندر یہ صفتیں ضرور پیدا کی جا سکتی ہیں اور ہو رہی ہیں۔

اگر کسی شخص کا مشین لگائے بغیر گزارہ نہ ہوتا ہو تو کیا اس کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ

اس بنا پر کوئی میشین نہ لگائے۔ کیونکہ ممکن ہے روز روز اُنہی میشینوں کو چلاتے چلاتے اُس کا جی اکتانے لگے۔ کیا اُس کو بھوکا مرنے دیا جائے یا یہ بہتر ہوگا کہ اُس کو ایک ایسے راستہ پر کھڑا کر دیا جائے جس پر چل کر وہ اپنا پیٹ اچھی طرح سے پال سکے۔ کیا انسان فاقے رہ کر زیادہ خوش ہوتا ہے؟ اگر ایک آدمی اپنی میشین کو پورا نہ چلا کر خوش ہوتا ہی۔ تو کیا اُسے جتنا وہ مال تیار کر کے دے سکتا ہے اُس سے کم تیار کرنے میں اور اس وجہ سے دنیا میں رہ کر جتنا سکھ اور روپیہ پانے کا اُس کا جائز حق ہی۔ اس کو چھوڑ کر غریبی اور تکلیف میں زندگی بسر کرنے میں زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہی؟

مجھے آج تک کوئی ایسی مثال نہیں ملی کہ بار بار وہی کام کرنے سے کسی آدمی کو ذرا بھی نقصان پہونچا ہو۔ صرف باتوں میں گھر پورا کرنے والوں کا کہنا ہے کہ بار بار وہی کام کرنے سے آدمی کا جسم اور دماغ دونوں تباہ ہو جاتے ہیں لیکن ہمارے تجربے سے کبھی یہ بات ظاہر نہیں ہوئی۔ ہمارے ہاں ایک آدمی ملازم تھا جس کو صبح سے شام تک ہمیشہ اپنے پاؤں سے دبا کر پہیہ چلانے کے سوائے بالکل کچھ اور کام کرنا نہیں پڑتا تھا۔ اس کو یہ وہم ہو گیا۔ کہ اس حرکت کی وجہ سے اُس کا ایک طرف کا دھڑ بالکل مارا گیا ہے۔ لیکن ڈاکٹری جانچ سے یہ بات ثابت نہ ہوتی تھی۔ تو بھی اُس کی تسلی کے لئے اُس کو ایک دوسرے کام پر لگا دیا گیا۔ جہاں پر پیر کی بجائے جسم کے دوسرے پٹھوں کی حرکت درکار تھی۔ مگر تھوڑے ہفتوں کے اندر اُس نے خود درخواست کی کہ مجھے اُسی پرانے کام پر لگا دو۔ سرسری طور پر تو یہی خیال ہوتا ہے کہ روز روز آٹھ گھنٹے ایک قسم کا کام کر کے جسم کے خاص حصوں کو وہی حرکتیں دینے سے بدن بے ڈول ہو جائے گا۔ مگر ایسا ہوا کبھی نہیں۔ جب کبھی کوئی کامگار اپنی ڈیوٹی بدلنا چاہتا ہے۔ ہم بڑی خوشی سے بدل دیتے ہیں۔ اور یہ ہم چاہتے بھی ہیں کہ کامگاروں کی ڈیوٹیاں باقاعدہ بدلتی رہیں۔ کیونکہ اس میں مشکل کچھ نہیں۔ لیکن دکھ یہ ہے کہ کامگار خود ڈیوٹیاں بدلنا نہیں چاہتے۔ جب تک وہ اپنے آپ نہ کہیں وہ ڈیوٹی بدل کر خوش نہیں ہوتے۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ ہمارے اکثر کام بندھی چال کے ہوتے ہیں اور اُن کی چال قاعدے کے اندر اتنی سخت بندھی ہوئی ہے کہ ایک بار تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کوئی برلا ہی ماں کا لال ہوگا جو ان میں سے کسی ایک کام پر بہت دیر تک ٹک سکے۔ ہمارے سارے کارخانے کے اندر شاید سب سے زیادہ بندھی چال کا جو کام ہے وہ یہ ہے کہ ایک آدمی فولادی کُنڈے کے ساتھ ایک دانتے دار

پہیہ کو پکڑ کر اسے تیل کے ایک چوبچّہ میں ہلاتا ہے اور پھر اس کو ایک جھابے میں پھینک دیتا ہے
بس صبح سے شام تک برابر یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اور اس میں نہ کبھی فرق پڑتا ہے۔ نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے
دانتے دار پہیے ہمیشہ عین اسی مقام پر اس کے پاس آتے رہتے ہیں۔ ہر ایک پہیہ کو وہ اتنی بار ہی جھنجھوڑتا
ہے۔ اور پھر ان سب کو ایک جھابے میں پھینکتا چلا جاتا ہے۔ جو ہمیشہ ایک ہی مقام پر پڑا رہتا ہے
جسم کے کسی حصّہ کو زور لگانا پڑتا ہے۔ نہ کچھ عقل خرچ کرنی پڑتی ہے۔ اس کو صرف اپنے ہاتھ آگے
پیچھے آہستہ آہستہ ہلانے پڑتے ہیں۔ کیونکہ فولادی کنڈا بالکل ہلکا ہوتا ہے۔ جو آدمی یہ کام کر رہا ہے
اس کو اس جگہ پر لگے ہوئے پورے آٹھ برس گزر چکے۔ اس عرصہ میں اس نے کافی کمائی کی ہے۔
اور بچایا ہے۔ اس وقت اس کے پاس لگ بھگ ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ جمع ہوگا۔ اور اگر آج اس سے
کوئی یہ کہے۔ یا اس کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ یہ جگہ چھوڑ کر تم کسی اور بڑی نوکری پر چلے جاؤ۔ تو وہ
لڑنے کو تیار ہو جائے گا۔

نہایت گہری چھان بین کرنے کے بعد بھی آج تک ایسی ایک مثال نہیں ملتی جس سے یہ
ظاہر ہوتا ہو کہ کام کرنے کی وجہ سے فلاں آدمی کے دماغ کو دھکّا لگا ہے۔ یا وہ پاگل ہو گیا ہے۔ جو
لوگ لگاتار وہی ایک کام کرنا پسند نہیں کرتے اُن کے لئے ایسے کاموں میں لگنا ضروری نہیں ہے ہمارے
ہاں ہر ایک محکمہ کا کام پسند اور لیاقت کے لحاظ سے تین درجوں یعنی درجہ نمبر ۱ درجہ نمبر ۲۔ اور درجہ نمبر ۳
میں بانٹا ہوا ہے۔ اور ہر ایک درجہ میں دس سے لے کر بیس طرح کے مختلف عمل ہوتے ہیں۔ شروع میں جب
ایک آدمی ہمارے بھرتی کے محکمہ سے آتا ہے تو اس کو درجہ تین میں بھرتی کیا جاتا ہے۔ جب وہ کچھ
سیکھ لیتا ہے تو درجہ نمبر ۲ میں آ جاتا ہے۔ اور پھر ترقی کرتے کرتے درجہ اوّل میں پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر درجہ
اول میں سے چھانٹ کر اوزار بنانے والے محکمے میں یا سپرنٹنڈنٹی کے عہدے کے لئے لیا جاتا ہے
مگر یہ آدمی کی اپنی لیاقت اور پسند پر منحصر ہے۔ کہ وہ کس جگہ جا کر ٹکتا ہے۔ اگر کوئی مال بنانے والے
محکمہ میں لگا ہوا ہے تو اس لئے کہ یہاں پر کام کرنے کی اس کی خود اپنی مرضی ہے۔

میں پہلے کسی بیان میں کہہ آیا ہوں کہ ہمارے ہاں کسی آدمی کو جسم کے اندر کچھ خرابی ہونے کے
سبب کام دینے سے انکار نہیں کیا جاتا۔ بارہ جنوری ۱۹۱۴ء کو ہم نے فیصلہ کیا کہ آئندہ ہمارے کارخانہ
میں ایک آدمی کو ایک دن کی تنخواہ کم سے کم پندرہ روپیہ ضرور ملا کرے گی۔ اور دن میں صرف آٹھ گھنٹے

کام کرنا پڑے گا۔ اُسی دن سے ہم نے اس پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ ہم نے یہ شرط بنا دی کہ کسی آدمی کو چھوت کی کوئی بیماری ہونے کے علاوہ جسم کے اندر کسی اور روگ اور خرابی کی وجہ سے جواب نہیں دیا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ صنعتی کارخانوں کو جاری کرنے کا جو اصلی منشا ہے وہ بھی پورا ہو سکتا ہے جب یہ ممکن ہو کہ جس طرح سوسائٹی کے اندر لولے لنگڑے وغیرہ سبھی طرح کے انسان کھپے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ان کے اندر بھی ہر طرح کے آدمی کھپ جانے چاہئیں۔ ہمارے ہاں ہمیشہ لنگڑے اور بدھو ملازم رہتے ہیں۔ سوسائٹی کے اندر سبھی لوگ ایسے آدمیوں پر بہت رحم کرتے ہیں جن کے جسم مزدوری کرنے کے قابل نہیں ہیں اور ان کو پالنا پوسنا اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔ اور خیرات دے کر ان کا پیٹ پالتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ کئی حالتوں میں جیسے کہ ایک بالکل جاہل آدمی کو خیرات دے کر ضرور گزارہ کرانا چاہیئے لیکن ایسی مثالیں دیکھنے میں بہت کم آتی ہیں۔ اور ہمارا تجربہ ہے کہ جہاں ہمارے کارخانہ کے اندر اتنے کام طرح طرح کے ہو رہے ہیں وہاں ہر قسم کے آدمی کے لئے کام کرنے کی جگہ ضرور نکل آتی ہے اور منافع پر۔ ایک اندھا یا لنگڑا اپنے خاص کام کو جو اُس کے حال کے لائق ہو۔ اتنی ہی اچھی طرح سے کر کے دکھا سکتا ہے اور اُتنی تنخواہ کما سکتا ہے۔ جتنا کہ ایک پورے جسم والا۔ ہم لنگڑوں کو ترجیح نہیں دیتے۔ مگر ہم نے ثابت کر دکھایا ہے کہ لنگڑے بھی پوری تنخواہ کما سکتے ہیں۔

اس اصول پر چلنے سے ہمارا یہ منشا بالکل نہیں ہے کہ ان آدمیوں کو بھرتی کیا جائے جو لنگڑے ہوں تاکہ اُنہیں تھوڑے پیسے دینے پڑیں۔ چاہے مال تھوڑا تیار ہونے لگے۔ اس طریقہ سے ان آدمیوں کی مدد تو ضرور ہوتی ہے لیکن اُن کی مدد کرنے کا اس سے بھی بڑھیا ایک اور طریقہ ہے۔ سب سے بہتر طریقہ اُسی کو ماننا چاہیئے جس کے ذریعہ یہ لوگ اُتنے ہی پیسے کما سکیں کہ جتنے پورے جسم والے۔ میرا خیال ہے کہ دُنیا میں خیرات کرنے یعنی لوگوں کو مفت چیزیں بانٹنے کی بالکل کو ضرورت نہیں۔ بیوپار کے اندر خیرات کے لئے ہرگز کوئی جگہ نہیں۔ ایک کارخانہ کو جاری کرنے کا صرف ایک ہی منشا ہوتا ہے یعنی مال تیار کرنا۔ اور اگر کارخانہ اپنے پورے زور اور طاقت سے چل کر مال تیار نہیں کرتا۔ تو وہ سوسائٹی کی خدمت نہیں کرتا۔ ہم بلا جانچ پڑتال کئے یہ جھٹ پٹ مان بیٹھتے ہیں کہ ہر دھندے کو پورے طور سے اچھی طرح کرنے کے لئے پورے جسم والے آدمیوں کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ ہیں نے

یہ دیکھنے کے لئے کہ اصلی بات کیا ہے۔ کارخانہ کے اندر جتنے کام ہوتے تھے ان سب کو مشینوں اور ڈیوٹی کے لحاظ سے الگ الگ درجوں میں چھانٹا یعنی اس طرح پر کہ فلاں کام کرنے کے لئے جو محنت درکار ہوگی وہ ہلکی و معمولی یا سخت ہے۔ کیا اس کام کو کرنے میں ہاتھ پاؤں بھیگتے ہیں۔ یا صاف ستھرا کام ہے اور اگر بھیگتے ہیں تو اس میں کس قسم کا تیل یا عرق استعمال ہوتا ہے اور کیا وہ خالص ہے یا میل والا۔ چولھے یا بھٹی سے دور ہے یا نزدیک۔ وہاں تیز ہوا کتنی ہے۔ کیا اس میں ایک ہاتھ برتنا پڑتا ہے یا دونوں۔ کیا کام کرنے والے کو کام کرتے وقت کھڑے رہنا ہوتا ہے یا بیٹھ بھی سکتا ہے۔ کیا غل غپاڑہ کا کام ہے یا چپ چاپ۔ کیا اس میں نہایت ہشیاری کی ضرورت ہے۔ کیا جہاں پر نہ کام ہوتا ہے وہاں قدرتی روشنی پڑتی ہے یا بناوٹی ہے۔ فی گھنٹہ کتنے نگ بنانے پڑتے ہیں۔ مسالوں کا کتنا وزن ہے اور کامگار کے جسم پر اس کام کا کتنا دباؤ پڑتا ہے۔ تحقیقات کرنے سے پتہ لگا کہ اس وقت ہمارے کارخانہ میں جو ۷۸۸۲ مختلف دھندے ہوتے تھے ان میں سے ۹۴۹ ایسے پائے گئے جو سخت تھے اور جن کو کرنے کے لئے طاقتور پورے جسم والے یعنی جن میں کسی قسم کی بالکل کوئی خرابی نہ ہو درکار تھے ۳۳۳۸ کام ایسے تھے جن کو کرنے کے لئے معمولی جسم اور طاقت والے آدمیوں کی ضرورت تھی۔ باقی کے ۳۵۹۵ دھندے ایسے تھے جن کو کرنے کے لئے کوئی خاص جسمانی محنت درکار نہ تھی اور جن کو ایک دبلا پتلا اور نہایت کمزور انسان بھی بڑے مزے سے کر سکتا تھا بلکہ اصل پوچھا جائے تو ان میں سے اکثر کام عورتیں اور سیانی عمر کے بچے بڑی اچھی طرح سے کر سکتے تھے۔ یہ جو نہایت ہلکے دھندے پائے گئے ان کو ہم نے پھر دو درجوں میں تقسیم کیا کہ ان میں سے کون سے ایسے ہیں جن کو کرنے کے لئے پورے جسم والے آدمی درکار نہیں اور ہم نے دیکھا کہ ان میں ۶۷۰ کام ایسے تھے جن کو بغیر ٹانگوں والے کر سکتے تھے ۲۶۳۷ ایک ٹانگ والے کر سکتے تھے۔ ۲ کام ایسے تھے جو بغیر باہوں والے کر سکتے تھے ۷۱۵ ایک بانہہ والے اور ۱۰ بالکل اندھے کر سکتے تھے اس سے ظاہر ہے کہ ۷۸۸۲ دھندوں میں سے ۴۰۳۴ ایسے تھے جن کو کرنے کے لئے گو کچھ طاقت ضرور درکار تھی مگر پورے جسموں والے آدمیوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب صنعت ترقی کر جائے گی تو ایسے کام کرنے کے لئے زیادہ لیاقت والے آدمی درکار ہوں گے اور جیسا کہ آج کل سوسائٹی میں عام آدمی پائے جاتے ہیں ان کے لئے کم گنجائش ہوگی جس طرح ہم نے اپنے ہاں دھندوں کو الگ الگ

بانٹ کر دیکھا اُسی طرح اگر کسی صنعت یا کارخانے کے کاموں کو ٹکڑے کرکے دیکھا جائے تو ممکن ہے کہ اسی حساب سے پورے جسم والے اور دوسری قسم کے آدمیوں کے لئے وہاں پر کام نہ ہوں۔ لیکن میرا پختہ یقین ہے کہ اگر وہاں پر بھی نہایت چھان بین کرکے اور ہوشیاری کے ساتھ کام کے علیحدہ علیحدہ حصے کردئے جائیں تو ایسی بہت سی جگہیں لولے لنگڑے وغیرہ آدمیوں کے کرنیوالی ضرور نکل آئیں گی جہاں پر ان لوگوں کو ایک پورے جسم والے کامگار کے برابر تنخواہ مل سکے۔ یہ اوّل درجہ کی بے وقوفی ہوگی کہ ہم لنگڑے آدمیوں کو بھرتی کرنا اپنا فرض سمجھیں اور پھر اُن کو ٹوکری بننا یا ہاتھ کا ایسا ہی کوئی معمولی کام جس سے بڑی تھوڑی آمدنی ہوتی ہو اس خیال سے سکھاویں کہ گو ان بیچاروں کو اس حیلے سے گزارہ کرنے میں تو کیا سہارا ملے گا۔ البتہ ان کی مایوسی ضرور دور ہو جاوے گی۔

جب کسی آدمی کو ہمارا بھرتی کا محکمہ رکھ لیتا ہے تو خیال یہ ہوتا ہے کہ اُس کو ایک ایسے کام پر لگایا جائے جو اُس کے حال کے مناسب ہو۔ اگر وہ پہلے ہی کام کر رہا ہے جس کو وہ پسند نہیں کرتا یا اُس کو اچھی طرح سے کر نہیں سکتا تو اُس کو ایک بدلی کا کارڈ دے دیا جاتا ہے جس کو لے کر وہ بدلی محکمہ کے پاس پہنچتا ہے جو اُس کا اچھی طرح سے امتحان لے کر اُس کو کسی اور کام پر جو اُس کی حالت اور طبیعت کے موافق ہو لگا دیتا ہے۔ جن لوگوں کے جسم اوسط درجہ سے گرے ہوئے ہیں وہ بھی اگر اُن کو مناسب موقع ملے تو اتنا ہی اچھا کام کرنے والے ثابت ہوتے ہیں جتنا کہ اوسط درجہ سے بہتر جسم رکھنے والے مثال کے طور پر ایک دفعہ ہم نے ایک اندھے آدمی کو محکمہ اسٹاک میں اُن کابلے اور ڈھبریاں گننے کے لئے مقرر کیا جو ہم نے اپنی برانچوں کو باہر روانہ کرنی تھیں۔ اس کام پر دو آدمی قابل جسم والے پہلے سے لگے ہوئے تھے۔ دو دن کے اندر فورمین نے بدلی محکمہ کو ایک پرچہ لکھ کر بھیجا کہ مجھے اب قابل جسم والے آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ اندھا آدمی نہ صرف اپنا کام پورا کر لیتا ہے بلکہ اتنا اور کام کر لیتا ہے جتنا کہ وہ پہلے دو قابل جسم والے کر رہے تھے۔

ناقابل جسم والوں کی مدد اس سے بھی زیادہ کی جا سکتی ہے۔ عام طور پر یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ جب کوئی آدمی زخمی ہو جاتا ہے تو پھر وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتا اور اُس کو صرف الاؤنس ملنا چاہیے لیکن بیماری دور ہو جانے کے بعد خاص کر کوئی ہڈی ٹوٹنے کی حالت میں جب تک آدمی میں

پورا زور نہیں بنتا وہ تھوڑا بہت کام کرنے کے قابل ضرور ہوتا ہے اور اصل میں کچھ کام کرنا بھی چاہتا
ہے کیونکہ خواہ الاؤنس کتنا بھی زیادہ ملتا ہو یہ تنخواہ کی برابری ہرگز نہیں کرسکتا ورنہ بیوپار میں اس قسم کا
الاؤنس دینا ایک قسم کا اور ٹیکس ہوجاتا اور اس ٹیکس سے تیاری مال کی لاگت بڑھ جاتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا
کہ بکری تھوڑی ہوجاتی اور اس لئے کارخانہ کے اندر کام بھی گھٹ جاتا یہ ایک ایسی بات ہے جو کہ روپے
میں سولہ آنے سچی ہے اور جسے ہم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔

ہم نے اس بات کا تجربہ ایسے بیمار لوگوں پر کیا ہے جو اپنے بچھونے تو چھوڑ نہیں سکتے تھے مگر
اُس پر اُٹھ کر بیٹھ سکتے تھے ہم نے بچھونوں پر سیاہ اُکل کلاتھ کی چادریں یا کوئی اور کپڑے بچھا دیے۔
اور ان لوگوں کو وہاں بٹھا کر کابلوں پر ڈھبریاں کسنے کے کام پر لگا دیا یہ کام ایسا ہے جو صرف ہاتھ سے
کرنا پڑتا ہے اور جب پر ہمارے میگنیٹو کے محکمہ میں ۱۵ یا ۲۰ آدمی ہمیشہ لگے رہتے ہیں ہم نے دیکھا کہ ہسپتال
میں یہ بیمار آدمی اس کام کو اُتنی ہی تیزی اور صفائی کے ساتھ کرسکتے ہیں جتنی کہ ہمارے کارخانہ کے
اندر آدمی کرتے تھے اور اُن کے برابر اُجرتیں حاصل کرتے تھے بلکہ سچ پوچھو تو جتنی تعداد میں یہ کام ہمارے
کارخانہ کے اندر ہوتا تھا اُس سے ۲۰ فی صدی زیادہ میرے خیال میں یہ بیمار لوگ نہیں کرکے دیتے
تھے مگر ہم ہسپتال میں کسی آدمی کو یہ کام کرنے کے لئے مجبور نہیں کرتے تھے لیکن وہاں سبھی اس کو کرنا
چاہتے تھے۔ کیونکہ اس سے وقت بڑے مزے سے کٹ جاتا تھا اور اس لئے اُن کو نیند اچھی آنے لگتی
تھی۔ ہاضمہ کی طاقت بڑھ جاتی تھی اور اُن کو جلدی صحت ہونے لگتی تھی۔

گونگوں اور بہروں کی حالت میں بھی کسی قسم کی خاص رعایت کرنے کی ضرورت نہیں وہ اپنا کام
۱۰۰ فی صدی اچھا کرتے ہیں۔ جن ملازموں کو تپ دق کی بیماری لگی ہوئی ہے اور ہاں ایسے لگ بھگ
ایک ہزار آدمی ہوتے ہیں اُن کو کارخانہ کی حفاظت کے سامان کے محکمہ میں لگایا جاتا ہے جن کو چھوت
کی بیماری لگی ہوتی ہے وہ سب ایک جگہ ایک خاص شیڈ میں مل کر کام کرتے ہیں۔ عام طور پر ان کو
کھلی ہوا میں کام کرنے پر لگایا جاتا ہے۔

آخری مرتبہ جب ہم نے ملازموں کی جانچ پڑتال کی تو ۹۵۶۳ ایسے آدمی پائے گئے جن کو
پورے جسم والا نہیں کہا جاسکتا ان میں سے ۱۲۳ ایسے تھے جن کے بازو، بانہہ یا ہاتھوں میں کوئی نقص
تھا یا وہ کٹے ہوئے تھے۔ ایک کے دونوں ہاتھ غائب تھے۔ چار بالکل اندھے ۲۰۷ کانے ۲۵۳ لگ بھگ

کانے، ۳۷ گونگے اور بہرے ۶۰ مرگی والے ۴ آدمیوں کی دونوں ٹانگیں اور پاؤں موجود نہ تھے اور
۲۳۴ کی یا ایک ٹانگ نہ تھی یا ایک پاؤں۔ باقیوں کے جسم میں اور چھوٹی موٹی خرابیاں تھیں۔

مختلف کاموں اور پیشوں کو اچھی طرح سے سیکھ لیتے ہیں جتنا وقت لگتا ہے وہ یوں ۴۳ فیصدی
کام ایسے ہیں جن کو سیکھنے میں ایک دن سے زیادہ نہیں لگتا۔ ۳۶ فی صدی کو ایک دن سے لیکر
ایک ہفتہ کا وقت لگتا ہے ۶ فی صدی کو ایک سے دو ہفتہ تک ۱۴ فی صدی کو ایک مہینے سے ایک
سال تک اور ایک فی صدی ایسا کام ہوتا ہے جس میں پوری لیاقت حاصل کرنے کے لئے ایک سے
۶ سال کا عرصہ لگ جاتا ہے یہ کام عام طور پر بڑی ہوشیاری اور اُستادی کے ہوتے ہیں جیسے ا
اوزار بنانا اور ٹھپّے کھودنا۔

ہمارے تمام کارخانہ کے اندر ضابطہ کی پابندی بڑی سختی سے ہوتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات کے
لیئے کوئی قاعدے نہیں اور کوئی اوٹ پٹانگ قاعدہ نہیں کسی منشی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی ا
حکم سے کسی ماتحت کو بلا قصور نکال دے یہ اختیار صرف محکمہ بھرتی کے منیجر کو ہے اور اُس کو بھی یہ اختیار بہت
بار برتنا پڑتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء آخری سال ہے جس کا ہم نے نقشہ تیار کیا تھا اُس سال ہمارے کارخانہ میں
۳۰۱۵۵ تبدیلیاں ہوئی تھیں ان میں سے ۱۰۳۳۴ آدمی بغیر نوٹس دئے ۱۰ دس دن سے زیادہ غیر حاضر
رہے تھے اور اس لئے نکال دئے گئے۔ ۳۷۰۲ کو اس لئے جواب دیا گیا کیونکہ جو کام اُن کے سپرد کیا گیا
اُس کو کرنے سے اُنہوں نے انکار کیا۔ یا بلا کوئی وجہ بتلائے وہاں سے بدل جانا چاہا۔ ہم نے جو اسکول
جاری کیا ہوا ہے اُس میں انگریزی پڑھنے سے انکار کرنے پر ۳۸ کو موقوف کیا گیا۔ ۱۰۸ نے نام درج
ضرور کرایا مگر کام نہیں کیا اور لگ بھگ ۳۰۰۰ ملازموں کو ہم نے اپنے دوسرے کارخانوں میں بدل دیا۔ اتنی
ہی تعداد ایسے آدمیوں کی ہوگی جن کے کام چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ گھر جانا چاہتے تھے یا اپنے گھر جا کر
کھیتی باڑی یا بیوپار کرنا چاہتے تھے۔ ۸۲ عورتوں کو اس لئے جواب دیا گیا کیونکہ اُن کے خاوند ہمارے
کارخانہ میں ملازم تھے اور ہم ایسی بیاہی عورتوں کو نوکر نہیں رکھتے جن کے خاوند کام کرنے کے لائق ہوں ا
کر رہے ہوں، کل تعداد میں سے صرف ۸۰ خاص قصور کی وجہ سے نکالے گئے یعنی ۵۶ جھوٹ بولنے یا د
دینے اور ۲۰ محکمۂ تعلیم کے حکم سے نکالے گئے اور چار آدمیوں کو اس لئے جواب دیا گیا کیونکہ اُن کو کارخانہ
میں رکھنا مناسب نہ تھا۔

ہم اپنے ملازموں سے یہ اُمید کرتے ہیں کہ وہ جو کام ان کے سپرد کیا گیا ہے صرف اُسی کو کریں گے اور بالکل ہماری ہدایت کے مطابق کریں گے۔ تمام کارخانہ کے اندر سب کاموں کو اتنی ہوشیاری اور ترتیب سے چھانٹ کاٹ کر مقرر کیا گیا ہے کہ ایک محکمہ کا دوسرے کی پوری مدد اور آسرا لئے بغیر قطعی گزارہ نہیں۔ اس لئے ہم ایک منٹ کے لئے بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہمارے ملازم اور کامگار اپنے اپنے کاموں کو جس طرح سے اُن کے جی میں آئے کرتے رہیں۔ اگر کارخانہ میں ہر جگہ سخت ضابطہ قائم نہ رکھا جائے تو حد سے زیادہ چاروں طرف گڑبڑی پھیل جائے۔ میری یہ پختہ رائے ہے کہ ہر ایک کارخانہ میں سخت ضابطہ ضرور ہونا چاہیے جو آدمی کارخانہ میں کام کرتے ہیں اُن کو اس لئے ملازم رکھا گیا ہے کہ وہ اپنی نوکری اور ڈیوٹی پر جتنا زیادہ سے زیادہ کام کر کے دے سکتے ہیں۔ اتنا کریں۔ اور جتنی زیادہ سے زیادہ تنخواہ وہ پا سکتے ہیں اُس کو حاصل کریں اگر ہر آدمی کو کارخانہ کے اندر اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو لازمی طور پر تیار مال کی تعداد بہت گھٹ جاوے گی۔ اور اس لئے تنخواہوں بھی ملازموں کی گھٹ جائیں گی۔ جو ملازم ہماری مرضی اور ہدایت کے موافق کام کرنا نہیں چاہتا اس کے لئے صرف ایک راستہ کھلا ہے کہ وہ ہمارے کارخانہ کو چھوڑ دے۔ ہماری کمپنی کا یہ اصول ہے کہ ہم اپنے ہر ملازم سے پورا پورا کام لیتے ہیں اور اس معاملہ میں کسی کی ذرہ بھر رعایت نہیں کرتے اس لئے فورمین بلکہ تمام محکموں کے منشیوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ اُن کے ماتحتوں کی جتنی تھوڑی بیماریاں ہوں اُتنا ہی اچھا ہے۔ اگر کسی کامگار کے ساتھ کسی منشی نے کسی معاملہ میں ناجائز سختی کی ہے تو اُس کے پاس اس سے بچنے کا پورا انتظام اور علاج ہے۔ یہ درست ہے کہ کارخانہ میں کبھی نہ کبھی کسی کے ساتھ بے انصافی ضرور ہو جاتی ہے کیونکہ منشی لوگ اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہمیشہ انصاف سے سلوک نہیں کرتے۔ یہ انسان کی طبیعت میں ایک قدرتی کمزوری ہے۔ اور اس کی وجہ سے کارخانہ چلانے اور جاری کرنے میں جو ہم نے اپنے آگے اونچا اور نیک مقصد رکھا ہوا ہے۔ اس میں آن کر کبھی نہ کبھی رکاوٹ ضرور پڑ جاتی ہے یہ فورمین ہمیشہ یا تو ہمارے اس اصول کو اچھی طرح سے سمجھتا نہیں ہے یا وہ جان بوجھ کر اس کا غلط استعمال کرتا ہے لیکن کمپنی ہمیشہ اپنے اس اونچے مقصد اور اصول پر قائم رہنا اور چلنا چاہتی ہے۔ اور ہر ممکن طریقہ سے سدا کوشش کرتی رہتی ہے کہ کارخانہ میں نیچے سے لے کر اوپر تک سب ملازم اور افسر اس نیک اصول پر کاربند رہیں۔

کارخانہ کے اندر جو ملازم عام طور پر غیر حاضر رہتے ہیں اُن پر خاص دھیان رکھنا نہایت ضروری ہے۔ کسی ملازم کو اس بات کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے کہ اُس کی جب مرضی میں ہو کام پر آجائے اور جب

دل چاہے غیر حاضری کر دے۔ ہر ایک ملازم کو اس امر کی اجازت ہے کہ وہ جب چاہے اپنے منشی کے پاس چھٹی لینے کے لئے درخواست دے سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ اطلاع دئے بغیر اپنے کام سے غیر حاضر ہو جاتا ہے تو اس کی واپسی پر اس کی غیر حاضری کی اچھی طرح سے جانچ پڑتال کرنی چاہئیے۔ اور کبھی مرتبہ ہمیں یہ جانچ پڑتال ڈاکٹر کی معرفت کرانی پڑتی ہے۔ پھر اگر رپورٹ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس ملازم کے غیر حاضر ہونے کی وجہ معقول ہے تو اس کو کام پر لگایا جاتا ہے۔ ورنہ اس کو کام سے جواب دے دیا جاتا ہے۔ بھرتی کرتے وقت ہم ہر ایک آدمی سے اس کا نام پتہ اور عمر پوچھ کر لکھ چھوڑتے ہیں۔ اور یہ بھی نوٹ کر لیتے ہیں کہ آیا وہ بیاہا ہوا ہے یا ابھی کنوارا ہے۔ اس کے گھر کے کتنے ایسے بندے ہیں جن کے گزارہ کا بوجھ اس کے سر پر ہے؟ کیا اس سے پہلے اس نے کبھی فورڈ کمپنی میں کام کیا ہوا ہے؟ ہم کبھی یہ نہیں پوچھتے کہ اس سے پہلے وہ آجکل کیا کام کرتا رہا ہے۔ لیکن ہم نے اپنے ہاں ایک سسٹم جاری رکھا ہوا ہے جس کو ہم تبھر جاننے والوں کی فہرست کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہمارے کارخانہ میں نوکری کرنے سے پہلے اگر کسی نے کوئی خاص دھندا یا تجارت سیکھی ہوئی ہوتی ہے تو اس امر کی اطلاع پھر کر ہمارے بھرتی کے محکمہ کے پاس بھیج دی جاتی ہے جہاں پر اس قسم کی رپورٹوں کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ اس کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جب ہمیں کسی خاص کام کے لئے گنی یعنی کمال لائق آدمیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو ہم ایسے آدمیوں کو ان رپورٹوں کو دیکھ کر کے اپنے کارخانہ کے اندر سے ہی بڑی آسانی کے ساتھ ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ اس سسٹم کا ایک اور فائدہ ہے کہ اس کے ذریعہ اوزار اور سانچے بنانے والے بڑی جلدی ترقی کرتے ہیں۔ اور اونچے عہدوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ مجھے ایک مرتبہ ایک سوئٹزر لینڈ کے گھڑی ساز کی ضرورت تھی۔ میں نے ان رپورٹوں کو منگوا کر دیکھا اور مجھے فوراً ہی ایک ایسا آدمی مل گیا جو اس وقت تک برما پریس چلانے کے کام پر مقرر تھا۔ ہمارے والے محکمہ کو ایک بار فائر کلے یعنی اگن مٹی کی اینٹوں کے راج کی ضرورت تھی۔ ایسا آدمی بھی ایک برما پریس پر کام کرنے والوں میں ہمیں مل گیا۔ آج کل وہ جنرل سپرنٹنڈنٹ ہے۔

ہم ملازموں کو کارخانہ کے اندر بہت ملنے جلنے کی اجازت نہیں دیتے۔ کامگار کارخانہ میں آ کر کام کرتے ہیں اور پھر گھر چلے جاتے ہیں۔ کارخانہ کوئی کلب گھر نہیں ہے لیکن اس بارے میں ہم کوئی خاص سختی اختیار نہیں کرتے۔ کارخانہ میں کام پر آتے ہی ایک دوسرے سے بندگی سلام کرنا اور خیر خبر پوچھنا صرف اتنے پر ہمیں ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اور نہ ہم اس بات پر کبھی زور دیتے ہیں کہ تخت

لوگ اپنے افسروں اور منشیوں کو ضرور سلام کیا کریں کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ منشی صاحبان اپنے ماتحتوں پر خواہ مخواہ رعب نہ دکھایا کریں۔ ہمارے کارخانہ میں اتنے محکمے موجود ہیں۔ مانو ایک دُنیا بسی ہوئی ہے اور اس میں ہر طرح کے آدمی پائے جاتے ہیں۔ ملازموں کی آپس میں لڑائی دنگا کی بات لو۔ آدمی آپس میں ضرور لڑیں گے۔ یا دنگا کریں گے عام طور پر اس کا یہ نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ کہ لڑنے اور دنگا کرنے والوں کو نوکری سے علیٰحدہ کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس بارے میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اس سزا سے لڑنے جھگڑنے والوں پر کوئی خاص اچھا اثر نہیں پڑتا اور وہ آگے کو لڑنا جھگڑنا بند نہیں کر دیتے البتہ اتنا ضرور فائدہ ہوتا ہے کہ وہ ہماری آنکھوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہمارے فورمینوں نے ایسی لڑائی جھگڑوں کے واسطے اس قسم کی عمدہ سزائیں تجویز کر رکھی ہیں کہ قصور کرنے والے کے گھر کے لوگوں کا تو کوئی نقصان نہیں ہونے پاتا۔ اور قصور کرنے والوں کو اسی وقت فوراً سزا مل جاتی ہے۔

مشینوں سے پورا کام لینے کے لئے اور کام گاروں سے پورا پورا کام کرانے کیلئے نہایت ضروری ہے کہ کارخانے کے اندر کام کرنے کی تمام جگہیں نہایت صاف ستھری اور ہوادار ہوں۔ اور جہاں پر خوب روشنی پڑتی ہو۔ ہماری مشین بالکل ایک دوسرے کے پاس لگی ہوئی ہوتی ہیں اور چپہ چپہ زمین کچھ نہ کچھ کام کرنے کے لئے بنٹی ہوئی ہے جس کا خالی ہو یا گھری ہوئی برابر ایک جیسا کرایہ اور خرچہ سر پر پڑتا ہے۔ اگر ضرورت سے بے فائدہ چھ انچ کا فاصلہ بھی دو مشینوں کے درمیان زیادہ دے دیا جائے تو اس سے باربرداری کا خرچ بڑھ جائے گا اور اس لئے تیار مال کے دام خریدار کے لئے لازمی طور پر بڑھ جائیں گے۔ ہم چھوٹے سے چھوٹے پرزے کا بھی حساب لگا لیتے ہیں کہ اس کو کرنے کے لئے ٹھیک ایک آدمی کو کتنی جگہ درکار ہوگی۔ ہم اتنی تنگ جگہ بھی مقرر نہیں کرتے کہ کام گار بالکل کھنچ جائے کیونکہ یہ بالکل فضول ہوگا لیکن اگر اس کو اور اس کی مشین کو ضرورت سے زیادہ جگہ دے دی جائے تو بھی فضول ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی اور فیکٹری میں مشینیں اتنی پاس پاس لگائی بھی نہیں ہیں جتنی کہ ہمارے۔ ایک باہر کے آدمی کو دیکھنے سے تو ایسا لگے گا جیسے کہ یہ مشینیں ایک کے اوپر دوسری چڑھی ہوئی ہوں لیکن یہ بات کوئی نہیں۔ ان سب کو نہ صرف عمل کے لحاظ سے بالکل ہر کام گار اور مشین کے خیال سے اس ترتیب سے لگایا گیا ہے کہ جتنے انچ جگہ ہر آدمی اور ہر مشین کے لئے درکار ہے اتنی ضرور اس کو مل جائے لیکن اگر ممکن ہو تو اس سے ایک انچ زیادہ نہیں اور ایک فٹ زیادہ تو بالکل نہیں۔ ہم جو کارخانہ میں عمارتیں کھڑی

کرتے ہیں وہ ہم اس خیال سے نہیں بناتے کہ ہمارے کام گار وہاں آکر سیر سپاٹے کریں مگر یہ ضرور ہے کہ کیونکہ مشینیں بہت پاس پاس لگی ہوئی ہیں اس لئے ہم نے بچاؤ اور ہوا کا زیادہ سے زیادہ انتظام کیا ہے۔

مشینوں سے اپنی حفاظت کیسے کی جاتی ہے۔ یہ بھی ایک نہایت ضروری مضمون ہے۔ ایک مشین خواہ کتنا ہی اچھا کام کیوں نہ دیتی ہو ہم اس کو اچھی مشین نہیں سمجھتے جب تک کہ اس کو چلانے میں ذرا بھی خطرہ نہ ہو۔ ہمارے کارخانہ میں ایسی ایک بھی مشین نہیں جسے ہم خطرے والی سمجھتے ہوں لیکن پھر تھوڑے بہت حادثے ، ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک حادثے کی چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ایک گُنی آدمی کے ذریعہ جو کہ خاص اس کام کے لئے نوکر رکھا ہوا ہے جانچ کی جاتی ہے اور مشین کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کی جاتی ہے تاکہ آئندہ اس قسم کے حادثے بالکل نہ ہو سکیں۔

جب ہم نے پہلی عمارتیں بنائی تھیں تو ہمیں اس وقت ہوا داری کے مضمون کی اتنی خبر نہ تھی جتنی کہ اب ہے۔ جو ہم نے نئی عمارتیں بنائی ہیں اُن کے کھمبے اندر سے کھوکھلے رکھے گئے ہیں جن کے ذریعہ ہوا باہر نکالی جاتی ہے اور اچھی ہوا اندر لائی جاتی ہے۔ سارے کارخانے میں ہر جگہ لگ بھگ سارا سال ہی ایک جیسی ٹمپریچر رکھی جاتی ہے اور دن کے وقت کسی جگہ بھی بجلی سے روشنی کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لگ بھگ سات سو آدمی کارخانے کی ہر عمارت اور جگہوں کو صاف کرنے کھڑکیاں اور دروازے دھونے اور دوبارہ پینٹ کرنے پر مقرر ہیں۔ جن جگہوں اور کونوں میں اندھیرا رہتا ہے جہاں لوگ جا کر تھوکتے رہتے ہیں ان کو سفید پینٹ کیا جاتا ہے۔ جہاں صفائی نہیں وہاں کام کبھی سلیقے سے نہیں اس لئے جس طرح ہم مال تیار کرتے وقت درمیانہ درجہ کے نرے جلا وان کام نکالنے والے طریقے اور عمل استعمال کرنا ہرگز گوارا نہیں کرتے اُسی طرح ہماری ادھوری اور ہلکی صفائی سے بالکل تسلی نہیں ہوتی۔

کوئی وجہ نہیں ہے کہ فیکٹری کے اندر کام کرنا کیوں خطرناک ہو۔ اگر ایک آدمی نے نہایت سخت کام کیا ہے۔ یا اپنے پاؤں سے بہت گھنٹوں تک لگاتار کام کیا ہے۔ تو یہ قدرتی امر ہے کہ اُس کی طبیعت اتنی اور ایسی خراب ہو جائے جس سے لازمی طور پر حادثے پیدا ہونا بالکل ممکن ہے۔ حادثوں کو تین طرح سے روکا جاتا ہے۔ اول تو یہ کہ کارخانہ میں کام کرنے والے ملازموں کی ایسی اور اتنی خراب ہونے کا کبھی موقع نہ دیا جائے۔ دوسرے کہیں پر لاپرواہی نہ ہونے دی جائے اور تیسرے مشینوں کو اس طریقے سے لگایا جائے کہ ان کو چلانے میں کاریگر کی جان اور جسم کو قطعی خطرہ نہ ہو۔ گُنی یعنی کام میں اُستاد لوگوں کا کہنا ہے

ضرور سے حادثے پیدا ہونے کے بارہ سبب یہ ہیں :- (۱) خراب عمارتیں۔ (۲) نقص دار مشینیں۔ (۳) تنگ جگہ۔ (۴) حفاظت کا سامان نہ ہونا۔ (۵) صفائی کی کمی یا نہ ہونا۔ (۶) خراب روشنی۔ (۷) خراب ہوا۔ (۸) ڈھیلی پوشاک۔ (۹) لاپرواہی۔ (۱۰) بے سمجھی یعنی ناتجربہ کاری۔ (۱۱) خراب یا کمزور طبیعت اور (۱۲) ایک دوسرے سے مل جل کر کام نہ کرنا۔

خراب عمارتیں۔ نقص دار مشینیں۔ تنگ جگہ۔ صفائی کی کمی یا نہ ہونا۔ خراب روشنی۔ خراب ہوا۔ خراب طبیعت کا ہونا اور مل جل کر کام نہ کرنا۔ ان سب باتوں کا علاج تو بہت سہل ہے۔ کارخانہ کی اندر اچھی طرح ملازم یا کاریگر بھی حد سے زیادہ کام کرنے والے نہیں ہوتے۔ دس میں سے نو نقص جو کاریگروں خراب یا کمزور طبیعت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں وہ اچھی تنخواہیں دینے سے دور ہو جاتے ہیں۔ اور باقی تمام اچھی عمارتوں میں ان سے کام کرانے سے رفع ہو جاتے ہیں۔ اب سوال رہ گیا صرف ڈھیلی پوشاک لاپرواہی۔ ناتجربہ کاری کا۔ اور اس بات کا کہ ہر مشین کو کیونکر اس طرح پرفٹ کیا جاوے کہ اس پر کام کرنے والے کو کسی طرح کا ذرا بھر بھی خطرہ نہ رہے۔ جہاں پر پٹے چلتے ہوں وہاں پر یہ انتظام کرنا خاص طور پر مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم نے اپنی سب نئی عمارتوں میں ہر ایک مشین کے ساتھ الگ الگ بجلی کی موٹر لگائی ہوئی ہے مگر پرانی عمارتوں میں پٹے ہی چلانے پڑتے ہیں۔ ہر ایک پٹے کے اردگرد حفاظت کا سامان لگایا ہوا ہے۔ جو پٹے جہاں اپنے آپ چلتے ہیں اُن کے اوپر پل بنائے ہوئے ہیں تاکہ کسی آدمی کو گذرتے وقت خطرہ نہ ہو۔ جہاں پر دھات کے ذرّوں کا اُڑ کر آنکھ میں پڑ جانے کا خطرہ ہے وہاں پر کام کرنے والوں کو پہننے کیلئے عینکیں دی جاتی ہیں اور مشین کے اردگرد جالی لگا دی جاتی ہے جس سے ذرّوں کا آنکھ میں پڑنے کا اندیشہ اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ گرم بھٹیوں کے چاروں طرف جنگلے لگا دئے جاتے ہیں مشین کا کوئی حصہ کھلا چھوڑا نہیں جاتا جس میں کام گار کے جسم کا کوئی کپڑا یا کپڑے جانے کا خطرہ ہو۔ سب چھوٹے موٹے صاف ستھرے رکھے جاتے ہیں۔ دھات کو کھینچنے والے شکنجوں کو چلانے کے لئے جو سوئچیں استعمال کی جاتی ہیں اُن کے ساتھ بڑے بڑے لال فیتے باندھ دئے جاتے ہیں جن کو ہٹائے بغیر سوئچیں کھولی نہیں جا سکتیں اس کا یہ فائدہ ہے کہ ان مشینوں کو یوں ہی اندھا دھند چلانا کوئی شروع نہیں کر سکتا چاہے انتظام کر لو پھر بھی کام گار لوگ کچھ نہ کچھ ڈھیلی پوشاک پہن کر کام پر آ ہی جاتے ہیں۔ اُڑتی ہوئی کوئی جو ممکن ہے کسی گراری میں پھنس جائے۔ بغیر بٹن والی بانہہ کی قمیص یا اسی طرح کا کوئی اور ڈھیلا کپڑا پہن کر

آجاتے ہیں۔ محکمے کے مشینوں اور افسروں کو اس بات کا خاص دھیان رکھنا پڑتا ہے اور عام طور پر
یہ تصور کرنے والوں کو پکڑ بھی لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی مشین لگائی نہیں جاتی جب تک کہ اُس کی
ہر لحاظ سے پوری جانچ نہیں کرلی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے کارخانے میں مشکل سے ہی کبھی
کوئی بڑا حادثہ ہوتا ہے۔

یاد رکھو کہ دُنیا میں کارخانے لوگوں کی جان لینے کے لئے نہیں ہیں۔

بیان (۸)

تنخواہیں

دوسروں کی خالی نقل کرنے سے کبھی کوئی بیوپار نہیں چلا کرتا۔ نہ کسی کارخانہ دار کا یہ کہہ کر گزارہ ہو سکتا ہے کہ جتنی اور کارخانے تنخواہیں دیتے ہیں۔ اُتنی ہی میں بھی اپنے ملازموں کو دیتا ہوں۔ حالانکہ وہی کارخانہ دار اتنی جلدی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ میرے پاس دوسروں کی نسبت بہتر یا سستی چیز بیچنے کے لائق نہیں ہے۔ کوئی عقل والا کارخانہ دار یہ کبھی نہیں کہے گا کہ نہایت بڑھیا مال تیار کرنے کے لئے سب سے سستے کچے مسالے استعمال کرنا مناسب ہے پھر یہ ملازموں کی بھلائی کے لئے اتنا شور شرابا کیوں کیا جاتا ہے اور یہ کیسے کہا جاتا ہے کہ مزدوروں کی تنخواہیں کم کرنے سے ملک کو بہت فائدہ ہوگا۔ تنخواہیں کم کرنے سے لوگوں کے اندر خریدنے کی طاقت کم ہوتی ہے اور مال کم تیار ہوتا ہے۔ ایسے کارخانے جاری کرنے سے بالکل کچھ فائدہ نہیں جن کا انتظام خراب ہونے کی وجہ سے انہیں کام کرنے والوں کو پیٹ بھر کر پوری روٹی بھی نصیب نہ ہوسکے۔ ہماری سوسائٹی کے سامنے کوئی سوال اتنا ضروری نہیں ہے جتنا کہ تنخواہ کا کیونکہ ہمارے ملک کے اکثر آدمیوں کا گزارہ تنخواہوں سے ہوتا ہے۔ ملک کی خوشحالی کا اندازہ لوگوں کے رہن سہن کے طریقوں یعنی تنخواہوں کی شرح سے پایا جاتا ہے۔

فورڈ کے تمام کارخانوں میں اب کم سے کم اٹھارہ روپے فی روز تنخواہ مقرر ہے۔ اس سے پہلے ہم کم سے کم پندرہ روپے فی روز دیا کرتے تھے۔ اگر ہم آج پھر اس پرانی شرح سے تنخواہیں دینے لگیں تو نہ صرف یہ بہت واہیات بات ہوگی بلکہ اس سے ہمارے بیوپار کو بھی سخت دھکا لگے گا۔

سب سے اوّل دونوں کا آپس میں رشتہ اور تعلق سمجھنا ضروری ہے۔ عام طور پر ملازم مالک کے ساتھ پتّی دار کبھی نہیں کہا جاتا۔ لیکن ذرا غور سے سوچ کر دیکھو کہ وہ اور ہے کیا؟ جس وقت ایک آدمی کا کام اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ اکیلا اُسے سنبھال نہیں سکتا تو وہ اپنی مدد کرنے کو اور بندے اپنے کام میں لا لیتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک کارخانہ کا مالک یہ دیکھتا ہے کہ کارخانے کا ہر ایک کام وہ اکیلا اپنے دونوں ہاتھوں سے نہیں کر سکتا تو پھر جن آدمیوں کو وہ اپنی مدد کے لئے بھرتی کرتا ہے وہ اُس کے پتّی دار کیوں نہیں۔ ہر ایک دھندا جس میں ایک سے زیادہ آدمی کام کرتے ہیں ایک طرح سے پتّی سے ہیں یوں ہی ایک آدمی اپنے دھندے میں مدد کے لئے کسی کو نوکر رکھتا ہے خواہ وہ ایک لڑکا ہی کیوں نہ ہو تو یوں ہی سمجھ لینا چاہیئے کہ اُس نے اپنے ساتھ ایک پتّی دار پیدا کر لیا ہے چاہے وہ اپنے سارے دھندے کا اکیلا مالک ہو اور اُس کے سب کام اُس کی مرضی اور حکم سے چلتے ہوں لیکن وہ تب ہی تک پورا خود مختار کہلا سکتا ہے جب تک کہ وہ اپنے کام کا اکیلا کرنے والا اور چلانے والا ہے۔ جب تک ایک آدمی کو کسی دوسرے کی مدد لینے کی ضرورت ہے تب تک وہ خود مختار نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو آپس کا رشتہ ہے۔ مالک اپنے ملازم کا پتّی دار ہے اور ملازم اپنے مالک کا پتّی دار ہے ایسی حالت میں مالک یا ملازم کے لئے یہ سمجھ بیٹھنا کہ صرف ان میں سے ایک ہی دھندے کی گاڑی بڑے مزے سے چلا سکے گا۔ بالکل نامعقول بات ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے واسطے نہایت ضروری ہیں اور ایک کا دوسرے کے بغیر گذارہ نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے کا گلا گھونٹ کر کچھ عرصہ تک چل سکے لیکن اخیر میں اُس کا اپنا ہی دم گھٹنے لگے گا۔ اس لئے پونجی والوں اور مزدور لوگوں کا اپنے جُدا جُدا جتھے بنانا بہت بھاری حماقت ہے اور جب وہ ایک دوسرے کے حق مارنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس سے وہ صرف اپنے کارخانے یا کمپنی کو ہی نقصان پہونچاتے ہیں جس کے وہ پتّی دار ہیں اور جس سے ان دونوں کا پیٹ پلتا ہے۔

اپنے دھندے میں سب سے آگے ہونے کے لئے ہر ایک مالک کارخانہ کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے ملازموں کو اپنے دھندے کے دوسرے مالکوں کے مقابلہ میں زیادہ تنخواہیں دے سکے۔ اور ملازموں کی سدا یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ مالک کے واسطے ایسا کرنا ممکن بنا سکیں۔ یہ درست ہے کہ ساری کارخانوں میں ہر جگہ اکثر ملازموں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ اگر اپنی پوری طاقت اور لیاقت سے کام کریں تو اُس سے اُن کے مالکوں کو ہی فائدہ ہوتا ہے مگر اُن کو خود کچھ نہیں ملتا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایسا خیال لوگوں

کے دل میں بیٹھا ہوا ہے۔ مگر یہ خیال موجود ضرور ہے۔ اور شاید اس کے لئے تھوڑی بہت معقول وجہ بھی ہو اگر مالک اپنے ملازموں سے پورے زور کے ساتھ کام کرنے کو کہتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد ملازموں کو یہ پتہ لگتا ہے کہ مالک نے اس کی کچھ قدر نہیں کی اور کچھ انعام نہیں دیا۔ تو وہ پھر اپنی پرانی چال پر آجاتے ہیں لیکن اگر پوری محنت سے کام کرنے کا ان کو روپیہ پیسے کی شکل میں کچھ انعام ملنے لگے اور ان کو یہ ثابت ہو جائے کہ زیادہ محنت کرنے سے زیادہ پیسے ملتے ہیں تو وہ بھی اس بیوپار یا کارخانہ کو اپنانے لگیں۔ کہ اسکی کامیابی کا دار و مدار ان پر ہے اور ان کی کامیابی کا دار و مدار اس پر ہے۔

مالک کو تنخواہیں کتنی دینی چاہئیں اور ملازم کو کیا تنخواہ ملنی چاہئے؟ یہ بڑے معمولی سوال ہیں اصلی بنیادی سوال تو یہ ہے کہ فلاں دھندے سے تنخواہ نکل کتنی سکتی ہے۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ کوئی دھندا اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ نہیں کر سکتا۔ اگر ایک کنوئیں کے اندر جتنا پانی آتا ہو اس سے زیادہ نکلنا شروع ہو جاوے تو وہ خشک ہو جاوے گا۔ اور جب وہ کنواں خشک ہو جاوے۔ تو جن کا اس پر گزارہ تھا وہ پیاسے مرنے لگیں گے۔ اس وقت اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ پہلے ایک کنواں ختم کر لیں پھر دوسرے پر دھاوا بول دیں گے۔ تو تھوڑے عرصہ کے اندر سبھی کوئیں خشک ہو جاویں گے۔ آج پبلک کا یہ تقاضہ دم بدم بڑھ رہا ہے کہ اب تک کارخانوں کی آمدنیوں کا جو بہت بڑا حصّہ مالکوں کی جیب میں جا رہا ہے۔ یہ سراسر ناواجب ہے۔ اور ملازموں کو بھی ان میں آگے کی نسبت معقول اور زیادہ حصّہ ملنا چاہئے۔ مگر ان آمدنیوں کی بھی آخر کوئی حد مقرر ہے۔ دھندا اس حد کو مقرر کرتا ہے۔ اگر ایک دھندے سے تین لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی ہے تو اس میں سے ۴ لاکھ روپیہ نکال کر ملازموں کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا بیوپار سے ہی تنخواہیں مقرر ہوتی ہیں لیکن بیوپار کی کوئی حد مقرر نہیں ہاں پرانے طریقوں اور چالوں میں پڑ کر بیوپار کی حد ضرور چھوٹی ہو جاتی ہے۔

بجائے اس کے کہ ملازم لوگ یہ کہیں کہ مالک کو ایسا کرنا چاہئے۔ یہ کہیں کہ بیوپار کو کس طریقہ پر چلانا چاہیئے اور اس کا فلاں انتظام اس طریق پر ہونا چاہئے تو اس سے بہت فائدہ نکلے کیونکہ آخر دھندے سے ہی تنخواہیں نکلتی ہیں۔ اگر دھندے سے تنخواہیں نہیں نکلتیں تو مالک اپنی جیب سے نہیں دے سکتا لیکن اگر دھندا اتنا اچھا چل رہا ہے کہ اس سے بڑی تنخواہیں نکل سکتی ہیں اور پھر بھی مالک اُنہیں نہیں دیتا تو پھر کیا کرنا چاہئے عام طور پر بیوپار کے سر سے بہت سے آدمیوں کا گزارہ ہوتا ہے

اور اس میں خواہ مخواہ دخل نہیں دینا چاہیئے جس دھندے کو کرنے کے لیئے بہت سے آدمیوں نے کافی عرصہ تک محنت کی ہو اور جس کے سہارے رہ کر اب صرف اُن کا گزارہ ہو رہا ہو اُس کو بند کر دینا میرے خیال میں بھاری جرم ہے۔ ہڑتالیں کرنے یا کام میں رُکاوٹ ڈالنے سے کبھی کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر مالک اپنی موجھوں پر تاؤ دے کر ہمیشہ یہی سوچتا ہے کہ اپنے ملازموں کو کتنا کم سے کم دے کر اپنا دھندا چلا سکتا ہو تو اس سے اُس کو کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر ملازم لوگ بھی اکڑ جائیں اور یہ کہیں کہ ہم مالک کی گردن پکڑ کر اتنی تنخواہ لے کر ہی چھوڑیں گے تو اس سے بھی سراسر نقصان ہے۔ آخر میں دونوں کو ہی دھندے کی ہی شرن لینی پڑے گی۔ اور یہ دیکھنا پڑے گا کہ ہم کس طرح سے اس دھندے کو پکّے پاؤں پر کھڑا کر سکتے ہیں اور اس سے اتنا منافع اُٹھا سکتے ہیں جس سے اس کام کو کرنے والے سبھی آدمیوں کا اچھی طرح سے اور آرام کے ساتھ گزارہ ہو سکے۔

یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ سبھی مالک اور ملازم ہمیشہ ٹھیک اصول پر چلنے کے لئے تیار نہیں ہوتے عام طور پر لمبی سوچ کرنے کی عادت بہت دیر میں آتی ہے۔ کیا کیا جائے کچھ نہیں پتہ چلتا کوئی قاعدہ اور قانون انسان کے اندر یہ فرق نہیں ڈال سکتا۔ لیکن اگر آدمی اپنی بھلائی سوچے تو یہ عقل کبھی نہ کبھی ضرور آجائیگی اور یہ خیال لوگوں کی سمجھ میں ضرور آنے لگے گا کہ جہاں پر مالک اور ملازم ایک اصول پر چلنے کی کوشش کریں گے وہاں بیوپار میں ضرور ترقی ہوگی۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ بڑی تنخواہیں دینے سے ہماری مراد کیا ہے؟ بڑی تنخواہ دینے سے ہماری مراد یہ ہے کہ جو تنخواہیں دس مہینے یا دس سال پہلے دی جاتی تھیں اُس سے اب زیادہ دی جائیں ہمارا اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جس تنخواہ کو پانے کا وہ مستحق نہیں ہے وہ ملازم کو ادا کی جائے۔ دس سال بعد شاید جس کو آج ہم بڑی تنخواہ کہتے ہیں وہ چھوٹی پائی جائے۔

اگر کارخانے کے ایک منیجر کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ اپنے مالکوں اور رشتہ داروں کو زیادہ سے زیادہ ڈیونڈ ادا کرنے کی کوشش کرے تو اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے ملازموں کو اُتنی ہی زیادہ تنخواہ دینے کی بھی کوشش کرے لیکن بڑی تنخواہیں دینا کارخانے کے منیجر کے بس کی بات نہیں ہاں اگر وہ دے سکتا ہو اور پھر آنا کانی کرے تو بے شک قصور اس کا ہے۔ لیکن بڑی تنخواہیں دینا اکیلے اُس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ جب تک کارگر کام کر نہ دیں تب تک ایک منیجر ہرگز بڑی تنخواہیں نہیں دے سکتا۔

اُن کی کامگاری اور محنت ہی ساری کمائی کا وسیلہ ہے مگر صرف یہی ایک کمائی کا وسیلہ نہیں ہے اگر انتظام خراب ہو تو کامگاروں کی محنت ساری برباد ہو سکتی ہے اور سارے کچے مسالے ضائع چلے جائیں گے اور کامگاروں کا سب کیا کرایا چوپٹ ہو جائے گا۔ انتظام کتنا بھی اچھا کیوں نہ ہو لیکن اگر کامگاروں کا دل نہ ہو تو سب دھرا دھرایا رہ جاتا ہے۔ لیکن جہاں پر اچھا انتظام ہو اور کامگار بھی ایمانداری سے کام کریں اور دونوں کی ایک طرح سے بنتی ہو تو وہاں پر کامگار کے ہاتھ سے بڑی سی تنخواہیں نکلنا بالکل ممکن ہے۔ وہ اس میں اپنی محنت اور لیاقت خرچ کرتا ہے۔ اور اگر وہ پورے دل اور ایمانداری کے ساتھ یہ دونوں چیزیں خرچ کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُس کو بڑی تنخواہ کی شکل میں ان کا انعام کیوں نہ ملے۔ نہ صرف اُس نے اپنا پسینہ بہا کر اس کو حاصل کیا ہے۔ بلکہ اصل میں اُسی نے ہی اس کو پیدا کیا ہے۔

یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہیئے کہ بڑی تنخواہیں صرف کارخانے کے اندر سے ہی نکلا کرتی ہیں اور اگر وہاں سے نہیں نکل سکتیں تو کامگاروں کو ان کے ملنے کی بالکل کوئی صورت نہیں دُنیا میں آج تک کوئی ایسا سسٹم ایجاد نہیں ہوا جس کے ذریعہ بالکل کچھ کام کئے بغیر آدمی کچھ روپیہ پیدا کر سکے۔

قدرت کے اندر بھی ہم یہی اصول کام کرتا دیکھتے ہیں۔ پرمیشر نے ہرگز کسی آدمی کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ سُست اور کاہل رہے۔ کام ہی ہماری نیکی ہماری عزت اور ہمارے بچاؤ کی صورت ہے اس لئے کام لعنت نہیں بلکہ پرمیشر کی ہماری لئے سب سے بڑی نعمت ہے۔ سوسائٹی کے اندر پورا امن امان تب ہی قائم رہ سکتا ہے جبکہ سب لوگ اپنا اپنا کام ایمانداری سے کرتے چلے جائیں۔ اس لحاظ سے جو آدمی سوسائٹی کی زیادہ مدد کرتا ہے اُس کو زیادہ پیسے ملنے چاہئیں اس لئے بڑی تنخواہوں کے دینے میں خیرات کا بالکل کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جو کامگار دھندے میں اپنا پورا تن من لگا دیتے ہیں۔ دھندے کے واسطے اُس سے بہتر کامگار کوئی نہیں لیکن اگر اس کے کام اور لیاقت کی مناسب قدر نہیں کی جائے گی تو وہ ہمیشہ اور لگاتار کبھی اپنی پوری طاقت اور لیاقت سے کام نہیں کر سکے گا۔ کامگار کے دل میں صحیح کام پر لگنے کے وقت اگر یہ خیال

ہے کہ چاہے وہ کتنا ہی جی توڑ کر کام کرے اُس کو پیسے تو اُتنے ہی ملتے ہیں جس سے اُس کا مشکل ہی سے گزارہ ہوگا تو وہ کس طرح سے جی لگا کر اس دن کام کرے گا۔ اُس کو فکر توڑ توڑ کر کھا رہا ہے اور وہ پریشان ہے اور اس کا اثر اُس کے کام پر ضرور پڑتا ہے اور کافی پڑتا ہے۔

لیکن اگر ایک کامگار کو یہ پتہ ہو کہ اُس کے سامنے جو آج کام ہے اُس کو کرنے سے نہ صرف اُس کے گھر کی تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں گی بلکہ اس سے اُس کو تھوڑا بہت اور سکھ بھی مل سکے گا اور اس سے وہ اپنی اور بال بچوں کو کچھ میر سپاٹا بھی کرا سکے گا تو وہ اپنے کام کو بڑے شوق سے کرے گا اور بڑی خوشی کے ساتھ پورا دل لگا کر کرے گا اس طرح کرنے سے اس کو بھی کافی فائدہ ہے اور اس کے کارخانہ کی بھی اسی میں بھلائی ہے۔ اگر سارا دن کام میں مغز پچی کرنے کے بعد آدمی کو کچھ تسلی حاصل نہیں ہوتی تو وہ کبھی اپنی پوری تنخواہ نہیں پا سکتا۔

ایک کامگار کے لئے نوکری کوئی چھوٹی موٹی چیز نہیں بلکہ ایک بڑی بھاری نعمت ہے دنیا اس پر کھڑی ہوئی ہے۔ ہماری عزت کی بنیاد یہی ہے۔ اس لئے کارخانے کے ایک مالک کو اپنے ملازموں کی نسبت بھی لگاتار زیادہ محنت سے اپنا کام کرنا چاہیئے۔ جو مالک اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے اُس کو اس دنیا میں رہ کر ضرور سخت محنت کرنی ہوگی وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کیونکہ میرے ماتحت ہزاروں آدمی کام کرتے ہیں اس لئے مجھے کیا پرواہ ہے بلکہ اصلی بات اس سے بالکل اُلٹ ہے کیونکہ ایک طرح سے ان ہزاروں آدمیوں نے اس کو اپنا نوکر رکھا ہوا ہے۔ اور جتنا وہ محنت کے ساتھ کام کرتے ہیں اُتنا ہی اُن کے بنائے ہوئے تیار مال کو بیچنے کے لئے مالک کو محنت زیادہ کرنی پڑے گی تنخواہوں اور طلبوں کی رقم ہمیشہ ایک مقرر ہوتی ہے اور حساب رکھنے کے لئے ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے۔ تنخواہیں اور طلبیں ایک طرح سے منافع کی پیشگی تقسیم سمجھنی چاہیئے۔ مگر اکثر ایسا ہو جاتا ہے کہ سال ختم ہونے پر جب دھندے کا بہی کھاتہ بند کیا جاتا ہے تو یہ پتہ لگتا ہے کہ جتنا منافع بانٹا گیا ہے۔ اس سے زیادہ ادا کیا جا سکتا تھا۔ اور اُس وقت یہ زائد رقم بھی ضرور ادا کر دینی چاہیئے۔ جب ہم دھندے میں مل کر کام کرتے ہیں تو ہم سب کو منافع کا حصہ ملنا چاہیئے خواہ وہ تنخواہ یا طلب کی شکل میں ہو یا بونس کی صورت میں۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس پر لوگ آہستہ آہستہ اب آ رہے ہیں۔

اب تو اس بات کی کھلے طور پر مانگ کی جا رہی ہے کہ دھندوں میں تیار مال کی جتنی قدر کی جاتی ہے اُتنی ہی کامگاروں کی بھی ہونی چاہیئے۔ اور یہ ایک دن ہو کر رہے گا۔ اب صرف سوال اتنا باقی رہ جاتا ہے کہ سوسائٹی کے اندر یہ تبدیلی کیا عقل اور ترتیب کے ساتھ آہستہ آہستہ داخل ہوگی یا ایسے بیہودہ طریقہ پر جس سے کہ پچھلے سالوں میں جتنی ہم نے ترقی کی ہے وہ سب کی سب ضائع ہو جائے کارخانوں اور دھندوں سے ہماری قوم کی ترقی کا پتہ لگتا ہے اور ہماری مالی حالت کا اندازہ ہوتا ہے اور ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہمارا کیا درجہ ہے۔ ہم اپنی پوزیشن کو خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتے ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ایک انسان کی بطور انسان آگے سے زیادہ قدر ہونے لگے۔ میرا خیال ہے کہ سوسائٹی کے اندر بغیر کسی قسم کی گڑبڑ کیئے اور کسی کو نقصان پہونچائے بغیر ہم اپنے الہ ہر ہر تبدیلی لا سکتے ہیں بلکہ اس سے سوسائٹی کے ہر ایک ممبر کو بہت فائدہ رہے گا۔ یہ سب باتیں بڑی آسانی کے ساتھ پوری ہو سکتی تھی۔ اگر مالک اور کامگار کے درمیان پتّی کے اصول کو مان لیا جائے جب تک ایک آدمی بالکل خود مختار نہیں ہوتا اور جب تک اُس کو ایک دوسرے آدمی کی کسی نہ کسی شکل میں مدد کی ضرورت رہے گی تب تک پتی دار کے بنا بالکل گزارہ نہیں۔

یہ ہیں تنخواہوں کی نسبت بنیادی سچائیاں۔ تنخواہیں بیوپار میں پتی داروں کے درمیان منافعوں کے مناسب تقسیم کے سوائے اور کچھ بھی نہیں۔

کیا تنخواہ مناسب ہے؟

کام کے لحاظ سے ایک آدمی کو اپنی کیسی رہائش رکھنی چاہیئے؟ کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ یہ تنخواہ کیوں دی جاتی ہے اور کیا ہونی چاہیئے۔ یہ کہنے کی نسبت کہ اس سے آدمی کا گزارہ ہونا چاہیئے چُپ رہنا ہی اچھا ہے۔ کارخانہ کے اندر تیار مال کہنے و بار برداری کا جیسا اچھا یا بُرا انتظام ہوگا اتنا ہی کامگاروں کی وہاں پر رہائش اچھی یا بُری ہوگی اور یہ تب ہی اچھے ہوں گے اگر انتظام اچھا ہے اور کامگار اچھے ہیں۔ اگر کارخانے کے اندر کام اچھا ہو رہا ہو اور انتظام اچھا ہو تو ایسے کامگاروں کو تنخواہیں بڑی ملیں گی اور رہائش کا خرچ گھٹ جائے گا۔ لیکن اگر ہم تنخواہیں رہائش کے خرچ پر حساب لگا کر بانٹنا شروع کر دیں تو ہم کبھی کچھ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ رہائش کا خرچ ایک طرح سے

ایک نتیجہ ہے اور جن چیزوں کو ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے اگر ہم ہمیشہ بدلتے رہیں تو ایک جیسا نتیجہ کبھی نہیں رہ سکتا جب ہم تنخواہیں رہائش کے خرچ کا حساب لگا کر بانٹنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم ایک کتے کی نقل کرتے ہیں جو اپنی پونچھ کو پکڑنے کے لئے چکر کاٹتا رہتا ہے اس کے علاوہ کون اتنا لائق ہے جو یہ حساب لگا کر کہہ سکے کہ فلاں قسم کی رہائش رکھنے کے لئے اتنی لاگت کافی ہے اور اس کا فلاں قاعدوں اور طریقوں سے شمار کر کے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہم کو اس بات پر کھلے دل کے ساتھ غور کرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ ایک کارمگار کے لئے تنخواہ کیا ہم نے رکھی ہے اور اس کی کیا قدر ہے اور یہ کتنی مقرر کرنی چاہیئے تنخواہ کے سر سے کامگار نے کارخانے سے باہر اپنی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ اور کارخانے کے اندر اس کے سہارے اس نے اپنے دھندے کی خدمت اور انتظام کرنا ہے۔ آج تک دنیا کے اندر روزانہ نوکری سے بڑھ کر دھن کی کوئی کان نہیں نکلی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک کامگار کی کارخانہ کے باہر جتنی ضرورتیں ہیں وہ سب اسی سے ضرور پوری ہونی چاہئیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ کامگار کے بڑھاپے کے دنوں میں بھی جب اُس کے ہاتھ پاؤں کام کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اس کا گزارہ اسی تنخواہ سے نکلے گا۔ اگر تنخواہیں ان سب باتوں کو پوری کر سکیں تو تمام کارخانوں کو ایک ایسے ڈھنگ اور اصول میں باندھنا پڑے گا جس میں تیار مال بکری اور منافعے بالکل ٹھیک ٹھیک مقرر کئے ہوئے ہوں گے اور جس سے ایسے مفت خوروں کے جیب میں کوئی پیسہ نہ جا سکے گا جو تیاری مال میں بالکل کچھ مدد نہیں کرتے ایک اس قسم کا سسٹم قائم کرنے کے لئے جو مالک کی صرف خاص مہربانی پر منحصر نہ ہو اور جس میں مالک کی بد نیتی بالکل کچھ نہ کر سکتی ہو ہمیں یہ ضرور دیکھنا پڑے گا کہ آج دنیا میں لوگ اپنا گزارہ کرنے کے لئے حقیقت میں چاہتے کیا ہیں۔

چاہے گندم کا بھاؤ تین روپے فی بوری ہو یا کہ ساڑھے سات روپے دونوں حالتوں میں اُس کو پیدا کرنے کے لئے ایک کسان کو اُتنی ہی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح انڈے چاہے چھ آنے فی درجن ہوں یا پونے تین روپے دونوں صورتوں میں محنت ایک جیسی کرنی پڑتی ہے۔ اس سے ایک آدمی کو اپنی روزانہ نوکری کرنے میں جتنی محنت خرچ کرنی پڑتی ہے اُس میں بالکل کچھ فرق نہیں پڑتا۔

اگر ایک آدمی کے اپنے ہی گزارے کا سوال ہوتا تو یہ فیصلہ کرنا کہ اُس کو گزارہ کے لئے کتنا خرچ

درکار ہے اور اس کو کیا تنخواہ ملنی چاہیئے آسان تھا۔ لیکن وہ اکیلا تو ہے نہیں وہ ایک شہری ہے جو قوم کی بھلائی میں مدد کرتا ہے۔ اُس کا ایک کنبہ بھی ہے۔ شاید وہ کئی بچوں کا باپ ہے جن کی پرورش کا بوجھ اُس کے سر پہ ہے۔ اب آپ بتائیں کہ کون سا ایسا طریقہ ہے جس سے یہ حساب لگایا جا سکے کہ اگر وہ اتنے پیسے کمائے تو اُس کا کام اچھی طرح سے چل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ یہ کس طرح سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُس کے روزانہ کام میں اُس کے گھر میں سُکھ اور آرام ہونے سے کتنا فرق پڑتا ہے۔ آپ ایک آدمی کو اُس کے کام کے لحاظ سے دام دیتے ہو۔ لیکن کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ جو کام اُس نے کیا ہے اُس میں اس کے گھر میں سکھ اور آرام ہونے کا کتنا ہاتھ ہے؟ اس کام کو کرنے میں اُس کی ایک شہردار ہونے کی حیثیت سے کیا فرق پڑا ہے۔ اسی طرح ایک باپ ہونے کی حیثیت سے کتنا۔ آدمی تو کارخانے میں کام کرتا ہے لیکن اُس کی بیوی گھر پہ کام کرتی ہے مگر دونوں کا خرچ نکالنا صرف کارخانے کے ذمّے ہے حساب لگانے کا کونسا ایسا طریقہ ہے جس سے یہ پتہ لگ سکے کہ ایک آدمی کی مزدوری میں اُس کے گھر کا کتنا حصّہ ہے۔ کیا ایک کامگار کی تنخواہ کا فیصلہ کرنے کے لئے صرف اتنا دیکھنا ضروری ہے کہ اس کا صرف اپنی رہائش پر خرچ کتنا ہوتا ہے اور اس کے اوپر اُس کا گھر بار اور کنبہ ہونے کی وجہ سے جو ضرورت ہے وہ بونس میں سے نکلنا چاہیئے۔ کیا اس بونس کا اندازہ صرف نقد دام کی شکل میں لگایا جائے گا کہ ایک آدمی کی مزدوری سے اُس کا اور اُس کے کنبہ کا پیٹ بھر جانے کے بعد کتنے پیسے بچتے ہیں یا یہ کہ تنخواہ کی مد میں بیوی بال بچے اور سب رشتہ داروں کا خرچ آجائے گا اور بونس کا حساب ان سے بالکل علیحدہ لگایا جاوے گا یعنی مطلب یہ ہے کہ کیا ایک کامگار کو اپنا اور اپنے کنبہ کا خرچ نکال کر اُن کو کپڑے پہنا کر آرام کے ساتھ ایک گھر میں رکھ کر اور اچھی طرح سے پڑھا لکھا کر غرضکہ ایک اچھی رہایش رکھنے کے لئے جو سہولتیں ملتی ہیں اُن سب کو پورا کرنے کے بعد بونس کی شکل میں تنخواہ کے علاوہ کچھ اور بھی ملنا چاہیئے یا نہیں اور کیا یہ سب رقم مزدوری کے سر پڑنی چاہیئے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ بے شک مزدوری کے سر پڑنا چاہیئے ورنہ ایک دن ہمیں یہ خوفناک نظارہ دیکھنا پڑے گا کہ چھوٹے بچے اور اُن کی مائیں گزارہ کرنے کے لئے کام پر لگنے کیلئے مجبور ہوں گی۔

یہ ہیں وہ سوال جن کا حل ڈھونڈنے کے لئے ہمیں نہایت باریک چھان بین کرنی چاہیئے

اور بڑا سوچ سمجھ کر حساب لگانا چاہیئے۔ اگر ہم اپنی مالی زندگی کے ہر پہلو پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے لگیں تو شاید
ہمیں کسی اور بات سے اتنی حیرانی نہیں ہوگی جتنا کہ یہ جان کر کہ ایک مزدوری کے سر پر کیا کیا ذمہ داریاں ہیں۔
شاید یہ کبھی ممکن ہو سکے کہ کسی دن کا کام تھوڑا بہت خراب کر کے یہ ٹھیک ٹھیک پتہ لگایا جا سکے کہ
ایک دن کا کام کرنے میں ایک آدمی کی کتنی طاقت خرچ ہوتی ہے۔ مگر یہ ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا کسی
حالت میں بھی ممکن نہیں کہ اگلے دن جو اُسے کام کرنا ہے اُس کو کرنے کے لئے اس کھوئی ہوئی طاقت کو کیسے
پورا کیا جا سکتا ہے۔ نہ کبھی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جتنی طاقت اُس کی خرچ ہو چکی ہے اُس کا کتنا حصّہ
وہ عمر بھر کبھی پورا نہیں کر سکے گا ابھی تک دھن شاستر نے ایسا کوئی فنڈ قائم نہیں کیا جس کے ذریعہ ایک کامگار
اپنی خرچ کی ہوئی طاقت واپس حاصل کر سکے۔ اس فنڈ کی ایک شکل یہ ہو سکتی ہے کہ بڑھاپے میں کامگاروں
کو پنشن دے دی جائے۔ لیکن پنشن کا یہ نقص ہے کہ یہ بہت پیچھے ملتی ہے۔ اگر مزدوری کے ساتھ ساتھ وہی
رقم ملتی رہتی تو کامگار کو اتنے فکر اور فاقے کبھی نہ کرنے پڑتے اور نہ اُس کی طاقت اتنی جلدی ضائع ہو جاتی
آج تک جتنی بڑی سے بڑی تنخواہیں ادا کی گئی ہیں وہ کبھی اتنی بڑی نہیں ہوئیں جتنی کہ ہونی چاہئیں
ابھی تک دھندے کرنے کے طریقے لوگوں کی سمجھ میں پورے طور سے نہیں آئے اور نہ ہی اُن کو یہ پتہ لگا ہے کہ
کارخانوں کو چلانے کا اصلی منشا یہی ہے کہ کامگاروں کو جتنی تنخواہ ملنی چاہیئے اُس سے ہم کچھ زیادہ اُنہیں
ادا کر سکتے ہیں۔ اب یہ کام ہمارے سامنے ہے۔ بہت سے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اگر تنخواہ کا سسٹم اُڑا دیا جائے
اور چھوٹے چھوٹے جتھوں میں ملکیت تقسیم کر دی جائے تو اس سوال کا حل بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ مگر یہ
غلط بات ہے۔ صرف تنخواہ کا ہی یہ اچھا سسٹم ہے جس کے ذریعہ مال تیار کرنے والوں کو لیاقت اور محنت کا
انعام دیا جا سکتا ہے۔ اگر تنخواہ کا سسٹم اُڑا دیا جائے تو ہر جگہ افراتفری پھیل جائے۔ تنخواہ کے سسٹم کو پورے
طور سے ضابطہ میں لایا جائے تو چاروں طرف امن وامان ہو جائے گا۔

بہت سالوں کے بعد میرے ہاتھ تنخواہوں کا گُر لگا ہے سب سے پہلے اور سب باتیں چھوڑ کر
میں نے یہ دیکھا ہے کہ جتنی ہم تنخواہیں زیادہ دیتے ہیں اتنی ہماری بکری بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اگر ہم بڑی
تنخواہیں دیتے ہیں تو لوگ انہیں خرچیں گے تو ضرور اور اس سے دوسرے دھندوں کے کرنے والوں۔ مال
رکھنے اور بیچنے والوں۔ اور کامگاروں کو خوب منافع ہوگا اور اُن کی خوشحالی سے ہماری بکری بھی ضرور بڑھیگی

اگر سارے ملک میں تنخواہ بڑی ملنے لگیں تو سارا ملک خوشحال ہو جائے مگر شرط یہ ہے کہ بڑی تنخواہ صرف تب ہی دینی چاہئیں جب کہ تیار مال کی تعداد بھی بڑھے اگر تنخواہ بڑھتی چلی جائیں اور تیار مال کی تعداد میں کمی ہونے لگے تو اس سے مارکیٹ میں بہت جلدی مندی پھیل جائے گی۔

کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد ہماری سمجھ میں یہ بات آئی کہ تنخواہوں کا ہمارے کام پر کتنا اثر پڑتا ہے اور یہ بات ہمیں اُس وقت تک پتہ نہیں لگی جب تک کہ ہم نے اپنا ماڈل T تیار نہیں کر لیا تھا۔ اور تب ہم یہ حساب لگانے کے قابل ہوئے تھے کہ حقیقت میں تنخواہیں کیا ہونی چاہئیں اُس سے پہلے ہم منافع کی تھوڑی بہت تقسیم کیا کرتے تھے۔ پچھلے چند سالوں سے ہمارا یہ قاعدہ تھا کہ ہر سال جتنا منافع ہوتا تھا اُس کا کچھ فی صدی ہم اپنے ملازموں میں بانٹ دیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر سنہ ۱۹۰۰ء میں اپنے کامگاروں کو اُن کی ملازمت کے عرصہ کے لحاظ سے دو لاکھ چالیس ہزار روپیہ بطور منافع کے بانٹا۔ اگر ایک شخص کی ملازمت ایک سال کی ہوئی ہے تو اُس کو اُس کی سال بھر کی تنخواہ کا پانچ فی صدی روپیہ بطور منافع دیا گیا۔ دو سال والے کو ۷½ فی صدی اور تین سال والے کو ۱۰ فی صدی مگر اُس سکیم میں یہ نقص تھا کہ اس کی بنیاد ایک کامگار کی مزدوری پر نہ تھی ایک کامگار کو اُس کا کام کاج کر لینے کے بہت دیر بعد یہ منافع ملتا تھا اور پھر بھی ایک طرح سے ایک تحفہ کی شکل میں۔ اصل بات یہ ہے کہ کوئی کامگار بھی اپنی تنخواہ کے ساتھ اس طرح کی خیرات لے کر خوش نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ ایک اور بھاری نقص یہ تھا کہ اس وقت کام کے لحاظ سے قاعدہ کے ساتھ تنخواہیں مقرر نہیں کی گئی تھیں۔ ایک آدمی کو نمبر۱ کام کرنے سے جتنے پیسے ملتے تھے اُس سے نمبر۲ کام کرنے والے کامگار کو زیادہ پیسے دئے جاتے تھے۔ لیکن اُس وقت یہ بالکل ممکن تھا کہ جتنی نمبر۲ کام کرنے میں لیاقت اور عقل کی ضرورت ہے اُس سے نمبر۱ میں کہیں زیادہ ہو جب تک کہ مالک اور ملازموں کو پوری طور سے یہ تسلی نہ ہو جائے کہ تنخواہوں کی جو شرح رکھی گئی ہے وہ ایک خاص اصول کے مطابق بنائی گئی ہے اور اٹکل پچو قائم نہیں کی گئی تب تک ملازموں کی تنخواہوں میں بہت بے انصافی ہونے کا ڈر رہتا ہے۔ اس لئے سنہ ۱۹۱۳ء سے لے کر ہم نے اپنے کارخانوں کے اندر جتنے بھی ہزاروں عمل ہوتے تھے اُن سب کا اچھی طرح سے حساب لگانا شروع کیا کہ ایک عمل کو کرنے میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے۔ یوں حساب لگانے سے ہمیں کچھ موٹا سا اندازہ

آسکتا ہے۔ کہ ایک کامگار کو سارے دن میں کتنا مال تیار کر کے دینا چاہیئے۔ اس کے بعد تھوڑی بہت اور گنجائش رکھ کر کہ آدمی سے کبھی کوئی غلطی ہو جاتی ہے یا کوئی اور گڑبڑ ہو جاتی ہے ایک روز کی ایک خاص تعداد تیار مال کی مقرر کی جا سکتی ہے مگر اس کو مقرر کرتے وقت یہ دیکھ لیا جاتا ہے کہ اس کام کو کرنے کے لئے اتنی لیاقت اور محنت کی ضرورت ہو گی اور اس لئے فلاں کام کرنے والے کو اتنی تنخواہ ملنی چاہیئے جب تک ایک عمل کی اچھی طرح سے چھان بین نہ کر لی جائے تب تک مالک کو یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ فلاں کام کے لئے اسے اتنی تنخواہ کیوں دینی پڑتی ہے اور نہ ہی کبھی کامگار یہ جان سکتا ہے کہ اس کو اتنی تنخواہ کیوں ملتی ہے۔ ہر عمل کے وقت کا لحاظ کر کے ہم نے اپنی فیکٹری میں ہر کام کا درجہ مقرر کر دیا ہے اور اس کے مطابق اس کی شرح باندھ دی ہے۔

ہم ٹھیکہ پر کام نہیں کراتے۔ ہم کچھ آدمیوں کو روزانہ مزدوری کے حساب سے اور کچھ کو گھنٹوں کے حساب سے تنخواہیں ادا کرتے ہیں لیکن دونوں صورتوں میں ہمارے ہر کام کی تعداد ایک خاص مقرر ہوتی ہے جس سے تھوڑا کام کرنے کی ہم کسی کامگار کو اجازت نہیں دیتے ورنہ نہ کامگار کو اور نہ ہمیں یہ پتہ لگ سکتا ہے کہ کامگار یہ تنخواہ پانے کا واقعی حقدار تھا یا کہ نہیں کسی کامگار کو مزدوری دینے سے پہلے اس کا اس کا کام بالکل ٹھیک تعداد میں مقرر کر لینا نہایت ضروری ہے۔ چوکیداروں کو حاضر رہنے کی تنخواہ ملتی ہے اور کام کرنے والوں کو کام کرنے کی۔

جب تجربہ سے ہم نے یہ باتیں سیکھ لیں۔ تو ہم نے جنوری ۱۹۱۴ء میں اعلان کر دیا اور آئندہ کے لئے ایک طرح منافع کی بنٹوار قائم کر دی جس کے مطابق کامگاروں کو خاص خاص حالتوں میں کم سے کم ۱۵ روپیہ فی روز کی تنخواہ مقرر کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہم نے روزانہ کام کے گھنٹے ۹ سے گھٹا کر آٹھ کر دئے۔ اور ہفتہ میں صرف ۴۸ گھنٹے کام کا قاعدہ باندھ دیا۔ اس تبدیلی کے لئے ہم کو بالکل کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔ تنخواہوں کی جو شرح ہم نے مقرر کی ہے وہ سب اپنی مرضی سے کی ہے۔ ہمارا یقین تھا کہ یہ تنخواہیں بڑھانا ہمارا دھرم ہے۔ اور پچھلے نقشہ شمار میں ہم نے یہ کام صرف اپنے دل کی تسلی حاصل کرنے کے لئے کیا تھا۔ انسان کو ہمیشہ اپنے بھائی بندوں کو سکھی کرنے سے ایک طرح کی خاص خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اس نے اپنے بھائی بندوں کے دکھ اور تکلیفوں کو کسی حد تک کم کیا اور اس طریقہ سے اس نے تھوڑا بہت آرام اور سکھ پہنچایا۔ زندگی میں لوگوں کی عائیں

اور خیر خواہی حاصل کرنا ہی ایک بڑی بھاری نعمت ہے ایک پختہ ارادے کا آدمی بیشک جس چیز کے پیچھے پڑ جائے اُسے کر چھوڑے گا لیکن جب تک ایسا کرنے میں وہ ساتھ ساتھ لوگوں کی خیر خواہی حاصل نہیں کرتا اور اس کے لئے اُن کے دل سے ٹھنڈی دعائیں نہیں نکلتیں تب تک یہ سمجھنا چاہئے کہ اُس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا ہے۔

مگر اس اسکیم کے اندر خیرات کو قطعی کوئی جگہ نہ تھی۔ مگر عام طور پر اس سے اُلٹ سمجھا جاتا تھا۔ کئی کارخانوں کے مالکان کا یہ خیال تھا کہ ہم نے یہ نوٹس اس لئے نکالا تھا کہ اُس وقت ہمارے ہاتھ میں بہت سا روپیہ آگیا تھا۔ اور ہم اپنی اس طرح سے شہرت کرنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے یہ کہہ کر ہمیں بدنام کرنا شروع کر دیا کہ اس طرح سے ہم نے مارکیٹ میں بہت گڑبڑ پیدا کر دی ہے اور آج تک مزدور کو کم سے کم پیسے دے کر جس پر وہ کام کرنے کے لئے رضامند ہو کام کرانے کا جو قاعدہ چلا آرہا تھا اُس کو ہم نے توڑ دیا ہے لیکن یہ سب فضول باتیں ہیں۔ کیونکہ کام کے کوئی خاص درجے اور قاعدے ہمیشہ کیلئے مقرر نہیں ہیں۔ یہ سدا بدلتے رہتے ہیں۔ پرانے قاعدے ہٹا دئے جاتے ہیں اور نئے قاعدے جاری ہوتے رہتے ہیں۔ ہم نے یہ تبدیلیاں صرف اس خیال سے نہیں کیں کہ اب ہم بڑی تنخواہیں اپنے ملازموں کو دینا چاہتے تھے اور ہم اب اس پوزیشن میں ہو گئے تھے کہ یہ بڑی تنخواہیں اس وجہ سے دینا چاہتے تھے کہ ہمارا کام ہمیشہ کے لئے پکے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ ہم بالکل کچھ خیرات کرنا نہیں چاہتے تھے ہم تو اپنے لئے آئندہ کا پختہ بندوبست کر رہے تھے۔ جس بیوپار میں ملازموں کو چھوٹی تنخواہیں ملتی ہیں اُسکو ہمیشہ خطرہ ہی خطرہ ہے۔

تجارت کی دُنیا میں شاید اور کسی نوٹس یا خبر نے اتنی ہل چل پیدا نہیں کی جتنی کہ ہمارے اس اعلان سے ہوئی تھی اس پر بڑی زبردست نکتہ چینیاں ہوئیں لیکن بات کی تہہ کو اعتراض کرنے والوں میں سے شاید ہی کوئی پہنچا ہو۔ عام طور پر کامگاروں نے بھی سمجھا کہ ہماری نئی اسکیم کا مطلب یہ ہے کہ خواہ وہ کتنا اور کیسا ہی کام کیوں نہ کریں اُن کو روز کے کم سے کم پندرہ روپیہ ضرور مل جایا کریں گے۔

لیکن اصل بات اس سے بالکل اُلٹ تھی۔ ہم منافع تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ ابھی تک تو یہ طریقہ تھا کہ منافع کمانے کے بعد منافع تقسیم کئے جاتے تھے لیکن ہم نے اب انوکھی اسکیم کے ماتحت خاص خاص

حالتوں میں پیشگی مقرر کر کے تقسیم کرنا چاہا، اور یہ رقم اُن ملازموں کی تنخواہ کے ساتھ بڑھا دی جاتی تھی جنکو ہمارے پاس کام کرتے ہوئے چھ مہینے یا اس سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے یہ بات ہم اپنے ملازموں کے یہ تین درجے بنا کر تقسیم کیا کرتے تھے۔

(۱) ملازم لوگ جن کی شادی ہو چکی ہے جو اپنے کنبے کے ساتھ رہتے ہیں اور اُن کی بڑی اچھی پرورش کر رہے ہیں۔

(۲) بائیس سال سے زیادہ عمر کے کنوارے ملازم جو فضول خرچ نہیں تھے۔

(۳) بائیس سال سے کم عمر کے آدمی یا عورتیں جو اپنے کسی نزدیکی رشتہ دار کے گزارے کا اکیلا گزارہ ہیں۔

ہمارا سب سے پہلا یہ قاعدہ تھا کہ ایک آدمی کو مناسب تنخواہ کم سے کم ضرور ملنی چاہئے اور ہمارا اندازہ یہ تھا کہ اُس وقت مارکیٹ میں جو تنخواہیں دی جا رہی تھیں اُس سے اوسط پر پندرہ فی صدی تنخواہیں بڑھا کر مقرر کرنا بالکل مناسب ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک ملازم کو خاص شرح سے منافع میں بھی حصہ ملنا چاہئے۔ اور یہ تنخواہ اور منافع اتنا ہونا چاہیئے کہ دونوں مل کر کم سے کم ایک روز کے لئے پندرہ روپے اُس کو پڑ جائیں۔ منافع کے بانٹ کی شرح کام فی گھنٹہ کے حساب پر مقرر کی گئی تھی اور کام فی گھنٹہ والی تنخواہ کے کھاتہ میں جمع کر دی جاتی تھی تاکہ گھنٹوں کے حساب سے جن ملازموں کو سب سے تھوڑی تنخواہیں ملتی ہیں اُن کو منافع کا سب سے زیادہ حصہ ملے۔ اور یہ منافع تنخواہ کے ساتھ ساتھ ملازموں کو ہر پندرھویں دن بانٹ دیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر اگر ایک آدمی کو ایک روپیہ ایک آنہ فی گھنٹہ تنخواہ ملتی ہے تو اُس کو منافع ساڑھے چودہ آنے فی گھنٹہ کے حساب سے ملتا تھا۔ اور اس طرح سے اُس کی تنخواہ روز کی کم سے کم پندرہ روپیہ ضرور ہو جاتی تھی۔ ایک ملازم جس کو ایک روپیہ گیارہ آنے فی گھنٹہ ملتا تھا اُس کو منافع صرف ساڑھے دس آنے فی گھنٹہ کے حساب سے ادا کیا جاتا تھا اور اس طرح سے اس کی آمدنی فی روز اٹھارہ روپے ہو جاتی تھی۔

یہ ایک طریقہ سے خوشحالی کی بانٹ کی تقسیم تھی۔ مگر چند شرطوں پر کامگار کو اپنے رہنے کا ڈھنگ اور اپنے گھر کی صفائی ایک خاص پایہ کی رکھنی ہوتی تھی اور اُس کو بطور ایک شہری کے بھی کچھ فرائض

برداشت کرنی ہوتی تھیں۔ اس سسٹم سے ہماری ہرگز یہ مراد نہ تھی کہ ہم ملازموں کے سر پر بطور باپ کے ہاتھ رکھنا چاہتے تھے۔ مگر پھر بھی تھوڑی بہت کہیں نہ کہیں رعایت ہو جاتی تھی اور اس کی وجہ سے بھی ہمیں اپنی ساری اسکیم اور سماج سدھار محکمہ میں کچھ تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ لیکن شروع میں ہمارا یہی خیال تھا کہ لوگوں کو بہتر طریقہ سے رہائش رکھنے کے لئے خاص طور پر اکسایا جائے اور اس کیلئے بڑی تنخواہ سے بڑھ کر اور کیا اکساہٹ ہو سکتی ہے ایک آدمی جو ٹھیک طریقہ سے رہ رہا ہے وہ کام بھی ٹھیک کرے گا اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی ڈر تھا کہ ملازم لوگ بڑی تنخواہیں پا کر کہیں آگے سے کام تھوڑا یا ناقص کرنا شروع نہ کر دیں۔ پچھلی جنگ میں ہم نے دیکھ لیا تھا کہ ایک آدمی کی بہت جلدی جلدی تنخواہیں بڑھانے سے کبھی کبھی صرف اتنا ہی فرق پڑتا ہے کہ اُس کی عادتیں آگے سے اور خراب ہو جاتی ہیں اور وہ بُرے راستے اختیار کرنے لگتا ہے جس سے اُس کی کام کرنے اور روپیہ کمانے کی طاقت گھٹ جاتی ہے۔ اگر ہم شروع میں ہی اپنے ملازموں کی ایک دم تنخواہیں بڑھا دیتے تو ممکن تھا کہ کام تھوڑا ہوتا یا ناقص ہونے لگتا۔ نئی اسکیم میں لگ بھگ آدھے ملازموں کی تنخواہ دوگنی ہو گئی تھی اور ممکن تھا کہ ہمارے ملازم یہ سمجھتے کہ یہ مفت کے روپیہ ہیں۔ مفت کے روپیہ کے خیال سے کام ہمیشہ خراب ہونے لگتا ہے چاہے ایک آدمی کو پہلے تین روپیہ روزانہ تنخواہ ملتی ہو یا تین سو اُس کی تنخواہ میں بہت جلدی جلدی زیادتی کرنے سے ہمیشہ خطرہ ہے۔ ایک کامگار جس کی تنخواہ ایک دن میں تین روپیہ فی گھنٹہ سے بڑھا کر ۹ روپے کر دی جائے وہ اتنا بھوندو نہیں بن جائیگا جتنا کہ وہ آدمی جس کی تنخواہ ایک دن میں تین سو روپے روز سے بڑھا کر نو سو روپیہ کر دی جائے۔ ایک ملازم کی جتنی بڑی تنخواہ ہوگی وہ اس حالت میں اتنا ہی بڑا بھوندو بن جائے گا۔

ہماری اس پہلی اسکیم میں ہم نے سدھار کا درجہ بہت اونچا رکھا تھا۔ گو اس کو حاصل کرنے میں کبھی کبھی غلطیاں ضرور ہو جاتی تھیں۔ ہمارے سماج سدھار محکمہ میں لگ بھگ ۵۰ انسپکٹر مقرر تھے جو لوگوں کے دکھ کو سمجھنے کی واقعی بڑی قابلیت رکھتے تھے لیکن ۵۰ آدمی یہ قابلیت ایک جیسی رکھنے والے اکٹھے کرنے ناممکن ہیں اس لئے اُن سے غلطیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ انسان سے ہمیشہ غلطیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ بونس کو حاصل کرنے کے لئے بیاہے ہوئے ملازم اپنے کنبے کے ساتھ

رہیں اور اُن کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کریں۔ پردیسی کامگاروں میں ایک بُرا رواج یہ چل پڑا تھا کہ وہ اپنے ساتھ گھروں میں ٹھیکہ پر روٹی کھانے والے بسا لیا کرتے تھے۔ گویا وہ اپنے گھروں کو رہنے کی جگہ کے بجائے روپیہ کمانے کی چیز سمجھتے تھے ۱۸ سال کی عمر سے کم کے لڑکوں کو بونس ملتا تھا اگر اُن کے سر پر کسی رشتہ دار کا گزارہ تھا۔ کنوارے آدمی اگر اچھی طرح سے رہائش رکھتے تھے تو اُنھیں بھی ان میں سے کافی حصہ ملتا تھا۔ اس اسکیم کے مفید ہونے کا ثبوت ریکارڈ دیکھنے سے پورے طور پر ملتا ہے جب یہ اسکیم جاری کی گئی تھی تو اُس وقت ۶۰ فی صدی کامگار فوراً اس میں شامل ہو گئے چھ مہینے کے بعد ۷۸ فی صدی اور ایک سال کے بعد ۸۷ فی صدی۔ ڈیڑھ سال کے اندر ایک فی صدی سے بھی کم ایسے ملازم رہ گئے ہوں گے جن کا نام اس اسکیم میں نہ آتا ہو۔

بڑی تنخواہوں کے دینے سے ہمیں اور بہت فائدے ہوئے ۱۹۱۴ء میں جب ہم نے پہلی بار یہ اسکیم جاری کی اُس وقت ہمارے پاس چودہ ہزار ملازم تھے لیکن اس تعداد کو برابر پوری رکھنے کے لئے ایک سال میں ہمیں لگ بھگ ۵۳ ہزار آدمی مزدوری پر بھرتی کرنا پڑا کرتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں ہمیں صرف ۶۵۰۸ آدمی مزدوری پر بھرتی کرنے پڑے۔ اور ان میں سے بھی زیادہ تر اس لئے رکھے گئے۔ کیونکہ کام بڑھ گیا تھا۔

اگر ہم پرانے طریقوں سے مزدور لوگ بھرتی کرتے رہتے تو اس وقت ہمیں اپنا کام جاری رکھنے کیلئے ایک سال میں لگ بھگ دو لاکھ آدمی مزدوری پر بھرتی کرنا پڑا کرتے جو کہ بالکل ناممکن بات ہے۔ ہمارے کارخانہ کے اندر ایک چھوٹے سے کام کو سیکھنے کے لئے چاہے کتنا ہی تھوڑا وقت کیوں نہ لگتا ہو پھر بھی یہ ناممکن ہے کہ ہم ہر صبح یا ہر ہفتہ یا ہر مہینے نئے آدمی بھرتی کیا کریں کیونکہ ایک آدمی دو یا تین دن کے اندر کام سیکھ کر گزارہ لائق کام کرنے لگ پڑے گا اس کے بعد ہمیں مزدوروں کی بھرتی کی کبھی تکلیف نہیں۔ یہ اندازہ ہم ٹھیک ٹھیک تو بتا نہیں سکتے کیونکہ ہم ساری مشین پورے زور سے نہیں چلاتے تو ہم زیادہ ملازموں کو کام بانٹنے کی غرض سے کچھ آدمیوں کو ایک محکمہ سے نکال کر دوسرے محکمہ میں ادلا بدلی کرتے رہتے ہیں اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ کتنے آدمیوں نے خوشی سے استعفا دیا اور کتنوں نے مجبور ہو کر۔ آج ہمارے پاس اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے کیونکہ ہمیں مزدوروں کی بھرتی کی کوئی تکلیف نہیں اس لئے ہم اس کا کچھ حساب کتاب نہیں رکھتے لیکن جہاں تک

ہمارا خیال ہے کہ یہ تعداد ایک مہینے ۲ فی صدی سے لے کر ۶ فی صدی تک ہوگی۔

ہم نے سسٹم کو ضرور بدل دیا لیکن ہم نے اس اصول میں کوئی فرق نہیں آنے دیا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ کوئی آدمی تمہارے لئے اپنا وقت لگا دے اور محنت کرے تو اُس کی تنخواہ اتنی ضرور ہونی چاہئے جس سے اُس کو کوئی مالی پریشانی بالکل نہ رہے اس میں فائدہ رہتا ہے۔ اس سسٹم کو جاری کرنے سے پہلے ہم بونس لگ بھگ تین کروڑ روپیہ اپنے ملازموں میں فی سال بانٹا کرتے تھے لیکن اب بڑی تنخواہیں اور منافع دے کر جتنا ہمیں اب فائدہ ہو رہا ہے اُس سے یہ ثابت ہے کہ بڑی تنخواہیں دینا ہی کام کرنے کا سب سے بڑھیا منافع دینے والا طریقہ ہے۔

لوگوں کو اس بات پر اعتراض تھا کہ نیک چلنی کے لحاظ سے جو تنخواہوں کے ساتھ بونس دیا جاتا ہے وہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں اس بات کی بو پائی جاتی ہے جیسے کہ باپ اپنے لڑکے کیلئے کچھ کرتا ہو تجارت میں ایسی مدد یا رعایت کی کوئی گنجائش نہیں وہ زمانہ گیا جبکہ کسی ملازم کی مدد اس کے گھر کی تکلیفوں کو سُن کر دی جاتی تھی۔ ملازموں کو اب صلاح کی ضرورت ہے اور مدد کی بھی اور عام طور پر خاص مدد کی لیکن یہ سب کچھ بھلائی کے نام پر اور شرافت کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔ مگر یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ انڈسٹری کو مضبوط کرنے اور خلقت کا بھلا کرنے کے لئے اصلی کام کارخانوں کا کھولنا اور کام گاروں کو مالکوں کے ساتھ منافع میں مناسب حصّہ دینا ہے۔ اس کے علاوہ لوگوں کے سدھار کے جو اور کام ہیں وہ سب معمولی ہیں۔

ہم نے کوئی نیا اصول قائم کرنے کی بجائے تنخواہ بانٹنے کے طریقے کو بدل ڈالا ہے۔

بیان نو

کیوں نہ اپنے ہاتھ برابر خوب کام رہے

کارخانے کے مالک کو اپنے اور اپنے گھر والوں کے واسطے سال کے تین سو پینسٹھ دن ہی کھانے کے لئے روٹی
تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا اور رہنے کے لئے عمدہ مکان چاہئے اور کارخانے میں کام کرنے والوں کو بھی ان چیزوں
کی ہمیشہ ضرورت ہے۔ مگر کتنے تعجب کی بات ہے کہ عام طور پر جب یہ دونوں کسی کام کا آرڈر دینے لینے لگتے ہیں
تو ایک ہفتے سے زیادہ دنوں کا حساب کبھی نہیں لگاتے۔ اگر روپیہ کی تنگی ہے۔ تو پھر جو کام اور آرڈر ملے اور
جس دام پر ملے اسی کو پکڑ بیٹھتے ہیں۔ جب بازار تیزی پر جا رہا ہو اس وقت آرڈروں کی کمی نہیں رہتی۔
لیکن مندے دنوں میں کوئی آرڈر یا کام ڈھونڈنے پر بڑی مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ یعنی بیوپار میں ہمیشہ یا تو پو بارہ ہیں
یا تین کانے بھی نہیں۔ گویا سدا یا تو "بہار اور مزہ" ورنہ "برا حال اور تباہی"۔ یہ ٹھیک ہے کہ دنیا میں ایسا موقع کبھی
نہیں آتا جبکہ ہر شخص کے پاس مال و اسباب حد سے زیادہ اکٹھا ہو جائے۔ .. ..
.. .. یا جبکہ ہر شخص کو اس قدر آرام اور خوشی نصیب ہونے لگے کہ پھر اسے اور کسی چیز کی
ضرورت باقی نہ رہے اور نہ دل میں کوئی تمنا۔ البتہ ایسا بہت مرتبہ ہوا ہے جب یہ عجیب و غریب نظارہ دیکھنے
میں آتا ہے کہ ایک طرف تو دنیا مال و سامان کے لئے تڑپ رہی ہے۔ اور ادھر کارخانے بند پڑے ہیں۔
محض اس وجہ سے کہ پبلک کی مانگ اور مانگ کو پورا کرنے والے کارخانوں کے درمیان روپیہ کے سوال
نے ایک موٹی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ کارخانے اور بیوپار ایک دوسرے کے جان پران ہیں۔ مگر ہوتا گیا ہے
کہ عام طور پہ دونوں برابر نہیں چلتے۔ اور اگر ایک تیز رفتار ہو جاتا ہے تو دوسرے کی چال مدھم پڑ جاتی ہے یعنی

جب مارکیٹ میں مال کی مانگ بہت ہونے لگتی ہے تو کارخانوں میں مال کم تیار ملتا ہے۔ اور جب مارکیٹ میں مانگ نہیں ہوتی تو کارخانے دھڑا دھڑ مال تیار کر کے مارکیٹ میں اس قدر پھینکنے لگتے ہیں کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی۔ یہ مانا کہ بازار میں مال کی ہمیشہ کمی رہتی آئی ہے۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ کسی موقع پر مارکیٹ میں اتنا زیادہ مال اکٹھا ہو گیا ہو جو مارکیٹ کی مانگ پوری کرنے کے بعد بچ رہا ہو۔ ہاں ایسا تو کبھی کبھی ضرور ہوتا ہے کہ حد سے زیادہ غلط قسم کا مال بن کر بازار کیٹ میں آ گیا۔ اور وہ پڑا رہا۔ مگر اس کو حد سے زیادہ مال بنانا نہیں کہتے۔ اس کا نام تو اندھا دھند مال بنانا رکھا جا سکتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے پاس کسی موقع پر جو اتنا زیادہ مال اکٹھا ہو گیا ہے۔ اس کی یہ وجہ ہو کہ ہم نے اس کی قیمت نہایت اونچی رکھی ہوئی ہے۔ یہ ہرگز حد سے زیادہ مال بنانا نہیں مانا جا سکتا۔ اس کی بجائے یوں کہنا چاہئے کہ یا تو ہم نے غلط طریقہ سے مال بنایا ہے۔ یا ہمیں اس کو مارکیٹ میں بیچنے کا ٹھیک ڈھنگ نہیں آتا۔

کیا بیوپار کی تیزی یا مندی تقدیر پر منحصر ہے؟ ہرگز نہیں۔ بیوپار کی تیزی یا مندی ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ ہمیں زمین سے اناج پیدا کرنے۔ کانوں سے دھاتیں۔ کوئلہ تیل وغیرہ نکالنے اور کارخانے چلا کر مال بنانے کی صرف اس وجہ سے ضرورت ہے کہ لوگوں کو کھانے کے واسطے روٹی تن ڈھانپنے کے واسطے کپڑا میسر ہو سکے۔ اور وہ کارخانوں سے بنی ہوئی چیزوں کو استعمال کر کے مزے اور آرام سے اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ اس کے علاوہ ہرگز اور کوئی وجہ نہیں۔ مگر اس بات کو ہم سب بھولے بیٹھے ہیں۔ اور آج دنیا میں جتنے بھی کام دھندے چل رہے ہیں۔ وہ لوگوں کی بھلائی اور خدمت کرنے کی نیت سے نہیں بلکہ روپیہ بٹورنے کی غرض سے کئے جا رہے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم نے روپیہ کا سسٹم کچھ ایسا باندھا ہے۔ کہ اس کے ذریعہ اپنا ایک مال دے کر اپنی ضرورت اور خواہش کے مطابق کوئی دوسرا مال حاصل کرنے میں سہولت ہونے کی بجائے الٹا اس کی وجہ سے کبھی کبھی سخت رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اس سوال کا مفصل ذکر آگے چل کر کروں گا۔

میرا کہنا تو یہ ہو کہ بیوپار میں جو ہمیں بار بار گھاٹا پڑتا ہے جس کے لئے ہم اپنی تقدیر کو کوستے ہیں وہ محض ہماری اپنی بدانتظامی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آ سکتی ہے۔ کہ اگر کبھی ملک میں ساری فصل ایک بار ہی تباہ ہو جائے۔ تو تمام خلقت ضرور بھوکی مرنے لگے گی۔ مگر جب فصل کی بربادی اور تباہی ہماری

اپنی نالائقی اور بدانتظامی کی وجہ سے ہو۔ جو روپیہ کے نامعقول سسٹم ہونے کے سبب لازمی ہے۔ تو ہیں یہ ہرگز گوارا نہیں کرسکتا کہ ایسی حالت میں ہم کیوں بھوک اور غریبی کے صدمے برداشت کریں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جنگ نے ملک میں سارا انتظام اُلٹ پلٹ کردیا۔ اور تمام دُنیا میں گڑبڑ مچادی لیکن اگر ہمارا انتظام شروع سے درست ہوتا تو جنگ ہی کبھی نہ ہوتی۔ مگر اس کے لئے سارا الزام اکیلے جنگ کے سر پر نہیں تھوپا جاسکتا اس جنگ نے ہمارے روپیہ کے سسٹم میں بہت سے نقص ظاہر کردئے۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ اس نے ہمیں یہ جتلادیا کہ جس بیوپار کی بنیاد صرف روپیہ ہے وہ نہایت غیر محفوظ ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بیوپار کی مندی روپیہ لگانے کے غلط طریقوں کا نتیجہ ہے یا بیوپار کو چلانے میں ہماری اپنی بُری نیت کی وجہ سے روپیہ لگانے کے طریقے بگڑ گئے۔ مگر میرا یہ پختہ یقین ہے کہ گو روپیہ لگانے کے موجودہ سسٹم کو ایک سرے سے ہی بالکل پلٹ دینا ٹھیک نہیں ہوگا تو بھی یہ نہایت لازمی ہے کہ بیوپار خدمت کرنے کے خیال سے چلایا جائے۔ تب روپیہ لگانے کا ایک بہتر سسٹم اپنے آپ نکل آئے گا اور موجودہ سسٹم اپنی موت آپ مرجائے گا کیونکہ پھر اس کی ضرورت نہ رہے گی۔ مگر یہ کام دھیرے دھیرے وقت پاکر ہوگا۔

اپنے بیوپار کو مضبوط بنانے کی ہر ایک آدمی کوشش کرسکتا ہے۔ لیکن وہ اکیلا ہی سب کچھ نہیں کرسکتا۔ مگر جوں جوں وہ بڑھتا جائیگا لوگ اس کی نقل کرنے لگیں گے اور وقت پاکر بھی سمجھنے لگ جاویں گے کہ جس طرح چیچک اور اسی قسم کی دوسری بیماریوں سے ہم بچ سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم پھُلیھلے اور مندے بیوپار دونوں سے بھی بچ سکتے ہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک نہ ایک دن ہمارے موجودہ بیوپار اور روپیہ لگانے کا طریقہ ضرور بدل جائے گا۔ اور تب اگر "بُرے دن" نہ سہی۔ کم سے کم ان کا بُرا اثر ضرور جاتا رہے گا اور بیوپار میں اس وقت جو سال کے خاص خاص وقت پر مندے دن آتے ہیں وہ نہیں آئیں گے کھیتی باڑی کے سلسلے میں یہ نظام کی تبدیلی ہونی شروع ہوگئی ہے۔ جب انڈسٹری اور کھیتی باڑی دونوں کا ٹھیک نظام قائم ہوگیا۔ تو یہ ایک دوسرے کے جوڑی دار اور مددگار ثابت ہوں گے۔ کیوں دونوں ایک دوسرے کے سہارے پر چلتے ہیں علیحدہ نہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے ڈھبنی (valve) کے کارخانہ کو لیجئے ہم نے اس کو شہر سے دور باہر اٹھارہ میل کے فاصلہ پر اس واسطے لگایا تاکہ اس میں کسان لوگ بھی کام کرسکیں۔ اگر کھیتی باڑی میں مشینوں سے کام لیا جائے تو جتنا اس میں اب وقت صرف ہوتا ہے اس سے کہیں تھوڑا لگے جتنا

وقت ہم بیج بونے۔ کاشت کرنے اور فصل کاٹنے کاٹنے میں خرچ کرتے ہیں۔ قدرت نے ہمیں اس سے کہیں زیادہ دیا ہے۔ جو ہمیں دوسرے کاموں میں استعمال کرکے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ اس لئے بہت سی صنعتوں میں جہاں بڑے لمبے چوڑے نگ بنانے نہیں ہوتے۔ اس بات کا کچھ اثر نہیں پڑتا کہ وہ کہاں پر بنائے جاتے ہیں۔ پانی کی طاقت کی مدد سے ان کو بڑے مزے کے ساتھ کھیتی باڑی کرنے والے دیہاتوں میں بنایا جاسکتا ہے اس طرح پر جتنا عام طور پر خیال کیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تعداد میں ہم کو ایسے کسان مل سکتے ہیں جو کاشتکار ہونے کے علاوہ ساتھ میں کاریگر بھی ہوں۔ اور سائنس کے بڑھیا سے بڑھیا اصولوں کے مطابق صاف ستھری آب وہوا میں رہ کر کھیتی باڑی کیا کریں اور ساتھ ساتھ یہ کام بھی کرتے رہیں۔ یہ بندوبست صرف انہیں صنعتوں کے لئے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ جو سال کے خاص خاص سیزن میں چلتی ہوں۔ کچھ ایسی صنعتیں بھی ہیں جن کے لئے سیزن اور مال بنانے کے سامانوں کے لحاظ سے ایسا انتظام قائم کیا جاسکتا ہے جس سے سال کے تین سو پینسٹھ دن ہی ایک کے بعد دوسرا مال متواتر تیار ہوتا چلا جائے اور کبھی خالی نہ پڑے انکے علاوہ چند مخصوص صنعتیں جن پر تھوڑی ہی ہوشیاری اور دماغ پر زور دینے سے سارا سال ہی لگاتار چلائی جاسکتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی صنعت یا بیوپار میں کوئی ایسی رکاوٹ یا مشکل بات نہیں ہے جو پوری توجہ دینے سے دور نہ ہوسکے۔

اس کے مقابلہ میں ہر سال جو خاص خاص موسم اور وقت پر باری سے مندے دن آتے رہتے ہیں۔ ان سے بیوپار کو کہیں زیادہ نقصان پہنچتا ہے کیونکہ سرسری طور پر دیکھنے میں ان کا اثر اتنی دیر تک قائم رہتا ہے کہ ان سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ جب تک سارا انتظام ایک سرے سے پختہ نہ ہوجائے۔ تب تک ان کی جڑ نہیں جاتی۔ مگر پھر بھی ہر شخص کم سے کم اپنے لئے تو بیوپار میں اس کا تھوڑا بہت علاج کرہی سکتا ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے ساتھ میں دوسروں کا بھی بہت حد تک بھلا کرسکتا ہے۔ جب سے فورڈ کارخانہ جاری ہوا اور اس میں مال تیار ہونے لگا ہے تب سے ہمارے کام میں نہ کبھی خاص تیزی آئی نہ مندی۔ سنہ ۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۱۹ء کے عرصہ کو چھوڑ کر جب کہ کارخانہ میں صرف جنگ کا سامان تیار ہوتا تھا۔ ہمارا سدا ہی ایک جیسا حال رہا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ سال سنہ ۱۹۱۲-۱۳ء مندا تھا۔ گو اب کئی اس کو نارمل بھی بتانے لگے ہیں۔ لیکن اس سال ہماری بکری دوگنی ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء مندا تھا مگر ہماری بکری ایک تہائی سے زیادہ بڑھ کر ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء کو ایک

نہایت ہی مندا سال مانا جاتا ہے۔ تب ہم نے سوا دس لاکھ کاریں بیچی تھیں یعنی ۱۴-۱۹۱۳ء سے جس کو نارمل سال کہا جاتا ہے پانچ گنا۔ اس میں کوئی خاص بھید نہیں۔ ہمارے بیوپار کی سب دوسری باتوں کی طرح یہ بھی ایک اصول پر چلنے کا لازمی نتیجہ ہے جو ہر بیوپار میں لاگو ہو سکتا ہے۔

اب ہم اپنے کارخانہ میں سب کو کم سے کم اٹھارہ روپیہ روزانہ تنخواہ بلا کسی شرط کے دیتے ہیں، بڑی تنخواہ کے پانے سے لوگ نگرانی کے بنا کام کرنے کے عادی ہو گئے ہیں جوں ہی کاریگر اس کے لائق اپنی قابلیت دکھاتا ہے فوراً اس کو یہ اٹھارہ روپیہ روزانہ ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ کتنی جلدی کام سیکھتا ہے۔ ہم نے تنخواہوں پر اپنے منافع کا اندازہ لگایا ہوا ہے اور جتنی تنخواہیں ہم جنگ کے پیچھے جب نرخ قیمتوں دھوم سے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ دیتے تھے۔ اس سے بہت زیادہ اب دے رہے ہیں لیکن سدا کی طرح کام کے حساب سے ادا کرتے ہیں۔ اور ہمارے آدمی کام بھی ضرور کرتے ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ گو ہم نے کم سے کم تنخواہ ۶ ڈالر مقرر کی ہوئی ہے۔ ساٹھ فی صدی کے لگ بھگ کاریگر اس سے زیادہ پاتے ہیں۔ ۶ ڈالر ہر ایک کے لئے نہیں بلکہ کم سے کم تنخواہ رکھی ہوئی ہے۔

آؤ پہلے یہ دیکھیں کہ خوش حالی کی تہہ میں کون سے اصول کام کرتے ہیں۔ قلا بازیاں مارنے کا نام ترقی نہیں۔ ہر قدم کو سوچ سمجھ کر دھرنا ہوگا۔ بلا سوچے سمجھے کوئی ترقی کرنے کی امید نہیں رکھ سکتا۔ خوش حالی کو ہی اصلی خوش حالی کا زمانہ اسی کو کہتے ہیں جبکہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو کھانے کے لیئے روٹی اور پہننے کے لیئے کپڑا جس کے وہ حقدار ہوں ملے۔ اور اصلی معنوں میں مزے سے اپنی زندگی گزار سکیں کسی دیش کی خوش حالی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاتا ہے کہ کتنے زیادہ سے زیادہ لوگ وہاں پر آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں نہ کہ اس بات سے کہ وہاں کے کارخانے داروں نے کتنا دھن جمع کر لیا ہے۔ کارخانہ دار کا کام اس آرام کو بڑھانے کا ہے وہ سماج کی گاڑی کا ایک اوزار ہے اور وہ سوسائٹی کی خدمت صرف اس طریقہ سے کر سکتا ہے کہ وہ اپنے دھندوں کو ایسی خوبی سے چلاوے کہ وہ پبلک کو روز بروز بہتر سے بہتر کوالٹی کا مال بنا کر دم بدم قیمتیں گھٹاتا ہوا سپلائی کرتا رہے۔ اور ساتھ ساتھ اپنے تمام کام کرنے والوں کی تنخواہیں ان کے کام کے حساب سے بڑھاتا چلا جاوے۔ دنیا میں ہر ایک کارخانہ دار یا جو کوئی بھی بیوپار میں پڑنا چاہے۔ دونوں کے زندہ رہنے کے لئے صرف یہی ایک راستہ ہے۔ اور کوئی نہیں۔

دھن شاستر کے پنڈتوں نے خوشحالی اور مندی کے دورہ کے چکروں کے جو نقشے باندھے ہیں اور مت
قائم کیے ہیں اُن کی ہمیں بہت پرواہ نہیں۔ جب قیمتیں اونچی ہوتی ہیں تو اسے وہ خوشحالی کا زمانہ کہتے ہیں
لیکن کارخانہ دار جو اپنے مال کی قیمتیں مقرر کرتے ہیں۔ ان سے اصلی خوشحالی کے زمانہ کا قطعی اندازہ نہیں
لگایا جا سکتا۔

لفظوں کے ہیر پھیر میں ہم پڑنا نہیں چاہتے۔ مال کی قیمتیں اگر لوگوں کی آمدنی سے زیادہ ہیں۔ تو
نرخ قیمتوں کو گھٹا کر آمدنی کے برابر لاؤ۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ بیوپار مال بنانے کے عمل سے شروع ہوتا ہے
اور برتنے والے پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ جو چیز کارخانہ دار بنا کر برتنے والے کے ہاتھ بیچنا چاہتا ہے۔ اگر
وہ اس کو خریدنا نہ چاہے یا خریدنے کی اس میں ہمت نہ ہو تو کارخانہ دار برتنے والے کو کوسنے لگتا ہے۔
اور بیوپار میں برا حال بتاتا ہے۔ اور اس طرح سے گاڑی کے پیچھے گھوڑا جوت کر گاڑی نہ چلتی دیکھ کر بیٹھا
سر و سنتار رہتا ہے کیسی واہیات بات ہے!

کیا کارخانہ دار برتنے والے کے لئے بنا ہے یا برتنے والا کارخانہ دار کے لئے؟ جو کارخانہ دار
مال بناتا ہے اگر اس کو برتنے والا نہیں خریدتا یا کہتا ہے۔ کہ مجھ میں خریدنے کی ہمت نہیں۔ تو یہ
اس کا قصور ہے کارخانہ دار کا یا برتنے والے کا؟ یا دونوں میں سے کسی کا بھی نہیں۔ اگر دونوں میں سے
کوئی قصوروار نہیں تو کارخانہ دار کو ایک دن جلدی بیوپار کے میدان سے باہر نکلنا پڑے گا۔

لیکن کون سا ایسا بیوپار ہے جو کارخانہ دار سے شروع ہو کر برتنے والے پر جا کر ختم ہو جاتا ہو؟
اس گاڑی کے پہیوں کو حرکت میں لانے کے واسطے روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ صرف برتنے والے کی
...دوں کو ایک سبب سے برتنے والے کے پسند کے موافق مال بنانے کی لیاقت پر ہی صرف کارخانہ دار کی کامیابی کا دارو
...پلائی کرتا رہے۔ خواہ یہ بہتر کوالٹی کی وجہ سے ہو خواہ کم قیمت کے سبب سے برتنے والے کی سب سے زبردست
...ہش یہ ہوتی ہے کہ اس کو بڑھیا سے بڑھیا کوالٹی کا مال کم سے کم داموں میں ملے۔ جو بیوپاری یا کارخانہ
...ر برتنے والے کو مال بڑھیا سے بڑھیا کوالٹی کا کم سے کم داموں میں سپلائی کر سکے گا وہ ہی بیوپار میں
...ب کو پیچھے چھوڑ جائے گا اور بازی لے جائے گا خواہ کوئی مال کیوں نہ بناتا ہو۔ یہ ایک ایسی سچائی
...جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

تو پھر بیوپار میں "اچھے دنوں" کی انتظار میں کیوں بھٹکتے پھرتے ہو۔ بہتر انتظام قائم کر کے مال کو بنانے
اور تیار کرنے کی لاگتوں کو کم کرو۔ اور بکری کی قیمتیں ایسی مقرر کرو جو برتنے والے کی آمدنی کے اندر ہوں یعنی
اُن قیمتوں پر برتنے والا مال سہولیت سے خرید کر سکے۔

مندی کے مقابلہ کرنے کا سب سے آسان اور بھدا طریقہ یہ ہے اپنے مزدوروں اور کامگاروں
کی تنخواہوں کو گھٹا دینا اوّل تو یہ ویسے ہی انسانیت سے گری ہوئی حرکت ہے دوسرے یہ اس امر کا پکا
ثبوت ہوتا ہے کہ کارخانہ اور بیوپار کو چلانے والے لوگ خود تو نالائق ہیں اور اس طرح سے اپنی نالائقی مزدوروں
اور کامگاروں کی آڑ میں چھپا رہے ہیں۔ کاش ہم یہ جانتے کہ ہر مندی کارخانہ دار کو ایک طرح کا چیلنج ہوتا ہے
کہ دوسرے جو عمدہ نتیجے اور منافعے تنخواہیں گھٹا کر نکالنا چاہتے ہیں ان کو وہ اپنے کاروبار میں زیادہ عقل و
دماغ لڑا کر اور بہتر انتظام قائم کر کے حاصل کر لے گا جب تک اور تمام طریقے آزما کر ختم نہیں ہو جاتی تب
تک تنخواہوں کو کم کرنا بیماری کی جڑ پر ہاتھ نہ ڈالنے کے برابر ہے اور اگر پہلے بیماری کی جڑ ہی کاٹ دی
جائے تو بہت ممکن ہے کہ تنخواہوں کو گھٹانے کی ضرورت ہی نہ پڑے یہ میرا اپنا ذاتی تجربہ ہے۔ اس
سب کچھ کہنے سے ہمارے واسطے فوراً عمل کرنے کے قابل بات یہ نکلتی ہے کہ اس بیماری سے چھٹکارا پانے
کے لئے کسی نہ کسی کو نقصان ضرور اُٹھانا پڑے گا۔ اور جن کے پاس کچھ گنوانے کو ہوگا اور جن کے اندر سمجھ نقصان
برداشت کرنے کی ہمت ہوگی اُن کے علاوہ اور کون نقصان اٹھا سکتا ہے لیکن یہاں پر لفظ "نقصان
اُٹھانے" کا اصلی مطلب سمجھنے میں غلطی لگ جانے کا بہت اندیشہ ہے۔ حقیقت میں نقصان تو کچھ بھی نہیں
اُٹھانا پڑتا آئندہ زیادہ منافع کمانے کے خیال سے پچھلے حاصل کئے ہوئے منافعوں میں سے کچھ حصہ نکال دینا
یا چھوڑ دینا بس اتنا ہی اس "نقصان اُٹھانے" کا مطلب ہے۔ تھوڑے عرصہ کی بات ہے میں ایک لوہے کے
سوداگر سے جس کی دوکان ایک معمولی سے قصبہ میں تھی بات چیت کر رہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ جو مال اس
وقت میرے اسٹاک میں موجود ہے اس پر مجھ کو تیس ہزار روپیہ کا گھاٹا پڑنے کی اُمید ہے۔ لیکن اگر ذرا غور
سے دیکھو تو حقیقت میں میرا اتنا نقصان نہیں ہوگا کیونکہ ہم لوہے والوں نے پچھلے دنوں میں خوب کمایا تھا
اور بہت سا مال جو میں نے اونچے داموں پر خرید کیا تھا اس میں کا میں بہت سارا کافی منافع پر اب تک بیچ
چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اب جو مجھے یہ تیس ہزار کا خسارہ پڑ رہا ہے ان کا اصل مول پہلے سے کہیں کم ہے۔

کیونکہ یہ تو ایک طرح سے میرے سٹے سے کمائے ہوئے روپیہ میں سے ہیں۔ یہ اُس وقت والے کھرے روپیہ نہیں جن سے میں نے ایک روپیہ خرچ کرکے پورا سولہ آنے مال خرید کیا تھا۔ اس لئے گو میرا نقصان دیکھنے میں بہت بڑا لگتا ہے لیکن حقیقت میں اتنا ہے نہیں۔ اس کو چھوڑ کر ایک اور بھاری فائدہ مجھ کو یہ ہوگا کہ اس طریقے سے میں اپنے شہر اور علاقے کے لوگوں کی جو اپنے مکان کھڑے کرنا چاہتے ہیں سستے داموں پر لوہا سپلائی کرکے اُن کی کافی مدد کر سکوں گا۔

یہ سوداگر سمجھدار ہے۔ وہ اونچے داموں پر مال بیچنے کی نیت سے سٹاک جمع رکھنے اور اس طرح سے اپنے علاقہ کے لوگوں کو اُبھرنے نہ دینے کی بجائے کم منافع کھا کر اپنے بیوپار کو چالو رکھنا بہتر سمجھتا ہے۔ ایسا آدمی اپنے شہر کے واسطے انمول رتن ہے۔ اس کا دماغ بالکل صحیح ہے۔ اپنے ملازموں کی تنخواہیں کاٹنے اور اس طرح سے ان کی مال خریدنے کی ہمت کو توڑنے کی بجائے وہ اپنے سٹاک کے دام وقت کے مطابق گھٹا بڑھا کر اپنے بیوپار کو عین ٹھیک راستہ پر چلانے میں دوسروں سے بہت زیادہ قابل ہے۔

اُس نے اونچی قیمتوں کو چھاتی سے چمٹا کر یہ انتظار کبھی نہیں کی کہ جب "اچھے دن" پھریں گے۔ تب اپنا سٹاک بیچ لوں گا۔ اُس نے اس اصول کو جس کو عام طور پر لوگ بھول جاتے ہیں پا لیا ہے۔ کہ ہر بیوپار اور کاروبار میں کمائی کے پھول کے ساتھ کبھی نہ کبھی نقصان اُٹھانے کا کانٹا لازمی لگا ہوا ہے۔ اس لئے ہم کو جو نقصان ہمارے حصہ میں تھا۔ اُٹھانا پڑا۔

مندی کے زمانہ میں دوسرے سب بیوپاروں کی طرح ہماری بکری بھی گر گئی۔ ہمارے پاس مال کا بھاری سٹاک جمع ہو گیا تھا جو ہماری مشینری اور مال تیار کرنے کے ساز و سامان تھا جس دام پر ہم نے خرید کیا تھا اگر صرف اُس کے حساب سے ہی دام مقرر کرتے تو بھی جو کار کی قیمت ہم نے بیچنے کے واسطے اس وقت رکھی ہوئی تھی اُس سے ایک کوڑی کم پر ہمارے لئے کار تیار کرنا قطعی ناممکن تھا۔ اُدھر مارکیٹ کی حالت یہ تھی کہ لوگ اتنی قیمت تو ادا نہیں کر سکتے تھے۔ یا دینا نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے سوچا۔ چلو بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔ ہمارے سامنے اس وقت یہ سوال درپیش تھا۔ کہ یا تو ہم اس سٹاک پر پانچ کروڑ دس لاکھ روپیہ کا نقصان چپکے سے برداشت کر لیں ورنہ کارخانہ اور کام بالکل بند کرکے اس سے بھی کہیں زیادہ نقصان اُٹھا دیں۔ پس ہمارے لئے اس کے سوائے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ یہ خسارہ برداشت کر لیں۔

بیوپاری زندگی میں اکثر ایسے مواقع آتے رہتے ہیں جبکہ انسان کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ یا تو اُس کی حساب کی بہیوں میں جو اب گھاٹا پڑتا نظر آرہا ہے اُس کو برداشت کرلے۔ اور اپنا کاروبار جاری رکھے۔ ورنہ اپنا کام بالکل بند کردے۔ اور خالی بیٹھ رہنے سے جو نقصان پڑے گا۔ اُس کو سہے۔ عام طور پر بیوپار میں خالی بیٹھ رہنے سے جو نقصان اُٹھانا پڑتا ہے وہ موجودہ سٹاک پر فوری خسارہ کی نسبت کہیں زیادہ ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ بیکاری کے زمانہ میں ڈر کے مارے نئی نئی چیزیں بنانے یا کام کرنے کے دوسرے بہتر طریقے نکالنے کا حوصلہ جاتا رہتا ہے۔ اور اگر کاروبار جھینکتا جھینکتا کچھ عرصہ کے بعد چوپٹ ہوا۔ تو دوبارہ کام جاری کرنے کی ہمت بھی تب تک ختم ہو لیتی ہے۔

اپنے کاروبار کو ترقی دینے کے لئے مفت میں انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کارخانہ دار اپنی ذمہ داری پوری کرنا چاہتا ہے تو اُس کے مال کی جتنی قیمتیں لوگ خوشی اور سہولیت سے ادا کرنے کو تیار ہیں۔ اُتنی ہی قیمتیں اُس کو گھٹا کر اپنے مال کی لازمی طور پر رکھنی پڑیں گی۔ بیوپار کتنا بھی مندا کیوں نہ ہو ایک ایسی قیمت ضرور ہوتی ہے جس کو لوگ ضرورت کی شے اور مال کے لئے ہمیشہ ادا کر سکتے ہیں اور ضرور کریں گے۔ اور اگر کارخانہ دار نے بھی دل میں پختہ ارادہ کرلیا ہو تو وہ ہمیشہ ہر زمانہ میں اپنا مال تیار کرکے اس قیمت پر منافع سے بیچ سکتا ہے۔

گر بیوپار میں یہ مضبوط پوزیشن مال کی کوالٹی کو گرانے یا جھوٹ موٹ کے صرفے اور بچتیں کرنے سے ہرگز حاصل ہوا نہیں کرتیں۔ ان سے تو اُلٹا کامگاروں میں بہت بے چینی پھیلا کرتی ہے۔ نہ ہی بیوپار اس اونچے مرتبے پر ظاہری ٹیپ ٹاپ کرنے یا اِدھر سے اُدھر یوں ہی بھاگنے دوڑنے سے پہنچا کرتا ہے یہ انعام صرف مال کی تیاری میں گہری جانکاری ہونے سے آدمی پا سکتا ہے ورنہ ہرگز نہیں۔ اس نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے تو ہر مندی جو بیوپار میں آتی ہے وہ ایک طرح سے بیوپاری کا امتحان لینے آتی ہے۔ کہ اُس کے اندر کتنی عقل اور لیاقت ہے۔ خلقت کی خدمت کرنے کی بجائے صرف قیمتوں پر زور دیتے رہنا اس امر کی پختہ نشانی ہے کہ ایسا آدمی بیوپار کرنے کے قطعی ناقابل ہے۔

اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ کسی جنس کو تجارتی اور بیوپاری شکل میں بدلنے کے واسطے جس قدر انسانی عقل طاقت اور محنت خرچ ہوتی ہے وہی اس کا اصل مول ہے اور

تمام بکری کی قیمتیں قدرتی طور پر اُس کے حساب سے مقرر ہونی چاہئیں لیکن اس موٹے اصول کو بیوپار میں عام طور پر اس لئے رد کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بہت ہی سادہ ہے۔ اور اس کی بجائے بتایا جاتا ہے کہ اصلی بیوپار وہ ہے جو نیک سے نیک کاروبار کو بھی ایسے گٹھ کترے ٹٹے بازوں کے بس میں ڈال دے جن کا کام ہی یہ ہے کہ خوراک اور دوسری جنسوں کی مارکیٹ میں سدا فرضی کمی پیدا کرتے رہیں۔ تاکہ لوگوں میں اُن کی بابت ہائے توبہ مچی رہے اور لین دین کے سودے برابر ہوتے رہیں۔ لیکن یہ چمڑے کے سکّے کب تک چل سکتے ہیں۔ آخر ایک نہ ایک دن بھید کھل جاتا ہے۔

سوسائٹی کے اندر امیری غریبی کے معاملہ میں شروع سے ہی متواتر بے انصافی ہوتی چلی آئی ہے۔ اور زیادہ تر اس کی وجہ ہماری اپنی ناسمجھی ہوا کرتی ہے۔ آپ خواہ یہ کہیئے کہ مالی حالت نے سوسائٹی کی موجودہ شکل پیدا کر دی ہے یا یوں کہیئے کہ سوسائٹی کی اپنی مہربانی سے موجودہ مالی حالت نظر آتی ہے۔ دنیا میں اکثر آدمیوں کا تو یہ دعویٰ ہے کہ جیسی مالی حالت بناؤ گے سوسائٹی کی شکل ویسی ہی یعنی اُس کے مطابق بن جاتی ہے۔ اور اُن کے خیال میں اس وقت جتنے نقص ہم کو عام طور پر سوسائٹی میں نظر آتے ہیں۔ ان سب کے لئے وہ ہمارے صنعتی سسٹم کو ذمہ وار اور قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ انسان اپنی قسمت آپ سنوارتا یا بگاڑتا ہے اور انسان میں جو اپنی کمزوریاں و نقص ہیں ہمارے صنعتی سسٹم میں جو بھی خرابی ہے صرف اُن کی وجہ سے ہے۔ کارخانہ دار اس امر کو تسلیم کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ کہ ہمارے موجودہ صنعتی سسٹم میں جو غلطیاں اور خرابیاں ہیں وہ اصل میں کم سے کم کچھ حد تک ضرور بیوپار کے قاعدوں میں بندھی ہوئی اور چھوٹی سے بڑی کی ہوئی اپنی ہی غلطیاں ہیں۔ لیکن اگر آدمی اپنے کاروبار تنگ چار دیواری سے باہر نکل کر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرے گا تو وہ ضرور مان جائے گا کہ یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر قدرت کی طرف سے انسانی خصلت میں اتنی کمزوریاں نہ ہوتیں۔ تو ہمارا سوشل سسٹم اتنا ناقص نہ ہوتا۔ یا اگر انسانی خصلت موجودہ سے بھی زیادہ بُری ہوتی۔ تو سوشل سسٹم اس سے بھی بُرا ہوتا۔ گو شاید وہ اتنی دیر چل نہ سکتا۔ جتنا کہ آج کل کا۔ لیکن بہت تھوڑے آدمی یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ انسان نے جان بوجھ کر نقص دار سوشل سسٹم قائم کیا ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ سوشل سسٹم کی تمام خرابیوں کی جڑ انسان آپ ہی ہے تو بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے جان بوجھ کر اپنی کمزوریوں اور

خرابیوں پر لگاتار عمل کرتے کرتے اُن کو اتنا مضبوط بنا لیا ہے کہ سوسائٹی کے اندر اب اُنہوں نے گھر کر لیا ہے
ایسا کہنا بہت حد تک بے سمجھی اور جہالت پر مبنی ہے۔

مثال کے طور پر اپنے موجودہ صنعتی سسٹم کی بابت دیکھو کہ اس کا شروع کیسے ہوا تھا۔ کوئی نہیں
جانتا تھا کہ یہ ملک کے اندر کیسے قائم ہو سکے گا۔ اور کیونکر ترقی کرے گا۔ صنعت اور بیوپار کے میدان میں
ہر نئے قدم اُٹھانے پر پیٹھ ٹھونکی جاتی تھی اور لوگ بہت خوش ہوتے تھے۔ کسی کو یہ خیال نہیں آتا تھا کہ
"سرمایہ داری" اور "مزدوری پیشہ" ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ کسی کو یہ خواب میں نہ سوجھا تھا کہ صرف کامیابی
کی وجہ سے ہی اس سسٹم میں بہت سے چور خطرے گھس آئیں گے اور یہی ہوا کہ جوں جوں یہ سسٹم پھیلنے لگا توں
توں اس کی اندرونی خرابیاں بھی بڑھنے لگیں۔ بیوپار کے کاروبار نے اتنی ترقی کی کہ اُس کو اپنے ماتحتوں کی تعداد
کو اس قدر بڑھانا پڑا جن کے نام بھی اُس کو نہ یاد رہ سکتے تھے لیکن اس بات کی کسی نے پرواہ نہیں کی۔ بلکہ خوب
خوشی منائی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس طرح سے ایک بے جان سسٹم قائم ہو گیا جس کے اندر کامگار کی ہستی
بطور ایک "انسان" کے نہ رہی بلکہ وہ مشین کے ایک پُرزہ کی مانند شمار ہونے لگا۔ یہ بے شک درست ہے کہ ایسا
انسانیت کو کچلنے والا سسٹم کسی نے جان بوجھ کر ایجاد نہیں کیا۔ مگر پھر بھی سوسائٹی کے اندر یہ جم گیا اور خوب پھیلا
بات یہ تھی کہ یہ بُرائی سسٹم میں شروع دن سے ہی اندر چھپی ہوئی تھی۔ مگر کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا
اور نہ اس کی بابت کوئی پہلے سے سوچ سکتا تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ ہاں اگر کسی کے پاس غیر معمولی علم اور دماغ ہوتا۔ یا
کوئی بہت بھاری جوتشی ہوتا تو ممکن تھا کہ اس کا پتہ چل جاتا۔

صنعت کی تہہ میں کونسا اصول ہے۔ کیا آپ کو اس کی خبر ہے! صنعت کا بنیادی اصول روپیہ
کمانا نہیں ہے صنعت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دُنیا میں جتنے لوگوں کو جس جس مال اور سامان کی ضرورت ہو
اُن کے بنانے والے بھی اتنی ہی تعداد میں ہوں اور وہ اس قابل ہوں کہ لوگوں کی عین ضروریات کے مطابق
اشیا بنا کر دے سکیں اور جو کاروبار صرف اس نیت سے چلاویں کہ اس سے ان کا مقصد روپیہ کمانا نہیں بلکہ خلقت
کی خدمت کرنا ہے۔

بس مال تیار کرو۔ اور خوب مال تیار کرو۔ اور ایک ایسا سسٹم جاری کرو جس سے مال کا تیار کرنا ایک
نہایت اونچے درجے کا اور باریک فن سمجھا جائے۔ اس طریقے سے کام چلانا جس سے کاروبار خوب پھیلے۔ اور

بنت نئی دکانیں اُس مال کی بکری کے لئے کھلتی جاویں۔ ہزاروں نئی قسم کی مفید چیزوں کو تیار کرنا اور لاکھوں کی تعداد میں بنانا۔ یہ ہے صنعت کا اصلی بنیادی اصول اور یہ ہے سچی اور صحیح صنعت عقل دماغ اور محنت سے کام کرنے کی بجائے سٹے بازی کے ذریعے روپیہ کمانا صنعت کے بنیادی اصول کے بالکل برخلاف اور اُلٹ ہے۔ کوتاہ اندیش لوگ صرف دو پیسے کمانا جانتے ہیں اور لمبی سوچ نہیں کرتے۔ لیکن سچا بیوپار ہے خود کمانا اور دوسروں کو بھی کمانے دینا۔ دنیا میں آپ جینا اور دوسروں کو بھی جینے دینا۔ اکیلے اپنے فائدہ کا دھیان نہ رکھ کر سب لوگوں کی بھلائی کرنے کی نیت سے کاروبار کہلاتا ہے۔ اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ بیوپار ایک ایسا دریا ہے جس کے فائدہ مند پانی کی دھار اُس کے کاروبار کی زمین تک پہنچ کر وہیں ختم ہو جانی چاہئیے تو اس کے معنٰی یہ ہیں وہ اپنا مال اکیلے اپنے ہاتھ فروخت کر کے ہی اپنے کاروبار کو چالو رکھنا چاہتا ہے۔ کون ایسا ہے جو دولت کے چشمہ کا منہ اس طرح سے بند کر کے دولت پیدا کر سکے گا۔

پبلک کی خدمت کرنے کی نیت سے کاروبار کرتے ہوئے بیوپار میں کبھی مندی نہیں آسکتی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ہم تجارت کے ذریعہ دولت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ تو اول ہمیں پبلک کی خدمت کرنے کے اصولوں اور طریقوں کو ضرور جاننا چاہیئے۔

بیان دس

مال کتنا سستا بنایا جا سکتا ہے

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اگر قیمتیں کافی کم ہوں تو بیوپار کی خواہ کیسی حالت ہو۔ گاہک سدا ملتے رہیں گے۔ یہ بیوپار کا موٹا اصول ہے۔ کبھی کبھی چاہے قیمتیں کتنی تھوڑی ہوں تو بھی کچے مسالوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں ملتا۔ یہ نظارہ ہم تھوڑا بہت پچھلے سال دیکھ چکے ہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ نئے سودے کرنے سے پہلے کارخانہ دار اور سپلائی کرنے والے اوّل اپنے اونچے دام کے سٹاک کو نکالنے کی فکر میں تھے۔ مارکیٹ ٹھنڈا ضرور تھا لیکن مال سے ٹھسا ٹھس بھرا نہ پڑا تھا۔ مارکیٹ میں مال صرف اسی حالت میں رکتا ہے جب قیمتیں گاہک کی طاقت سے باہر ہوں۔

بے مناسب اونچی قیمتیں ہمیشہ تھوتھے بیوپار کی نشانی ہوتی ہیں۔ کیونکہ ایسا صرف کسی خاص سبب سے ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک تندرست آدمی کی ٹمپریچر نارمل ہوتی ہے۔ اسی طرح ٹھیک مارکیٹ نارمل قیمتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ عام طور پر قیمتیں مارکیٹ کے اندر مال آجانے کی رپورٹ اڑنے پر سٹہ بازی کی وجہ سے چڑھتی ہیں۔ گو ہر ایک چیز کا کبھی توڑا نہیں پڑتا تو بھی چند ضروری اشیا بلکہ کبھی صرف ایک چیز میں ٹوٹ پڑنے سے ہی سٹہ بازی شروع ہو جاتی ہے۔ یا ایسا بھی ہوتا ہے کہ مال کی بالکل تھوڑ نہ ہو۔ کرنسی یا کریڈٹ کی پھلاوٹ سے فوراً خریداری کی تو ند نکل آتی ہے جس سے سٹے کو موقع مل جاتا ہے۔ ممکن ہے کبھی ایسا ہو جائے کہ سچ مچ مال کی تھوڑ ہو اور ساتھ میں کرنسی بھی بڑھی ہوئی ہو۔ جیسا کہ اکثر جنگ کے دنوں میں ہوا کرتا ہے۔ لیکن جب بھی بے مناسب اونچی قیمتیں ہوتی ہیں۔ خواہ وہ کسی وجہ سے کیوں نہ ہوں لوگ ان کو

محض اس ڈر سے ادا کرتے ہیں کہ کہیں تھڑ نہ پڑ جائے۔ تب وہ روٹی کپڑا اپنی ضرورتوں سے زیادہ اس
خیال سے خرید کر جمع کر لیتے ہیں کہ بعد میں کہیں یہ نہ ملیں اور ہم خالی رہ جائیں۔ یا وہ انہیں ٹھہر کر پھر سے
منافع پر بیچنے کی اُمید میں ایسا کرتے ہیں۔ جب کھانڈ میں توڑا پڑ جانے کی ہوا اُڑی۔ تب جن گھر کی عورتوں نے
ساری عمر میں پانچ سیر سے زیادہ کھانڈ ایک وقت میں کبھی خرید نہ کی تھی۔ اُنہوں نے فوراً من یا دو من اپنے
مٹکوں میں بھرنے کی فکر کی۔ اور جب یہ کام ادھر ہو رہا تھا اُدھر سٹہ بازوں نے دھڑا دھڑ کھانڈ خرید کر اپنے
گودام بھرنے شروع کر دیئے۔ جنگ کے دنوں میں جو مال کی تھڑیں پڑتی رہیں وہ سب سٹہ یا ضرورت سے
زیادہ پہلے خرید لینے کی مہربانی تھی۔

ایک شے کی سپلائی کتنی بھی کم کیوں نہ ہو جائے۔ چاہے گورنمنٹ اُس کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ یا
اس کا ایک ایک دانہ ضبط کرے۔ تو بھی آدمی جتنی سپلائی لینے کے لیئے پیسے خرچ کرنے کو تیار رہا اُتنی شے اُس کو
ہمیشہ ہی مل جائے گی۔ کوئی نہیں جانتا کہ حقیقت میں فلاں تجارتی مال کا سٹاک ملک میں اس وقت
کتنا زیادہ یا تھوڑا ہے۔ ہوشیار سے ہوشیار حسابی بھی اس کا تخمینہ صرف اٹکل سے ہی لگا سکتا ہے۔ اور ساری
دُنیا میں کسی ایک مال کے سٹاک کی تعداد نکالنے میں وہ اور بھی بڑی غلطی کھا جائے گا۔ ہم سمجھتے ہیں۔ کہ
ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ ایک دن میں یا مہینہ میں یہ مال کتنا تیار ہوتا ہے۔ مگر اس سے ہرگز یہ پتہ نہیں
چلتا کہ اگلے دن یا اگلے مہینے یہ مال کتنا تیار ہوگا۔ اسی طرح ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ فلاں مال کی کتنی کھپت
ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بہت سا روپیہ اور وقت خرچ کر کے ہمیں یہ کچھ کچھ ٹھیک اندازہ لگ سکے۔ کہ کسی خاص
ایک وقت میں فلاں مال کی اتنی کھپت ہوئی۔ لیکن جتنے عرصہ میں ہم یہ حساب جوڑ کر اکٹھا کریں گے تب
تک یہ پرانا ریکارڈ دیکھنے کے سوائے اس کی کچھ بھی قیمت نہ رہے گی۔ کیونکہ شاید آگے چل کر یہ کھپت اُسی
عرصہ میں دُگنی ہو جائے۔ یا آدھی رہ جائے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ لوگ خریدنے سے کبھی تھکتے نہیں
ملک میں بیوپار کو سب سے بہتر طریقہ سے چلانے کے لیئے جو سوشلسٹ یا کمیونسٹ قانون گھڑے جاتے
ہیں یا اور دوسری تجویزیں بنائی جاتی ہیں ان سب میں یہی نقص ہے کہ ان کو بناتے وقت یہ پہلے فرض
کر لیا جاتا ہے کہ لوگ اب خریدنے سے بس کر جائیں گے۔ قانون کو گھڑنے والے کے من میں بھی یہی بات
بیٹھی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو اور خریدنے سے زبردستی منع کرنا چاہتا ہے مگر اس کی کوئی نہیں سنتا

اور اس کے لئے میں پر ماتما کا بہت شکر گزار ہوں۔

کھپت قیمت اور کوالٹی کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اور کوئی یہ نہیں جانتا نہ حساب لگا سکتا ہے کہ کل کو کتنی ہوگی۔ کیونکہ جب بھی قیمت گرے گی تب ہی خریداری کی طاقت ایک درجہ اوپر بڑھے گی ہر ایک اس بات کو دل میں جانتا ہے۔ لیکن اکثر آدمی کریں گے اس طرح جیسے وہ اس کو نہیں جانتے۔ جب ایک سوداگر غلط قیمتوں پر خرید کر مال سے اپنا گودام بھر لیتا ہے۔ اور پھر دیکھتا ہے کہ مال نہیں نکلتا تو وہ ایک ایک درجے اپنے دام گھٹاتے گھٹاتے مال نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ سمجھدار ہے تو وہ اس طرح نرخوں میں آہستہ آہستہ کاٹ چھانٹ کر کے اپنے گاہکوں کے اندر یہ اُمید جگانے کی بجائے کہ کل کو شاید قیمت اور بھی تھوڑی گر جائے۔ اپنے دام ایک بڑے جھٹکے سے ایک دم کافی گرم کر سارے کا سارا گودام خالی کرتا رہتا ہے۔ ہر بیوپاری اپنی لکڑی سے حساب لگا کر کچھ گھاٹا سہتا ہے لیکن عام طور پر یہ اُمید رکھی جاتی ہے کہ شائد آئندہ بڑا منافع کمانے کی کوئی ایسی صورت نکل آئے جس سے یہ سارا گھاٹا پورا ہو جائے۔ لیکن ایسا اکثر کبھی نہیں ہوتا۔ اس مال کے بیچنے میں جو دام گرانے سے پہلے منافع کمایا تھا۔ اُسی میں سے یہ گھاٹا نکلے گا۔ جس بے وقوف نے بیوپار کے موسم بہار میں کمائے ہوئے ڈھیر منافعوں کو اپنی جدی جائداد سمجھ لیا تھا۔ مندی آنے پر سب سے زیادہ اُسی کی جان کو بنی۔ تو بھی لوگوں کے دلوں کے اندر یہ یقین جما ہوا ہے اور یقین بھی بڑا پکا۔ کہ بیوپار باری باری سے منافع اُٹھانے اور گھاٹے سہنے کا نام ہے۔ اور اچھا بیوپار اس کو کہتے ہیں جس میں منافع زیادہ بار آئیں۔ اور گھاٹے تھوڑی مرتبہ۔ اس سے کئی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ بس مارکیٹ میں جتنی تیز سے تیز قیمت پر مال بک سکے وہی قیمت ہوتی ہے اس بیوپار میں مفید گردانا جاتا ہے۔ مگر کیا یہ ٹھیک بات ہے؟ ہم نے تو ایسا نہیں پایا۔

مسالے خریدنے میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ فوری ضرورت سے زیادہ خریدنا بے کار ہے۔ تیاری مال کے لئے جتنی ہمیں ضرورت ہوتی ہے۔ صرف اتنا ہم خریدا کرتے ہیں۔ لیکن باربرداری کی حالت کا لحاظ رکھ کر اگر باربرداری کا انتظام بالکل درست ہو اور مسالے برابر ملتے چلے جانے کی گارنٹی ہو تو کوئی سٹاک جمع کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ مسالے کی گاڑیاں وقت پر اپنے آپ پہنچتی رہیں گی۔ اور جس حساب سے اور جتنا مسالہ درکار ہوگا ملتا چلا جائے گا۔ اور تیار مال کی شکل میں بن کر نکلتا رہے گا۔ اس سے روپیہ کی کافی

بچت ہوگی کیونکہ جلدی جلدی مال بن کر مارکیٹ میں جانے سے روپیہ کا لوٹ پھیر بھی تیزی سے ہوگا۔ اور مسالوں میں بہت روپیہ پھنسا نہیں رہے گا۔ لیکن جب بار برداری میں گڑبڑی ہو تو مسالوں کا سٹاک زیادہ جمع کر کے رکھنا پڑتا ہے۔ ۱۹۲۱ء کی کھتونی مال پڑتال کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُس سال میں ایسے مسالوں کا سٹاک بہت رکھنا پڑا۔ کیونکہ بار برداری کا انتظام بڑا خراب تھا۔ لیکن ہم نے کبھی کا سبق سیکھا ہوا تھا کہ فوری ضرورت سے زیادہ بچت کے خیال سے کبھی مسالے خرید کر سٹاک اکٹھا نہیں کریں گے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب قیمتیں بڑھنے کی اُمید ہو تو اُس سے پہلے پہل کافی مسالے خرید کر لینا اور قیمتیں بڑھ جانے پر ہاتھ کھینچ کر رکھنا بیوپار میں عقلمندی کی چال ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کسی لمبی چوڑی دلیل کی ضرورت نہیں۔ کہ آج مسالے ڈھائی روپیہ فی سیر کی در سے خرید کر لیں۔ اور کل کو بھاؤ پانچ روپیہ فی سیر ہو جائے تو جس آدمی کو یہ مسالے پانچ روپیہ فی سیر کے حساب سے خریدنا پڑے گا۔ اس سے ہم ضرور منافع میں رہے۔ لیکن ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ مسالے اکٹھے کر لینے سے آخر میں منافع نہیں رہتا۔ یہ تو قسمت آزمائی ہوئی۔ اسکو بیوپار کرنا نہیں کہتے۔ اگر ایک آدمی ڈھائی روپیہ کی در سے کافی سٹاک جمع کر لیتا ہے تو جب تک دوسرا آدمی پانچ روپیہ کی در سے خریدتا رہتا ہے۔ تب تک اس کا ہاتھ اونچا ہے۔ اس طرح سے اس کو بعد میں پانچ روپیہ کی در سے اور زیادہ سٹاک خریدنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ یہ سودا بڑا اچھا ہوا کیونکہ چاروں طرف سے آثار قیمت ساڑھے سات روپیہ ہو جانے کے نظر آتے ہیں۔ بس پوری تسلی کے ساتھ اپنی ہوشیاری پر بھروسہ رکھ کر جس کے ذریعہ اس نے پہلے اسی سودے میں روپیہ پیدا کیا تھا۔ وہ شان سے یہ نیا سودا کر لیتا ہے۔ اور تب نہ جانے کہاں سے قیمت ایک دم نیچے جا گرتی ہے۔ اور وہ دیکھتا ہے کہ میں جہاں سے چلا تھا مُڑ کر پھر وہیں آ پہونچا ہوں جہاں چلا تھا۔ ہم نے کئی سالوں پر حساب پھیلا کر دیکھا ہے کہ ضرورت سے زیادہ خرید کر لینے میں کبھی فائدہ نہیں ہوتا۔ اور ایسے سودوں میں آج کا کمایا ہوا کل کسی نہ کسی طرح سے برابر ہو جاتا ہے۔ آخر میں جتنی ہم نے اس کام میں محنت کی اور دکھ اُٹھایا تھا۔ اُتنا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم نے یہ اصول بنا ہوا ہے کہ جتنا سٹاک ہم کو فوری ضرورت کے لئے درکار ہوتا ہے صرف اُتنا ہی ہم مارکیٹ سے اس وقت کے سستے سے سستے داموں پر خرید لیتے ہیں۔ اگر دام تیز ہیں تو ہم تھوڑا نہیں خریدتے۔ اور اگر بھاؤ گرا ہوا ہے۔ تو زیادہ نہیں خرید لیتے۔ ہم روپیہ بچانے کی نیت سے ضرورت سے زیادہ نہ خریدنے پر

خاص دھیان رکھتے ہیں۔ اس فیصلے پر پہنچنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ لیکن یہ ایک سچائی ہے۔ کہ سٹہ کرکے کوئی کارخانہ دار بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر دو چار سودے کرنے میں اُس نے کچھ روپیہ پیدا کر لیا۔ تو اپنے اصل بیوپار سے روپیہ پیدا کرنے کی بجائے اُس پر بہت جلد اِدھر خریدا اور اُدھر بیچ کر پیدا کرنے کی دُھن سوار ہو جائے گی۔ اور وہ چور چور ہو جائے گا۔ اس مصیبت سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے یعنی صرف اتنا خریدنا جتنا کہ ضرورت ہے۔ نہ زیادہ نہ کم۔ اس طریقہ سے بیوپار کا ایک بھاری اندیشہ دور ہو جاتا ہے۔

اس خریدنے کے تجربے کو ہم نے اتنا کھول کر اس لئے بیان کیا ہے کہ اس سے آپ کو ہماری بیچنے کی پالیسی سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔ مقابلہ بازی کرنے والوں یا مانگ کی پرواہ نہ کر کے ہم اپنی قیمتیں مقرر کرتے وقت یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ کتنے زیادہ سے زیادہ لوگ یہ دام ہماری اُس چیز کا ادا کرنے کو تیار ہوں گے یا کر سکتے ہیں جس کو ہم بیچنا چاہتے ہیں۔ اس پالیسی پر عمل کرنے کا جو نتیجہ نکلا ہے۔ اُس کا سب سے پکا ثبوت آپ کو ٹورنگ (سفری) کار کی تعداد اور ان کی قیمتوں کا مقابلہ کرنے سے چلے گا۔ جو ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

سال	قیمت فی کار	تعداد
۱۹۰۹-۱۰ء	2850 روپیہ	۱۸۶۶۴ کاریں
۱۹۱۰-۱۱	۲۳۴۰ "	۳۴۵۲۸ "
۱۹۱۱-۱۲	۲۰۷۰ "	۷۸۴۴۰ "
۱۹۱۲-۱۳	۱۸۰۰ "	۱۶۸۲۲۰ "
۱۹۱۳-۱۴	۱۶۵۰ "	۲۴۸۳۰۷ "
۱۹۱۴-۱۵	۱۴۷۰ "	۳۰۸۲۱۳ "
۱۹۱۵-۱۶	۱۳۲۰ "	۵۳۳۹۲۱ "
۱۹۱۶-۱۷	۱۰۸۰ "	۷۸۵۴۳۲ "
۱۹۱۷-۱۸	۱۳۵۰ "	۷۰۶۵۸۴ "
۱۹۱۸-۱۹	۱۵۷۵ "	۵۳۳۷۰۶ "

(پچھلے دو لڑائی کے سال تھے۔ اور فیکٹری لڑائی کا سامان تیار کرنے میں لگی ہوئی تھی)

۲۰-۱۹۱۹ء	۱۶۲۵ روپیہ سے ۱۳۲۰ روپیہ تک	۹۹۶۶۶۵ کاریں
۲۱-۱۹۲۰	۱۳۲۰ روپیہ سے ۱۰۶۵ روپیہ تک	۱۲۵۰۰۰۰ ″

اگر کرنسی کی پھلاوٹ کا خیال کریں۔ تو ۱۹۲۱ء کی اونچی قیمتیں حقیقت میں اونچی نہ تھیں۔ اس وقت قیمت ۱۴۹۱ روپیہ ہے۔ لگاتار کوالٹی بڑھیا کرتے جانے کے خیال سے یہ قیمت اتنی بڑی بیج ہی نہیں ہے جتنی کہ نظر آتی ہے۔ ہر کار جو ہم بناتے ہیں ہم اس میں ڈھونڈھتے رہتے ہیں کہ اس میں کیا چیز بہتر بڑھائی جا سکتی ہے۔ اور کیا ترقی ہو سکتی ہے۔ اگر کسی کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو ہماری سے بہتر ہے تو ہم اُسے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس لئے مارکیٹ میں جو کوئی نئی قسم کی کار آتی ہے وہ ہم ایک ضرور خرید لیتے ہیں۔ پہلے کچھ عرصہ کے لئے اُس کو استعمال کر کے دیکھتے ہیں۔ سڑک پر چلا کر اُس کا امتحان کرتے ہیں پھر کھول کر ہر ایک ٹکڑے اور پرزہ کی خوب جانچ پڑتال کرتے ہیں کہ یہ کس چیز کا بنایا گیا ہے۔ اور کیسے۔ مقام ڈیربارن کے آس پاس دنیا میں آج تک جتنی قسم کی کاریں بنی ہیں ان سب کا ایک ایک نمونہ شاید ہمارے پاس ضرور موجود ہے جب بھی ہم کوئی نئی کار خریدتے ہیں تو آگے پیچھے اخباروں میں یہ خبر نکل جایا کرتی ہے۔ اور کوئی کوئی یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ فورڈ اپنی فورڈ کار استعمال نہیں کرتا۔ پچھلے سال ہم نے ایک بڑی لینچسٹر کار کا آرڈر دیا جو انگلینڈ کی سب سے عمدہ کار مانی جاتی ہے۔ یہ ہمارے لونگ آئلینڈ کی فیکٹری میں کئی مہینے پڑی رہی۔ تب میں نے اسے چلا کر ڈیٹروٹ لے جانے کی سوچی۔ اور ہم ایک چھوٹا سا قافلہ بنا کر کئی کاریں یعنی یہ لینچسٹر۔ ایک پیکارڈ اور ایک دو فورڈ میں بیٹھ کر ایک ساتھ چلے۔ اتفاق سے میں لینچسٹر میں سوار تھا۔ چنانچہ جب ہم نیویارک کے ایک شہر میں سے گزر رہے تھے تو اخبار کے رپورٹروں نے مجھ کو گھیر لیا اور پوچھنے لگے کہ سچ سچ بتائیے آپ اپنی فورڈ کار میں کیوں نہیں بیٹھے میں نے جواب دیا۔ بھئی اصلی بات یہ ہے کہ میں آج کل چھٹیاں منا رہا ہوں۔ مجھے کوئی جلدی تو ہے نہیں کہ کب واپس پہنچوں۔ اس لئے میں فورڈ کار میں نہیں بیٹھا۔ فورڈ کار کی ایسی ایسی بہت سی کہانیاں بنتی رہتی ہیں۔

ہماری پالیسی ہے قیمت کو کم کرنا۔ کار کو زیادہ مفید بنانا اور کوالٹی کو اور بھی بڑھیا بنانے کی کوشش کرتے جانا۔ نوٹ کریں کہ سب سے اوّل قیمت کو کم کرنا ہے۔ ہم نے یہ کبھی نہیں مانا کہ فلاں لاگت اتنی ضرور ہی ہوگی۔ پس ہماری سب سے پہلے یہ کوشش ہوتی ہے کہ اتنی کم قیمت کر دیں جس سے ہماری بکری

بڑھنے کی اُمید ہو۔ پھر ہم یہ زور لگاتے ہیں کہ ہماری چیز اتنی قیمت کے اندر بنے۔ لاگت ہم نہیں دیکھتے یہ نئی قیمت اپنے آپ ہی لاگت گھٹا کر چھوڑے گی۔ عام طور پر قاعدہ یہ ہے کہ پہلے لاگت گن کر پھر قیمت مقرر کی جاتی ہے۔ اور موٹی عقل سے ہونا بھی ایسے ہی چاہیئے۔ لیکن اگر لمبی سوچ کی جائے تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ اگر لاگت کا حساب لگا کر ہی پتہ لگے گا کہ چیز جس قیمت پر مارکیٹ میں بک سکتی ہے۔ اُس کے اندر ہم بنا ہی نہیں سکتے تو اس کا فائدہ کیا ہوا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس سے تو نوگنا بہتر کام کی بات یہ ہے کہ گو آدمی لاگت کا حساب چاہے لگائے (ہم بھی ہر ایک لاگت کا حساب بڑی ہوشیاری سے لگاتے ہیں) لیکن کوئی آدمی بھی لاگت کا پورا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ کہ کتنا بالکل ٹھیک ہے۔ یہ جاننے کے لئے کہ کتنی ٹھیک ٹھیک لاگت آنی چاہیئے ایک راستہ یہ ہے کہ اتنی تھوڑی قیمت ٹھان لی جاوے جس کے اندر مال تیار کرنے کے لئے کارخانہ میں ہر ایک آدمی کو اپنی ساری عقل اور لیاقت خرچ کر دینی پڑے۔ کیونکہ تھوڑی قیمت کے دھیان سے ہر ایک کو جہاں تہاں سے بچت نکالنے کی فکر پڑتی ہے اس سر بڑے طریقہ سے جتنی نئی نئی باتیں ہمکو مال بنانے اور بیچنے کے لیئے ملی ہیں۔ وہ آرام کے ساتھ قلم دوات لے کر حساب کتاب سے جانچ پڑتال کرنے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں۔

یہ خوش قسمتی ہے کہ بڑی تنخواہیں دینے سے بھی لاگت میں بچت ہوتی ہے۔ کیونکہ باہر کی پریشانیوں سے چھوٹ جانے کی وجہ سے کام کرنے والے روز روز آگے سے بھی زیادہ کام میں ہوشیار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ روزانہ آٹھ گھنٹے کام کے لئے پندرہ روپے کی کم سے کم تنخواہ مقرر کرنا لاگت کو گھٹانے کے لئے ہماری ایک نہایت بڑھیا چال تھی اور اٹھارہ روپیہ تنخواہ دینا اور بھی سستا ہے۔ یہ سلسلہ کہاں تک چلتا رہیگا ایشور جانے!

ہم نے جو قیمت مقرر کی۔ ہمیں اُس میں سدا منافع ہی رہا۔ اور کیونکہ ہمیں یہ کوئی پتہ نہیں۔ کہ تنخواہیں کہاں تک بڑھیں گی ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ ہم قیمت کہاں تک گھٹا سکیں گے۔

مثال کے طور پر ہم پہلے اپنے ٹریکٹر کو ۲۲۵۰ روپیہ میں بیچتے تھے۔ پھر ۲۰۵۰ روپیہ میں پھر ۱۸۷۵ روپیہ میں۔ اور اب ہم نے اس میں سینتیس فی صدی کمی کر دی ہے اور صرف ۱۱۸۵ روپیہ میں بیچ رہے ہیں آٹوموبائل کاروں کی خاطر ہم ٹریکٹر تیار نہیں کرتے۔ کوئی کارخانہ اتنا بڑا نہیں جو دو چیزیں ایکساتھ

تیار کر سکے۔ ایک دوکان سے پورا پورا فائدہ تب ہی نکل سکتا ہے جب اس میں صرف ایک مال رکھاوے
بہت سارے کاموں میں جس آدمی کے پاس مشین ہو وہ بغیر مشین والے کے مقابلہ میں فائدہ میں
رہتا ہے۔ خاص ڈھانچہ دے کر اور بنانے کا عمل بتا کر ہم اس طرح کی ایک مشین بنوا سکتے ہیں جس کے استعمال
سے آدمی اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کی طاقت کو زیادہ سے زیادہ بڑھا سکے۔ اس طرح ہم اس آدمی کی بڑی
خدمت کرتے ہیں یعنی اس کا جسم زیادہ آرام پانے کا حقدار ہے۔

اس اصول کو دھیان میں رکھ کر ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے بیوپار میں چھوکٹ کیا ہے جسے ہمیں
دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہمیں اپنے دھندے میں کوئی ایسی چیز نہ لانی چاہیئے۔ جو بے مطلب کی ہو۔
ہم کو اپنی کامیابی کی یادگار میں لمبے چوڑے محل کھڑے کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو روپیہ ان میں لگے گا اس کا
سود اور ان کی دیکھ بھال اور مرمت کی رقم سے سوائے اس کے کہ جو مال تیار کرنا ہے اس کی لاگت مفت
میں بڑھے۔ اور کچھ فائدہ نہیں۔ اور ایک دن ان کامیابی کی یادگاروں کا خاتمہ کھنڈروں کی شکل میں ہوتا
ہے۔ دھندا چلانے کے لئے ممکن ہے ایک بڑی بلڈنگ درکار ہو لیکن اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ شک سا
پڑ جاتا ہے کہ یہاں پر اتنا کام نہیں ہوتا جتنا کہ چودھرتا۔ انتظام کے لئے۔ ہم نے کبھی لمبا چوڑا اعلیٰ نوکر نہیں
رکھا۔ بجائے اس کے کہ ہم لوگوں کو بتاتے پھریں کہ یہ مال کہاں بنتا ہے۔ ہم پسند کرتے ہیں کہ ہماری تعریف
ہماری بنی ہوئی چیز خود کرے۔

جس سکہ بند مال کو خریدنے سے برتنے والے کو کافی بچت ہوتی ہے۔ اس کے بنانے والے کو اتنا
بے شمار منافع ہوتا ہے کہ اس کو سمجھ نہیں پڑتی کہ اتنے روپیہ کو وہ کیا کرے گا۔ لیکن اسے سچے دل سے
خوب محنت کر کے اور بے دھڑک ہو کر کوشش کرنی ہوگی۔ آدھی درجن نمونے مال کے بنا دینا سکہ بندی
کرنا نہیں ہوتا۔ اس سے دھندا ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہیں پاتا۔ اور عام طور پر دیکھنے میں بھی یہی
آتا ہے۔ کیونکہ اگر ایک آدمی اپنا مال منافع کے اس موٹے اصول کو دھیان میں رکھ کر بیچتا ہے۔ کہ برتنے والے
کی جتنی گانٹھ کٹ سکے کاٹ لو۔ تو بے شک برتنے والے کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کو پسند ہے تو کسی
دوسری جگہ سے مال خرید کرلے۔

لگاتار سکہ بند مال کر دیتے چلے جانا تیاری مال کے عمل میں آخری حد یعنی درجہ کمال ہے۔ اس مطلب

کے واسطے ہم کو کارخانہ سے برتنے والے کے پاس جانے کی بجائے ہم کو اُلٹا برتنے والے سے چل کر کارخانہ جانا پڑے گا۔ یعنی پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ برتنے والے کو کس قسم کا مال اصل میں درکار ہے۔ پھر ہم اس کی ضروریات کے مطابق سانچے یا ڈھانچے بنائیں گے۔ اور تب اس کے بعد مال بنانا شروع کریں گے۔ اس طرح سے مال بنا کر دینا یہ بھی لوگوں کی سچی خدمت کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

اس چکر کو دل میں ذرا اچھی طرح سے بٹھا لینا چاہیئے۔ ابھی تک یہ چکر پوری طرح سے لوگوں نے نہیں سمجھا قیمت کیا ہونی چاہئے۔ لوگ یہ بات نہیں جانتے۔ ابھی تک عام خیال یہ چھپا ہوا ہے کہ قیمت اونچی سے اونچی رکھنی چاہئے لیکن اس کے برخلاف اچھا بیوپار اور بڑی کھپت قیمتوں کے گھٹنے سے ہوا کرتی ہے اب ایک اور بات لو۔ تم جتنی اچھی سے اچھی خدمت کر سکتے ہو وہ تمہیں کرنی ہوگی۔ کارخانہ داری کی ایک مفید چال سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کو دنیا داری میں بُرا بھی گنا نہیں جاتا۔ کہ کبھی کبھی مال کے ماڈل کو بدل دینا چاہئے۔ تاکہ پرانے ماڈل بیکار ہو جائیں۔ اور لوگ نئے خریدنے پر اس وجہ سے مجبور ہوں کیونکہ پرانے سانچوں کے پُرزے یا حصے مارکیٹ میں نہیں ملتے۔ یا اس لئے کہ نیا سانچہ دکھا کر خریدار کی جیب اور روپیہ نکالا جائے اور اس کو نیا سانچہ لینا پڑے۔ ہمیں صلاح دی جاتی ہے کہ بیوپار بڑھانے کا یہ بڑا اچھا گر ہے۔ اور یہ بڑی چترائی کی چال ہے۔ اور بیوپار کا مطلب ہی یہ ہے کہ لوگ بار بار خریدیں۔ اور کہ ایسی چیز بنانا کہ جو کبھی خراب نہ ہو۔ بڑی بے وقوفی ہے۔ کیونکہ ایسی چیز ایک بار خرید کر آدمی پھر نہیں خریدے گا۔

لیکن ہمارے بیوپار کا اصول اس سے بالکل الٹا ہے۔ ہمارے تو یہ دماغ میں بات نہیں آتی۔ کہ اگر ہم نے خریدار کو ایسی چیز بنا کر دی جو ہماری عقل اور لیاقت کا پورا زور لگانے پر بھی اُس کے پاس ساری عمر نہ چلی تو ہم نے اس کی کچھ بھی خدمت نہیں کی۔ ہم تو ایک اس طرح کی مشین بنا کر اسے دینا چاہتے جو سدا اس کے کام میں آئے۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی نہیں ہوتی کہ ہماری کار خریدار کے پاس چل کر اب گھس گئی ہے۔ یا ناکارہ ہوگئی ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری کار جو ایک مرتبہ خرید کر لے اُس کو ساری عمر دوسری خریدنے کی ضرورت نہ پڑے۔ ہم کبھی کوئی ایسی تبدیلی نہیں کرتے جس سے پرانا سانچہ ناکارہ ہو جائے کوئی بھی ہماری کار ہو اس کے تمام پُرزے نہ صرف اُس سانچے کی کسی کار سے ادلے بدلے جا سکتے ہیں

بلکہ جتنی بھی کاریں ہم بناتے ہیں۔ . . . . . ان سب میں اُس قسم کے پرزوں سے ادلے بدلے جا سکتے ہیں
دس سال کی پرانی خریدی ہوئی کار میں بھی آپ آج کے بنتے ہوئے پرزے خرید کر بڑے عزے سے جڑ
سکتے ہیں۔ اور بہت تھوڑے سے خرچ سے اُس کو آج کی بنی ہوئی جیسی بنا سکتے ہیں۔ دل میں جب
یہ ارادے ہیں۔ لاگت اپنے آپ ہمیشہ گھٹ جاتی ہے۔ اور کیونکہ ہماری یہ پکّی پالیسی رہی ہے کہ ہمیشہ قیمتوں
کو گھٹاتے جانا۔ اس لیئے کام کرتے وقت ہمارے سر پر سدا یہ تلوار لٹکتی رہتی ہے اور کبھی کبھی تو اس سختی کے
مارے ہماری جان پر آ بنتی ہے۔

اور بھی ہم کئی ایک جتن کرتے ہیں جس کی چند مثالیں یہ ہیں:۔

نیارہ یعنی چھیڑن کو کام میں لا کر ہم سال میں اٹھارہ لاکھ روپیہ بچا لیتے ہیں۔ دوسری طرف ہم
روز تجربے کرتے رہتے ہیں کہ کترنوں کو کس طرح سے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ ایک مہر لگانے والے مل میں
ہمیں دھات کی چادر میں سے چھ چھ انچ کے گول چکّر کاٹنے پڑتے ہیں۔ پہلے یہ ردّی سمجھ کر کترن میں پھینک
دیئے جاتے تھے۔ یہ نقصان سب کو اکھرتا تھا۔ کام کرنے والوں نے سوچا کہ ان چکّروں کو کیسے کام میں لایا
جائے۔ تجربے کر کے اُنہوں نے ڈھونڈ لیا کہ ان اپٹیوں کا سائز اور شکل بالکل ٹھیک اُتنی ہے جتنی کہ
ہمیں ریڈی ایٹر کی ٹوپیاں کاٹنے کے لیئے درکار ہوتی ہے۔ صرف اس کی دھات کافی موٹی نہیں۔ تب
انہوں نے پلیٹوں کی موٹائی ڈبل کر کے تجربے کرنے شروع کیے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ایک
اٹھتا ٹوپی تیار کر لی جو دھات کی ایک چادر سے تیار کی ہوئی ٹوپی سے کہیں زیادہ مضبوط نکلی۔ ہمارے
پاس ایسے چکّر روز کے ڈیڑھ لاکھ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اب ہم نے ان میں سے بیس ہزار کے لئے تو کام
نکال لیا ہے اور اُمید ہے کہ باقی کے لیئے بھی کوئی نہ کوئی ترکیب نکل آئے گی۔ ان ٹوپیوں کو بازار
سے خریدتے ہیں جو ہماری لاگت آتی اُس سے ہمیں اس نئے طریقے سے ٹوپیاں تیار کرنے میں تقریباً
تیس روپیہ فی ٹوپی کی بچت رہی۔ اسی طرح ہم نے ڈھبریاں بنانے کا تجربہ کیا۔ اور ایک خاص قسم کا
بولٹ ایک "پیلٹنے والی مشین" نام والی مشین سے لپٹے ہوئے ڈورے کے ساتھ تیار کیا جس کی ٹکّر کا مضبوط
بولٹ ہم بازار سے خرید نہیں سکتے تھے لیکن اس بولٹ کے تیار کرنے میں ہمارا دوسرے کارخانوں
کے بنے ہوئے بولٹوں کی نسبت صرف ایک تہائی لوہا خرچ ہوتا تھا۔ صرف اس ایک قسم کے

بولٹ بنا کر ہی ہمیں سال میں تیس لاکھ روپیہ کی بچت ہونے لگی۔ ہم اپنے کاروں کو ڈیٹرائٹ
میں جوڑا کرتے تھے۔ اور گو ہم خاص پیکنگ کر کے ایک ویگن میں پانچ یا چھ کاروں کے حصے بھر کر بھیجا یا
کرتے تھے لیکن پھر بھی ہم کو اس کام کے لیئے سیکڑوں ویگنیں روز کی درکار ہوتی تھیں۔ رات دن یہ
ویگنیں چلتی رہتی تھیں۔ ایک بار ہم نے ایک دن میں ایک ہزار ویگنیں بھر کر بھیجیں۔ اس طریقہ سے سامان
ڈھونڈنے میں جگہ کی تھوڑی بہت تنگی کا ہونا لازمی تھا۔ باربرداری کے خرچ کے علاوہ مشینوں کو اس
طرح سے ڈھونڈ کر رکھنے میں کہ راستہ میں نقصان کچھ نہ ہو بہت لاگت اٹھتی ہے۔ بس اب ہم یہ کرتے
ہیں کہ ڈیٹرائٹ میں صرف تین یا چار سو کاریں روز کی جوڑتے ہیں جتنی کہ وہاں کے مارکیٹ کے لیئے
درکار ہیں نہ صرف یونائیٹڈ سٹیٹس میں بلکہ لگ بھگ ساری دنیا میں ہم نے جہاں جہاں اتنا انتظام
کیا ہوا ہے وہاں اُن مقاموں کو ہم کارخانے سے سیدھے کاروں کے حصے بھر کر بھیج دیتے ہیں۔ اور مشینیں
وہاں جوڑی جاتی ہیں۔ اس پر بھی اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ڈیٹرائٹ سے بنا کر بھیجنے کی بجائے کسی جگہ
کوئی خاص حصہ لوکل بنوانے میں سستا رہے گا۔ تو ہم کار کا وہ حصہ وہیں اُس برانچ میں بنوا لیتے
ہیں۔ انگلینڈ کے شہر مانچسٹر میں جو ہم نے کارخانہ لگایا ہے وہ لگ بھگ ہماری کار کے سارے حصے
تیار کر لیتا ہے۔ آئرلینڈ کے مقام کارک والا ہمارے ٹریکٹر کا کارخانہ لگ بھگ پورا ٹریکٹر بنا لیتا ہے۔
اس سے لاگت میں بے شمار بچت ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کسی ملواں مرکب شی کا ایک
ٹکڑا یعنی حصہ صرف اُسی خاص مقام پر ہی بنایا جاوے۔ جہاں پر اُس کی لاگت سب سے تھوڑی آتی ہو
تو بیوپار کے ہر کام والائن میں بہت کچھ ترقی ہو سکتی ہے۔ کار کے بنانے میں ہمیں جو چیز بھی لگانی پڑتی ہے
ہم سب کے برابر تجربے کرتے رہتے ہیں۔ لکڑی تختہ جو ہم برتتے ہیں۔ اُس کی بہت زیادہ تعداد ہم اپنے
جنگلوں سے ہی کاٹتے ہیں۔ ہم لگاتار نقلی چمڑا بنانے کے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا نقلی چمڑے کا
روزانہ خرچ چالیس ہزار گز ہے۔ جہاں تہاں سے ہو سکے۔ دمڑی دمڑی بچانے سے ہی سال بھر میں ایک
اچھی خاصی موٹی رقم ہو جاتی ہے۔

لیکن ان سب سے بڑھکر ہماری بچت دریا رُوج کے کارخانے سے ہوئی ہے۔ جیسے پورا چلا کر ہم
اپنی سب چیزوں کی قیمتوں کو بہت زیادہ گھٹا سکیں گے۔ اب ٹریکٹر بنانے کا سارا کارخانہ وہیں پر چلا

گیا ہے۔ یہ کارخانہ مقام ڈیٹرائٹ کے بالکل ساتھ لگایا گیا ہے۔ اور اس کے لئے چھ سو پینسٹھ ایکڑ زمین لی گئی ہے
جس میں کام آگے کو بڑھانے کے لئے بھی کافی جگہ نکل آئے گی اس کے اندر ایک بڑی ڈھلوان ہے اور ایک
بڑا حوض جس میں پانی بھرا جا سکتا ہے۔ اور نکالا بھی جا سکتا ہے جس میں جھیل کا چھوٹا جہاز آ جا سکتا ہے۔
تھوڑی سی کھدائی کر کے اور ایک چھوٹی سی نہر بنا کر دریا ڈیٹرائٹ کے راستے جھیل کا پانی بڑے مزے سے
اس حوض میں لایا جا سکتا ہے۔ ہمارا کوئلہ کا بڑا خرچ ہے۔ یہ کوئلہ کانوں سے سیدھا ڈیٹرائٹ۔ ٹولیڈو
اور آئرن ٹن ریلوے کے راستے جو ہمارے ماتحت ہے۔ ہمارے ہائی لینڈ پارک اور دریا روج کے
کارخانوں میں پہنچتا ہے۔ اس کا کچھ حصہ بھاپ بنانے کے کام میں آتا ہے اور کچھ کوئلہ سے ہم کوک کے
چولھوں میں جو ہم نے دریا روج کے کارخانہ میں لگائے ہیں۔ آگ سنگی چیزیں تیار کر لیتے ہیں۔ کوک
چند مشینوں کے ذریعہ اپنے آپ چولھوں سے بھٹکنے والی بھٹیوں میں پہنچ جاتا ہے۔ کم حرارت پر بن جانے
والی گیسیں بھٹکنے والی بھٹیوں سے پائپوں کے ذریعہ بجلی پیدا کرنے والی مشین کے بائلروں میں پہنچا دی
جاتی ہیں۔ جہاں ان میں کارکاہودا بنانے والے کارخانہ سے آگر برادہ اور چھانگیں مل جاتی ہیں۔ (کیونکہ
ہم کاروں کے ہودے بنانے کا سارے کارخانہ کو یہیں پر لے آئے ہیں) اور اس کے علاوہ کوک میں
سے جو جھاڑسی اڑتی ہے۔ اُسے اب ہم آگ بھڑکانے کے کام میں لاتے ہیں۔ اس طرح ہم بھاپ پیدا
کرنے والی مشین میں آگ جلانے کے لئے صرف یہی ایندھن استعمال کرتے ہیں۔ جو ورنہ بالکل بے کار
جاتے۔ بڑی بڑی بھاپ کی چکیوں کو ڈائینمو کے ساتھ جوڑ کر ہم اس سے بجلی پیدا کر لیتے ہیں۔ اور ٹریکٹر
اور ہودے بنانے کے کارخانوں میں ہم نے جتنی موٹریں لگائی ہوئی ہیں وہ سب اسی بجلی سے چلتی ہیں
ہمیں اُمید ہے کہ عرصہ پا کر ہم ہائی لینڈ پارک کا سارا کارخانہ صرف اسی بجلی سے چلا سکیں گے! اور
تب ہمارا کوئلہ کا خرچہ بہت گھٹ جائے گا۔

کوک کے چولھوں میں سے جو ضمنی چیزیں تیار ہوتی ہیں اُن میں ایک قسم کی گیس بھی ہے۔ یہ پائپ
لگا کر روج اور ہائی لینڈ پارک کے دونوں کارخانوں میں بھیجی جاتی ہے۔ جہاں پر یہ گرمی پہنچانے کے
لئے اور میناکاری کرنے والے چولھوں۔ کار کے چولھوں اور اسی قسم کی اور جگہوں میں برتی جاتی ہے۔ پہلے
ہمیں یہ گیس خریدنی پڑتی تھی۔ امونیم سلفیٹ سے کھاد کا کام لیا جاتا ہے۔ بینزول موٹر کا ایک ایندھن

ہے۔ کوک کے چھوٹے چھوٹے ڈلے جو بھٹکنے والی بھٹیوں میں کام نہیں آسکتے۔ کام کرنے والوں کے ہاتھ بازار کے بھاؤ سے بہت کم داموں پر بیچ دیئے جاتے ہیں۔ اور ان کے گھر تک پہنچانے کا کچھ چارج نہیں کیا جاتا۔ کوک کے بڑے بھٹکنے والی بھٹیوں کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ اس میں ہاتھ کی کچھ محنت نہیں برتی جاتی۔ بھٹکنے والی بھٹیوں سے پگھلا ہوا لوہا سیدھا بڑی بڑی ڈوئیوں میں جا پڑتا ہے۔ یہ ڈوئیاں انجن کے ذریعہ اپنے آپ ورکشاپ میں جا پہنچتی ہیں۔ اور دوبارہ گرم کئے بغیر یہ لوہا ٹھیک سانچوں کے اندر گرنے لگتا ہے۔ اس طریقہ سے نہ صرف . . . برابر ایک جیسی مقدار رہتی ہے کی ہم کو ملتی رہتی ہے جتنی کہ ہم کو حساب سے چاہیئے اور جس کا بڑھانا گھٹانا ہمارے اختیار میں ہوتا ہے۔ بلکہ ہمیں ایک بار کچا لوہا پگھلانا بچ رہتا ہے۔ بلکہ اصل پوچھو تو بنانے کا ایک سارا عمل اس طرح بیچ میں سے اڑ جاتا ہے۔ اور ہماری سب کثرتیں کام میں آ جاتی ہیں۔

ان سب سے ہمیں کتنی بچت ہوگی۔ یہ ہم نہیں جانتے یعنی ہم یہ نہیں جانتے کہ کتنی بھاری بچت ہوگی۔ کیونکہ ابھی تو ہمیں یہ کام کرتے ہوئے تھوڑا عرصہ ہی ہوا ہے جس سے آگے کا صرف موٹا اندازہ لگ سکتا ہے۔ اور اب ہم بہت طرفوں سے بچت کرنے لگ پڑے ہیں یعنی بار برداری میں۔ بجلی کی طاقت پیدا کرنے میں گیس بنانے میں۔ ڈھلائی کے خرچ میں اور پھر اس کے علاوہ وہ آمدنی جو ہمیں کوک کی ضمنی چیزوں اور چھوٹے چھوٹے ڈلوں سے ہونے لگی ہے۔ ان بچتوں کو ڈھونڈھ نکالنے میں آج تک ہمارا خرچ بارہ کروڑ روپیہ سے اوپر ہو چکا ہے۔

اس طرح کرنے سے ہم کہاں تک چیزوں کے نکاس تک پہنچ سکیں گے۔ یہ حالات پر منحصر ہے۔ کہیں بھی کوئی آدمی سوائے الکل پچو کے ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں لگا سکتا کہ کل کو تیار مال کی کیا لاگت آئے گی۔ اگر ہم یہ بھروسہ رکھ کر کام کریں گے کہ پیچھے کی نسبت ہمارا آنے والا زمانہ زیادہ شاندار ہے۔ اور یہ کہ جو ہم آج کام کر رہے ہیں اس میں کل کے لئے ترقی کی راہ چھپی ہوئی ہے۔ تو یہ ہمارے لئے زیادہ عقل کی بات ہوگی۔

اور تیار مال؟ اگر زندگی گزارنے کے لئے جتنی چیزیں درکار ہیں۔ وہ سب اتنی سستی اور اس قدر تعداد میں بنیں گی۔ تو کیا جلدی ہی ان چیزوں سے دنیا ناک تک بھر نہ جائے گی؟ پھر کیا ایک وقت ایسا

نہیں آئے گا جبکہ لوگوں کے پاس جو کچھ موجود ہے۔ اس سے کسی قیمت پر بھی ایک عدد زیادہ کوئی خریدنے کو تیار نہیں ہوگا؟ اور اگر ان چیزوں کے بنانے میں کام کرنے والوں کی تعداد آہستہ آہستہ کم ہوتی جائے گی تو ان آدمیوں کا کیا بنے گا؟ ان کو نوکریاں کہاں سے ملیں گی اور گزارہ کیسے ہوگا؟

پہلے ہم پچھلی بات کا جواب دیتے ہیں۔ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ ہم نے کئی مشینوں کو اور بنانے کے طریقوں کو اب بند کر دیا ہے۔ جب سے بہت سے آدمی خالی ہو گئے تب ہم سے سوال ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے مالک کو تو واقعی بڑا فائدہ ہوا ہے لیکن ان بے چارے غریبوں کا کیا بنے گا۔ جن کی روزی چھین لی گئی ہے؟

سوال بالکل واجب ہے۔ لیکن اس کا پوچھا جانا تھوڑا سا عجیب ضرور لگتا ہے۔ کیونکہ انڈسٹری کو بہتر طریقوں پر چلانے سے کہاں سچ مچ آج تک کسی کی روزی چھاپی گئی ہے؟ ریل کے آنے سے گاڑی والوں کی روزی واقعی ماری گئی لیکن کیا اس لیے ریلیں چلائی نہ جائیں اور گاڑیاں رہنے دی جائیں؟ کیا جتنے آدمی اس وقت ریلوے میں نوکر ہیں ان سے زیادہ گاڑی وان تھے؟ کیا ہم لاریاں اس واسطے نہ چلاتے کیونکہ اس سے گھوڑا گاڑی والوں کی روٹی چھن گئی؟ مقابلہ کر کے دیکھو کہ گھوڑا گاڑی والے کتنے تھے اور اب لاریاں چلانے والے کتنے ہیں؟ جیسے جوتیوں کے کارخانے جاری ہوئے۔ ہاتھ سے بنانے والے جوتیوں کی بہت سی دوکانیں بند ہو گئیں۔ جب ہاتھ سے جوتیاں بنتی تھیں کوئی امیر آدمی ہی گھر میں ایک سے زیادہ جوڑا رکھتا تھا۔ اور گرمیوں کے دنوں میں بہت سے کامگاروں کو ننگے پاؤں ہی چلنا پھرنا پڑتا تھا اب کسی بیرے کے پاس ہی صرف ایک جوڑا ہوگا۔ اور جوتیوں کا کاروبار خوب بڑھ گیا ہے۔ بس جب بھی آپ ایسا انتظام کریں گے تب ہی آپ اپنے دیش کے دھن کو بڑھاتے ہیں۔ اور جو آدمی اس طرح سے خالی ہوتا ہے۔ اس کو آپ پہلے سے نیا اور اچھا کام ڈھونڈھ کر دیتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر ایک دم سارے کاروبار اس طرح سے بدل دئے جاویں۔ تو فالتو آدمیوں کے لیے کام نکالنے کی دقت پیش آئے لیکن یہ تبدیلیاں اتنی جلدی کبھی نہیں ہوا کرتیں۔ ٹھہر ٹھہر کر ہوا کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں جونہی کوئی بہتر طریقہ مال بنانے کا جاری کرنے کی وجہ سے کسی کو اس کی پرانی جگہ سے ہٹایا جاتا ہے۔ اس کے لئے ہمیشہ اور اکثر نئی جگہ بنا ہوئی ہے۔ اور جو حالت میرے کارخانوں میں ہے۔ ویسا ہی کاروبار میں ہر جگہ

ہوتا ہے۔ جب فولاد ہاتھ سے تیار کیا جاتا تھا اُس سے آج فولاد کے کارخانوں میں کئی گنا زیادہ آدمی کام کر رہے ہیں۔ یہ لازمی تھا کیونکہ ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ اور آگے کو بھی ایسا ہی ہوگا۔ اگر کوئی اسے نہیں مانتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اُسے اپنی ناک سے پرے کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔

اب چیزوں کی بہتات کی بات لو۔ ہم سے بار بار پوچھا جاتا ہے کہ ہم کب مانگ سے کہیں زیادہ مال تیار کرنے کی حد تک پہنچ جاویں گے؟ یعنی مارکیٹ میں کب اتنی تعداد کاروں کی جمع ہو جائیگی جو لوگوں کی مانگ سے زیادہ ہوگی؟

ہمارا خیال ہے کہ ایک دن ایسا ہونا ممکن ہے جب سب چیزیں اتنی سستی تیار ہونے لگیں گی سوچ کر کبھی گھبراتے نہیں بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ دنیا میں اُس سے بڑھ کر اور کیا اچھی حالت ہو سکتی ہے جبکہ ہر شخص کے پاس جو کچھ اسے چاہیے موجود ہو۔ بلکہ ہمیں تو یہ ڈر ہے کہ ایسی حالت آنے میں ابھی بہت عرصہ درکار ہے۔ اور ہماری چیزوں کے لئے تو یہ حالت ابھی بہت دور ہے۔ ہمیں پتہ نہیں کہ ایک کنبہ ہماری کوئی ایک خاص قسم کی کاریں کتنی برتنا چاہے گا۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ قیمت کم ہونے پر جو کسان پہلے ایک کار برتتا تھا۔ اب اکثر دو کاریں رکھتا ہے۔ اور ساتھ میں ایک موٹر والا چھکڑا بھی۔ یہ یاد رکھنا چاہئیے۔ کہ بہت عرصہ نہیں ہوا جب کھیتی باڑی کی مارکیٹ میں موٹر کاروں کا کوئی نام بھی نہ جانتا تھا۔ اور اُس وقت ملک میں جتنے لکھ پتی ہوا کرتے تھے۔ لگ بھگ صرف اتنی ہی موٹر کاریں بکا کرتی تھیں۔

ہمیں تو ایسا جان پڑتا ہے کہ کئی میلوں میں پھیلے ہوئے ایک کارخانہ کے کامگاروں اور مزدوروں کو ایک ساتھ لاری میں بٹھا کر اُن کو اپنے اپنے مختلف محکموں میں بھیجنے کی بجائے اگر ہر کامگار اور مزدور کو اپنی علٰحدہ کار کام پر جانے کے لئے دیدی جائے۔ تو یہ سستا رہے گا۔ ہماری کاروں کے بیچنے والے ایجنٹوں کی حالت میں بھی یہی بات ہے۔ پبلک اب سیانی ہو گئی ہے۔ اور اپنی ضرورتوں کا بالکل ٹھیک اندازہ لگانے لگ گئی ہے۔ اب کیونکہ ہم نے سالم موٹر کاروں اور ٹریکٹروں کا بنانا ترک کر دیا ہے بلکہ صرف اُن کے پُرزے اور ٹکڑے بناتے ہیں۔ اور مارکیٹ میں اس وقت کوئی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہماری کاریں چل رہی ہیں۔ اس لئے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہم خواہ کتنا زور کیوں نہ لگائیں۔ ہم اُن کی مرمت اور درستی کے لئے کافی مال تیار کر کے بھی نہیں دے سکیں گے۔ یہ صرف ہمارے کام کے لئے نہیں۔ دوسرا

کوئی بھی اور کاروبار لے لو سب میں یہی حالت ضرور ہوگی۔ اگر قیمتیں مناسب ہوں تو اس بات کا ہرگز اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ کبھی اتنا زیادہ مال تیار ہونے لگے گا جس کی مارکیٹ میں نہ کھپت ہو سکے اور پبلک میں مانگ نہ رہے۔ سچ پوچھو تو بیوپار کرنے کا مزہ ہی تب آنا شروع ہوتا ہے جب لوگ زیادہ قیمتیں ہونے کی وجہ سے مال خریدنا بند کر دیتے ہیں۔ اُس وقت اگر کسی نے اپنا کاروبار جاری رکھنا ہوگا تو اُسے اپنی غرض کو بنا کوالٹی میں فرق ڈالے اور گھٹائے اپنی قیمتیں کم کرنی پڑیں گی۔ یہ قیمتوں کا گھٹنا ہمیں مال تیار کرنے کے بہتر سے بہتر طریقے اور کم سے کم کچّے مسالے اور سامان ضائع کرنے والے عملوں کو سیکھنے اور ڈھونڈنے پر مجبور کرتا ہے جس صنعت میں جس کو نارمل حالت کہا جاتا ہے اُس پر اپنے کاروبار کو پہنچانا اُس کے چلانے والوں منیجروں اور کارندوں کی اُس کام کے کرنے کے بہتر طریقے اور عمل تو ڈھونڈھتے نکالتے رہنے پر منحصر ہے۔ اگر ایک آدمی اپنی چیز اتنی تھوڑی قیمت پر بیچنا شروع کر دیتا ہے جس میں اُسے کچھ فائدہ نہیں ہوتا بلکہ نقصان ہوتا ہے۔ تو پھر اُس کا یہ ڈھونڈے بغیر گزارہ نہیں کہ وہ وہی چیز اُتنی ہی عمدہ کسی دوسرے طریقے سے بنا کر۔ نہ کہ اپنے ملازموں کی تنخواہیں کاٹ کر یا اپنی چیز کے دام بڑھا کر۔ منافع نکالنے کی کوشش کرے۔

اپنے ملازموں یا خریداروں کی جیب کاٹ کر منافع بنانا معقول بندوبست نہیں ہے۔ بہتر بندوبست کے ذریعہ نفع کماؤ۔ اپنی چیز کی کوالٹی کم نہ کرو۔ تنخواہیں مت گھٹاؤ۔ اور پبلک کو لوٹنے کی کوشش مت کرو۔ رات دن اپنے کام کرنے کے نئے نئے بہتر طریقے ڈھونڈ نکالنے میں عقل خرچ کرو۔ دماغ لڑاؤ اور خوب لڑاؤ۔ آج سے کل کام بہتر کر کے دکھاؤ۔ اس طرح سے بیوپار کرنے میں بیوپاری گاہک اور پبلک سبھی کو پورا سکھ ملتا ہے اور فائدہ ہوتا ہے۔

اور یہ سب کچھ آدمی ہمیشہ ہر حال میں کر سکتا ہے۔

کارخانہ کھولنے کا اصلی اور سب سے بڑا مقصد مال تیار کر کے دینا ہوتا ہے۔ اور اگر یہ مقصد ہمیشہ سامنے ہو تو کارخانہ دار کو روپیہ کی آمدنی و خرچ کی طرف جو اصل میں منیمی کا کام ہے بہت معمولی توجّہ دینی پڑے گی۔ روپیہ پیسے کے معاملہ میں اوّل روز سے میری پالیسی بڑی سیدھی سادی رہی ہے۔ شروع شروع میں مَیں سامان صرف نقد خریدتا تھا اور اپنا مال نقد بیچتا تھا۔ اور کافی روپیہ ہمیشہ ہاتھ میں رکھتا تھا۔ تاکہ خریدنے میں زیادہ سے زیادہ رعایت لے سکوں۔ اور بینک میں میرا جتنا روپیہ ہو اُس کا پورا پورا سود مجھے مل سکے۔ مجھے بینک کا صرف یہی ایک بڑا فائدہ نظر آتا ہے کہ یہاں پر روپیہ محفوظ ہے۔ اور جمع کرانے اور نکالنے میں آرام رہتا ہے۔ لیکن جوں ہی ہم اپنے کمپٹیشن (مقابلہ) کرنے والوں کو نقصان پہنچانے کی غرض سے خرچ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنا نقصان ہونا پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ جتنا ہم روپیہ پیسہ بچانے میں ہوشیاری دکھانے لگتے ہیں۔ اُتنی ہی ہمارے تیار مال کی تعداد میں کمی پڑنے لگتی ہے۔ فیکٹری کو روپیہ پیسہ کی فکر اپنے کارخانہ کے اندر کرنی چاہیئے نہ کہ بینک میں جا کر میں یہ نہیں کہتا کہ بیوپاری آدمی کو روپیہ پیسہ کے معاملہ میں بالکل بُدھو ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کی تھوڑی جانکاری بہت زیادہ جاننے سے بہتر رہتی ہے۔ کیونکہ اگر وہ اس لائن میں خوب ہوشیار ہو گیا۔ تو وہ سدا یہی حساب لگاتا رہا کرے گا کہ کمانے کی بجائے وہ اپنا کام روپیہ اُدھار لے کر چلا سکتا ہے۔ اور تب جو روپیہ اس نے اُدھار لیا ہے۔ اس کو اُتارنے کے لئے وہ اور روپیہ اُدھار لیتا چلا جائے گا۔ اور اخیر میں بیوپاری بننے کی بجائے وہ صرف روپیہ پیسے کا ایک مداری بن کر رہ جائے گا۔ جس کے پاس نوٹوں

اور سکوں کو کبھی پیدا کرنے اور کبھی غائب کر دینے کے سوائے اور کچھ کام نہیں۔

اگر وہ اپنے اس پیشے میں واقعی ہوشیار ہے تو ممکن ہے۔ کافی عرصہ تک اس کا کام اس طریقہ سے چلتا جائے۔ لیکن ایک نہ ایک دن اس کو ٹھوکر لگے گی۔ اور اس کی ساری کمائی برابر ہو جائے گی۔ مال بنا کر بیچنا اور مہاجنی گری کرنا دونوں بالکل الگ الگ چیزیں ہیں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ اکثر بیوپاری مہاجنی میں پھنسے ہوئے ہیں اور مہاجنوں کی بہت بھاری تعداد نے بیوپار میں ٹانگ اڑائی ہوئی ہے۔ اپنی اصلی جگہ سے دونوں دھندوں کو ہلانے کی کوشش کی جا رہی ہے جس سے دونوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ روپیہ دوکان کے اندر سے نکالنا ہے نہ کہ بینک سے۔ اور میرا تجربہ یہ ہے کہ دوکان ساری ضرورتیں پوری کر سکتی ہے۔ ایک بار جبکہ یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ روپیہ کی کمپنی کو سخت ضرورت ہے ہم نے جب اپنی دوکان پر زور ڈالا تو وہاں سے جو رقم ہمیں ملی وہ اس قدر بھاری تھی کہ ملک کے اندر کسی بینک میں اتنی بڑی رقم اُدھار دینے کی طاقت نہ تھی۔

ہمیں روپیہ جوڑ کر رکھنے کی زیادہ تر ضرورت تردید کرنے کے واسطے پڑی۔ چند سال ہوئے ہمیں کافی عرصہ تک یہ متواتر تردید کرنا پڑا کہ فورڈ موٹر کمپنی کی مالک سٹینڈرڈ وائل کمپنی نہیں ہے اور معاملہ کو زیادہ صاف کرنے کے لئے ہم ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ ہمارا اسکے یا کسی اور کمپنی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہم اپنی کاریں صرف بذریعہ ڈاک بیچنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ پچھلے سال سب سے مزیدار افواہ یہ تھی کہ ہم روپیہ کی "تلاش میں وال سٹریٹ کے بینکوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ میں نے اس کی تردید کرنے کی بالکل پرواہ نہ کی۔ ہر ایک چھوٹی بات کی "تردید کرنے میں بھی کافی وقت لگتا ہے۔ سوائے اس کے ہم نے یہ دکھلانے کی کوشش کی کہ ہمیں روپیہ کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کے بعد آج تک کبھی یہ خبر نہیں اڑی کہ ہمیں وال سٹریٹ سے روپیہ لینے کی ضرورت پڑی ہے۔

ہم روپیہ اُدھار لینے کے خلاف نہیں۔ نہ ہم مہاجنوں کے خلاف ہیں۔ ہم خلاف ہیں اس بات کے کہ بیوپار کی جگہ اُدھار لے۔ ہم اس مہاجن کے خلاف ہیں۔ جو بیوپار کو گول گپا سمجھ کر کھا لینا چاہتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ روپیہ اُدھار اور دھن اپنی اپنی جگہ پر اگر رکھے جاویں تو سب اچھے ہیں لیکن ایسا کرنے کے لئے آدمی کو بڑے سوچ سمجھ کر چلنا پڑتا ہے کہ کہاں پر ٹھیک روپیہ کی ضرورت ہے۔

اور وہ کیسے اُتارا جا سکے گا۔

روپیہ بیوپار میں صرف ایک ونار ہے۔ یا یوں کہو کہ اس مشینری کا ایک پُرزہ ہے۔ اگر تمہارے بیوپار کے اندر کچھ نقص ہے۔ . . . . تو خواہ تین لاکھ خراد لے آؤ۔ خواہ تین لاکھ روپیہ۔ نہ خرادوں سے روگ دور ہوگا۔ نہ روپیہ سے۔ صرف زیادہ عقل۔ خیال اور حوصلہ سے کام کرکے یہ بیماری دور ہو سکتی ہے جب بیوپار میں جو پونجی پاس موجود ہے اُس کا غلط استعمال ہو رہا ہو وہاں اگر اور پونجی لے کر ڈال دی جائے تو اُس کا بھی غلط استعمال ہوگا۔ مطلب یہ کہ پہلے غلط استعمال کو ہٹاؤ۔ جب یہ ہو گیا۔ بیوپار اپنے آپ روپیہ پیدا کرنے لگے گا جیسے کہ بیماری دور ہونے پر انسان کے جسم کے اندر اپنے آپ کافی اچھا خون بننا شروع ہو جاتا ہے۔

اُدھار لے کر کام چلانا بیوپار میں اصل نقص کو نہ پکڑنے کا آسانی سے بہانہ بن سکتا ہے۔ اُدھار کی آڑ میں آدمی اپنی کاہلی یا گھمنڈ کو مزے سے چھپا سکتا ہے۔ کئی بیوپاری اتنے کاہل ہوتے ہیں کہ وہ اتنی دیکھ بھال کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ اصل روگ کہاں پر ہے۔ یا وہ اسی جھوٹی شان میں مرے جاتے ہیں کہ جس طریقے پر ہم نے کام جاری کیا ہوا ہے وہ کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتا لیکن بیوپار کے اصول بالکل اسی طرح ہیں جس طرح قدرت کا یہ قانون کہ زمین ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور جو آدمی ان سے اُلٹا چلنا چاہتا ہے یہ اُسے ناک سے چنے چبوا کر چھوڑتے ہیں۔

بیوپار کو بڑھانے کی غرض سے اُدھار لینا اور بات ہے۔ مگر اُدھار سے بد انتظامی اور پھوکٹ کی کسر پوری کرنا بالکل الگ چیز ہے۔ اس پچھلی ضرورت کے لئے روپیہ بالکل درکار نہیں کیونکہ روپیہ سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ پھوکٹ کا علاج بچت کرنے سے ہوگا۔ اور بد انتظامی عقل برتنے سے دور ہوگی۔ ان دونوں میں سے کسی کا بھی روپیہ سے واسطہ نہیں۔ بلکہ اُلٹا غور سے دیکھو تو کئی حالتوں میں یہ ان کا دشمن ہوتا ہے۔ اور ایک نہیں بلکہ بے شمار بیوپاری اپنے اُس اڑے وقت کو سراہتے ہیں جب اُنہیں یہ سمجھ آئی کہ ان کی سب سے بڑی پونجی ان کے اپنے دماغ کے اندر موجود ہے۔ نہ کہ بینک سے لئے ہوئے قرضوں میں۔ کئی حالتوں میں اُدھار لینا بالکل ایسا ہوتا ہے جیسے شرابی شراب کا اثر دور کرنے کے لئے ایک اور گلاس چڑھا لے۔ اس طرح کرنے سے وہ فائدہ نہیں ملتا جس خیال سے یہ کام کیا

جاتا ہے۔ اُلٹا اس سے جھنجھٹ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اپنے دھندے میں جہاں جہاں نقص ہوں۔ ان کو دور کرنے سے سات فی صدی سود پر بڑی سے بڑی رقم اُدھار لینے کی بجائے کہیں زیادہ فائدہ رہے گا۔

بیوپار کے اندر جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں سب سے زیادہ ان کا دھیان کرنا چاہیئے مارکیٹ میں جسے "بیوپار کرنا" کہا جاتا ہے۔ اُس کا مطلب صرف اتنا ہی ہوتا ہے۔ کہ لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کیا جاوے۔ اگر ہم ایک ایسی چیز بناویں جس کی لوگوں کو ضرورت ہے اور اُسے ایسے مناسب داموں پر بیچو جو دے کر لوگوں کو اُس چیز سے آرام ملے۔ اور جو انہیں نہ اکھرے۔ تو جب تک اُس چیز کی مانگ مارکیٹ میں ہے تمہارا بیوپار چلتا رہے گا۔ جس طرح لوگ پانی پیتے ہیں عین اُسی طرح لوگ بڑے مزے سے ان چیزوں کو اپنے آپ خریدتے رہتے ہیں جن سے ان کو آرام ملتا ہو۔

لیکن اس طرح کی چیز تیار کرنے کا جو عمل اور طریقہ ہے اُس میں لگاتار دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ مشینری چلتے چلتے گھس جاتی ہے اور اس کو مرمت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کام کرتے کرتے آدمی چڑچڑے سُست یا لاپرواہ ہو جاتے ہیں۔ بیوپار کسی خاص چیز کو تیار کرنے کے لئے آدمیوں اور مشینوں کے ایک جگہ اکٹھا ہونے کا نام ہے۔ اور آدمیوں اور مشینوں دونوں کو وقت وقت پر مرمت کرنے اور بدلنے کی ضرورت ہے۔ بہت بار بیوپار میں جو اونچے اونچے عہدوں کو سنبھالے بیٹھے ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ انہیں کو کسنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی بھول اور کمی کو آخیر دم تک نہیں مانتے۔ جب بیوپار میں غلط طریقوں سے کام کرنے کی بھرمار ہو جائے جب بیوپار کسی خاص طرف کم دھیان دینے کی وجہ سے ڈھیلا پڑنے لگے جب بڑے بڑے افسر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر کرسیوں پر مزے سے بیٹھے رہنے لگیں۔ جیسے جو کچھ انہوں نے آج تک کیا ہے آئندہ کے لئے بھی وہی کافی ہے۔ جب آدمی بیوپار کو کرنے کے لائق ایک بڑا کام نہ سمجھ کر صرف روپیہ بٹورنے کی ایک سبیل سمجھنے لگے۔ تو جان لو کہ مصیبت سرہانے کھڑی ہے۔ ایک دن سو کر جب صبح جاگو گے تو پتہ لگیگا۔ کہ تمہیں اب اتنا کام کرنا پڑے گا جتنا پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اور اس پر آمدنی تھوڑی۔ جو کچھ پاس میں روپیہ تھا وہ سب ختم ہو لیا۔ روپیہ اُدھار بے شک مل سکتا ہے اور تم بڑی آسانی سے لے بھی سکتے ہو۔ لوگ

چاروں طرف سے اپنے آپ آکر تمہیں کہیں گے کہ روپیہ لے لو۔ خاص کر چھوٹی عمر کے بیوپاری کے پھنسنے کے لئے اس سے بڑھ کر بھاری جال اور کوئی نہیں۔ تمہارے روپے اُدھار لینے کا صرف یہ نتیجہ ہوگا کہ تمہارے بیوپار کے اندر جو جو خرابیاں تھیں وہ ابھی اور دیر تک چلتی رہیں گی لیکن بیماری اپنا اثر کرتی جائے گی۔ کیا آدمی اپنے نجی روپیہ کی نسبت روپیہ اُدھار لے کر زیادہ عقل والا ہو جاتا ہے؟ عام طور پر ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں روپیہ اُدھار لینا گویا برباد ہوتی ہوئی جائداد کو گروی رکھنا
بیوپار کے لئے روپیہ اُدھار لینے کا اگر کوئی وقت ہے تو وہ ہے جبکہ اُسے اس کی ضرورت نہ ہو۔ یعنی وہ وقت جبکہ جو کام اُسے خود کرنے چاہئیں۔ اُن کے بدلے اُسے نہ برتے۔ اگر ایک آدمی کے بیوپار کی حالت بہت اچھی ہے جسے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ تو اُدھار لینے میں اتنا ڈر نہیں۔ لیکن اگر تمہارے کاروبار کو بد انتظامی کی وجہ سے روپیہ درکار ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے کاروبار کے اندر گھس جاؤ۔ اور جہاں اس میں نقص نظر آئے اُسے دور کرو۔ اس تھوڑے پر بینک سے

اُدھاری روپیہ کی بلڈنگ باندھنا بالکل بے کار ہے۔

میری دھن کی پالیسی میری بکری کی پالیسی کے پیچھے چلتی ہے۔ میرا اصول یہ ہے کہ تھوڑے منافع پر زیادہ تعداد میں مال بیچنا تھوڑا مال زیادہ منافع پر بیچنے سے بہتر ہے۔ اس طرح لوگ زیادہ تعداد میں مال خرید سکتے ہیں۔ اور کافی اچھی تنخواہ پر زیادہ تعداد میں آدمیوں کو کام پر لگایا جا سکتا ہے اس سے بیوپاری کو یہ فائدہ ہے کہ وہ آگے کو اپنے تیار مال کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ اور ایسی ترکیبیں نکال سکتا ہے۔ جس سے اُسے مندی آنے پر کچھ تکلیف نہ ہو۔ اور اس کی ساری مشینیں برابر چلتی رہیں۔ ایسا کرنے سے کام اچھا اور لگاتار ہوتا رہے گا۔ اور اگر غور سے سوچا جائے تو پتہ لگے گا۔ کہ جو یہ اکثر بیوپار میں کہا جاتا ہے کہ روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے کام اٹکا ہوا ہے۔ اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ لگاتار کام حاصل کرنے کیلئے پہلے سے کوئی تجویز سوچی ہوئی نہیں ہوتی۔ کہ اس طرح سے چلنا ہے۔ کم سمجھ بیوپاری کا خیال ہوتا ہے کہ اگر میں نے اپنی قیمتوں میں کمی کی تو میری ساری آمدنی بھی کم ہو جائے گی۔ اس قسم کے بیوپاری کے ساتھ مغز پچی کرنا فضول ہے۔ کیونکہ وہ بالکل جانتا ہی نہیں کہ بیوپار اصل میں ہے کیا چیز۔ مثال کے طور پر ایک بار جب میں اپنی کار کی قیمت فی عدد دو سو چالیس روپے کم کر دینے کی سوچ رہا تھا۔ مجھ سے سوال

کیا گیا۔ کہ کیا اس طرح کرنے سے پانچ لاکھ کاریں بنا کر بیچنے میں میری کمپنی کی آمدنی بارہ کروڑ روپیہ گھٹ نہ جائے گی؟ بے شک یہ درست ہے۔ اگر نئی قیمت پر صرف یہ پانچ لاکھ کاریں ہی بیچی جاویں تو ضرور بارہ کروڑ کی آمدنی میں کمی ہو جائے گی۔ یہ حساب لگانا تو بڑا ضروری رہے۔ مگر اس کا بیوپار سے ذرا بھی واسطہ نہیں۔ کیونکہ اگر تم اپنی چیز کی قیمتیں کم نہ کرتے جاؤ تو بکری لگاتار اوپر نہیں چڑھے گی۔ اور بیوپار کی پائیداری جاتی رہے گی۔

یا تو ایک کام بڑھ رہا ہے۔ ورنہ ضرور گھٹ رہا ہے۔ اور گھاٹے پر چلنے والے بیوپار کو ہی بہت سا روپیہ لینے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ پچھلے زمانہ میں بیوپار اس اصول پر کیا جاتا تھا کہ لوگ جتنی اونچی سے اونچی قیمتوں پر مال خریدنے کو تیار ہوں۔ وہ رکھی جاویں۔ آج بیوپار میں اس سے بالکل الٹا چلنا پڑتا ہے۔

مہاجنوں اور وکیلوں کے دماغ میں یہ بات کبھی نہیں آ سکتی۔ وہ کہتے ہیں کہ بیوپار کی پائیداری اسی میں ہے کہ جس طرح چل رہا ہے چلنے دو۔ اُن کی عقل یہ ہرگز نہیں مانتی کہ بیوپار میں کبھی اپنے آپ بھی قیمتیں کم کر دینے کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اسی لئے عام قسم کے مہاجن یا وکیل کو بیوپار کے انتظام میں ساتھ رکھنا آفت مول لینا ہے۔ قیمتیں گھٹانے سے بکری بڑھ جاتی ہے۔ اور روپیہ لینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن صرف اُس صورت میں جبکہ آدمی یہ سوچ لے کہ اس طریقہ سے جو لازمی منافع ہوگا وہ میرے پاس گویا صرف امانت کا روپیہ ہے جس کو لگا کر آئندہ میں اور بھی زیادہ اور بہتر کام کر سکوں گا۔ چونکہ جو مال ہم بناتے ہیں اُس کو جلدی ہی جلدی بیچ ڈالتے ہیں۔ اور بکری کی رقم بھی خوب بڑی ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں منافع سدا کافی سے زیادہ ہوتا رہا ہے۔ خواہ ہم نے اپنی چیز کو کسی دام پر بیچا ہو۔ ہم فی نگ تھوڑا سا منافع رکھ لیتے ہیں۔ لیکن آخر میں سب مل ملا کر یہ بڑی بھاری رقم بن جاتی ہے۔ منافع سدا ایک جیسا نہیں ہوتا۔ قیمتیں کم کرنے پر کچھ عرصہ کے لئے منافع تھوڑا رہتا ہے لیکن تب کام کرنے والوں کو دھندے میں لازمی طور پر بچتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنی پڑتی ہیں۔ جن کے شروع ہوتے ہی منافع پھر بڑھنے لگتا ہے۔ لیکن یہ رقم کمپنی کے حصہ داروں کو بطور ڈیوی ڈینڈ (یعنی سال کا حصہ بڑتی نفع) تقسیم کر کے نہیں دینی چاہیئے۔ ہمیشہ کم ڈیوی ڈینڈ بانٹنا یہ میرا اپنا اصول رہا ہے۔

اور آج ہماری کمپنی کا کوئی ایسا حصّہ دار نہیں۔ جو اس پالیسی سے خوش نہ ہو۔ میرا یہ یقین ہے کہ بیوپار میں جو منافع ہوتا ہے اُس میں فی سیکڑہ تھوڑا سا حصہ داروں کے لئے رکھ کر باقی سب کاروبار کے پاس ہی رہنا چاہیئے حصّہ داروں کا اس پر کوئی حق نہیں۔

میری رائے میں ایک کارخانہ کے حصّہ دار صرف انہیں آدمیوں کو ہونا چاہیئے جو خود بیوپار کرنے والے ہوں۔ اور جو کارخانہ کو محض روپیہ کمانے کی ایک مشین نہ سمجھ کر اسے پبلک کی خدمت کرنے کا ایک ذریعہ سمجھیں۔ اگر منافع خوب ہو رہا ہے اور خدمت کے خیال سے کاروبار کرتے ہوئے منافع لازمی طور پر خوب ہوگا۔ تو اُس منافع کو پھر لوٹ کر اپنے کاروبار میں ہی ڈالدینا چاہیئے۔ تاکہ آئندہ خدمت اور بھی اچھی طرح سے کی جاسکے۔ اور منافع کا کچھ حصّہ خریدار کی جیب میں بھی چلا جاوے۔ ایک سال کا ذکر ہے کہ جتنا ہم نے اندازہ لگایا تھا۔ اُس سے اس قدر زیادہ منافع ہوا۔ کہ ہم نے اُس سال میں اپنی ہر کار کے خریدنے والے کو ڈیڑھ صد روپیہ خود بخود لوٹا دیا۔ کیونکہ ہم نے محسوس کیا کہ ہم نے جو قیمت انجان پنے میں خریدار سے چارج کی ہے۔ وہ بہت زیادہ تھی۔ اور ہم اُتنے کے حقدار نہ تھے۔ چنانچہ چند سال ہوئے ہماری کمپنی پر اس غرض سے دعوےٰ دائر کیا گیا کہ ہم اپنے حصہ داروں کو زیادہ ڈیوی ڈینڈ کیوں ادا نہیں کرتے۔ اس مقدمہ میں میں نے اپنی بکری اور روپیہ کمانے کی پالیسی کو کھول کر ظاہر کیا۔ گواہ کے کٹھرے میں کھڑے ہو کر میں نے وہ تمام اصول بیان کئے۔ جن پر میں اُس وقت چل رہا تھا۔ اور اب تک چل رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ:۔

سب سے اوّل میرا یہ پختہ یقین ہے کہ مناسب تھوڑے منافع پر زیادہ تعداد میں کاروں کو بیچنا زیادہ منافع پر تھوڑی کاریں بیچنے کی نسبت ہمیں اچھا رہتا ہے۔

میں یہ بات اِس لئے کہتا ہوں کہ اس طریقہ سے لوگ زیادہ تعداد میں کاریں خرید سکتے ہیں۔ اور ان کا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اور اس طرح زیادہ تعداد میں ہم اچھی تنخواہوں پر آدمیوں کو اپنے کام میں لگا سکتے ہیں۔

یہ ہیں میری زندگی کے مقصد۔ اور اگر میں اپنے کاروبار سے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے واسطے کافی روپیہ کما کر نہیں دے سکتا۔ تو میں کامیاب کہلانے کا حقدار نہیں۔ بلکہ مجھے زندگی میں بالکل

فیل سمجھنا چاہیئے۔

میں اسے بہت ایک اچھی پالیسی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس پر چلنے سے بڑا فائدہ رہتا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس طرح کام کرنے سے ہم ہر سال پچھلے سال کی نسبت زیادہ تعداد میں اور زیادہ خریداروں کے ہاتھ اپنے کاروں کو بیچتے رہے ہیں۔ اور زیادہ تعداد میں آدمیوں کو اپنے کام میں لگاتے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ بکری زیادہ ہونے کی وجہ سے ہمارا منافع اتنا بڑھتا چلا جا رہا ہے جس کا ہمیں جب ہم نے کام شروع کیا تھا خواب میں بھی امید نہیں ہو سکتی تھی۔

دل میں یہ بات اچھی طرح بٹھا لو کہ کوالٹی کو گھٹائے بنا جب بھی تم اپنی اپنی کار کی قیمت کم کر دو گے تبھی تم اپنے اُن خریداروں کی تعداد بڑھا رہے ہو۔ جو تمہاری کار خریدنے کی سوچ رہے ہیں۔ بہت سے آدمی ایسے ہیں۔ جو کار ۱۳۲۰ روپیہ میں خریدنے کے لئے تیار نہیں لیکن ۱۰۸۰ روپیہ میں خریدنے کو تیار ہو جائیں گے۔ جب کار کی قیمت ہماری ۱۳۲۰ روپیہ تھی تو لگ بھگ ہمارے خریدار پانچ لاکھ ہوں گے۔ اور میرا اندازہ ہے کہ اگر ہم قیمت گھٹا کر ۱۰۸۰ روپیہ کر دیں تو یہ تعداد ایک سال میں آٹھ لاکھ تک پہنچ جاوے گی۔ اور فائدہ ؟ گو فی کار پر کم منافع آئے گا۔ لیکن زیادہ تعداد میں کاریں بنیں گی۔ اور زیادہ آدمیوں کو نوکریاں ملیں گی۔ اور آخیر میں جا کر جتنا ہمارا مناسب حق ہے اُتنا منافع اور کافی ضرور ہو جائے گا۔

ایک بات اور ہے جو میں اس جگہ پر کہہ دینی چاہتا ہوں۔ میں یہ ہرگز نہیں مانتا کہ ہمیں اپنی کاریں بیچ کر بے حد منافع وصول کرنے کا حق ہے۔ مناسب منافع تو بالکل جائز ہے۔ مگر حد سے زیادہ ہرگز نہیں ہونا چاہیئے۔ بس میری پالیسی شروع دن سے ہی چلی آئی ہے۔ کہ جوں جوں ہمارے کارخانہ میں زیادہ مال تیار ہونے لگے قیمتیں کم کرتا چلا جاؤں۔ تا کہ خریداروں اور مزدوروں کا بھلا ہو جس کی وجہ سے ساتھ ہمیں بھی بے شمار فائدہ ہوتا رہا ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ دھندا شروع سے اخیر تک اس طور سے چلانا چاہیئے۔ جس سے اس کے مالکوں کو زیادہ سے زیادہ نقد منافع ہو سکے۔ میری پالیسی یہ نہیں۔ اس لئے جنہیں عام طور پر آج کل حصہ دار کہا جاتا ہے۔ میں اُن سے کتراتا ہوں۔ کیونکہ ان میں خدمت کرنے کے لئے آگے بڑھنے کا

مادہ نہیں ہوتا میرا مقصد یہ ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو کام دے سکوں۔ اور جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے۔ جو ہم نے یہ کام چالو کیا ہے۔ اُس سے جو فائدہ ہوگا۔ اُس کو سب گھروں تک پہنچاؤں۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ آرام کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں اور اپنا گھر بار بناویں۔ اس کے لیئے ضروری ہے کہ بیوپار سے جو منافع ہو اس کا بڑا حصّہ پھر مڑ کر بیوپار میں ہی ڈال دیا جاوے۔ اسی لئے ہمیں بیوپار میں ایسے حصّہ داروں کی ضرورت نہیں جو خود کام کرنے والے نہیں۔ کیونکہ خود کام کرنے والے حصّہ دار کو بینک کے ڈیوی ڈینڈوں کی نسبت لوگوں کی خدمت کرنے کی زیادہ فکر رہتی ہے۔

اگر کبھی یہ سوال اُٹھے کہ تنخواہیں کم کی جاویں یا ڈیوی ڈینڈ اُڑا دیئے جاویں۔ تو میں ڈیویڈنڈ اُڑانا پسند کروں گا۔ مگر ایسا وقت آنے کی اُمید نہیں۔ کیونکہ تنخواہیں گھٹانے سے بچت نہیں ہوا کرتی دھن کے خیال سے تنخواہیں گھٹانا خراب پالیسی ہے۔ کیونکہ اس سے لوگوں کے اندر خریدنے کی طاقت بھی اُتنی ہی کم ہو جاتی ہے اگر یہ سچ ہے کہ کوئی شخص لیڈر بن کر ذمہ واریوں سے بچ نہیں سکتا۔ تو اُس کی ایک ذمہ واری یہ بھی ہے کہ وہ اس بات کا خاص خیال رکھے کہ آیا اُس کے مریدوں اور ماتحتوں کو گزارہ لائق پیسے کمانے کے معقول موقعے ملتے ہیں یا نہیں۔ پرمیشور نے روپیہ صرف کمپنی یا کارخانہ کو منافع کما کما کر دینے یا مالدار کرنے کی غرض سے نہیں بنایا ہے۔ بلکہ اس میں وہ رقم بھی شامل ہے جو کمپنی یا کارخانہ اپنے ملازموں اور کامگاروں کو تنخواہوں کی شکل میں واپس کر دیتی ہے۔ یہ کسی پر کوئی احسان نہیں۔ مناسب تنخواہیں دینا احسان کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ان کا صرف مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس کمپنی یا کارخانہ کا انتظام اور بندوبست اتنا اچھا نہیں کہ وہ اپنے ایک ملازم کو بہتر کام کر کے دکھلانے پر زیادہ تنخواہ پانے کا موقع نہیں دیتی۔ اُس کے فیل ہونے میں کوئی شک نہیں۔

تنخواہیں ایک طرح سے پوجا کی چیز ہے۔ ان سے لوگوں کے گھر بار ٹبّر قبیلہ اور خاندانوں کی بگڑتی سنورتی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ ان پر بڑا سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا چاہیئے۔ تنخواہ رجسٹر کے اندر تو یہ صرف رقمیں ہی ہیں۔ لیکن باہر دُنیا میں یہ روٹیاں اور کپڑا ننھے بچّوں کے پنگوڑے اور ان کی تعلیم اور گھر کا آرام اور سکھ ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ پونجی بھی ایسی ہی پوجا کی چیز ہے۔ جسے لگا کر کام سے منافع کمایا جاتا ہے۔ اگر آج ہمارے اُدیوگوں کا خون چوس لیا جائے۔ تو اس سے کسی کو بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اس لئے جس طرح

گھر پوجنے کی چیز ہے۔ اسی طرح ایک کارخانہ بھی ہے۔ جس میں ہزاروں آدمی کام کر رہے ہیں۔ گھر
میں جو کچھ بڑھیا نظر آتا ہے۔ اس کی اصلی بنیاد کارخانہ میں ہوتی ہے۔ اگر ہم گھروں کو خوش رکھنا
چاہتے ہیں ہمیں اپنے کارخانوں کو خوب ترقی دینی چاہیے۔ کارخانوں سے منافع صرف اس خیال
سے پیدا کرنے چاہئیں۔ کہ ان سے ایک تو وہ دھندا اور بھی پکے پاؤں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے
ان سے اور بہت سے لوگوں کو نوکری مل جاتی ہے۔ منافعوں سے اگر اکیلے آدمی کی دولت بڑھ
گئی تو یہ ان کی ایک صفت ہوئی۔ لیکن اگر ان سے دھندے کے پاؤں مضبوط ہوتے ہوں۔
انتظام بہتر ہو جائے اور آدمیوں کے لئے نوکریوں کی زیادہ جگہیں نکلنے لگیں۔ تو یہ بالکل الگ
قسم کی صنعتیں ہیں۔ اس طرح کی آئی ہوئی پونجی کو یوں ہی گنوانہ دینا چاہیے۔ مانا کہ برتنے
کے لئے یہ ایک آدمی کے قبضہ میں ہو گئی ہے مگر ہے یہ ساروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے۔

منافعوں کے تین مالک ہیں۔ ایک تو وہ دھندا جن سے یہ نکلے ہیں۔ ان منافعوں
سے اس دھندے کو پائیدار اور مضبوط بنانا چاہیئے اور بڑھانا چاہیئے۔ دوسرے ان کے مالک
وہ لوگ ہیں جن کی ہمّت اور محنت سے یہ منافعے حاصل ہوئے۔ اور تیسرے مال کے
خریدار ان کے مالک ہیں۔ ایک کامیاب دھندا چلانے والے بنانے والے اور خریدنیوالے
تینوں کے لئے ہی منافعے کی چیز ہے۔

اصلی اصول یہ ہے کہ جن لوگوں کو بہت زیادہ منافع ہو رہے ہیں سب سے پہلے انہیں اپنی
قیمتیں کم کرنی چاہئیں۔ لیکن وہ یہ کبھی نہیں کرتے۔ الٹا جو کام زیادہ ہو جانے سے تھوڑی سی لاگت
بڑھ جاتی ہے وہ بھی دھندے کے سر سے ہی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں
بلکہ اس پر کچھ اور منافع بھی جوڑ کر وہ یہ ساری رقم خریدار کی جیب سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے
بیوپار کا سارا گر یہ ہے کہ جو ملے سب ہڑپ کرو۔ یہ لوگ سٹہ باز ہیں۔ لٹیرے ہیں۔ اور نکمّے۔ جنہوں
نے ہمیشہ سچے بیوپار کو نقصان پہنچایا ہے۔ ان سے کچھ امید نہیں رکھنی چاہیئے۔ یہ اندھے ہیں
انہیں روپیہ آنے پائیوں کے سوائے دنیا میں اور کچھ نظر نہیں آتا۔
یہ لوگ اپنے منافعے میں سیکڑہ پیچھے دس یا بیس کم کرنے کی بجائے اپنے ملازموں کی

تنخواہیں دس یا بیس فی سیکڑہ گھٹا کر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ لیکن بیوپاری کو اپنی ساری سوسائٹی کا خیال کر لینا چاہیئے۔ اور سب لوگوں کی خدمت کرنے کی غرض سے اور اسے مضبوط بنانے کے لئے اپنی حیثیت کے مطابق مدد دینے کے لئے سدا تیار رہنا چاہیئے۔

ہاتھ میں کافی نقد روپیہ رکھنا یہ ہماری شروع سے پالیسی رہی ہے۔ اور پچھلے سالوں میں یہ رقم پندرہ کروڑ سے بھی اوپر پہنچتی رہی ہے۔ جسے ہم کئی شہروں میں بینکوں کے پاس جمع کروا چھوڑتے ہیں۔ ہم اُدھار نہیں لیتے۔ لیکن مارکیٹ میں ہم نے اپنی اتنی ساکھ ضرور بنائی ہوئی ہے کہ آج ضرورت پڑے تو ہم بڑی آسانی سے بینک سے ایک کافی بڑی رقم اُدھار پا سکتے ہیں۔ لیکن ہاتھ تلے نقد روپیہ ہونے سے اُدھار لینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ البتہ ہم اتنی حفاظت ضرور کر لیتے ہیں۔ کہ اگر کبھی بھیڑ پڑ جائے تو روپیہ کا انتظام اور خاص طور پر خلیمت کرنے کا جو ڈھنگ میں نے قائم کیا ہے وہ بیوپاریوں سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں نہ چلا جاوے۔

دھن کی ضرورت مندی کے دنوں میں دھندا بند کر کے بیٹھ رہنے سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔ لوگوں میں بیکاری بڑھ جاتی ہے۔ مشینیں بیکار پڑی رہتی ہیں۔ اور مال تیار نہ ہونے کی وجہ سے قیمتیں اوپر چڑھ جاتی ہیں۔ اُس کی وجہ سے آگے ہونے والی بکری پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہ جھنجھٹ ہمیں بھی کرنی پڑتی تھی۔ ہم سردیوں میں کاریں بنا بنا کر سٹاک نہیں کر سکتے تھے جبکہ بکری بہار اور گرمیوں کے موسم سے کم ہوا کرتی تھی۔ اکٹھی پانچ لاکھ کاریں بنا کر آدمی کہاں رکھے اور کیسے؟ اور کیسے باہر روانہ کی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ کسی شخص کے پاس اتنا سٹاک رکھنے کے لئے روپیہ فالتو پڑا ہے!

کامگاروں کے لئے فصلی کام مصیبت ہے۔ اچھا کاریگر سال بھر میں صرف کچھ عرصہ کے لئے کام کرنے کو کبھی راضی نہیں ہوگا۔ سال میں لگاتار بارہ مہینے کام کرنے سے کاریگروں کی لیاقت بڑھتی ہے۔ مال کے بنانے کا دھندا اپنے پاؤں کھڑا ہوتا ہے۔ اور مال کی کوالٹی آج سے کل اور کل سے پرسوں بہتر ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ لگاتار کام ملنے سے سب کاریگر اپنے اپنے

کام کے اُستاد ہوتے چلے جاتے ہیں۔

فیکٹری کمپنی اور سوداگران تینوں میں سے ہر ایک تب ہی دھندے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ جبکہ سال میں بارہ مہینے برابر تینوں میں سے ہر ایک اپنا کام بدستور کرتا رہے۔ یعنی فیکٹری کاریں بناتی رہے۔ کمپنی بیچتی رہے۔ اور سوداگر خریدتا رہے اگر پرچون کے دوکانداروں کو سال بھر میں صرف تیزی کے دنوں میں کاریں خریدنے کی نسبت بارھوں مہینے خریدتے رہنے میں زیادہ فائدہ رہتا ہے۔ جتنی دیر میں دوکانداروں کی سمجھ میں یہ بات آئیگی اتنا عرصہ آگے کو زیادہ کام ہو جانے کی اُمید میں کارخانہ والوں کو دھڑا دھڑ مال بنانا اور سوداگروں کو خریدنا شروع کر دینا چاہیئے۔

آٹوموبائل کے بیوپار میں سب سے اوّل ہم نے اس سوال کو حل کیا۔ فورڈ کاروں کو بیچنا بیوپاری معاملہ ہے جس زمانہ میں ہر کار آرڈر ملنے کے بعد بنائی جاتی تھی۔ اور ایک مہینے میں پچاس کاریں بنا لینا بڑی بہادری خیال کی جاتی تھی۔ اُس وقت یہ حالت ٹھیک تھی کہ آرڈر مل گیا۔ تو بکری ہونے کی صورت نکل آئی۔ کارخانہ دار جب تک آرڈر نہ ملے۔ مال تیار نہ کرتا تھا۔

مگر ہم نے بہت جلدی دیکھ لیا کہ آرڈروں کے انتظار میں رہ کر ہمارا گزارہ ہونا مشکل ہے۔ مارچ سے لے کر اگست کے مہینے تک جتنے آرڈر ہم کو ملتے تھے۔ اُن کے بنانے کے لئے جتنی بڑی فیکٹری چاہیئے اُتنی اگر چاہتے بھی تو بھی نہیں بنا سکتے تھے۔ اس لئے ہم کئی سالوں سے لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہماری فورڈ کار صرف یہی فائدہ نہیں کہ گرمیوں میں اس پر بیٹھ کر ہوا خوری یا تفریح کر لی جائے۔ بلکہ روٹی کپڑے کی طرح آدمی کو اس کی بھی سارا سال ہی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے دوکانداروں کو یہ سکھا رہے ہیں کہ اگر وہ سردیوں میں اتنی کاریں نہیں بیچ سکتے جتنی کہ گرمیوں میں۔ تو بھی اگر وہ سردیوں میں سٹاک کر لیں گے۔ تو گرمیوں میں حاضر مال فوراً سپلائی کر دینے کی وجہ سے ان کو بہت فائدہ رہے گا۔ یہ ہماری دونوں چالیں بڑی

کامیاب رہیں۔ دیش کے بہت سارے حصّوں میں کاریں سردیوں میں بھی اب لگ بھگ
اُتنی ہی استعمال ہونے لگی ہیں جتنی کہ گرمیوں میں۔ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ ہماری کاریں
برف پالا اور کیچڑ غرضیکہ ہر حالت میں اور ہر جگہ چل سکتی ہیں۔ اس لئے اب پچھلے کئی سالوں سے
ہماری سردیوں میں بکری برابر بڑھ رہی ہے۔ اور ہمارے سوداگروں پر جو تیزی کے دنوں میں
یک دم زیادہ آرڈر آجانے کی وجہ سے بوجھ سا پڑ جایا کرتا تھا۔ وہ بہت سارا جاتا رہا ہے۔
ہمارے سوداگر اب یہ سمجھ گئے ہیں کہ سیزن میں جتنی کاریں بکنے کی اُمید ہے اُنہیں پہلے سے
خرید کر سٹاک کر لینے میں ہمیشہ فائدہ رہے گا۔ اس لئے ہماری فیکٹری پر مارکیٹ کی تیزی یا
مندی کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ پچھلے تھوڑے سالوں تک سوائے ان دنوں کے جبکہ ہمارا سالانہ
سٹاک شمار کرنے کی وجہ سے ہمیں کام بند کرنا پڑا ہو۔ ہمارے "تیار مال کی تعداد برابر ایک
جیسی ہوتی رہی ہے۔ صرف ایک بار جبکہ مارکیٹ بالکل ہی ٹھنڈا پڑا تھا۔ ہمارے تیار مال
کی تعداد میں رکاوٹ پڑی تھی۔ جو جان بوجھ کر اس لئے ڈالی گئی تھی۔ کیونکہ مارکیٹ کی نئی حالت
کے مطابق چلنے کے لئے کارخانہ کے نظام میں ہمیں کچھ تبدیلیاں کرنا لازمی تھا۔

متواتر تیار مال کر کے لگاتار ایک جیسا روپیہ کی آمد و خرچ کا سلسلہ باندھنے کے
واسطے ہمارے لئے یہ ضروری تھا کہ ایک خاص عرصہ میں اپنے ہر محکمہ سے جتنا کام لینا ہے
اُس کی تعداد کو بڑا سوچ سمجھ کر مقرر کر لیں۔ چنانچہ ہر مہینے کارخانہ کے اندر جتنا مال کرنا ہوتا ہے
اُس کی تعداد کا پورا اندازہ بنانے والے محکموں کے افسر بکری کے محکمہ کے لوگوں کے ساتھ
مل کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔ تاکہ جتنی کاروں کے آرڈر ہاتھ میں ہیں۔ وہ سٹاک سے سپلائی ہو سکیں
پہلے پہل جب ہم کاروں کو پورا جوڑ کر اپنے ہاں سے روانہ کیا کرتے تھے۔ ہمارے لئے یہ
سوال نہایت ضروری ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ ہمارے پاس پوری کاروں کو سٹاک کرنے کے لئے
کوئی جگہ نہ تھی۔ اب ہم کاروں کے صرف حصّے ہی الگ الگ روانہ کرتے ہیں۔ اور صرف
اتنی کاریں جوڑتے ہیں جتنی ڈیٹرائٹ کے علاقہ میں کھپ جاویں۔ لیکن تو بھی پہلے سے
حساب لگا کر رکھنا سخت ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر تیار مال اور آرڈروں کی رفتار لگ بھگ

برابر نہ ہو۔ تو یا تو کاروں کے حصّے بن کر اتنے ہمارے پاس جمع ہو جاویں گے۔ کہ ناک میں دم آ جاوے گا۔ یا آرڈر بے شمار اکٹھے ہو جاویں گے۔ جب ایک دن میں چار ہزار کاروں کے حصّے کارخانہ میں تیار ہو رہے ہوں۔ اور ذراسی لاپرواہی کرنے کی وجہ سے آرڈروں کے شمار میں چوک کر زیادہ اندازہ لگ جاوے۔ تو لاکھوں روپے کا مال بن کر جمع ہو جاوے گا۔ اسی لئے تمام محکموں کے کام کا اندازہ بڑی ہوشیاری سے لگانا چاہیئے۔

چونکہ ہم بہت تھوڑا منافع رکھ کر کام کرتے ہیں۔ اس لئے۔ اپنا پورا منافع حاصل کرنے کے لئے یہ نہایت لازمی ہے کہ مال تیزی سے بنے اور جلدی جلدی بکتا جاوے۔ ہم کاریں بیچنے کے لئے بناتے ہیں۔ نہ کہ سٹاک کرنے کے لئے۔ اگر ایک ماہ میں جو ہم مال تیار کرتے ہیں نہ بکے تو اتنی بھاری رقم بن جائے جس کا سود ہی بہت ہو۔ ہم ایک سال پہلے اپنے تیار مال کا نقشہ تیار کر چھوڑتے ہیں اور سال کے ہر ماہ میں جتنی کاریں بنانی ہوتی ہیں ان کی تعداد مقرر کر لیتے ہیں۔ کیونکہ باہر سے جو کچّے مسالے اور دوسری چیزیں منگوانی ہوتی ہیں اُن کو تیار مال کے اندازہ کے مطابق وقت پر موجود رکھنے کے لئے پہلے سے بڑے انتظام کرنے کی ضرورت ہے جس طرح ہم پوری تیار کی ہوئی کاروں کو سٹاک کر کے نہیں رکھ سکتے۔ اسی طرح کچے مسالوں کا بھی ضرورت سے زیادہ سٹاک جمع رکھنے کی ہم میں طاقت نہیں۔ جو چیز آتی رہے جھٹ پٹ کام میں خرچ ہوتی رہے۔ اور جو مال بنے فوراً نکلتا رہے تب ہی ٹھیک ہے۔ اس اصول پر چلنے سے ہی ہم کئی دفعہ بال بال بچ گئے۔ چند سال ہوئے ڈائمنڈ مینوفیکچرنگ کمپنی کا کارخانہ جل گیا۔ وہ ہمارے لئے ریڈی ایٹر والے حصّہ اور پیتل کے حصّے یعنی ٹکیاں اور کاسٹنگ تیار کیا کرتے تھے سو ہمارے لئے ضروری تھا کہ ہم فوراً یا تو کوئی اور انتظام کریں یا کافی گھاٹا سہیں۔ ہم نے سب محکموں کے افسروں۔ سانچے بنانے والوں اور ڈرافٹ مینوں (نقشے بنانے والوں) کو اکٹھا کیا۔ وہ سب لگاتار ایک دم چوبیس گھنٹے سے لے کر اڑتالیس گھنٹے تک کام کرتے رہے۔ انہوں نے نئے سانچے تیار کر لئے ڈائمنڈ کمپنی نے ایک اور فیکٹری ٹھیکہ پر لے لی۔ اور بذریعہ تار کچھ نئی مشینیں منگوا لیں۔ باقی جو اور سامان درکار تھا وہ ہم نے اپنے پاس سے سپلائی کر دیا۔ بس بیس دن کے اندر پھر یہ سب

مال تیار ہو کر باہر جانے لگا۔ سات آٹھ دن کا سٹاک پہلے ہمارے پاس موجود تھا۔ لیکن اس آگ کے لگ جانے سے دس پندرہ دن تک ہم کاروں کو باہر روانہ نہ کر سکے۔ اگر ہمارے پاس یہ سٹاک بھی نہ ہوتا۔ تو بیس دن کے لیئے ہمارا کام بالکل بند ہو جاتا اور خرچ سر پر ویسے کو ویسے برابر سر پر پڑتے رہتے۔

ہم ایک بار پھر دوہراتے ہیں۔ کہ روپیہ لگانے کا اصلی ٹھکانا اپنی دوکان یا فیکٹری ہے۔ اس اصول نے ہمیں آج تک کبھی دھوکا نہیں دیا۔ اور ایک دفعہ جبکہ ہمارا ہاتھ سخت تنگ تھا اور ہم سوچتے تھے کہ روپیہ کہاں سے آئے گا۔ ہماری فیکٹری نے پختہ طور سے یہ ثابت کر کے دکھلا دیا کہ روپیہ حاصل کرنے کے واسطے انتظام کہیں باہر سے کرنے کی بجائے اپنے کارخانہ میں ہی ہزار درجہ بہتر ہو سکتا ہے۔

بیان بان

روپیہ۔ کیا ہمارا افسر ہے یا غلام

ماہ دسمبر سنہ ۱۹۲۰ء میں سارے دیش میں کاروبار۔ گھڑیاں پل۔ گن رہا تھا۔ آٹوموبائیل کے جتنے نئے کارخانے کھلے تھے اُس سے زیادہ بند ہو گئے تھے۔ اور بند ہونے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد پورے طور سے مہاجنوں کے قبضہ میں آ گئی تھی۔ لگ بھگ ہر کارخانہ و کمپنی کی نسبت یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ ان کے پاس روپیہ پیسہ ختم ہو رہا ہے۔ اور مجھے اس قسم کی افواہیں سننے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ کہ نہ صرف فورڈ موٹر کمپنی کو روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔ بلکہ ان کو مانگنے پر بھی کہیں سے نہیں مل رہا۔ اپنی کمپنی کے متعلق طرح طرح کی افواہیں سننے کا میں شروع سے عادی ہو چکا ہوں یہاں تک کہ اب میں کسی افواہ کو سن کر تردید کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ لیکن تماشہ کی بات یہ تھی کہ یہ سب افواہیں ایک دوسرے کو کاٹنے والی ہوتی تھیں۔ اور سب اتنی ٹھیک اور نپی تلی ہوتی تھیں کہ کمال ہے! میں نے ایک افواہ یہ سُنی کہ اب میں اُدھار لینے کے برخلاف نہیں رہا۔ اور جلد ہی وال سٹریٹ کے کسی بینک سے روپیہ قرض لینے والا ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی مشہور ہو گیا کہ کوئی مجھے روپیہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے میرا دیوالہ نکلنے والا ہے اور ہماری کمپنی ٹوٹ جائے گی۔

یہ سچ ہے کہ ہمارا ہاتھ سخت تنگ تھا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں ہمیں فورڈ موٹر کمپنی کے سٹاک کو خریدنے کے لئے کاغذ لکھ کر ۷۰۰۰۰۰۰۰ روپیہ قرض لینا پڑا تھا۔ اس میں سے ابھی ۹۹۰۰۰۰۰۰ روپیہ اُتارنا باقی رہتا تھا۔ ادھر گورنمنٹ کو ۸۴۰۰۰۰۰۰ روپیہ انکم ٹیکس ادا کرنا تھا۔ اور ہر سال کی طرح ہم اپنے

ملازموں کو 2100000 روپیہ بونس دینا چاہتے تھے۔ گویا یکم جنوری سے اٹھارہ ۱۸ اپریل سنہ ۱۹۲۱ء
کے درمیان ہمارے سر پر 17400000 روپیہ کی ادائیگی کرنے کا بھار ہو گیا تھا۔ ہمارے پاس
بینکوں میں کل 6000000 روپیہ تھے۔ ہمارا کچا چٹھا کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا اور سب کو
یہی یقین تھا کہ بقایا 11400000 روپیہ اُدھار لئے بغیر ہمارا گزارہ نہیں۔ کیونکہ یہ کافی بڑی
رقم ہے۔ وال سٹریٹ کے کسی بینک کی مدد کے بغیر اتنی بڑی رقم اتنی آسانی اور جلدی سے
اور بھلا کہاں سے حاصل ہو سکتی تھی۔ لیکن ہمارے پاس روپے کا پورا انتظام تھا۔ دو سال پہلے ہم
1500000 روپیہ قرض لے چکے تھے۔ اور کیونکہ نہ ہماری کوئی جائداد گروی تھی نہ ہمارے سر پر
کوئی بیوپار کا قرض تھا۔ ہر کوئی ہمیں ایک بڑی موٹی رقم اُدھار دینے کے لئے فوراً تیار ہو جاتا۔ بلکہ
سچ پوچھو تو ایک بینک کے لئے یہ بڑے منافع کا سودا تھا۔

مگر میں نے یہ دیکھا کہ ہمارے دشمن یہ مشہور کر رہے ہیں کہ کیونکہ ہماری کمپنی فیل ہونے والی
ہے۔ اس لئے انہیں روپیہ کی سخت ضرورت ہو رہی ہے۔ تب مجھے شک ہوا۔ کہ گویا افواہیں خبروں
کی شکل میں دیش کے ہر کونے کے اخباروں میں نکل رہی ہیں۔ لیکن یہ نکلتی سب ایک ہی جگہ سے ہیں۔
جب ہمیں یہ پتہ چلا کہ [illegible] میں ایک خوب موٹا مالدار ایڈیٹر ہے جو ہماری بری مالی حالت
کی نسبت خبریں لکھ لکھ کر باہر بھیج رہا ہے۔ تو میرا یہ یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ اس لئے میں نے
سوچ لیا کہ میں کسی افواہ کو دنیا کے آگے جھوٹ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ چنانچہ ہم نے
فیصلہ کر لیا کہ قرضہ لئے بغیر ہم نے کس طرح سے روپیہ کا انتظام کرنا ہے۔

اس بات کو میں اپنے پورے زور کے ساتھ کہتا ہوں۔ کہ روپیہ اُدھار پر لینے کا سب سے
نامناسب موقع وہ ہے۔ جب کہ مہاجن لوگوں کو یہ خیال ہو کہ اس وقت تمہیں روپیہ کی سخت ضرورت
ہے۔ میں پچھلے بیان میں اپنی دھن کی پالیسی کھول کر بتا آیا ہوں۔ ہم نے ایسی پالیسی پر عمل کیا۔ ہم نے
اپنے کاروبار کے اندر کی تمام خرابیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جڑ سے اکھاڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

آؤ دیکھیں اُس وقت دیش میں بیوپار کی کیا حالت تھی۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے پہلے چند مہینوں میں ایسے
آثار نظر آنے لگ گئے تھے۔ جس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ جنگ کی وجہ سے جو سٹہ بازی کا بازار خوب گرم

ہو رہا تھا اب ماند پڑنے کو ہے۔ چند ایک کارخانے جو جنگ کی وجہ سے جاری ہوئے تھے اور جن کی حقیقت میں کچھ ضرورت نہ تھی بند ہو چکے تھے۔ لوگوں نے خرید نا کم کر دیا تھا۔ ابھی تک تو ہماری بکری بالکل ٹھیک ہو رہی تھی لیکن ہمیں پتہ تھا کہ آج کل میں ضرور کم ہونے والی ہے۔ میری بڑی خواہش ہو رہی تھی کہ اپنی قیمتیں گھٹا دوں لیکن مال بنوائی کی لاگتیں ہر جگہ چڑھ رہی تھیں۔ مزدور لوگ تنخواہیں جتنی بڑی پا رہے تھے اُتنا کام کر کے نہ دیتے تھے۔ کچے مسالوں کے سپلائی کرنے والوں کے دماغ آسمان پر پہونچے ہوئے تھے۔ سامنے آندھی اُٹھتی ہوئی دیکھ کر بھی کوئی خبردار نہیں ہوا۔

ماہ جون میں ہماری بکری پر اثر پڑنا شروع ہو گیا۔ اور ماہ ستمبر تک ہر مہینے ہماری بکری کم ہوتی چلی گئی۔ لوگوں کے ہاتھ اپنا مال بیچنے کے لئے جتنی ان کے اندر ہمت تھی اس کے مطابق قیمتیں کچھ کم کرنا ہمارے لئے لازمی تھا۔ اور نہ صرف یہ۔ بلکہ ہم کوئی ایسی دھڑکے دار حرکت کرنی چاہتے تھے۔ جس سے لوگوں کو یہ پتہ چلے کہ ہماری جڑیں پکی ہیں اور ہم محض دکھاوا نہیں کر رہے چنانچہ ہم نے ماہ ستمبر میں اپنی ٹورنگ (سفری) کار کی قیمت 1725 روپیہ سے گھٹا کر 1320 روپے مقرر کر دی۔ اس کار کے بنانے میں جو لاگت آ رہی تھی اُس سے یہ دام بہت کم تھے۔ کیونکہ جس سامان سے یہ کاریں تیار ہو رہی تھیں وہ ہمارے پاس پہلے سٹاک میں موجود تھا جو ہمارے پاس اس وقت کا خریدا ہوا تھا۔ جب ہر چیز کے بھاؤ بڑھے چڑھے ہوئے تھے قیمت کی اس کمی سے مارکیٹ میں کافی ہلچل مچ گئی۔ ہم پر خوب نکتہ چینی ہونے لگی۔ کوئی کہتا مارکیٹ میں گڑبڑ ڈالنے والے ہم ہی ہیں۔ بالکل ٹھیک یہی ہم چاہتے تھے۔ ہمارا فرض تھا۔ کہ یہ جو قیمتیں یوں ہی چڑھی ہوئی ہیں۔ ان کو اپنی ٹھیک نارمل حالت کی جگہ پر لانے کی کوشش کریں اور یہی ہم نے کیا۔ میرا تو یہ پکا یقین ہے کہ اگر کارخانے والے اور سوداگر وقت پر مناسب قیمتیں ایک دم جھٹکے کے ساتھ گرا دیا کریں۔ اور اچھی طرح سے دیکھ بھال کر کے اپنے فضول کے خرچ اُڑاتے جایا کریں۔ تو بیوپار میں مندی کے اتنے لمبے عرصے کبھی آیا ہی نہ کریں بہتر قیمتیں وصول کرنے کی بیکار اُمید میں بیٹھے رہنے سے ہی یہ گڑبڑ پیدا ہوا کرتی ہے۔ جتنی بہتر قیمتیں پانے کی اُمید لگائی ہوتی ہے۔ اُتنی آج تک کسی کو نہیں ملیں۔ اور اگر بیوپار والے موجودہ حالت میں جتنا نقصان

پڑ رہا ہے۔ اُس کو فوراً برداشت کرلیں تو اس سے نہ صرف دیش کے کارخانہ داروں اور سوداگروں
کو برابر کام چلتے رہنے سے خوب فائدہ رہتا بلکہ لوگوں کے اندر عام بیکاری اتنے عرصہ کے لئے نہ پھیلتی
اونچی قیمتیں پانے کی چھوٹی اُمید میں پڑ کر نقصان ڈبل ہونے لگا۔ کیونکہ جو یہ لالچ کر رہے تھے۔ انہیں
جو مال سٹاک جمع کیا ہوا تھا۔ اُس پر سود دینا پڑا۔ اور جو سوچ سمجھ کر چلنے سے تھوڑا بہت منافع کماتے
وہ بھی ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔ بیکاری بڑھ جانے کے سبب تنخواہیں کم بٹنے لگیں۔ اور اس طرح سے خریدار اور
بیچنے والا ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ تب گھبراہٹ کے مارے یہ صلاحیں ہونے لگیں
کہ اگر ممکن ہو سکے تو کیوں نہ یورپ کو اُدھار پر یہ سارا مال بیچ دینے کا انتظام کیا جائے مطلب تھا کہ اس طرح سے
اُلو بنا کر یورپ والوں کے گلے یہ اونچی قیمت کا سٹاک مڑھ دیا جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تجویز اس
بھدی شکل میں پیش نہیں کی گئی تھیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ بہت سے لوگوں کا سچے دل سے یہ خیال
تھا کہ اگر اصل یا سود کی رقم گھر میں آنے کی اُمید نہ بھی ہو تو بھی یورپ کو کافی اُدھار دینے سے امریکہ
کے بیوپار کو اخیر میں کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور رہے گا۔ یہ درست ہے۔ کہ اگر اتنا مال اُدھار دے کر امریکہ کے
بینک رکھ لیتے۔ تو ان اونچی قیمتوں کے سٹاک رکھنے والے تھوڑا سا منافع کھا کر ان مالوں سے اپنا پیچھا
چھڑا سکتے تھے۔ لیکن تب یہ سٹاک بینکوں کے ہاتھ دمڑی کا رہ جاتا۔ اور بینک بالکل تباہ ہو جاتے
یہ ٹھیک ہے کہ آخری دم تک منافع ہونے کی اُمید رکھنی چاہئے۔ لیکن اسے سچا بیوپار نہیں کہتے۔

قیمتیں گھٹانے سے ہماری بکری بڑھ گئی لیکن تھوڑے عرصہ بعد پھر کم ہونے لگی جتنی
لوگوں کے اندر خریدنے کی طاقت تھی۔ اس سے اب بھی ہماری قیمتیں کچھ اونچی تھیں۔ پر جون کی
قیمتیں ابھی تک جتنی گھٹ سکتی تھیں اتنی کم نہ ہوئی تھیں۔ لوگوں کو کسی قیمت پر بھی یقین نہ آتا تھا۔
ہم نے اپنی قیمتوں میں ایک بار اور کمی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنے تیار مال کی تعداد ہر ماہ ایک لاکھ
کاروں کے لگ بھگ مقرر کر دی۔ گو ہماری بکری کے مطابق اتنا تیار مال درکار نہ تھا۔ لیکن ہم
چاہتے تھے کہ کارخانہ بند کرنے سے پہلے ہم اپنے کچے مسالوں سے جتنی کاریں تیار کر سکتے ہوں بنا کر رکھ
لیں۔ ہم جانتے تھے کہ سٹاک کی فہرست بنانے اور اندر کا کوڑا کرکٹ صاف کرنے کے لئے ہمیں ایک
نہ ایک دن کارخانہ ضرور بند کرنا پڑے گا۔ ہمارا ارادہ یہ تھا۔ کہ جب دوبارہ کام چالو کریں تو قیمتیں کم

اور بھی زیادہ گرا کر شروع کریں۔ اور مانگ پوری کرنے کے لئے کاروں کا سٹاک کافی ہاتھ میں رکھیں
تب سستے داموں پر تازہ کچے مسالے خرید کر نئی کاریں بنائی جاویں۔ ہم نے سستے داموں پر کچے
مسالے حاصل کرنے کی ٹھان لی تھی۔

دو ہفتہ کے بعد پھر کھولنے کے ارادہ سے ہم نے کارخانہ ماہ دسمبر میں بند کر دیا۔ لیکن کام کرنے
کا اتنا ہوگیا۔ کہ چھ ہفتے۔ کھولنے میں لگ گئے۔ جوں ہی ہمارا کارخانہ بند ہوا۔ ہماری مالی حالت کی نسبت
افواہیں اور بھی زور سے پھیلنے لگیں۔ میں جانتا ہوں۔ کہ بہتوں کو یہ امید تھی۔ کہ ہمیں روپیہ قرض لینا پڑے گا
کیونکہ اگر روپیہ اُدھار لیا۔ تو ہمیں دوسرے کی سب شرطیں ماننے پڑیں گی۔ مگر ہم نے روپیہ مانگا نہیں
ہمیں روپیہ کی ضرورت نہ تھی۔ ہمیں ایک جگہ سے روپیہ ملتا بھی تھا۔ میرے پاس نیویارک کے ایک
بینک کا آدمی پہونچا۔ اور اُس نے میرے سامنے روپیہ کی ایک کافی بڑی رقم قرض پر لینے کی تجویز رکھی
جس میں ایک شرط یہ تھی کہ بینک والوں کا ایک آدمی ہمکو اپنے ہاں رکھنا پڑے گا۔ جو ہماری کمپنی کا
بطور خزانچی کام کرے گا۔ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں اِن لوگوں کی نیت بالکل صاف تھی۔ مگر ہمیں
روپیہ اُدھار لینے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اتفاق سے اس وقت ہمارے پاس کوئی خزانچی نہ تھا
صرف اس حد تک ان بینک والوں نے ہماری مالی حالت کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگا لیا تھا۔ میں
نے اپنے لڑکے ایڈسیل کو کمپنی کا خزانچی اور پریزیڈنٹ دونوں بننے کو کہا اس طرح پر ہمیں ایک خزانچی
مل گیا لیکن کیونکہ اصل میں کچھ بات تھی ہی نہیں۔ اس لئے بینک والے ہماری کیا مدد کر سکتے تھے۔

اب ہم نے اپنے کارخانہ کے اندر کی صفائی کرنی شروع کی۔ جنگ کے دنوں میں ہمیں
جنگ کے لئے بہت طرح کی چیزیں تیار کرنی پڑی تھیں۔ اور ہمیں مجبور ہو کر صرف ایک مال کے
بنانے کا اپنا اصول ترک کرنا پڑا تھا۔ اس وجہ سے ہمیں کئی نئے محکمے قائم کرنے پڑے تھے۔ دفتر
میں کلرک بڑھ گئے۔ کئی جگہوں پر ایک ساتھ مال تیار کروانے کی وجہ سے سامان ضائع زیادہ ہونے
لگا۔ جنگ کا کام تُرت پھُرت کا کام ہے اور اس میں مال ضائع بہت ہوتا ہے۔ ہم ہر شے کو جو
کاریں بنانے کے کام میں استعمال نہیں کی جا سکتی تھی۔ ردّی مان کر پرے پھینک رہے تھے۔
جن رقموں کو ہم نے فوراً ادا کرنا تھا۔ اُس میں اپنے ملازموں کو ۲۱۰۰۰۰۰ روپیہ بونس کی

صرف ایک رقم ایسی تھی جو ہم نے اپنی خوشی سے اپنے نام ڈالی ہوئی تھی۔ کوئی ہمیں اس کے دینے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا تھا لیکن ہم یہ رقم پہلی جنوری کو ادا کر دینا چاہتے تھے۔ ہم نے یہ اپنے ہاتھ میں جو نقد روپیہ تھا۔ اس میں سے ادا کر دیا۔

سارے دیش میں ہماری کل پینتیس برانچیں ہیں۔ یہ سب کاروں کے حصّوں کو جوڑنے والے کارخانے ہیں لیکن ان میں سے بائیس برانچوں میں یہ حصّے بنتے بھی ہیں۔ انہوں نے حصے بنانا بند کر دیا تھا۔ مگر کاروں کے جوڑنے کا کام بدستور ہوتا تھا۔ اپنا بڑا کارخانہ بند کرتے وقت ہمارے پاس ڈیٹرائیٹ میں کاروں کا سٹاک صفر کے برابر تھا۔ ہم سب حصّے باہر بھیج چکے تھے اور جنوری کے مہینے میں ڈیٹرائیٹ کے سوداگروں کی یہ حالت تھی کہ ان کو اپنی مانگ پوری کرنے کے لیئے کاریں خریدنے کے واسطے سچ مچ شکاگو اور کولمبس تک جانا پڑا۔ سال بھر میں ایک بیوپاری کو جتنی کاریں درکار ہوتی ہیں اُس کے حساب سے ہر ماہ کی کھپت کے مطابق برانچیں سپلائی کر رہی تھیں۔ بیوپاریوں کو مال نہ ملنے سے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ ماہ جنوری کے اخیر میں ہم نے کوئی دس ہزار آدمیوں کی اپنی ایک سبھا قائم کی جسمیں زیادہ کر کے فورمین۔ اسسٹنٹ فورمین اور اسی قسم کے اور افسران موجود تھے۔ اور اس طرح ہم نے ہائی لینڈ پارک کے کارخانہ میں مال تیار کرنے کا کام زور شور سے شروع کر دیا۔ دیش کے باہر جتنی ہماری رقمیں پھنسی ہوئی تھیں۔ ان سب کو اکٹھا کیا۔ اور اپنے ہاں جو ضمنی مال بنتے تھے اُن کو خوب بیچنا شروع کیا۔

اب ہم پوری رفتار پر چلنے کے لئے تیار تھے۔ اور آہستہ آہستہ بڑھاتے بڑھاتے اپنا مال پوری تعداد میں تیار کر کے منافع پر لگانے لگے۔ جن خرابیوں کی وجہ سے کارخانہ کے اندر مال ضائع ہوتا تھا اور جن کے سبب ہمیں قیمتیں اونچی رکھنی پڑتی تھیں اور جو سارا منافع کھا جاتی تھیں اُن کو ہم نے چن چن کر نکال پھینکا۔ جو بے کار سامان پڑا تھا ہم نے سب بیچ ڈالا۔ پہلے ہم ایک کار بنانے کے لئے پندرہ آدمی استعمال کرتے تھے۔ اب صرف نو ایک کار کو تیار کر لیتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی چھ کو ہم نے نوکری سے الگ کر دیا۔ البتہ یہ ہمارے سر پر مفت کا بار نہیں رہے ہم نے یہ اصول قائم کر دیا کہ ہر ایک آدمی یا تو ہمیں کچھ کما کر دے۔ ورنہ کارخانہ سے باہر ہو جائے

دفتر کا سٹاف ہم نے آدھا کر دیا۔ اور دفتر میں کام کرنے والوں کو ہم نے کارخانہ کے دوسرے محکموں میں بہتر کام پیش کئے۔ بہتوں نے یہ مان لیا اور نئے کام پر آ گئے۔ دفتر میں جو خالی آرڈر بنا کرتے تھے اور فضول کھتونیاں وغیرہ تیار کرنے کا کام جن سے ایک کار کی تیاری میں کچھ خاص فائدہ نہ تھا یہ سب ہم نے اڑا دئے۔ ابھی تک ان مال کی کھتونیوں کے ڈھیر کے ڈھیر ہمارے ہاں تیار ہوا کرتے تھے کیونکہ انہیں پڑھ کر مزہ آتا تھا۔ لیکن ان سے کاریں تھوڑے ہی تیار ہو سکتی ہیں! اس لئے ہم نے انہیں ختم کر دیا۔

ہم نے اپنے ٹیلیفونوں کی تعداد ساٹھ فی سیکڑہ گھٹا دی۔ ہر کسی کام یا کمپنی میں بہت تھوڑے آدمیوں کے لئے ٹیلیفون کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ پہلے ہر پانچ آدمیوں کے اوپر ایک فورمین ہوا کرتا تھا۔ اب ہم بیس پر ایک فورمین مقرر کرتے ہیں۔ باقی فورمین مشینوں پر کام کرتے ہیں۔

ہم اوپر خرچ گھٹاتے گھٹاتے ۱۴۸ روپیہ فی کار سے ۷۹ روپے پر لے آئے۔ اور جہاں ایک دن میں چار ہزار کاریں سے زیادہ تیار ہوتی ہوں۔ وہاں اس سے کتنا فرق جا پڑے گا۔ اس کا اندازہ لگا کر ہی آدمی سمجھ سکتا ہے کہ صرف فیس یا تنخواہیں کم کرنے سے نہیں بلکہ اندر کی خرابیاں اور پھوٹ دور کرنے سے ایک کارخانہ اپنے مال کی قیمتیں اتنی تھوڑی مقرر کر کے بھی منافع پر چل سکتا ہے جس کو عام طور پر "ناممکن" مانا جاتا ہے۔

لیکن سب سے بڑی بات ہم نے یہ پائی کہ مال تیزی سے بنا کر اور بیچ کر کاروبار تھوڑے سے روپے سے چلایا جا سکتا ہے۔ اور اپنی تیار مال کی تعداد بڑھانے میں ہمیں سب سے زیادہ فائدہ ڈیٹرائیٹ ٹولیڈو اینڈ آئرن ٹن ریل روڈ خرید لینے سے ہوا۔ ان ریل روڈ سے ہمیں بہت زیادہ بچت ہوئی۔ میں نے اس روڈ کی نسبت پورا الگ علیحدہ بیان اس کتاب میں لکھا ہے۔

تھوڑے سے تجربے کے بعد ہم نے دیکھ لیا کہ ہم اپنا باربرداری کا نظام اتنا اچھا مزے سے کر سکتے ہیں جس سے ہم ایک کار مکمل تیار کر کے بائیس کی بجائے چودہ دنوں میں ہی پیدا کریں گے۔ مطلب یہ کہ جتنا لگے وقت لگتا تھا اس سے تینتیس فی سیکڑہ کم عرصہ کے اندر اب کچے مسالے خرید کر انہیں بنا کر۔ اور کار پوری تیار کر کے سوداگر کی دوکان پر پہنچائی جا سکتی ہے۔ ہمیں لگاتار بغیر کسی دن

کام بند کیئے پوری تعداد میں مال تیار کرنے کے لئے لگ بھگ 180000000 روپے کے کچے مسالے ہمیشہ منگوا کر رکھنے پڑتے تھے مگر ایک تہائی وقت کم کر دینے سے اس رقم میں سے 00000000 کا روپے ہمارے بچا رہا۔ یا یوں کہو کہ اس طرح سال بھر میں سود کی 3600000 روپے کی رقم ہمیں بچ گئی۔ تیار مال کی کھتونی کی میزان پر ہمیں لگ بھگ 24000000 روپیہ اور بچ گیا۔ یعنی اپنی پونجی میں سے 84000000 روپیہ ہاتھ میں رہا اور اس پر سود جو بچا وہ الگ رہا۔

ہماری پاس پہلی جنوری کو 60000000 روپیہ تھا۔ یکم اپریل کو یہ رقم 261900000 روپے ہو گئی۔ یعنی جتنا ہمیں کل قرضہ اُتارنے کے لئے چاہیئے تھا۔ اُس سے 81900000 روپیہ زیادہ۔ یہ ہے اپنے کاروبار کے اندر خرابیوں کو کھوج کر نکال دینے کا فائدہ! یہ میزان ان رقموں سے بنی تھی :-

ہاتھ میں نقد۔ ماہ جنوری	60000000 روپیہ
یکم جنوری سے یکم اپریل تک سٹاک کو بیچ کر	74100000 "
مال کو جلد باہر روانہ کر کے	84000000 "
باہر دیشوں کے ایجنٹوں سے روپیہ اکٹھا کیا	9000000 "
ضمنی مال کو بیچکر	11100000 "
لبرٹی بونڈ بیچکر	23700000 "
جوڑ	261900000 "

میں یہ سب باتیں اپنی بہادری جتلانے کے خیال سے نہیں لکھ رہا۔ میں صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اُدھار لینے کی نسبت روپیہ پیدا کرنے کے لیئے کاروبار کے اندر سے ہی سبیلیں ڈھونڈ کر نکالی جا سکتی ہیں اور روپیہ اُدھار لینے کی وجہ سے ہم کو بینک والوں کی اس وقت جتنی خوشامد اور دھونس سہنی پڑ رہی ہے۔ اُتنی حقیقت میں ضرورت نہیں۔

ہمیں 150000000 روپیہ اُدھار مل سکتے تھے۔ اور اگر چاہتے تو اس سے بھی زیادہ اچھا! فرض

کرو. ہم اُدھار لے لیتے پھر کیا ہوتا؟ کیا ہمارے اندر اپنا کاروبار بہتر چلانے کی طاقت آجاتی؟ یا اور سُست ہوجاتی؟ اگر ہم نے اُدھار لیا ہوتا تو ہمیں اپنا مال سستی لاگت پر تیار کرنے کے لئے نئے نئے راستے ڈھونڈنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اگر ہمیں ۶ فی صدی سود پر روپیہ اُدھار مل جاتا تو جو بھاری رقم ہم کو دلّالوں وغیرہ کو کمیشن اور دوسرے خرچوں کی شکل میں ادا کرنی پڑتی۔ اس کے علاوہ ہمیں سال بھر میں پانچ لاکھ کاریں بنانے پر صرف سود کا ہی فی کار بارہ روپیہ کے حساب سے بھرنا پڑتا۔ ایک طرف تو ہمیں مال بہتر بنانے کی بھی عقل نہ آتی کیونکہ ہم اُدھر توجہ ہی نہ کرتے۔ اور دوسری طرف سر پر قرضہ کی بھاری رقم بڑھتی چلی جاتی۔ تب آج کی نسبت ہمیں اپنی کار کی قیمت تقریباً تین سو روپیہ زیادہ مقرر کرنی پڑتی جس سے ہمارے تیار مال کی تعداد لازمی طور پر گھٹ جاتی کیونکہ پھر اتنے خریدار کبھی نہ ملتے! اور نتیجہ یہ ہوتا کہ کارخانہ میں صرف آدمی رکھ کر کام کیا کرتے غرضکہ جتنی خدمت ہم سے سوسائٹی کی ہوسکتی ہے اتنی کبھی نہ کر پاتے۔ لطف یہ ہے۔ اور خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ تمام بینک والے ہمارے کاروبار کی خرابیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کے واسطے ہمیں صرف روپیہ اُدھار لینے پر زور دیتے تھے۔ مگر کسی نے ہمیں یہ کبھی مشورہ نہیں دیا کہ فلاں بہتر طریقے سے کام چلاکر ہمارا بھلا ہوسکتا ہے۔ یا یہ نیک صلاح دی ہو کہ ایک اور انجنیئر ملازم رکھنے سے ہمارے کام میں ترقی ہوسکتی ہے۔ اس کی بجائے اُن کے خیال میں ایک اور نیا خزانچی بھرتی کرلینا ہمارے لئے کئی درجہ فائدہ مند تھا!

بس کاروبار کے اندر بینکروں کو شریک کرلینے کا سب سے بڑا خطرہ یہی ہے۔ کہ ان لوگوں کو سوائے روپیہ کے کچھ نہیں سوجھتا۔ اُنہیں رات دن روپیہ کمانے کی فکر لگی رہتی ہے۔ وہ فیکٹری کو روپیہ پیدا کرنے کی نہ کہ مال بنانے کی مشین سمجھتے ہیں۔ اُن کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ کس طرح اس فیکٹری سے زیادہ سے زیادہ روپیہ پیدا کیا جائے۔ مال کی کوالٹی کو بہتر بنانے کی اُن کو ذرا بھی پروا نہیں ہوتی۔ اُن کے دماغ میں یہ بات کبھی نہیں آسکتی کہ کوئی کاروبار ایک جگہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ یا یہ بڑھے گا یا گرے گا۔ مگر اُن کا خیال یہ ہے کہ قیمتوں کے گھٹانے سے کاروبار میں ترقی نہیں ہوا کرتی بلکہ نقصان رہتا ہے۔

آج کل کاروبار میں بینکروں (مہاجنوں) کا جتنا ہاتھ ہے۔ وہ ضرورت سے بہت ہی زیادہ ہے۔ پرائیویٹ طور پر لگ بھگ سبھی بیوپاری اس بات کو قبول کرلیں گے۔ لیکن کھلے طور پر بہت کم کیونکہ وہ اپنے بینکروں (مہاجنوں) سے ڈرتے ہیں۔ مال تیار کر کے روپیہ پیدا کرنے کی نسبت روپیہ سے روپیہ پیدا کرنا کہیں آسان ہے۔ ایک اوسط درجہ کا کامیاب بینکر (مہاجن) اتنا عقل والا اور اپنا کام نکالنے والا نہیں ہوتا۔ جتنا کہ ایک اوسط درجہ کا کامیاب بیوپاری۔ مگر تو بھی روپیہ کے بل بوتے پر بینکر (مہاجن) اوسط درجہ کے بیوپاری کا حاکم بنا بیٹھا ہے۔

پچھلے پندرہ بیس سالوں میں خاص کر جب سے جنگ ہوئی ہے بینکروں نے ملک کے کاروبار پر اپنا پنجہ اور بھی مضبوط کر لیا ہے۔ اور فیڈرل ریزرو سسٹم کے جاری ہونے سے تو کچھ عرصہ کے لئے ان کے اختیار میں بے اندازہ روپیہ اُدھار پر دینے کی طاقت آگئی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے ذکر چکا ہوں۔ ایک بینکر اپنی تعلیم و پوزیشن (سوسائٹی میں درجہ) کی وجہ سے انڈسٹری چلانے کے واسطے بالکل ناقابل ہے۔ اس لئے اب اگر اُدھار پر روپیہ لگانے والے مہاجن لوگوں (بینکوں) کی طاقت اس قدر بڑھ گئی ہے۔ اور اُن کے ہاتھ میں اتنے اختیار آگئے ہیں۔ تو کیا یہ اس بات کی علامت نہیں کہ ہمارے "مالی سسٹم" کے اندر کہیں نہ کہیں کچھ خرابی ضرور ہے جس کی وجہ سے صنعت و حرفت (انڈسٹری) کے میدان میں پبلک کی خدمت کی بجائے روپیہ کی زیادہ عزت اور قدر ہو رہی ہے۔ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انڈسٹری کی باگ ڈور ان بینکروں کے ہاتھ میں بیوپاری لیاقت ہونے کی وجہ سے بالکل نہیں گئی۔ بلکہ ہمارے موجودہ سسٹم کی مہربانی سے یہ رتبہ اُن کو مفت میں اور زبردستی دلا دیا ہے۔ اس لئے میں خود اس تلاش میں ہوں کہ کیا واقعی ہمارا یہ مالی سسٹم ہمارے انڈسٹری کے دھندوں کے عین مناسب حال ہے یا نہیں۔

ایک بات میں فوراً یہاں پر کہہ دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ میرا جو بینکروں کے خلاف اعتراض ہے وہ ہرگز ذاتی نہیں ہے۔ یعنی میں ان لوگوں کے اس لئے برخلاف نہیں کیونکہ وہ بینکر ہیں۔ بلکہ ہمیں تو ایسے آدمیوں کی سخت ضرورت ہے جو روپیہ کے لین دین کے معاملوں میں خوب سمجھدار اور ہوشیار ہوں۔ بینکروں کے ہونے سے ہمیں اس قدر سہولتیں حاصل ہیں کہ ان کے بغیر دُنیا کے کاروبار چل نہیں سکتے

کیونکہ روپیہ لئے بغیر ہم تجارت نہیں کر سکتے۔ اور روپیہ کریڈٹ پر لئے بنا موجودہ زمانہ میں ہمارا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ ورنہ مال تیار کر کے مارکیٹ میں بیچنے کا پورا پورا فائدہ اُٹھایا نہیں جا سکتا پھر سرمایہ جمع کئے بغیر بھی کوئی بیوپار ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ مال تیار کرنے اور بنانے کیواسطے روپیہ چاہیئے مگر آیا ہمارے موجودہ بینکنگ (مہاجنی) سسٹم اور بینک سے کریڈٹ پر روپیہ لینے کے قاعدے صحیح اصولوں اور بنیادوں پر قائم کئے گئے ہیں یا نہیں یہ ایک بالکل الگ بات ہے۔

میرا یہ ہرگز منشا نہیں کہ میں خواہ مخواہ موجودہ مالی سسٹم کو ناقص ثابت کر کے دکھاؤں۔ میری حالت اُس آدمی جیسی نہیں جس کا کاروبار اس کی وجہ سے تباہ ہو گیا ہو اور اب وہ بدلہ لینے کی سوچ رہا ہو۔ جہاں تک میرا نجی معاملہ ہے مجھ پر اس امر کا رتی بھر بھی اثر نہیں پڑے گا کہ بینک والے ہمارے ساتھ آگے کو کیسا سلوک رکھینگے اور کریں گے۔ کیونکہ باہر کے کسی آدمی یا بینک سے روپیہ کی مدد لئے بغیر ہمارا کام بڑے مزے سے اور خوب چل رہا ہے۔ میں کسی ذاتی غرض سے یہ سوال نہیں اُٹھا رہا۔ میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ اس وقت کیا زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگوں کا زیادہ سے زیادہ بھلا ہو رہا ہے یا نہیں۔

جس مالی سسٹم سے ایک طرح کے کارخانہ داروں کو دوسروں کی نسبت زیادہ رعایت ملتی ہو وہ اچھا نہیں ہے۔ ہمیں ڈھونڈھ کر یہ پتہ لگانا چاہیئے کہ کیا کوئی ایسا سسٹم ممکن نہیں جس کے قائم ہونے سے بیوپار میں طاقت اور اختیار کا دینا روپیہ اور بینک کے ہاتھوں سے نکل جائے۔ سوسائٹی کے اندر کسی خاص پارٹی یا فرقہ کے واسطے الگ قانون بنانا نہایت بُرا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ملک کے اندر مال تیار کرنے کے طریقے اب اس قدر بدل گئے ہیں کہ اُن کی قیمت اور قدر کا اندازہ لگانے کے لئے روپیہ کے سکے سب سے بہتر ذریعہ ہیں۔ اور بینک والے جن قاعدوں اور پابندیوں کے ساتھ اس وقت (اور میرا یقین ہے کہ لاچار ہو کر) ٹکسالی سونا اور چاندی کے سکوں (گولڈ سٹینڈرڈ) پر بیوپاری لوگوں کو کریڈٹ دے رہے ہیں اُس سے لازمی طور پر ایک طرح کے کارخانہ داروں کو دوسروں کی نسبت زیادہ فائدہ رہتا ہے اور رعایت ملتی ہے۔ اس امر کا لحاظ نہ کرتے ہوئے کہ ملک میں دولت کتنی ہے کریڈٹ پر روپیہ جتنا ملک کے اندر صرف سونا ہو۔ اس کی حد کے اندر رہ کر لگانا چاہیئے۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ روپیہ اور روپیہ کریڈٹ پر دینے کے معاملہ میں جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ بالکل پتھر کی لکیر ہے۔ ابھی تک روپیہ اور اُدھار کے معاملوں میں کوئی بھی آدمی اتنا لائق پیدا نہیں ہوا جو چھاتی ٹھونک کر اپنی رائے دے سکے۔ دوسرے اصلی ضروری سوالوں کی طرح ان کا بھی ہوشیاری کے ساتھ اور عمدہ تجربے کرنے کے بعد فیصلہ کرنا ہوگا۔ ہمیں ایک ایک قدم بڑھنا ہوگا اور بڑے سوچ سمجھ کر۔ یہ پولیٹکل نہیں بلکہ مالی سوال ہے۔ اور میرا پختہ یقین ہے کہ لوگوں کو اس سوال پر سوچ بچار کرنے کے لئے تیار کرنا نہایت فائدہ کی بات ہے۔ اگر سچے دل کے ساتھ لوگوں کو یہ تعلیم دینے کی کوشش کی جاوے تو وہ اندھا دُھند بغیر سمجھے جانے بوجھے ہرگز کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے جس سے آفت کھڑی ہو جائے۔ ہر درجے اور ہر قسم کے لوگوں کے دل میں سب سے پہلا خیال روپیہ کا ہوتا ہے لیکن آج تک جتنے بے نقص سسٹم نکالے گئے ہیں۔ ان سب کو ایک سرسری نظر سے دیکھ کر ہی پتہ چل جائے گا کہ انہیں سے بہتیرے ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ان میں سے بہتوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ عام طور پر لوگ ایماندار ہوتے ہیں۔ یہ بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ اگر سبھی انسان ایماندار ہوتے تو ہمارا موجودہ سسٹم نہایت عمدہ چلتا رہتا۔ اصلی بات یہ ہے کہ روپیہ کے لین دین کے تمام معاملوں میں پچانوے فی صدی انسانی خصلت کام کرتی ہے۔ اس لئے صرف وہی سسٹم کامیاب ہوگا جس کے اندر انسانی خصلت کو اپنے قابو میں رکھنے کی طاقت ہوگی۔ نہ کہ جو اس کے ماتحت ہو کر چلیگا۔

آج کل لوگ روپیہ کے سوال پر سوچ بچار کر رہے ہیں۔ اور اگر روپیہ کے مالکوں نے اپنی لیاقت اور تجربے سے کچھ ایسی باتیں حاصل کر لی ہیں جن کو جان کر ان کے خیال میں لوگ بھٹکنے سے بچ جائیں گے تو اُن کو بتا دینے کا سب سے اچھا موقع یہی ہے۔ وہ دن گئے جب لوگوں کو یہ خطرہ ہوتا تھا کہ پتہ نہیں روپیہ اُدھار ملے گا یا نہیں۔ اور نہ اب لمبی چوڑی للکاروں سے کسی کو ڈر لگتا ہے۔ عام طور پر لوگ پرانی لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ اور خاص طور پر مہاجنوں سے زیادہ جن کو یہ خیال ہے کہ جس طرح چھاپے خانے دھڑا دھڑ ٹکٹ چھاپکر رکھ دیتے ہیں، اسی آسانی سے اشتہار بازی کر کے روپیہ بھی لوگوں کے پاس سے کھینچا جا سکتا ہے۔ وہ حقیقت میں لوگوں کو سمجھے نہیں۔ لوگوں کے اندر جو یہ پرانی لکیر کے فقیر رہنے کی خصلت ہے۔ اسی نے آج تک ہمارے دھن کو مہاجنوں کی اُن من مانی چالوں کے باوجود سنبھال کر رکھا ہے۔

جنہیں اپنے پیشے کے بھاری بھاری خاص نام دے کر دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

لوگ روپیہ کا جائز استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی ان کے اصول کو توڑ نہیں سکتا بلکہ یہاں تک کہ اگر ان کو ایک مرتبہ یہ معلوم ہو جائے کہ موجودہ سسٹم کے اندر جو اصل نقص ہیں ان کو کس طرح سے دور کیا جا سکتا ہے۔ تو پتہ نہیں وہ ترقی کرتے کرتے کہاں پہونچ جاویں۔

خالی لیکچروں سے یا پولیٹیکل ہلڑبازی سے یا مالی تجربوں سے روپیہ کا موجودہ سسٹم بدلا نہیں جا سکتا وہ وقت آنے والا ہے جب حالات سے مجبور ہو کر یہ اپنے آپ تبدیل ہو کر رہے گا۔ ان حالات کو نہ ہم پیدا کرنے والے ہوں گے اور نہ ان پر ہمارا کچھ زور ہوگا۔ بلکہ یہ قدرت کا کام ہوگا۔ ایسے حالات اور ان کا دباؤ اب ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں۔

ہمیں لوگوں کو یہ سمجھنے میں مدد کرنی چاہئے کہ روپیہ کا اصلی استعمال کیا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ انہیں بتائیں کہ اصلی استعمال یہ ہے۔ اور روپیہ کے اصلی معنے کیا ہیں۔ اور ہمارے موجودہ سسٹم کی آڑ میں وہ کیا کیا چالیں ہو سکتی ہیں جنہیں کھیل کر مٹھی بھر آدمی اتنی قوموں اور اتنے ملکوں کو اپنے قابو میں کیئے ہوئے ہیں

آخر روپیہ ہے تو نہایت معمولی چیز۔ یہ ہماری باربرداری میں کام آنے والی چیزوں میں سے ایک ہے۔ ایک آدمی سے دوسرے آدمی تک مال پہنچانے کا یہ سب سے سیدھا اور آسان ذریعہ ہے۔ روپیہ خود بھی تعریف کے قابل چیز ہے۔ اس کے اندر اصل کچھ برائی نہیں۔ آپس میں ملاپ رکھنے کے لئے سب سے مفید طریقہ یہی ہے۔ اور جب اس سے وہی کام لیا جائے جس کے لئے یہ بنا ہے۔ توڑ کلو کی بجائے اس سے مدد ملتی ہے۔

لیکن روپیہ کو ہمیشہ روپیہ کے طور پر برتنا چاہیئے۔ ایک فٹ میں ہمیشہ بارہ انچ ہوتے ہیں مگر روپیہ کب روپیہ ہوتا ہے! آج کل جسے ایکسچینج بولتے ہیں۔ اس کے اگر کسی چھومنتر سے کوئلہ تولتے وقت ایک من کے بٹّے چالیس سیر سے کچھ اور اوپر چڑھنے لگیں۔ اور گھر کا آٹا دال خریدتے وقت سیر اور چھٹانکوں کے بٹّے بدلنے لگیں۔ اور کپڑا ناپنے کے لئے آج گز ستائیس انچ کا ہو اور کل کو تینتیس انچ کا تو اب لوگ بھی اتنے بدھو نہیں رہے۔ جو اس کا فوراً علاج نہ سوچ سکیں گے۔ مگر جس حالت میں روپیہ روپیہ کے برابر نہیں ہوتا۔ اور جب سولہ آنے کے روپیہ کا مول مارکیٹ میں کبھی بارہ آنے ہو جاتا ہے۔ اور کبھی

آٹھ آنے سے بھی کم جیسا کہ کچھ عرصہ پہلے امریکہ کی مارکیٹ میں سونے اور چاندی کا حال ہوا تھا. پھر یہ جلانے کا کیا فائدہ ہے کہ روپیہ کی قدر جاتی رہی یا روپیہ کا بھاؤ گر گیا۔ روپیہ کا مول ہمیشہ سولہ آنے ہونا اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا کہ ایک من میں چالیس سیر اور ایک گز میں چھتیس انچ کا ہونا۔

یہ ظاہر ہے کہ وہ بینک والے جو نہایت نیک نیتی سے اور ایمانداری کے ساتھ اپنا کام چلا رہے ہیں. اُن کو اس امر کا دھیان ہونا چاہیئے کہ دوسرے لوگوں کی نسبت اپنے پیشہ کی وجہ سے صرف روپیہ کے کاروبار میں خوب لیاقت اور ہوشیاری کر کے اپنے بینک کو اول درجہ پر پہنچا کر اطمینان سے خاموش بیٹھ رہنے کی بجائے اُن کا سب سے پہلا اور ضروری فرض یہ ہے کہ وہ ہمارے مالی سسٹم کی گہری چھان بین کریں اور پھر اس کے نقص دور کرنے کے طریقے ڈھونڈیں۔ اگر بینکروں کے بھیس میں چھپے جو جوآرے بینک کی گدی سنبھالے بیٹھے ہیں۔ اُن کی بینکر کا نام ہونے کی وجہ سے جو مان اور دبدبہ ہے وہ ہمیشہ کے لئے چھن جائے تو بینکنگ (مہاجنی) کا کام ٹھیک ٹھکانے پر آجائے اور بینکوں سے پبلک کی جتنی خدمت ہونی چاہیئے وہ ملنے لگے۔ تب ہمارے موجودہ مالی سسٹم کے تمام نقص دور ہو جائیں گے اور لوگ بینک والوں کی ٹیڑھی چالوں کا شکار ہونے سے بھی بچ جائیں گے

مگر اس میں بھی ایک شرط ضرور ہے۔ گو وہ ایسی نہیں جو کہ پوری ہو سکے۔ حالت واقعی بڑی نازک ہوتی جا رہی ہے۔ اور اگر جنہیں اس علم کی اچھی واقفیت ہے۔ کمر کس کر اس کا علاج نہ سوچیں گے. تو پھر جن کے پاس یہ ہنر نہیں وہی کیوں نہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلائیں گے۔ سوسائٹی کی کسی ایک جماعت کے لئے یہ فرض کر لینا سب سے بڑی بے وقوفی ہے کہ اپنی ترقی کی کوئی سبیل نکالنا اپنے اوپر حملہ کرنے کے برابر ہے۔ ایک جماعت کی ترقی ہونے کا صرف یہ مطلب ہے۔ کہ اس کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر ساری سوسائٹی کی بڑھتی ہو۔ یہ بے وقوفوں کا کام ہے جو اپنی جماعت کی ترقی کی راہ میں روڑا اٹکاتے ہیں اور اس طرح سے اس کے ہاتھوں نقصان اُٹھاتے ہیں۔ دُنیا میں ہم سب اکٹھے ہی آئے ہیں۔ اس لئے سب کو اکٹھے ہی آگے بڑھنا چاہیئے۔ ترقی ہوتے دیکھ کر کسی آدمی یا جماعت کے لئے چڑنا اول درجہ کی حماقت ہے۔ اگر بینکروں اور مہاجنوں کا یہ خیال ہے کہ ترقی کی خواہش صرف غریب اور تنگی مزاج لوگوں کی تلملاہٹ کی علامت ہے۔ اور اگر وہ یہ سمجھتے ہیں. کہ ترقی کی طرف

ہر قدم جو اُٹھتا ہے۔ اُن کے مُنہ پر گویا ایک چپیت ہے۔ تو اُن کی ایسی واہیات حرکتوں سے بڑھ کر
اس بات کا اور کیا ثبوت مِل سکتا ہے۔ کہ وہ سوسائٹی کے لیڈر بننے کے ہرگز قابل نہیں۔

اگر کسی بینکر کو موجودہ نقص دار سسٹم سے کسی دوسرے بہتر اور زیادہ مکمل سسٹم کی نسبت
زیادہ فائدہ ہو رہا ہے۔ اور اگر اس بینکر کو دُنیا میں ایک بہتر اور زیادہ مکمل سسٹم قائم کرنے میں
مدد دینے کی عزت حاصل کرنے کی نسبت اپنی عمر کے باقی سالوں میں اپنے ذاتی منافعوں کو جوڑنے
کا زیادہ لالچ ہے۔ تو لوگوں اور بینکروں کے ذاتی منافعوں کے درمیان ایک نہ ایک دن ٹکّر ضرور
ہو کر رہے گی۔ لیکن یہاں پر ایک بات بینکروں کے خود بھلے ہم اُن کے خود غرضی سے بھرے ہوئے
ذاتی منافعوں کے بارے میں جتلا دینی بالکل واجب ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ اگر بینکر لوگ اس
نیت سے ٹکّر لیں گے اور لڑائی چھیڑیں گے۔ کیونکہ ان کو موجودہ سسٹم کی وجہ سے خوب فائدہ ہوتا
ہے۔ تو اُن کی لازمی طور پر ہار ہوگی۔ آخر بینکر لوگ اتنا ڈرتے کاہے سے ہیں؟ دُنیا تب بھی
قائم رہے گی۔ اور لوگ تب بھی ایک دوسرے سے تجارت ضرور ہی کرتے رہیں گے۔ روپیہ بھی
ہوگا۔ اور روپیہ کی مشین چلانے والے اُستاد انجنیئروں کی تب بھی ضرورت ویسی ہی بنی رہے گی
جیسی کہ آج ہے۔ غرضکہ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی رہے گا۔ صرف یہ گول گانٹھیں اور اُلجھنیں نکل
جائیں گی۔ البتہ موجودہ نظام میں کچھ تھوڑی بہت ادلا بدلی ضرور ہو جائے گی۔ یعنی تب بینک
والے صنعت (انڈسٹری) کے حاکم نہیں بلکہ نوکر ہوں گے۔ روپیہ بیوپار کے نہ کہ بیوپار روپیہ کے
ماتحت ہوگا۔ سوسائٹی کو تباہ کرنے والے ذاتی منافعوں کی کشمکش بہت حد تک ڈھیلی پڑ جائے گی
تب بینکوں سے لین دین کرنے کا خدشہ مٹ جائے گا اور بینک پبلک کی سچی خدمت کرنے لگینگے
بینکوں کے ذریعہ آج کی نسبت لوگوں کا کہیں زیادہ بھلا ہونے لگے گا۔ موجودہ وقت میں بینکوں
کو قائم کرنا اور اس کو چلانا دوسرے تمام بیوپاروں کی نسبت زیادہ مہنگا ہے۔ گو ڈیوی ڈینڈ
نکالنے میں سب سے زیادہ منافعے بھی انہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن تب ان کو قائم کرنے
اور چلانے میں اتنا خرچ نہیں ہوا کرے گا۔ اور ان کے ذریعہ جو منافعے ملا کریں گے۔ اُن کو
سوسائٹی میں سب لوگ بانٹ کر کھایا کریں گے۔

پُرانے سسٹم کی دو باتیں بنیادی ہیں۔ اُن میں سے اوّل یہ ہے کہ خود ہماری قوم کے اندر
چھوٹے چھوٹے بہت سے بینک ہونے کی بجائے چند بڑے بڑے بینکوں کے ہاتھ میں روپیہ کا
تمام کاروبار و لین دین سونپ دینے کی طرف کافی جھکاؤ پایا جاتا ہے۔ خواہ یہ ایک بڑا
سرکاری بینک ہو یا کچھ بینکروں کی مل کر بنائی ہوئی ایک پرائیویٹ کمپنی۔ ہر قوم اور سوسائٹی
کے اندر چند ایک ایسی پرائیویٹ یا آدھی سرکاری کمپنیاں ضرور ہوا کرتی ہوں جن کے ہاتھوں
میں روپیہ بیوپار میں کریڈٹ پر لگانے کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نہ صرف
امریکہ میں بلکہ دُنیا کے تختہ پر تمام قوموں کے اندر بھی بینکنگ کا کام صرف چند بہت بڑے بینکوں
کے ذریعہ کرنے کا جھکاؤ تیزی سے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ جس طرح جنگ سے پہلے تمام دُنیا کا کریڈٹ
لندن کے ہاتھ میں تھا۔ اور دُنیا کی تجارت میں ایکسچینج (شرح تبادلہ) کے واسطے برطانیہ کا پونڈ سٹینڈرڈ
یعنی حساب کرنے کا پیمانہ مانا جاتا تھا۔ اسی طرح آج تمام امریکہ میں روپیہ کریڈٹ پر دینے کے کام کی
باگ ڈور صرف نیویارک کے چند بڑے بڑے بینک والوں کے ہاتھوں میں ہے۔

ہم دو طریقوں سے اپنا سدھار کر سکتے ہیں۔ ایک نیچے سے اوپر کو چلتا ہے۔ اور دوسرا اوپر
سے نیچے کو۔ یہ پچھلا طریقہ زیادہ قاعدہ میں ہے۔ گو پہلے کا بھی تجربہ روس میں کیا جا رہا ہے۔ اگر
ہم نے سدھار کا کام اوپر کی جانب سے شروع کرنا ہے۔ تو ہمیں اپنے ذاتی منافعوں کو حاصل
کرنے کی خاطر جو ٹیڑھی چالیں چل کر اپنا مطلب حل کرنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ اس کو ایکدم
چھوڑ کر ہمیں اپنے سامنے ہمیشہ سچے دل اور پوری لگن کے ساتھ ساری قوم بلکہ تمام دُنیا کی بھلائی
کرنے کا دھیان رکھنا ہوگا۔

اکیلے سونے اور روپیہ سے دُنیا کی دولت نہیں بنتی۔ نہ سونے اور روپے سے یہ ٹھیک طور
پر ظاہر ہوتی ہے۔ سونا بطور سونا کوئی خاص قیمتی شے نہیں جس طرح عمدہ سے عمدہ اور قیمتی ٹوپیاں آخر
ٹوپیاں ہی رہیں گی اور صرف سر پر پہننے کے کام آئینگی۔ اسی طرح سونے کی بات ہے۔ اور سکوں
کی شکل میں سیکڑوں کے ہاتھوں میں آکر اس کی قیمت بڑھ نہیں جاتی۔ البتہ تب اس کو بنا سنوار کر
لوگوں کے سامنے دولت کہہ کر ضرور پیش کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ روپیہ کریڈٹ پر لینے والے کارخانہ داروں

پر جو مال تیار کرکے مارکیٹ کو دیتے ہیں۔ اور جو کہ ملک کی اصلی دولت ہے پورا قبضہ ہو جائے۔ روپیہ صرف خرید و فروخت کرنے کا ذریعہ ہے۔ تو بھی اگر محض اس کے لین دین کا بیوپار کیا جائے۔ تو بڑی منافع کا سودا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب سامان خریدنے یا مال تیار کرکے بیچنے کا کاروبار کرنے کی بجائے صرف روپیہ کی لین دین کا بیوپار ہی شروع ہو جاتا ہے۔ تو روپیہ کی سٹہ بازوں اور سودخوروں کی خوب چاندی ہو جانے کی وجہ سے ملک کے کارخانوں میں مال تیار ہونا اسی حساب سے گھٹنے لگتا ہے۔ روپیہ کے ٹھیکہ داروں اور مالکوں کا ملک کے کارخانوں پر کتنا زبردست غلبہ ہے۔ اس کا اندازہ صرف اتنی بات سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ گو روپیہ کو دنیا کی اصلی دولت کی علامت شمار کیا جاتا ہے۔ تو بھی روپیہ کی نسبت ہمیشہ دولت زیادہ رہی ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اصلی دولت کو عام طور پر روپیہ کی منہ کی طرف تکنا پڑتا ہے۔ اور اس کی خوشامد رہتی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ گو آج دنیا دولت سے بھری پڑی ہے۔ تو بھی لوگ تنگ حال ہیں اور ان کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔

یہ باتیں سرکاری خزانوں کی رپورٹوں کی طرح جن کو پڑھ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے فرضی اور ڈھکوسلے نہیں بلکہ ہر انسان اپنی تقدیر کے ساتھ ان خصلتوں کو بھی لے کر دنیا میں آتا ہے۔ اور ان کی وجہ سے خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ دنیا میں غریبی بہت کم حالتوں میں مال کی نایابی کی وجہ سے ہوا کرتی ہے بلکہ اکثر اس کا سبب روپیہ کے ٹھیکہ داروں اور مالکوں کی چالبازیاں ہوتا ہے۔ قوموں کے درمیان تجارتی کمپٹیشن (مقابلہ بازی) کا ہونا۔ جس کی وجہ سے ملکوں کا ایک دوسرے کے خلاف دشمنی اور نفرت کا پھیلنا اور پھر آپس میں لڑائیوں کا ٹھن جانا۔ یہ سب چند معمولی سی علامتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ وہ بالکل ایک حقیقت ہے اور زمانہ حال کی سچی تصویر ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ غریبی اور جنگ دونوں ہی ایک ڈال کے پات ہیں۔ اور اس لئے اگر ہم کوشش کریں تو ان دونوں بڑی آفتوں سے بچ سکتے ہیں۔

آیئے ذرا سوچیں۔ کہ کیا ہم موجودہ حالت کو بہتر بنانے کے واسطے ابھی سے کچھ نہیں شروع کر سکتے۔

غریب کیوں رہو

غریبی کئی سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ جن میں سے جو بڑے ہیں اُن کا علاج ہو سکتا ہے اسی طرح بیوپار ہیں جو لوگوں کو خاص رعایتیں دی جاتی ہیں۔ وہ دور کی جا سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ غریبی اور خاص رعایتیں دونوں کا ہٹانا بالکل ممکن ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ ضرور ہٹا دینی چاہئیں۔ دونوں ہی غیر قدرتی ہیں لیکن خالی قاعدے باندھنے سے نہیں بلکہ کام کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ فلاں طریقہ پر چلنے سے فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔

غریبی سے میری مُراد وہ حالت ہے جبکہ ایک انسان کو یا کنبے کو خوراک، مکان اور کپڑے مناسب کافی تعداد میں نہ ملیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سوسائٹی میں ایک آدمی کی حیثیت کے مطابق ان چیزوں میں بہت فرق رہتا ہے۔ سبھی آدمیوں کی طبیعتیں اور جسم ایک جیسے نہیں ہوتے کوئی سکیم جو اس اصول پر قائم کی جائے کہ سبھی آدمی برابر ہیں۔ یا سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا چاہیئے۔ غیر قدرتی ہے۔ اور اس لئے چل نہیں سکتی۔ دُنیا میں کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہونا چاہیئے جس سے سب آدمیوں کا درجہ ایک برابر ہو جائے۔ اس طریقے سے غریبی گھٹنے کی بجائے بہت بڑھ جائے گی۔ ایک لائق مال تیار کرنے والے کو زبردستی نالائق بنا کر ایک نالائق مال تیار کرنے والے کو لائق نہیں بنایا جا سکتا۔ غریبی صرف زیادہ سے زیادہ مال تیار کر کے ہی دور کی جا سکتی ہے۔ اور اس وقت مال تیار کرنے یعنی کارخانہ چلانے کے قاعدے اتنے پکے بن چکے ہیں۔ کہ اب

ہم نے دیکھ لیا ہے کہ مال کا تیار کرنا اور سب لوگوں میں اس کی بانٹ اس طرح ترتیب اور سلیقہ کے ساتھ کی جا سکتی ہے کہ سبھی کو اپنی لیاقت اور محنت کے مطابق مزے کے ساتھ روٹی مل سکتی ہے۔

کمرشیلسٹوں نے اپنے لئے جب یہ قاعدہ بنا یا کہ کارخانوں کے ملنے سے کامگاروں کا ستیاناس ہو جائے گا تو وہ اُلٹے راستے پر پڑ گئے۔ آج کل انڈسٹری سے کامگاروں اور دُنیا کا آہستہ آہستہ زیادہ بھلا ہو رہا ہے۔ اس وقت ضرورت صرف اپنی اسکیموں اور طریقوں کو بہتر بنانے کی ہے۔ جن لوگوں نے اپنے دھندوں میں کمال حاصل کیا ہے۔ اگر وہ اپنی پوری لیاقت اور طاقت ان کے بنانے میں خرچ کریں تو حد سے زیادہ فائدہ رہے گا۔ گورنمنٹ کیونکہ ان چیزوں سے بالکل الگ رہتی ہے۔ وہ قوم کی ترقی کے کسی کام میں کھلے بندوں کبھی مدد نہیں دے سکتی۔ البتہ یہ اندر ہی اندر روبی طور سے ترقی کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور کرکے اور سوسائٹی پر بغیر کسی قسم کا بوجھ ڈالے ضرور مدد کر سکتی ہے۔

جہاں تک میں نے اس معاملہ پر غور کیا ہے۔ دُنیا میں غریبی کے جتنے بھی سبب ہیں ان سب کی جڑ صرف یہی ایک وجہ ہے کہ انڈسٹری سے جتنا مال تیار ہوتا ہے۔ اور کھیتی باڑی سے جتنی پیداوار ہوتی ہے۔ ان دونوں کی لوگوں میں تقسیم بہت بے مناسب ہوتی ہے۔ گویا نا اسی اور کھسپٹ بدانتظامی ہے۔ اور صرف اس بدانتظامی کی وجہ سے جس قدر چیز ضائع ہوتی ہے اس کا کچھ شمار نہیں لیکن اگر عقل کے ساتھ اور لوگوں کی خدمت کرنے کی نیت سے کام کیا جائے۔ تو انڈسٹری اور کھیتی باڑی میں ایک دمڑی کی چیز بھی ضائع نہ ہو۔ مگر جب تک کارخانہ داروں اور کھیتی باڑی کرنے والوں کو خلقت کی خدمت کرنے کی بجائے صرف روپیہ کمانے کی فکر ہے۔ تب تک کارخانوں کا مال اور کھیتی باڑی کی پیداوار اسی طرح ضائع ہوتی رہے گی۔ مگر سوسائٹی کو لمبی سوچ کرنے والے نہ کہ جھٹ پٹ فائدہ اُٹھانے کے خیال سے کاروبار کرنے والے اس نقصان سے بچا سکتے ہیں۔

جھٹ پٹ فائدہ اُٹھانے کے خیال سے کام کرنے والوں کو سب سے اوّل اور بڑی فکر روپیہ کمانے کی ہوتی ہے۔ اُن کو تیار مال اور کاشتکاری کی پیداوار کا یوں ضائع ہونا بالکل نظر نہیں آتا اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کی خدمت کرنا محض دھرم کا کام ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں اگر

کسی چیز سے سب سے زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے۔ وہ اپنی ناک سے آگے کچھ نہیں دیکھتے.
چھوٹی چیزوں میں پھنس کر ان کو بڑی چیزیں نظر نہیں آتیں۔ اور وہ سب سے بڑی چیز کو نہیں دیکھتے جو
کہ یہ ہے کہ صرف روپے پیسے کے خیال سے کوئی کام بھی کرنے میں سب سے کم منافع ہوتا ہے۔

دھرم کے خیال سے بھی بیشک خدمت کی جا سکتی ہے لیکن عام طور پر روزمرّہ کرنے والے
نہیں ہوتے۔ یہ بات نہیں کہ کارخانے جتنی دولت پیدا کرتے ہیں اس کو وہ ٹھیک طور پر
سوسائٹی کے اندر بانٹنے کے ناقابل ہیں۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ آج کل کارخانوں کے اندر اتنی
چیز ضائع جا رہی ہے کہ اُس کی وجہ سے جو لوگ کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ اُن میں سے
ہر ایک کو اس دولت کا پورا پورا حصّہ نہیں ملتا۔ حالانکہ کارخانہ کے اندر جو مال تیار ہوتا ہے وہ
مارکیٹ میں اتنی اونچی قیمت پر فروخت ہو رہا ہے۔ کہ اس وجہ سے تمام مال بکنے نہیں پاتا۔

جتنی چیز اور سامان مفت میں ضائع ہو جاتا ہے اس کی کچھ مثالیں یہاں دی جاتی ہیں
پہلے بجلی کی طاقت کی مثال لو جیسی ([illegible]) کی وادی میں کوئلہ نہیں ہوتا
مگر اس کے عین درمیان چھپی ہوئی لاکھوں من گھوڑے کی طاقت یعنی جیسی دریا بہہ رہا ہے۔
لیکن اگر اس کے کنارے پر رہنے والوں کو بجلی کی طاقت یا آگ کی ضرورت ہوتی ہے تو اس
کے لئے وہ کوئلہ خریدتے ہیں جو سیکڑوں میل کے فاصلہ سے آتا ہے اور جس کی وجہ سے قیمت
اتنی چڑھ جاتی ہے کہ اُس کا فائدہ بطور آگ یا بجلی کی طاقت کے بالکل تھوڑا رہ جاتا ہے۔ یا اگر
وہ یہ مہنگا کوئلہ خریدنے کی ہمّت نہیں رکھتے۔ تو وہ اپنے درخت کاٹنے شروع کر دیتے ہیں
اور اس طرح سے وہ دُنیا میں پانی کے ذریعہ بجلی پیدا کرنے کی طاقت کا جو خزانہ ہے۔ اُس کو
وہ تباہ کر دیتے ہیں۔ ابھی تک اُن کو کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ وادی میں لوگوں
کی اتنی بڑی آبادی ہے اُن کو جلانے کے لئے روشنی کرنے اور کھانا پکانے اور کام کرنے کے
واسطے جتنی بجلی کی طاقت کی ضرورت ہے۔ وہ بالکل ان کے قریب موجود ہے جسے وہ کوڑیوں کے
دام حاصل کر سکتے ہیں۔

فائدہ اپنی ضرورتوں کو کم کرنے اور اپنے نجی خرچ گھٹانے سے نہیں بلکہ زیادہ تعداد میں مال تیار

کرنے سے ہوتا ہے "کم خرچی" اور "کفایت" ان دو لفظوں کے معنوں کی حد سے زیادہ کھینچا تانی کی گئی ہے۔ لفظ کفایت سے ایک قسم کا ڈر ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی میں کبھی کوئی ایسا موقعہ آتا ہے جب اُس کے دل پر اتنی چیزوں کا اور اس قدر بڑی تعداد میں ضائع ہوتے دیکھ کر سخت چوٹ لگتی ہے۔ اور تب اُس کی طبیعت میں فضول خرچی کے خلاف نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور "کفایت" کا اصول اُسے بہت اچھا لگنے لگتا ہے۔ مگر یہ صرف کوئیں سے نکل کر گڑھے میں گرنے والی بات ہے۔ اور آدمی پورے طور سے غلطی کے اندھیرے سے نکل کر سچائی کی روشنی میں نہیں پہنچتا۔

"کفایت" نیم مُردہ لوگوں کی زندگی کا اصول ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فضول خرچی سے یہ بہتر ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہ اتنا اچھا نہیں جتنا کہ ایک چیز کو ٹھیک پوری طرح سے برتنا۔ جو لوگ کفایت شعار ہونے کا گھمنڈ کرتے ہیں۔ وہ اسے اپنی ایک تعریف سمجھتے ہیں لیکن اس سے بڑھ کر اور افسوسناک اور کیا نظارہ ہو سکتا ہے کہ ایک غریب مصیبت کا مارا ہوا انسان چند روپیوں اور پیسوں پر اپنی زندگی کے دن اور بہار ضائع کر رہا ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ انسان کو زندگی بسر کرنے کے لیئے گزارہ لائق تھوڑے سے پیسے مل جائیں۔ کئی کفایت شعار لوگ تو اس قدر کنجوس پائے جاتے ہیں کہ انہیں سانس لیتے وقت زیادہ ہوا کھینچنے میں بھی شائد شرم محسوس ہوتی ہے۔ اور وہ دنیا کی کسی چیز کو بھی پورے طور سے تو کیا کافی استعمال کرنے سے بھی گھبراتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے جسم اور جان دونوں مُرجھا جاتے ہیں "کفایت" کرنا بھی ایک قسم کی فضول خرچی ہے۔ یہ زندگی کے رس کو ضائع کرنا ہے۔ اور دُنیا کے مزوں سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہے۔ کیونکہ ایک چیز دو طرح سے ضائع ہوتی ہے۔ ایک تو فضول خرچ کا طریقہ ہے جو اپنی ساری طاقت اور کمائی عیش اور بدمعاشی میں پڑ کر گنوا دیتا ہے اور دوسرا سُست اور کاہل آدمی کا طریقہ ہے جس کی ساری کمائی اور طاقت اور کمائی کو استعمال نہ کرنے کی وجہ سے زنگ لگ جاتا ہے۔ اس لیئے کفایت شعار ہونے میں بھی اُتنا ہی نقصان ہونے کا ڈر ہے۔ جتنا کہ سُست اور کاہل ہونے سے۔ عام طور پر اپنے جائز اور مناسب خرچ دبانے کی وجہ سے انسان کے اندر فضول خرچی پیدا ہوتی ہے اور اسی طرح فضول خرچ بڑھانے کے بعد کفایت کرنے کا انسان کو

خیال آتا ہے۔

پرمیشور نے ہر چیز ہمارے استعمال کرنے کے لیئے بنائی ہے۔ دنیا میں جتنی ہمیں تکلیفیں آتی ہیں وہ سب ہمارے اُلٹے استعمال کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہماری زندگی کی عام چیزوں کے برخلاف جو ہم سب سے بڑا پاپ کر سکتے ہیں وہ اُن کا اُلٹا استعمال ہے۔ اُلٹا استعمال تو ایک بھاری لفظ ہے۔ عام طور پر ہم یہی کہتے ہیں کہ فلاں چیز ضائع ہو گئی۔ لیکن ایک چیز کا ضائع کرنا بھی تو ایک قسم کا اُلٹا استعمال ہے۔ کسی چیز کا ضائع کرنا اُلٹا استعمال ہے۔ اور کسی چیز کا اُلٹا استعمال کرنا اُسے ضائع کرنا ہے۔

لوگوں نے بچت کی عادت ڈالنے کی حد سے زیادہ تعریف کر دی ہے۔ ہر ایک آدمی کے لیے تھوڑا بہت بچا کر رکھنا مناسب اور واجب ہے۔ اور اگر ایک آدمی بچا سکتا ہو اور نہ بچائے تو سچ مچ وہ ضائع کرتا ہے۔ لیکن حد سے زیادہ بچت کرنی بھی بُری ہے۔ ہم بچوں کو روپے پیسے بچانا سکھاتے ہیں۔ اس کا اتنا فائدہ ضرور ہو جاتا ہے کہ ان کو سوچ سمجھ کر اور لوگوں کی خاطر بھی تھوڑا بہت خرچ کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے لیکن اس سے اصلی بات یا اصول اُن کو نہیں آتا۔ اس سے بچے کو یہ عقل نہیں آتی کہ کس طرح سے وہ اپنے اوپر اس کو ٹھیک ٹھیک اور مناسب خرچ کرے جس سے اُس کی ترقی ہو۔ ایک بچے کو بچانے کی عادت ڈالنے کی بجائے اگر اُس کو روپے پیسے کے ٹھیک خرچ کرنے کی عادت ڈال دی جائے۔ تو وہ اُس سے بہت بہتر ہے۔ اکثر آدمی اپنے پیٹ کو گانٹھیں دے دے کر روپیہ بچانے کی بڑی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر اس کی بجائے وہ ان چند روپیوں کو پہلے اپنے اوپر یعنی اپنی جسمانی ترقی کرنے اور لیاقت بڑھانے میں اور پھر کسی مفید کام کو سیکھنے میں خرچ کرنے لگیں۔ تو کہیں بہتر ہو گا۔ کیونکہ اس سے آخر میں اُن کو زیادہ بچت ہونے لگے گی۔ نوجوانوں کو بچانے کی نسبت اس طور پر خرچ کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ پہلے اُن کو اپنے دماغ کی طاقت کو بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ پھر جب وہ اپنے آپ کو کافی بہتر اور مفید بنا لیں گے۔ تب اُن کو تھوڑا تھوڑا بچانے کی بھی فکر کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہ اصول بہت اچھا ہے۔ کہ ایک انسان کو اپنی آمدنی کا ایک کافی حصہ ضرور بچانا چاہیئے۔ لیکن جس زمانہ میں تمہیں کچھ سیکھنا چاہیئے اور ترقی کرنی چاہیئے

اگر اُس وقت تم روپیہ جوڑنا شروع کر دو تو یہ بچت نہیں کہلاتی۔ اس طرح تو جو تمہاری اصلی پونجی ہے تم اُسی کو برباد کر رہے ہو اور قدرت نے جو تمہیں طاقتیں اور لیاقتیں بخشی ہیں۔ انہیں گنوا رہے ہو ہر چیز کا جائز اور پورا استعمال کرنا ہی انسان کی زندگی کا سنہری اصول ہونا چاہیئے۔ ہر چیز کا جائز اور پورا استعمال کرنا زندگی بخشتا ہے۔ اور طاقت بڑھاتا ہے۔ جائز اور پورا استعمال ہی زندگی ہے۔ اور اس سے انسان کی زندگی کی بھلائیوں میں بڑھتی ہوتی ہے۔

دنیا کی عام حالت کو تبدیل کئے بغیر انسان کی نجی ضرورتیں گھٹائی جا سکتی ہیں تنخواہیں بڑھانا قیمتیں اونچی کرنا منافع زیادہ حاصل کرنا۔ اِدھر اُدھر سے اور ہر طریقہ سے روپے بٹورنا یہ تمام کوششیں ایک آدمی اپنی مشکلوں کو آسان کرنے کے لیئے کرتا ہے۔ خواہ دوسروں کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے۔ لوگوں کے دل میں ایک یہ بیہودہ خیال سما گیا ہے کہ اگر کسی طریقہ سے روپیہ حاصل ہو جائے تو ہم دنیا کی ہر آندھی اور طوفان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مزدور سمجھتے ہیں کہ اگر ہمیں زیادہ تنخواہیں ملنے لگیں تو یہ آندھی ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ اسی طرح دھنی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اُن کو زیادہ منافع آنے لگے تو یہ آندھی اُڑ جائے گی۔ لوگوں کو روپیہ پیسے کی طاقت میں جو بھروسہ ہے وہ صرف ایک وہم ہے اور یہ وہم اتنا زیادہ ہے کہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ امن و امان کے دنوں میں واقعی دھن بڑے کام کی چیز ہے۔ لیکن جو آدمی کارخانوں میں کام کر کے مال تیار کرتے ہیں اُن سے زیادہ اس کی قیمت نہیں۔ اور اس کا اُلٹا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ لوگ اصلی دھن کی بجائے روپیہ کو اپنا مائی باپ اور خدا سمجھ کر اتنا پوجنے لگیں کہ اس کی ساری قدر ہی جاتی رہے۔

ابھی تک لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ انڈسٹری اور کھیتی باڑی کے درمیان سخت دشمنی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ کہنا واہیات ہے۔ کہ چونکہ شہروں کی آبادی بڑھتی گئی ہے اس لئے اب ہر ایک آدمی کو کھیتی باڑی پر چلا جانا چاہیئے۔ اگر ہر آدمی کھیتی باڑی کرنے لگے۔ تو جلد ہی اس کی ساری آمدنی بند ہو جائے۔ اسی طرح یہ سوچنا کہ ہر ایک آدمی کو گزارہ کرنے کے لئے شہروں میں چلا جانا چاہیئے۔ بے وقوفی ہوگی۔ اگر کھیتی باڑی چھوٹ جائے۔ تو کارخانے والے کیا کریں گے کھیتی باڑی اور کارخانوں کا آپس میں پورا میل ہے۔ کارخانہ دار کسان کو وہ چیز بنا کر دے سکتا

جس کی ایک اچھے کسان کو ضرورت رہتی ہے۔ اور ایک کسان کچے مصالحوں ہے
کے پیدا کرنے اور بنانے والے کارخانے دار کو وہ چیز بنا کر دے سکتے ہیں جس کی کہ ایک اچھے کارخانہ دار
کو ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ اس طرح سے بار برداری کا عمدہ اور بڑھیا انتظام کے ذریعہ ہم ایک ایسا
اچھا اور مضبوط سسٹم قائم کر سکتے ہیں جس سے تمام خلقت کا بھلا ہوگا۔ اگر ہم چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں
میں رہتے ہیں۔ جہاں کھانے پینے اور رہنے کا خرچ اتنا زیادہ نہیں جہاں پر کھیت کھیتی اور باغوں
کی پیداوار بے شمار رستہ بازوں اور دلالوں کے نہ ہونے کی وجہ سے سستی مل سکتی ہے۔ تو وہاں پر
نہ غریبی رہے گی۔ اور نہ کوئی بے چینی ہوگی۔

جو کام فصل وار ہوتے ہیں۔ ذرا اُن پر غور کرنا چاہیئے۔ فصل وار کام کا بطور مثال کے
عمارتوں کی بات لو۔ راج مزدور۔ اور مستری لوگ ساری سردیاں اس انتظار میں خالی پڑے رہتے ہیں
کہ عمارتوں کے بنانے کا کب موسم شروع ہو۔ انسان کی کتنی طاقت اور لیاقت اس طرح سے ضائع
ہو رہی ہے۔ پھر اتنی ہی طاقت اور لیاقت اس طرح سے ضائع ہوتی ہے۔ جب ان تجربہ کار کاریگروں
کو زبردستی عمارتوں کے بنانے کے موسم میں بھی اس ڈر کے مارے کارخانوں میں نوکری کرنی پڑتی ہے
کہ کہیں سردیوں میں انہیں پھر کارخانوں کے اندر کام نہ ملیں اور وہ خالی بیٹھے رہیں۔ اس سسٹم کی
وجہ سے سارا سال کتنی طاقت اور لیاقت ضائع ہوتی ہے۔ کہ کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر
ایک کسان کو بونے۔ فصل کی رکھوالی کرنے اور کاٹنے کے موسم میں (اور سال بھر میں یہ عرصہ کچھ اتنا
زیادہ کبھی نہیں ہوتا) کارخانہ سے چھٹی مل جائے۔ اور اگر عمارتیں بنانے والے کاریگروں کو اُن کے
موسم میں کارخانوں سے فرصت مل جائے۔ تو کتنا اچھا ہو اور دُنیا میں کتنا آرام اور سُکھ بڑھ جائے۔

فرض کرو شہر کے رہنے والے لوگ بہار اور گرمیوں کے دنوں میں باہر کھلی ہواؤں میں رہنے کے
لئے تین یا چار مہینے کے لئے چلے جایا کریں۔ تو پھر کیا ہوگا! یہ کہ پھر کبھی مارکیٹ مندی نہ آئے گی۔

سال میں کھیتی باڑی کا بھی کبھی مندا موسم آتا ہے۔ یہ ٹھیک وہ وقت ہے جبکہ ایک کسان کو
کارخانہ میں آ کر کام کرنا چاہیئے۔ اور اس طرح سے کھیتی باڑی کرنے کے لیئے جن چیزوں کی اُس کو ضرورت
ہے۔ اُن کو بنانے میں مدد کرنی چاہیئے۔ اسی طرح سال میں کارخانوں کے لئے کبھی مندا موسم آتا ہے۔ ؎

ٹھیک وہ وقت ہے جبکہ کام گاروں کو اناج پیدا کرنے کے لیئے کارخانوں سے نکل کر کھیتوں میں جانا چاہیئے۔ اس طرح سے سارا سال ہی تیزی رہے گی۔ اور مارکیٹ کبھی مندا نہیں ہوگا۔ اور ہمیں سمجھ آجائے گی کہ زندگی میں بناوٹ کتنی ہونی چاہیئے۔ اور رہنے کا اصلی قدرتی اصول کیا ہے۔

لیکن ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اس طریقے سے ہمیں زندگی کی کتاب کچھ اور زیادہ سمجھ میں آجائے گی۔ کہ انڈسٹری کے ساتھ ساتھ ہاتھ کی کاریگری کوئی آرٹ یا کھیتی باڑی کرنے سے نہ صرف جیب میں پیسے زیادہ آنے لگیں گے۔ بلکہ اس سے انسان کے دل میں دوسروں کے لیئے زیادہ ہمدردی اور محبت پیدا ہو جائے گی۔ اور دماغ روشن ہوگا۔ آج کل جو دنیا میں ہلچل پائی جاتی ہے اس کی بڑی وجہ ہماری اپنی تنگ دلی اور اُلٹے خیال ہیں۔ اگر ہمارے پاس کئی طرح کے کام ہوں۔ اور اگر ہمیں طرح طرح کے لوگوں سے برتنے کا موقع ملتا ہے۔ اور اگر ہم پھر یہ سمجھ سکیں۔ کہ دنیا میں ہر ایک کو دوسرے کی کتنی سخت ضرورت ہے۔ تو ہم دنیا میں زیادہ ٹھیک طور پر چلنے لگیں گے اس لئے ہر ایک شخص کے حق میں سال بھر میں کبھی کبھی باہر کھیتوں میں کام کرنا بہت مفید ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ ایسا کرنا بالکل ناممکن ہے۔ جو کام کرنے کے لائق اور واجب ہے۔ وہ کبھی ناممکن نہیں ہوتا۔ البتہ مل جل کر کام کرنا ہوگا۔ اور اپنے لالچ کو گھٹانے اور زندگی کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت پڑے گی۔

جو امیر ہیں وہ سال میں تین چار مہینے ضرور باہر کہیں چلے جانے کو بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ اور کسی پہاڑی یا برف کے مقام پر یہ عرصہ فضول سستی میں گنوا کر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ لیکن امریکہ کے درمیانہ درجہ کے لوگوں کا یہ خاصہ ہے۔ کہ اگر انہیں موقع بھی ملے تو بھی وہ اس طرح سے اپنا وقت ضائع کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ وہ اپنے لئے ہاتھ کی کار کا باہر کوئی نہ کوئی ایسا فصلی کام نکال لیں گے جو مل جل کر کرنے والا ہو۔

اس میں تو کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں کہ موجودہ زمانہ میں جو ہم ہلچل دیکھ رہے ہیں۔ وہ زیادہ کر کے ہمارے زندگی کے غیر قدرتی طریقوں سے بسر کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ جو لوگ سارا سال ایک ہی کام کو لگاتار کرتے رہتے ہیں۔ اور جن کو صحت دینے والی سورج کی روشنی بہت

کم ملتی ہے۔ اور نہ کھلی ہوا میں رہنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر اُن کی سمجھ میں یہ معاملہ ٹھیک ٹھیک
نہیں آتا۔ تو کوئی تعجب کی بات نہیں اور یہی اصول دھن والوں اور کام گاروں پر لاگو ہوتا ہے
جو سارا سال لگاتار ایک ہی چیز بڑی آبادی میں رہ کر یا ایک ہی کام کرتے رہتے ہیں۔

آخر دُنیا کے اندر کونسی ایسی چیز ہے جو ہمیں اپنی زندگی آرام اور چین کے ساتھ بسر کرنے
کے راستہ میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ انڈسٹری میں کوئی ایسی چیز نہیں جو ہاتھ کی کار کرنے والوں
کو ہاتھ کی کار لیاقت اور ہنر کے ساتھ کرنے سے روکتی ہو۔ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ اگر
گرمیوں میں کارخانوں میں کام کرنے والوں کو کارخانوں سے ہٹا لیا جائے۔ تو اس سے تیاری (مال)
میں فرق پڑ جائے گا۔ لیکن ہمیں اِس معاملہ پر غور کرتے وقت ساری خلقت کی بھلائی کا خیال رکھنا
چاہیئے۔ ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اس طرح تین یا چار مہینے باہر کھیتوں پر کام کرنے کے بعد کارخانوں
کے اندر کام کرنے کے لیئے کتنے لوگ اکٹھے ہو جایا کریں گے۔ اور اُس کے ساتھ یہ بھی سوچنا چاہیئے
کہ اس طرح سے جب لوگ باہر نکلا کریں گے تو شہر میں رہنے کا خرچ کتنا گھٹ جایا کرے گا۔

جیسا کہ میں پیچھے کسی بیان میں کہہ آیا ہوں۔ ہم نے کھیتی باڑی اور کارخانوں کا میلان کرنے
کے لئے ہمیشہ کوشش کی ہے۔ اور اس میں ہمیں پوری کامیابی ہوئی ہے۔ ڈیٹرائے کے پاس ہی
مقام نارتھ ول میں ہم نے ایک چھوٹی سی فیکٹری جاری کی ہے۔ جو ڈھبنیاں بناتی ہے۔ اس کا
انتظام اور مشینیں نہایت معمولی اور سادہ ہیں۔ کیونکہ اس کارخانہ میں صرف ایک ہی چیز تیار ہوتی
ہے۔ اس لئے یہاں کام کرنے کے لئے ہمیں خاص کاریگروں کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں
پڑتی۔ سارا ہنر تو یہاں کی لگی ہوئی مشینوں میں ہے۔ سال میں کچھ عرصہ گاؤں کے لوگ اس کارخانے
میں نوکری کرتے ہیں۔ اور باقی وقت میں اپنی کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ کیونکہ مشینوں کے ذریعے
کھیتی باڑی کرنے میں بہت محنت نہیں کرنی پڑتی۔ کارخانوں کے اندر بجلی کی طاقت پانی سے پیدا
کی جاتی ہے۔

ڈیٹرائے سے لگ بھگ پندرہ میل کے فاصلے پر ہم نے اس سے کچھ بڑا ایک کارخانہ مقام
فلیٹ راک پر جاری کیا ہے۔ یہاں ہم نے دریا میں بند لگا دیا ہے۔ یہ بند ڈیٹرائے سے آنے جانے

کے واسطے پل کا کام بھی دیتا ہے۔ اس مقام پر ٹولیڈو اینڈ آئرن تن ریلوے کو ایک پل بنانے کی ضرورت تھی اور لوگوں کے لئے آنے جانے کے واسطے یہاں پر ایک سڑک بھی درکار تھی۔ یہ سب کام اس بند بنانے سے ایک ہی بار ہو گئے۔ ہم اس کارخانہ میں اپنا شیشہ تیار کر لیں گے۔ بند لگانے کی وجہ سے دریا میں اس جگہ ہمارے کچے مسالوں کو بہا کر لانے کے لئے کافی اچھا پانی ہو جاتا ہے یہاں پر ہم نے ایک چھوٹا سا کارخانہ بھی لگا دیا ہے جس سے اس کارخانہ کو چلانے کے لئے بجلی پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ چاروں طرف دور دور تک کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کبھی ممکن نہیں۔ کہ یہاں کبھی بہت آبادی کی بھیڑ بھاڑ ہو سکے۔ یا آبادی بڑھ جانے سے جو ایک جگہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ ہو سکیں یہاں آدمیوں کے پاس کھیتی کرنے کے لئے ہمیشہ کافی زمین رہے گی۔ اور کارخانہ میں کام بھی اُن کو ہمیشہ ملتا رہے گا۔ یہ کھیت اور کارخانہ کے ارد گرد پندرہ یا بیس میل تک پھیلائے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ آج کل کامگاروں کے لئے موٹروں میں چڑھ کر کارخانے آنے جانے کی وجہ سے بالکل کوئی دقت نہیں رہی اس طریقہ سے ہم دُنیا کو دکھا دیں گے کہ کس طرح سے کھیتی باڑی اور انڈسٹری کا ایک ہی جگہ پر ملاپ ہو سکتا ہے۔ اور کس طرح سے ہم آبادی کے بھیڑ بھڑکے کی خرابیوں سے بالکل بچ سکتے ہیں۔

میری رائے میں یہ خیال کہ ایک صنعتی ملک کو اپنی ساری طاقت اور توجہ صرف صنعت پر ہی خرچ کر دینی چاہیئے درست نہیں۔ یہ صرف ملک کی صنعتی ترقی کرنے کا ایک راستہ ہے۔ جوں جوں ہم کو مال بنانے کی زیادہ سمجھ آتی جائے گی اور ہم کو ایسی چیزیں تیار کرنے کی زیادہ عقل آتی جائے گی جن کے پُرزے ایک میں سے نکال کر دوسری چیزمیں بڑی آسانی کے ساتھ فٹ ہو سکتے ہوں۔ توں توں ہم بہتر سے بہتر حالتوں اور جگہوں میں پُرزے بنانے سیکھ جائیں گے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو جگہیں اور حالتیں کارخانوں میں کام کرنے والوں کے لحاظ سے سب سے عمدہ ہیں۔ وہی کارخانہ داروں کے لئے بھی سب سے زیادہ مفید ہیں۔ ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ایک بڑا کارخانہ کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ ایک چھوٹی ندی پر ایک چھوٹا ہی کارخانہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور اگر ایسے بہت سے چھوٹے کارخانے جاری کر دئے جائیں۔ جن میں سے ہر ایک صرف ایک ہی

چیز تیار کرتا ہو۔ تو ان سب کے میل جول سے جو چیز تیار ہوگی۔ وہ ایک بہت بڑا کارخانہ ایک ہی جگہ پر لگانے کی نسبت کہیں زیادہ سستی پڑے گی۔ مگر چند کام ایسے بھی ہیں جیسے کہ ڈھلائی کا کام جن کے کرنے میں اس طریقہ پر چل کر فائدہ نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں جیسا کہ ریورنڈ کے کارخانے میں ہم ایک ہی جگہ لوہے کو بناتے اور گلاتے ہیں۔ اور جو مال اس میں سے پھوکٹ نکلتا ہے اس کو وہیں استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس کے لئے ایک ہی مقام پر بہت زیادہ لاگت لگانے اور کامگاروں کو اکٹھا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ایسے دھندے اتنے تھوڑے ہیں کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اور وہ اتنے زیادہ نہیں جس سے ایک ہی جگہ انڈسٹری کی خاطر بھیڑ بھاڑ سے بچنے کے قاعدے کو توڑنے کی ضرورت ہو۔

جوں جوں صنعت بڑھے گی۔ توں توں یہ ٹکڑوں میں تقسیم ہوکر بنتی چلی جاوے گی۔ اگر آج ایک شہر تباہ ہو جائے تو پھر یہ دوبارہ بالکل ویسا ہی کبھی نہیں بنایا جاسکتا جس سے ثابت ہے کہ ہماری شہروں کی اصلی حیثیت کیا ہے۔ شہر بھی ایک ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ اور ان سے ایک کام بھی نکلتا ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ اگر شہر نہ ہوں تو گاؤں کے لوگوں کا اتنا اچھا گزارہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ آبادیوں میں رہ کر لوگوں کو کچھ بھید پتہ لگ گئے ہیں۔ اگر وہ گاؤں میں ہی رہتے تو وہ یہ باتیں کبھی نہ سیکھتے۔ صحت کے اصول روشنی اور بھائی چارے کے اصول یہ سب چیزیں انسان نے شہروں میں رہ کر ہی اپنے تجربوں سے حاصل کی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کے اندر ہماری جتنی آج کل گھریلو خرابیاں ہیں اُن سب کی جڑ یہ شہر ہی ہیں۔ گاؤں میں رہنے والے لوگ جو موسم کے لحاظ سے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نہ بالکل غریب ہیں اور نہ بہت امیر۔ اور بڑے شہروں میں جو اُتھل پتھل اور ہلچل کے اتنے زہریلے کیڑے پھیل رہے ہیں۔ وہ اُن کے ہاں موجود نہیں۔ ایک دس لاکھ کی آبادی والے شہر میں ضرور کوئی ایسی خراب چیز ہے۔ جو کبھی دور نہیں کی جاسکتی۔ اور جس سے ہمیشہ ڈر لگا رہتا ہے۔ تیس میل باہر گاؤں میں آرام اور چین سے زندگی بسر کرنے والے لوگ شہروں کی چیخ پکار اور خون خرابے کے قصے پڑھتے رہتے ہیں۔ ایک بڑا شہر سچ مچ بہت ہی محتاج ہوتا ہے۔ ہر ایک چیز جو یہاں پر استعمال ہوتی ہے وہ باہر سے آتی ہے

اگر باربرداری کا سلسلہ آج بند کر دیا جائے تو تمام شہر اُجاڑ ہو جاویں۔ یہ صرف اپنی مکانوں کے سہارے زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن یہ دُکانیں خود کچھ پیدا نہیں کر سکتیں۔ شہر اپنے سر پر رہ کر نہ کھا پی سکتا ہے۔ نہ پوشاک پہن سکتا ہے۔ نہ روشنی حاصل کر سکتا ہے۔ اور نہ اپنے رہنے کے لئے مکان ہی بنا سکتا ہے۔ شہر میں کام کرنے اور رہنے کی حالتیں اس قدر بناوٹی ہیں کہ ان کو اتنا غیر قدرتی دیکھ کر آدمی کا جی سخت کھٹا ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور بڑا سبب یہ بھی ہے کہ بڑے شہروں میں رہنے اور دھندے چلانے کا خرچ اس قدر بڑھ گیا ہے۔ جو ایک آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ وہاں پر زندگی بسر کرنے کے خرچ اتنے زیادہ ہیں کہ ایک آدمی کے پاس اپنے کھانے پینے اور رہنے کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ گورنمنٹ کے محکموں کو روپیہ بڑی آسانی سے اُدھار مل جاتا ہے۔ اور اس لئے یہ محکمے خوب جی بھر بھر کر روپیہ اُدھار لے لیتے ہیں۔ پچھلے دس سال کے اندر ملک میں ہر ایک میونسپلٹی کا خرچ حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔

کچھ خرچ تو اس رقم پر سود کی وجہ سے ہو جاتا ہے۔ اور باقی روپیہ اینٹ پتھر اور گارا مول لیتے ہیں، یا شہری زندگی کی دوسری ضرورتیں پورا کرنے والی جیسے کہ ڈاٹ وَرکس اور گندہ پانی نکالنے کی موریاں اور نالے بنانے اور اسی طرح کی دوسری نکمّی چیزوں کو حاصل کرنے میں ضرورت سے کہیں زیادہ خرچ کر دیا جاتا ہے جتنا ان چیزوں کو بنانے اور جاری رکھنے۔ لوگوں میں امن و امان قائم رکھنے اور سڑکوں پر بھیڑ کی روک تھام کرنے میں خرچ کرتی ہے۔ اُس کے مقابلے میں شہر اور آبادی کو بہت ہی کم فائدہ ہوتا ہے۔ نئے زمانہ کے مطابق جو شہر آباد و حال میں ہوئے ہیں۔ اُن میں چیزیں اب تک بہت ضائع ہوتی رہی ہیں۔ اس لئے آج یہ شہر اندر سے بالکل کھوکھلے ہو گئے ہیں۔ اور ان کا بہت جلد بالکل دیوالہ نکل جائے گا

ملک کے اندر ایک ہی بار نہیں بلکہ آہستہ آہستہ اگر بجلی سستے داموں پر اور واجب طاقت کی کافی تعداد میں پیدا کرنے کے سامان بنا دئے جائیں۔ تو اس سے عام لوگوں کو سکھ اور چین کے ساتھ اپنی زندگیاں بسر کرنے میں اور چیزیں فضول ضائع نہ ہونے دینے میں جن دو چیزوں کے نہ ہونے کی وجہ سے دُنیا میں اتنی غریبی ہے سب سے زیادہ مدد ملے گی۔ بجلی کئی طریقوں سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ کسی خاص جگہ کے لئے بجلی پیدا کرنے کے واسطے کان کے منہ پر بھاپ کا کارخانہ لگانا سب سے زیادہ سستا ہے۔

اور دوسری جگہ شاید پانی سے بجلی پیدا کرنے میں سب سے زیادہ فائدہ رہے لیکن اس میں شک نہیں
کہ ہر شہر اور آبادی کے لئے سستی بجلی پیدا کرنے کا ایک کارخانہ ضروری ہونا چاہیے۔ بلکہ اسے اتنا ہی
ضروری سمجھنا چاہیئے جتنا کہ کسی مقام کے لئے ریلوے یا واٹر ورکس کا ہونا۔ اگر روپیہ کی لاگت کا سوال
نہ ہو تو ملک کے اندر جہاں جہاں سے بھی بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اُن تمام جگہوں میں ہم کو اس کے
کارخانے ضرور لگانے چاہیں۔ تاکہ ساری خلقت کا بہت بھلا ہو۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ پونجی کی نسبت
ہمارے جو اس وقت خیال ہیں اُن میں ہمیں تھوڑی بہت ضرور تبدیلی کرنی ہوگی۔

جو پونجی ایک دھندے سے پیدا ہوتی ہے وہ کامگاروں کی ترقی کے لئے اور ان کے آرام
اور خوشحالی کو بڑھانے کے واسطے استعمال ہونی چاہیئے۔ اُس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں کاریگروں
کو کام میں لگانے کے لئے استعمال کرنی چاہیئے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کوشش کرنی چاہیئے
کہ جہاں تک ممکن ہو سکے۔ پبلک کو بڑھیا سے بڑھیا مال تیار کر کے سستے سے سستے داموں پر اس قسم
کی پونجی چاہے ایک ہی آدمی کے ہاتھ میں کیوں نہ ہو۔ اُس سے خدا کی خلقت کو بالکل کوئی اندیشہ نہیں
یہ دھندے میں سے نکلا ہوا فالتو روپیہ امانت کی چیز ہے۔ جو سب لوگوں کی بھلائی کے لئے روزمرہ
استعمال ہوا کرے گا۔ اس پونجی کو سنبھال کر رکھنے والا اسے ہرگز کبھی اپنی نجی دولت یا انعام نہیں سمجھ سکتا
اس فالتو روپیہ پر اکیلے کسی آدمی کا بھی حق نہیں۔ چونکہ اُس نے اکیلے اس کو نہیں کمایا۔ یہ اُس کے کارخانے
کے سبھی ملازموں نے مل کر کمایا ہے۔ مالک نے اس روپے کو پیدا کرنے میں چاہے اپنی ساری ہمت
اور لیاقت خرچ کر دی ہو مگر پھر بھی اس میں ساری لیاقت، اور ہمت اکیلے صرف اُسی کی نہیں۔ اُسکا
ہر ایک کام گار اُس کے پیدا کرنے میں اس کا ساجھی ہے۔ کوئی دھندا کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا
جس میں صرف آج کی ہی فکر کی جائے۔ اور جو لوگ اس وقت اُس میں کام کر رہے ہوں۔ صرف
اُنہیں کا دھیان رکھا جائے۔ اس دھندے کو آئندہ بھی چلانا ہے اور اس کا ہمیشہ خیال رکھنا ہوگا
اس لئے بڑھیا سے بڑھیا تنخواہیں جو مناسب ہوں اپنے ملازمین کو دینی چاہیئں۔ ہر ایک آدمی جو
اُس دھندے یا کارخانے میں نوکر ہے خواہ اُس کی نوکری بڑی ہے یا چھوٹی اُس کو کم سے کم اتنے
پیسے مل جانے کی ضرور گارنٹی ہو جانی چاہیئے کہ وہ اپنا گزارہ بخوبی کر سکے۔ ایک دھندے کی کامیابی

کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ جو لوگ اس میں کام کرتے ہوں۔ ان کی بھلائی کے واسطے فالتو روپیہ کہیں نہ کہیں اکٹھا ہو جانا چاہئے۔ ایک سچا ایماندار کارخانہ دار ہمیشہ اپنے مناسب منافعوں سے جتنا فالتو روپیہ اور کماتا ہے اس کو اپنے ملازموں کی بھلائی کے لئے امانت کے طور پر رکھتا ہے۔ اس بات سے بالکل کچھ فرق نہیں پڑتا کہ یہ فالتو روپیہ امانت میں کون رکھتا ہے۔ اور اس کی کنجی کس کے پاس ہے۔ دیکھنا تو صرف یہ ہے کہ اس کو خرچ کس طریقہ سے کیا جاتا ہے۔ اور اس کا استعمال کہاں ہوتا ہے۔

جس پونجی سے لگاتار نئے نئے دھندے اور کام نہیں نکلتے۔ وہ ریت کے ایک ڈھیر سے بھی زیادہ نکمّی چیز ہے۔ وہ پونجی جس کی وجہ سے مزدور اور کاریگروں کی حالت لگاتار بہتر نہیں بنتی۔ اور جو مزدوروں اور کاریگروں کو اُن کا مناسب انعام نہیں دیتی وہ اپنا سب سے بڑا فرض پورا نہیں کرتی۔ پونجی کا سب سے بڑا فائدہ صرف زیادہ روپیہ پیدا کرنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ روپے سے عام لوگوں کی زیادہ خدمت کی جا سکے جس سے انسان اپنی زندگی بسر کر سکے اگر ہم اپنے صنعتی دھندوں کے ذریعہ اپنے بھائی برادری کے معاملوں کو اچھی طرح سے سلجھا نہیں سکتے۔ تو ہمارے سامنے جو سب سے بڑا کام ہے ہم اس کو نہیں کرتے۔ ہم اپنا پورا حق ادا نہیں کر رہے ہیں۔

بیان چودہ

ٹریکٹر اور موٹر کے ذریعے کھیتی باڑی

عام طور پر دنیا کو یہ پتہ نہیں کہ ہمکو اپنا ٹریکٹر جس کا ہم نے فورڈسن نام رکھا ہوا ہے۔ اپنی مرضی سے ایک سال پہلے ہی بنانا پڑا۔ کیونکہ انگلینڈ کی لڑائی چھڑ گئی تھی۔ اور انگلینڈ میں خوراک کی بہت کمی بڑ گئی تھی اسلیئے اُن مشینوں کو چھوڑ کر جو ہم نے تجربہ یا آزمائش کرنیکے لیئے بنائی تھیں ہم نے اپنی سب موٹریں اور کاریں اپنے کارخانے سے شروع شروع میں سیدھی انگلینڈ بھیجدی تھیں۔ سنہ ۱۹۱۷-۱۸ء کے نازک سال میں جبکہ ڈبکنی کشتیاں بڑی زور سے چل رہی تھیں۔ ہم نے پانچہزار ٹریکٹر سمندر پار انگلینڈ روانہ کیئے تھے۔ یہ سب کے سب ثابت وہاں پر پہنچ گئے تھے۔ اور انگریزی گورنمنٹ نے اس بات کو صاف لفظوں میں تسلیم کر کے اپنی شرافت کا ثبوت دیا ہے۔ کہ اگر اس وقت یہ بھیجکر ہم اُن کی مدد نہ کرتے تو خوراک کی کمی ہو جانے کی وجہ سے جو حالت پیدا ہو گئی تھی اُس کا وہ مشکل سے مقابلہ کر سکتے تھے۔ یہی وہ ٹریکٹر تھے جن کو تمام انگلینڈ میں پرانی جاگیروں اور گھوڑ دوڑ کی زمینوں میں انگریز عورتوں نے چلاکر فصل بوئی اور کاشت کی۔ اس کی وجہ سے فوج کے لیئے اور گولہ بارود کے کارخانوں میں کام کرنے کیواسطے آدمیوں کی کمی نہیں پڑی

یہ سارا واقعہ اس طور پر ہوا جس وقت ۱۹۱۷ میں ہم نے اس جنگ میں قدم رکھا اس وقت انگلینڈ کے محکمہ خوراک نے یہ دیکھا کہ جرمنی کی ڈبکنی کشتیاں سمندر میں ان کا مال و اسباب لیجانیوالا

ایک جہاز اوسط طور پر لگ بھگ ہر روز غرق کر دیتی ہیں ورنہ سمندر سے پار امریکن فوجوں کو بھیجنے کے واسطے امریکن اور انگلینڈ کی فوجوں کے پاس کافی گولہ بارود پہنچانے اور فوجوں کو خوراک پہنچانے اور اسکے علاوہ خود انگلینڈ کے اندر رہنے والے لوگوں کے لئے کافی خوراک پہنچانے کے واسطے ان کے پاس بالکل تھوڑے جہاز رہ گئے ہیں۔ تب انھوں نے انگریز عورتوں اور کنبوں کو انگلینڈ سے باہر کالونیوں میں بھیجنے کا انتظام کیا۔ اور اپنے انگلینڈ کے اندر زیادہ اناج پیدا کرنے کی اسکیم نکالی اس وقت حالت نہایت نازک تھی سارے انگلینڈ میں اس وقت زمینوں میں ہل چلانے اور کاشت کرنے کے لئے جو ڈھور ڈنگر موجود تھے ان کی تعداد اس قدر تھوڑی تھی کہ ان سے جو اناج پیدا کیا جا سکتا تھا اس کی مقدار دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے اناج کے مقابلے میں آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ موٹر کی طاقت کے ذریعے کھیتی باڑی کرنا کوئی نہیں جانتا تھا۔ کیونکہ جنگ سے پہلے انگلینڈ میں کھیتوں کی زمینیں بڑی چھوٹی ہوا کرتی تھیں جن کے لئے کاشتکاری کی بھاری اور مہنگی مشینیں درکار نہ تھیں۔ خاصکر جبکہ کھیتی باڑی کرنے کے لئے مزدور بہت سستے اور کافی تعداد میں مل جاتے تھے انگلینڈ میں کئی کمپنیوں نے ٹریکٹر بنائے لیکن وہ بہت وزنی تھے اور اکثر بھاپ سے چلنے والے تھے اس کے علاوہ وہ کافی تعداد میں بھی نہیں بنے تھے اور ان کو اور زیادہ تعداد میں بنانا اتنا آسان نہ تھا کیونکہ تمام فیکٹریاں اس وقت گولا بارود کا سامان بنانے میں لگی ہوئی تھیں اور اگر وہ بناتیں بھی تو وہ ٹریکٹر اتنے بھاری اور بھدے بناتیں کہ وہ درمیانے درجے کے کھیتوں پر کام نہیں دے سکتے تھے۔ اور ان کو چلانے کے لئے مستری درکار ہوتے۔

ہم نے اپنے مانچسٹر کے کارخانے میں کئی ٹریکٹر لوگوں کو چلا کر دکھلانے کے لئے جمع کر چھوڑے تھے وہ یونائیٹڈ اسٹیٹس میں بنائے گئے تھے اور انگلینڈ میں صرف ان کے پرزوں کو جوڑ کر کھڑا کر لیا گیا تھا۔ بورڈ آف ایگریکلچر (Board of Agriculture) نے رائل ایگریکلچرل سوسائٹی (Royal Agricultural Society) کو درخواست کی کہ وہ ان ٹریکٹروں کی جانچ کر کے رپورٹ پیش کرے۔ ان کی رپورٹ یہ تھی:-

انگلینڈ کی رائل ایگریکلچرل سوسائٹی (Royal Agricultural Society)

کی درخواست پر ہم نے دو فورڈ ٹریکٹروں کی جانچ کی جن کی 5 سے گھوڑے کی طاقت بتائی جاتی ہے اور جن کو ہم نے چلتے ہوئے دیکھا سب سے پہلے ان کو ایک گندی اور سخت کلر زمین میں ہل چلا کر آزمایا۔ جوتا اور اس کے بعد ان کو ایک معمولی زمین میں جس پر بہت سا جنگلی گھاس پھوس اُگا ہوا تھا چلایا۔ اور اس طریقے سے ہم کو یہ اندازہ لگانے کا پورا پورا موقعہ مل گیا کہ ہموار زمین اور پہاڑی ڈھلوان علاقے میں ان کے موٹر کے اندر کام کرنے کی کتنی طاقت ہے۔

پہلی جانچ میں دو ہلائی کرنے والا آلیور (Oliver) ہل چلایا گیا جس نے عام طور پر پانچ انچ گہری اور سولہ (16) انچ چوڑی زمین میں ہلائی کی پھر ایک تین ہلائی کرنے والا کوک شٹ (Cock - Shutt) ہل چلایا گیا جس نے زمین تو اتنی گہری ہی جوتی۔ مگر وہ چوڑائی صرف ۱۰ انچ کرتا تھا۔

دوسری جانچ میں ایک تین ہلائی والا ہل استعمال کیا گیا جس سے عام طور پر چھ (6) انچ گہری زمین جوتی گئی۔

دونوں حالتوں میں موٹر نے کام بڑے مزے سے کیا۔ اور ایک ایکڑ زمین جوتنے کے لئے ڈیڑھ ($1\frac{1}{2}$) گھنٹہ لگا۔ اور فی ایکڑ $2\frac{1}{3}$ گیلن پیرافین خرچ ہوا۔

ہماری رائے میں یہ نتیجے تسلی بخش ہیں۔

زمین کے لحاظ سے ہل جو استعمال کئے گئے اتنے اچھے نہ تھے اس لئے ٹریکٹر اپنا پورا کام کر کے نہیں دکھا سکے۔

ہم نے تول کر دیکھا کہ پورے ایندھن اور پانی سمیت ایک ٹریکٹر کا وزن $23\frac{1}{2}$ ٹن ہوتا تھا۔ اس کی طاقت کو دیکھتے ہوئے ٹریکٹر کا وزن بہت ہلکا ہے اس لئے زمین پر خوب چلتا ہے۔ آسانی سے چلایا جا سکتا ہے۔ بہت چھوٹے چکر میں گھوم لیتا ہے اور چلنے وقت بہت تھوڑی زمین چھوٹتی ہے۔

ایک ٹھنڈے ٹریکٹر کی موٹر کو تھوڑا سا پٹرول دے کر بہت جلدی گرم کر کے چلایا جا سکتا ہے۔

اتنے امتحان لینے کے بعد ہم مسٹرز فورڈ کے کارخانے میں گئے جو ٹریفورڈ پارک مانچسٹر (Trafford Park Manchester) میں واقع ہے۔ یہاں پر جن ٹریکٹروں کی ہم ابھی جانچ کر کے آئے تھے۔ وہ یہاں پر منگوا لئے گئے تھے اور اُن میں سے ایک کی موٹر کو کھولا جا رہا تھا۔ تا کہ ہم تمام

پرزوں کی بھی اچھی طرح سے دیکھ بھال کر سکیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پرزے کافی مضبوط ہیں اور ان کی کوالٹی نہایت عمدہ ہے۔ مگر ہماری رائے میں ان کے پہیے ہلکے ہیں۔ لیکن ہمیں بتایا گیا ہے کہ آئندہ ان کی شکل میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ اور نئے پہیے جو آگے کو سپلائی کئے جائیں گے وہ بہت مضبوط ہوں گے۔

یہ ٹریکٹر صرف زمین پر کام کرنے کے خیال سے تیار کیا گیا ہے اور ان کے پہیوں میں بچاؤ کے لئے کھوپریاں لگی ہوئی ہیں لیکن اگر ان پہیوں کی حفاظت کے لئے چاروں طرف کچھ جنگلا سا بھی لگ جائے جس سے یہ ٹریکٹر سڑک پر آسانی کے ساتھ ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں لیجانے کے لئے چل سکے تو ہمارے خیال میں بہت مناسب ہو گا۔

ان سب باتوں کا دھیان رکھتے ہوئے ہم موجودہ حالت میں سفارش کرتے ہیں کہ ان ٹریکٹروں کو فوراً زیادہ سے زیادہ تعداد میں بنانے کا انتظام کیا جائے۔

اس رپورٹ پر دستخط کرنے والوں کے نام یہ ہیں۔

Prof W.E. Dalby اور F.S. Courtney انجینیر۔
R.N. Greaves انجینیر اور کھیتی باڑی کے جانکار Robert W. Hobbs
اور Henry Overman کھیتی باڑی کے جانکار۔ Gilbert Greenall
آنریری ڈائریکٹر اور John E. Cross سکریٹری۔

اس رپورٹ کے پیش ہونے کے فوراً ہی بعد ہمیں یہ تار وصول ہوا۔ اس وقت تک آپ کی جانب سے کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی ہے کہ آیا آپ نے کارک فیکٹری کے واسطے ابھی تک ضروری فولاد اور مشینیں روانہ کر دی ہیں یا نہیں۔ کیونکہ خواہ کتنی بھی کوشش کیوں نہ کر لی جائے۔ کارک (Cork) کی فیکٹری اگلے موسم بہار سے پہلے مال تیار کر کے نہیں دے سکے گی۔ انگلینڈ میں اس وقت اناج کی کمی ہو جانے کی وجہ سے حالت بڑی خراب ہے اس لئے انگلینڈ کی بنجر زمینوں میں ہل چلانے کے لئے اور اگلی فصل کی گندم بونے کے لئے ٹریکٹر کافی تعداد میں جلدی سے جلدی یہاں پہنچنے چاہئیں مجھے گورنمنٹ کے اعلیٰ افسروں کی طرف سے ہدایت ہوئی ہے کہ میں مسٹر فورڈ کو امداد کرنے کے لئے اپیل

کروں. کیا آپ تمام ضروری چیزوں اور مشینوں وغیرہ کے نقشے دے کر سورن سن (Sorensen)
اور دوسرے آدمیوں کو یہاں بھیجنے کے لئے تیار ہیں. انگریزی گورنمنٹ اُن کو آپ سے اس واسطے اُدھار
لینا چاہتی ہے تاکہ سورن سن (Sorensen) کی ہدایت کے مطابق چل کر سرکاری فیکٹریوں میں بکٹروں
کے پرزے بنائے جاویں اور ٹریکٹر جوڑے جائیں. میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم یہ تجویز صرف قوم
کی خاطر پیش کر رہے ہیں اور اگر یہ منظور ہو گئی تو یہ لوگوں کا بھلا کرنے کے واسطے سرکار خود اپنے ہاتھ
میں رکھ کر چلائے گی. مگر اس سے گورنمنٹ یا کسی اور کا اس چیز کو بنانا سیکھنے. روپیہ پیدا کرنے یا منافع
کمانے کا بالکل منشا نہیں ہے. معاملہ سخت ضروری ہے. ہم امریکہ میں کسی اور جگہ سے اس خوراک
کی کمی کو پورا کرنے کے لئے کوئی انتظام نہیں کر سکتے. کیونکہ ہمیں یہ ٹریکٹر ہزاروں کی تعداد میں چاہئیں
اس کام کے لئے فورڈ ٹریکٹر کا ڈیزائن بھی سب سے بہتر سمجھا گیا ہے. اور اس کے علاوہ اور کوئی
ڈیزائن مناسب نہیں پایا گیا. اس لئے ہماری قومی ضرورت صرف مسٹر فورڈ کے ڈیزائن سے ہی
پوری ہو سکتی ہے. کام کی وجہ سے میں خود امریکہ آکر یہ تجویز آپ کے آگے پیش نہیں کر سکتا. مگر میں آپ
کی خدمت میں پورے زور کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس تجویز کو مہربانی کر کے ضرور منظور کریں اور فوراً
فیصلہ کریں. ہم مال کو تیار کرنے میں جتنی بھی مدد ہم سے ہو سکے گی کریں گے اور ہماری گورنمنٹ بالکل ایمانداری کے
ساتھ اس سارے کام پر اپنی پوری نگرانی رکھیگی. امریکہ سے سورن سن یا اور جیسی اور جتنی مدد اور ہدایت آپ
ہمیں بھیج سکیں. اُسکو پاکر ہمیں بڑی خوشی ہوگی. تار کا جواب اس پتہ پر دیں.

پیری معرفت ہارڈنگ پروڈوم - لندن —————— پروڈوم -

مجھے پتہ لگا ہے کہ یہ تار انگریزی گورنمنٹ کے وزیروں کی ہدایت کے مطابق دی گئی تھی. ہم نے فوراً
یہ جواب بذریعہ تار دیا کہ ہمارے پاس جو نقشے موجود ہیں وہ سب ہم آپ کو دکھلانے کے لئے بالکل تیار ہیں
اور جو کچھ ہم نے آج تک تجربوں سے حاصل کیا ہے اُسکو ہم بڑی خوشی سے بتا دیں گے اور جتنے آدمی بھی ہم مال
تیار کرنے کے لئے انگلینڈ بھیج سکتے ہیں بھیج دینگے. اور اس تار کو دینے کے بعد ہم نے انگلینڈ کو جانیوالے اگلے
جہاز میں چارلیس. ای. سورن سن کو تمام نقشے دے کر انگلینڈ بھیج دیا. مسٹر سورن سن نے ہی پہلے مانچسٹر جاکر
کارخانہ لگایا تھا اور انگلینڈ کی حالت سے واقف تھا. ہمارے ہاں ٹریکٹروں کے بنانے کا سارا کام اُسکے

اختیار میں تھا۔

مسٹر سورن سن نے انگریزی افسروں سے مل کر انگلینڈ میں سب پرزے بنانے اور اُن کو جوڑنے کا کام شروع کیا مگر بہت سے کچھ مصالحے جن کو ہم برتتے تھے خاص ہوتے تھے جو انگلینڈ میں مل نہیں سکتے تھے۔ انگلینڈ کی تمام فیکٹریاں جو ڈھلائی اور مشینوں کے بنانے کا کام کرنے کے قابل تھیں سامان گولا بارود کے آرڈروں سے بھری پڑی تھیں۔ اور انگریزی گورنمنٹ کے لئے اُن کے واسطے کسی قسم کے ٹینڈر (ٹھیکے) حاصل کرنا بہت ہی مشکل ہوگیا تھا۔ اتنے میں جون کا مہینہ سر پر آگیا اور لنڈن پر دشمن کے تباہ کرنے والے ہوائی حملے شروع ہو گئے۔ حالت نہایت نازک ہوگئی مگر کچھ نہ کچھ کرنا ضرور تھا آخر ہمارے آدمیوں نے بڑی کوشش کر کے اور بہت سی فیکٹریوں میں گھوم پھر کر گورنمنٹ کے پاس کچھ ٹینڈر بھجوائے۔

لارڈ ملنر (Mil ner) نے یہ ٹینڈر مسٹر سورن سن کو دکھائے ان میں جو سب سے اچھا ٹینڈر تھا اُس کے مطابق ایک ٹریکٹر کی قیمت ساڑھے چار ہزار روپیہ آتی تھی۔ مگر پھر بھی اس ٹینڈر میں یہ کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ ٹریکٹر کب تک بن کر گورنمنٹ کو مل جائیں گے۔ مسٹر سورن سن نے کہا کہ یہ قیمت حد سے زیادہ ہے۔ ٹریکٹروں کی قیمت فی ٹریکٹر اکیس سو (۲۱۰۰) روپیہ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ لارڈ ملنر نے اُس سے پوچھا کہ کیا تم پانچ ہزار (۵۰۰۰) ٹریکٹر اس قیمت پر بنا کر ہمیں دے سکتے ہو۔ مسٹر سورن سن نے جواب دیا۔ "ہاں"۔ تب لارڈ ملنر نے پوچھا۔ کہ ہمیں ان ٹریکٹروں کے تیار کرنے میں کتنا عرصہ لگے گا۔ مسٹر سورن سن نے کہا۔ کہ ہم ساٹھ دن کے اندر یہ ٹریکٹر بنا کر امریکہ سے روانہ کرنے شروع کر دیں گے۔

اس ٹھیکے پر فوراً وہیں دستخط ہو گئے۔ مگر اس ٹھیکے میں ہم نے ایک یہ بھی شرط لکھوائی تھی کہ کل قیمت کا ایک چوتھائی ($\frac{1}{4}$) روپیہ ہم کو بطور پیشگی پہلے مل جانا چاہیئے۔ مسٹر سورن سن نے ہمیں تار دے کر ان سب باتوں کی اطلاع دی اور خود اگلے جہاز پر چڑھ کر واپس امریکہ آگیا۔ شائد یہاں پر یہ لکھنا نامناسب نہیں ہوگا کہ ہم نے اس پیشگی کی اس رقم کو جب تک سارا ٹھیکہ ختم نہیں کر لیا بالکل ہاتھ نہیں لگایا اور تب تک ہم نے اس کو ایک طرح سے امانت کی رقم سمجھا۔

مگر یہ ٹریکٹر ابھی اتنا بننا شروع نہیں ہوا تھا کہ اس کو ہم بازار میں بیچنے کے لئے بھیج سکتے۔ اس کام کے لئے ہمارا ہائی لینڈ پارک (High Land Park) کا کارخانہ سب سے اچھی جگہ تھی مگر اُس وقت اس کی

ہر ایک مشین جنگ کے ضروری کام میں رات دن لگی ہوئی تھی۔ اب ہمارے پاس صرف ایک ہی چارا تھا ہم نے اپنے ڈیر بورن (Dear Born) کے کارخانہ کو ضرورت سے موافق عارضی طور پر بڑھالیا اور اس کے لئے مشینری تار دے کر آرڈر کی اور بذریعہ سواری گاڑی منگوائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ۶۰ دن کے اندر ہی اپنے ٹریکٹروں کا پہلا لاٹ بنا کر انگریزی افسروں کے سپرد نیو پارک کی بندرگاہ میں کر دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُن کو اس کو لے جانے والا جہاز جلدی نہ مل سکا۔ مگر ہمیں ۶ دسمبر ۱۹۱۷ء کو یہ تار ملی: لنڈن ۵ دسمبر ۱۹۱۷ء۔ بنام سورن سن۔ معرفت فورڈسن۔ آف۔ آر۔ ڈیر۔ بارن (Dear Born) آپ کے پہلے ٹریکٹر پہنچ گئے۔ سمتھ اور دوسرے آدمی انگلینڈ کب تک پہنچیں گے؟ تار کے ذریعہ جواب دو۔

پیری۔

یہ پانچ ہزار ٹریکٹر ہم نے تین مہینے کے اندر بنا کر انگلینڈ سپلائی کر دیئے۔ اور اسی وجہ سے یونائیٹڈ سٹیٹس (United States) سے پہلے انگلینڈ میں ان ٹریکٹروں کا رواج ہو گیا۔

سب سے اول ہماری اسکیم ٹریکٹر بنانے کی ہی تھی۔ موٹر کاریں بنانے کا خیال ہمیں بہت پیچھے آیا تھا۔ شروع شروع میں میں نے ان ٹریکٹروں کا اپنے کھیتوں پر چلا کر تجربہ کیا تھا۔ اور سب کو پتہ ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے میں اُن دنوں بھاپ سے چلنے والے ٹریکٹروں کے بنانے والے ایک کارخانے میں ملازم رہا تھا۔ ایک طرح سے یہ ٹریکٹر سڑک کوٹنے والے اور زمین ہموار کرنے والے بڑے بھاری انجن تھے۔ اُس وقت مجھے یہ بالکل اُمید نہیں تھی کہ بڑے ٹریکٹروں کے استعمال کرنے کا بھی کبھی وقت آئے گا۔ چھوٹے کھیتوں پر کام کرنے کے لئے یہ بہت ہی مہنگے تھے۔ اور ان کے چلانے کے لئے بڑی لیاقت کی ضرورت تھی اور جتنی ان میں کھینچ کرنے کی طاقت تھی اُس کے مقابلے میں یہ بہت ہی بھاری تھے۔ کم از کم لوگوں کی یہی خواہش تھی کہ کوئی چیز ایسی ہونی چاہیئے جو کھینچنے کی نسبت اپنے اندر بھار اُٹھانے کی زیادہ طاقت رکھتی ہو۔ اس لئے اُن کو ایک ایسی گاڑی (ٹریکٹر) بہت بھاتی تھی جس میں کسی گھوڑے کو لگانے کی ضرورت نہ ہو۔ ان باتوں کا خیال کر کے جب تک میں نے موٹر کاریں نہ بنا لیں تب تک ٹریکٹر بنانے کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ جب کھیتوں میں موٹر کاریں چلنے لگیں تو وہاں پر ٹریکٹروں کا ہونا لازمی ہو گیا۔ کیونکہ تب کسانوں کو بجلی کی طاقت کے فائدوں کا اچھی طرح سے علم ہو گیا تھا۔

ایک کسان کو نئے اوزاروں کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ بجلی کی طاقت کی جس کی مدد سے وہ اپنے ان اوزاروں سے کام لے سکے جو اُسکے پاس موجود ہیں ہیں نے کھیتوں میں میلوں ہل کے پیچھے قدم قدم چل کر زمین جوتی ہے۔ اور میں خوب جانتا ہوں کہ یہ کتنی بھاری مصیبت ہے۔ آہستہ آہستہ چلنے والے گھوڑا گاڑی کے پیچھے چلتے ہوئے ایک انسان کے بہت زیادہ گھنٹے اور دن خراب ہوتے ہیں۔ حالانکہ ایک ٹریکٹر کو لے کر وہ اتنے ہی عرصہ میں اس سے چھ گنا کام بڑے مزے کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اس لئے کچھ تعجب نہیں کہ جس حالت میں ایک درمیانہ درجہ کے کسانوں کو ہر کام اپنے ہاتھ سے سارا آہستہ آہستہ کرنا پڑتا ہے۔ تو اس وجہ سے اُس کا گذارہ کیوں نہ مشکل سے چلے گا۔ کیونکہ اس صورت میں نہ تو پیداوار زیادہ ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی وہ جتنے سستے دام واجب ہیں۔ ان پر وہ چیزیں بیچ سکتا ہے۔

اب ہماری یہ خواہش ہوئی۔ کہ موٹر کاروں کی طرح ہمارے ٹریکٹروں میں بھی طاقت تو کافی ہو مگر وزنی نہ ہوں۔ اُس وقت ٹریکٹر بنانے والوں کے دلوں میں یہ پکا خیال بیٹھا ہوا تھا کہ ٹریکٹر ضرور بھاری بننے چاہئیں اُن کا خیال یہ تھا کہ جتنے ٹریکٹر وزنی ہوں گے اُتنی ہی اُن کے اندر کھینچ کی طاقت ہوگی اور کہ اگر مشین بھاری نہ ہوگی تو وہ پکڑ نہ کر سکے گی۔ اُنھوں نے یہ نہیں سوچا کہ ایک بلی کتنی ہلکی ہوتی ہے مگر اوپر کو بڑی تیزی سے چڑھ جاتی ہے۔ وزنی چیزوں کے بنانے کی نسبت جو میرا خیال ہے وہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں یہ میری پختہ رائے تھی کہ سب سے اچھا ٹریکٹر کام کرنے کے لائق جو ہمیں بنانا چاہئے وہ وزن میں ہلکا مضبوط اور ایسا سادہ ہونا چاہئے جس کو ہر کوئی چلا سکے اور اس کے علاوہ اتنا سستا ہو کہ اُسے ہر کوئی خرید سکے۔

یہ ارادے دل میں ٹھان کر ہم نے لگ بھگ پندرہ سال تک اس قسم کے ایک ڈیزائن بنانے کی کوشش کی اور اس کے لئے تجربے کرنے میں کئی لاکھ روپیہ خرچ کر ڈالا۔ ہم نے اس کے بنانے میں وہی خیال اور ڈھنگ اپنے سامنے رکھے جو اصول اور قاعدے ہم نے موٹر کاریں بنانے کے لئے اپنے واسطے قائم کر رکھے تھے ہر ایک پرزہ جتنا مضبوط سے مضبوط بن سکتا تھا بنایا جاتا تھا۔ ہماری کوشش یہی تھی کہ ٹریکٹر کی مشین میں جتنے تھوڑے پرزے لگیں اتنا ہی اچھا ہے مگر ٹریکٹر کی ساری مشین اس قسم کی ہونی چاہئے جو زیادہ سے زیادہ تعداد میں تیار ہو سکے۔ پہلے ہمارا کچھ یہ بھی خیال تھا کہ ٹریکٹر میں اگر موٹر کار والا انجن ہی کام دے سکے تو اسی کو لگا دیا جائے۔ اور ہم نے اس کی خاطر کچھ تجربے بھی کئے۔ لیکن اخیر میں جا کر ہم نے دیکھ لیا کہ جس قسم کا ٹریکٹر

ہم بنانا چاہتے ہیں وہ ہمارے موٹر کار سے بالکل ہی ایک الگ چیز ہے۔ ہم نے شروع سے ہی یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ موٹر کاریں اور ٹریکٹر بالکل جدا جدا کارخانوں میں تیار کیا کریں گے کوئی کارخانہ اتنا بڑا نہیں ہے جو ایک وقت میں دو چیزیں تیار کر کے دے سکے۔

موٹر کار بوجھ اُٹھانے کے لئے اور ٹریکٹر کھینچنے یا اوپر چڑھنے کی غرض سے بنائے جاتے ہیں اور کیونکہ یہ دونوں کام ایک دوسرے سے بالکل ہی الگ الگ ہیں اس لئے اِن دونوں چیزوں کی مشینیں بھی الگ الگ ہینگی۔ ہمارے سامنے ایک مشکل سوال اس قسم کے بیرنگس (Bearings) بنانے کا تھا جو ایک بھاری کھینچ کو سہارنے کے قابل ہوں۔ آخر کار ہم نے اِن کو بنا کر چھوٹا اور ایک اس قسم کا ٹریکٹر تیار کر لیا جو ہر جگہ سب حالتوں میں درمیانے درجے میں نہایت اچھا کام کر سکے۔ ہم نے اس میں ایک چار سلنڈر کا انجن لگایا جو گیسولین سے شروع میں چلایا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ مٹی کے تیل سے چلتا رہتا ہے۔ اس قسم کا ایک مضبوط ٹریکٹر جو ہم تیار کر سکیں اُس کا وزن تین من چھ سیر تھا ایک بلّی کے پنجوں کی طرح ہمارے ٹریکٹروں میں بھی پکڑ کی طاقت ہانکنے والے پہیوں کی روکوں میں ہے۔

ایک ٹریکٹر سے کھینچ کا کام لینے کے علاوہ زیادہ سے زیادہ فائدہ نکالنے کے واسطے یہ نہایت ضروری تھا کہ اس کا ڈیزائن ایسا ہو کہ اس کو زمین میں ایک جگہ پختہ طور سے کھڑا کر کے بھی اس سے کام لیا جا سکے۔ تاکہ جب یہ سڑک یا کھیتوں میں نہ چلتا ہو تو اس کے ساتھ پٹہ جوڑ کر اور مشینیں بھی چلائی جا سکیں غرضکہ ٹریکٹر کا ڈیزائن ایک ایسی چھوٹی سی مشین ہونی چاہیئے جو ہر طرح کا کام کھڑے اور چلتے رہ کر طاقت پیدا کرنے کی شکل میں دے سکے ہمارا ٹریکٹر بالکل ایسا ہی ہے نہ صرف اس کے ذریعہ کھیتوں میں ہل چلایا گیا ہے۔ زمینوں میں سہاگہ پھیرا گیا ہے کھیتی کی گئی ہے اور کاٹی گئی ہے۔ بلکہ اس کی مدد سے اناج صاف کیا گیا ہے۔ آٹے اور لکڑی کاٹنے اور دوسری بہت سی قسم کی ملیں چلائی گئی ہیں اس سے درخت کی جڑیں اور تنے اُکھاڑے گئے ہیں۔ زمین پر جمی ہوئی برف کو توڑا گیا ہے۔ غرضکہ ایک درمیانے درجے کی طاقت والی مشین جو کام کر سکتی ہے وہ ہر ایک کام بھیڑ کے بال کاٹنے سے لے کر اخبار چھاپنے تک اس کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ سڑکوں پر بھاری مال ڈھونے کے لئے اس کے پہیوں پر بھاری ٹائر چڑھائے گئے ہیں اور جنگل سے لکڑی اور برف لانے کے واسطے اس کے ساتھ بے پہیئے کی گاڑی جوتی گئی ہے۔

اور نوکدار پہیوں کو اس میں لگا کر اسکو ریل کی پٹڑی پر بھی چلایا گیا ہے۔ جب کوئلہ نہ ہونے کی وجہ سے ڈیٹرائیٹ کے کارخانے بند ہو گئے تو ہم نے اپنا ایک ٹریکٹر اپنے بجلی سے چلنے والے چھاپے خانے میں بھیج کر اپنا اخبار ڈیر بارن انڈیپنڈنٹ نکالنا شروع کر دیا۔ یعنی ہم نے یہ کیا کہ ہم نے اس ٹریکٹر کو بجلی سے چلنے والے اپنے چھاپہ خانہ کے بالکل پاس کی ایک تنگ چھوٹی سی گلی میں کھڑا کر کے اس کے ساتھ ایک پٹہ جوڑ دیا۔ جو چار منزل اوپر تک جاتا تھا۔ اور ٹریکٹر کے ذریعے جو طاقت پیدا ہوتی تھی اُس کی مدد سے ہم نے چھاپنے والی پلیٹیں تیار کرنی شروع کر دیں۔ ابھی تک ہم کو ٹریکٹر سے پچانوے قسم کے بالکل الگ الگ کاموں کے کرنے کا پتہ چلا ہے۔ اور نہ جانے اس سے اور کتنے زیادہ کام نکل سکتے ہیں جن کی ہمیں اس وقت تک خبر نہیں لگی ہے۔ ٹریکٹر کی مشنری موٹر کار سے بھی زیادہ سادہ ہے مگر یہ بنائی بالکل اُسی ڈھنگ سے جاتی ہے اس سال تک کیونکہ ہمارے ہاتھ میں کوئی اچھا سا کارخانہ نہیں تھا اس لیے ہم ٹریکٹر زیادہ تعداد میں نہیں بنا سکے شروع میں ہم نے ٹریکٹر ڈیر بارن کے کارخانے میں بنائے تھے لیکن اس کارخانے میں آجکل صرف تجربے کیے جاتے ہیں۔ ایک بڑے کارخانے میں زیادہ تعداد میں تیار مال کر کے جو کفائتیں ہو سکتی ہیں وہ اس کارخانے میں نہیں ہو سکتی تھیں۔ کیونکہ یہ چھوٹا تھا اور اس کو ہم بڑا نہیں بنانے تھے کیونکہ ہمارا ارادہ یہ ٹریکٹر ریور روگ Rwes Rouge کے کارخانے میں بنانے کا تھا۔ اور یہ کارخانہ صرف اسی سال ہی مکمل ہوا ہے۔

اب ہمارا کارخانہ ٹریکٹر بنانے کے لئے پورے طور سے تیار ہے۔ سارا کام بالکل موٹر کاروں کی طرح سے اس کارخانے میں ہو رہا ہے۔ ہر ایک پرزہ بنانے کے الگ الگ محکمے ہیں اور جونہی ایک پرزہ تیار ہو جاتا ہے اس کو بجلی سے چلنے والے کھٹولے پر رکھ کر اس کے بڑے پرزے کے پاس پہنچایا جاتا ہے اور پھر وہاں سے پورا پرزہ تیار ہو کر اسی طرح ٹریکٹر میں جوڑ دینے کے لیے اپنی آخری جگہ پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہر ایک پرزہ بجلی کی طاقت سے اپنے آپ سرکتا ہے اور کسی خاص لیاقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمارا موجودہ کارخانہ ایک سال میں دس لاکھ ٹریکٹر تیار کر سکتا ہے اور ہم اتنی تعداد بنانے کی کوشش میں ہیں۔ کیونکہ اس وقت دنیا کو ایسی مشینوں کی ضرورت ہے جو سستی ہوں اور ہر طرح کی طاقت پیدا کرنے والی ہوں بلکہ اس سے پہلے دنیا کو ان کی اتنی ضرورت نہ تھی جتنی کہ آج ہے۔ کیونکہ اب لوگ جان گئے ہیں کہ اس قسم کی مشینری کا بہت ہی فائدہ ہے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں شروع میں ہم نے ٹریکٹرز انگلینڈ بھیجے تھے ۱۹۱۸ میں ہم نے ان کو بھیجنے کے لیے Umited States میں پہلے پہل ۲۲۵۰ روپئے فی ٹریکٹر قیمت مقرر کی اگلے سال کیونکہ لاگت بڑھ گئی تھی ہم نے اس کی قیمت بڑھا کر اس کی قیمت ۲۲۶۵۰ روپیہ کر دی مگر ہمارے لیے اس سال لگ بھگ چھ مہینے کے بعد اسکی قیمت پھر گھٹا کر ۲۲۵۰ پھر مقرر کرنا ممکن ہو گیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں ہم نے اس کی قیمت ۲۳۷۵ روپئے کر دی اور اس سے اگلے سال ہمیں اس کے بنانے میں اتنی سمجھ آگئی تھی کہ اس کی تیاری میں ہم کہاں کہاں لاگت کی بچت کر سکتے ہیں اس طرح سے ہم قیمت گھٹا کر ۱۸۷۵ روپئے پر لے آئے۔ اور جب سنہ ۱۹۲۴ء میں ریور روگ (River Rouge) کا کارخانہ اپنے پورے زوروں کے ساتھ چلنے لگا تو اس کی قیمت ۱۱۸۵ روپئے کر دی۔ ان تمام رقموں سے ظاہر ہے کہ اگر مال قاعدے کے ساتھ تیار کیا جائے تو قیمت میں کافی فرق پڑ سکتا ہے جس طرح میں آج یہ نہیں کہہ سکتا کہ آگے جا کر ہم ایک ون فورڈ موٹر کار کتنی سستی بنا کر مارکیٹ میں دے سکیں گے اسی طرح ٹریکٹروں کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ میں ان کو کتنا سستا بنا سکیں گا۔

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹریکٹروں کو سستا بنا کر دینا نہایت لازمی ہے ورنہ کھیتی باڑی کبھی بجلی کی طاقت سے نہیں ہو گی۔ اور کھیتی باڑی کے لیے بجلی کی طاقت کا ہونا سخت ضروری ہے تھوڑے ہی سالوں کے اندر ہم دیکھیں گے کہ جس طرح آج کوئی کارخانہ پاؤں چکی سے چلتا ہوا مشکل سے نظر آتا ہے۔ اس طرح تب کہیں کہیں ایسا کھیت ہمیں ملے گا جس پر صرف گھوڑوں۔ ڈنگروں یا ہاتھ کے ذریعے کام کیا جاتا ہو۔ ایک کسان کے لیے ابھی لازمی ہو گیا ہے کہ یا تو اب وہ بجلی کی طاقت استعمال کرے یا زمینداری کے دھندے کو چھوڑ دے ہم نے دونوں طریقوں سے خرچہ گن کر حساب لگا کر دیکھا ہے کہ اس کے سوائے اس کے لیے اور کوئی چارہ نہیں جنگ کے دنوں میں گورنمنٹ نے یہ امتحان کر کے دیکھا کہ کھیتوں میں گھوڑوں اور ڈنگروں کے مقابلے میں فورڈسن Ford/Son ٹریکٹر کے ذریعے کام کرنے سے خرچ کس کا زیادہ اٹھتا ہے۔ یہ حساب لگانے کے لیے ٹریکٹر کی قیمت اونچی سے اونچی لگائی گئی اور اس کو اس میں باہر سے لانے کا کرایہ بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ ان ٹریکٹروں کی عمر اور مرمت کا خرچ اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا کہ اس رپورٹ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اتنا ہو بھی تو کیونکہ اب ٹریکٹروں کی قیمتیں گھٹ کر لگ بھگ آدھی رہ گئی ہیں۔ اس لیے ان کی عمر گھسائی اور مرمت کا خرچ بھی آدھا رہ جائے گا۔ یہ حساب اس طرح پر ہے:-

قیمت فورڈسن ٹریکٹر ۲۲۴۵ روپے چلنے کی عمر ۶۴۰۰ گھنٹے ۳۸۴۵ ایکٹر زمین میں ۴/۵ ایکٹر فی گھنٹہ کے حساب سے۔

۳۸۴۵ ایکٹر در ۲۲۴۵ روپے۔ عمر گھسائی فی ایکڑ ——— ۲۲۱

۳۸۴۵ ایکڑ کی مرمت در ۳۰۰ روپیہ فی ایکڑ ——— ۵۲۶

خرچ ایندھن۔ تیل مٹی در ۱/۲ ۹ آنے۔ ۴ گیلن فی ایکڑ ——— ۳۸

۳/۴ گیلن تیل فی ۸ ایکڑ ——— فی ایکڑ ——— ۰۷۵

تنخواہ ڈرائیور چار روپیہ فی روز ۸ ایکڑ فی ایکڑ ——— ۲۵

فورڈسن ٹریکٹر کے ذریعے ہل چلانے کا کل خرچ فی ایکڑ ——— ۹۵

۸ گھوڑے قیمت ۳۶۵۵ روپیہ۔ ان کے کام کرنے کی میعاد ۵۰۰۰ گھنٹے ۴۰۰۰ ایکڑ زمین ۴/۵ ایکڑ فی گھنٹہ کے حساب سے۔

۴۰۰۰ ایکڑ در ۳۶۵۵ روپیہ۔ ان گھوڑوں کی عمر گھسائی۔ فی ایکڑ ——— ۰۲۵

خوراک فی گھوڑا سوا روپیہ (ایک سو کام کے دن) فی ایکڑ ——— ۰۴۵

خوراک فی گھوڑا پانچ آنے فی روز (۳۶۵ خالی دن) فی ایکڑ ——— ۰۲۶۵

تنخواہ دو ڈرائیور۔ اور دو ہلوں کی جماعت چار روپیہ فی روز فی ایکڑ ——— ۰۵۵

گھوڑوں کے ساتھ ہل چلانے کی لاگت فی ایکڑ ۱۰۴۶

آجکل جو ہماری لاگت آرہی ہے اُس کے مطابق سوا روپے پر عمر گھسائی اور مرمت کا خرچ صرف ایک آنہ آتا ہے۔ لیکن یہ حساب لگانے میں وقت کے خرچ ہونے کا کوئی شمار نہیں رکھا گیا۔ ٹریکٹر کے ذریعے ہل چلانے میں صرف ایک چوتھائی کے قریب صرف وقت خرچ ہوتا ہے اور ٹریکٹر کو گھمانے میں جتنی طاقت خرچ ہوتی ہے صرف اتنا ہی ایک آدمی کو زور لگانا ہوتا ہے۔ ٹریکٹر کے ذریعے کھیتوں میں ہل چلانا اتنا ہی آسان ہوگیا ہے جتنا کہ اس میں موٹر کار دوڑانا۔

لوگ بہت جلدی پرانے طریقے سے یعنی ہاتھ اور گھوڑوں کے ذریعے کھیتی باڑی کرنا بھول جائیں گے اس کا یہ مطلب نہیں کہ کھیت پر کچھ کام کرنے کو نہیں رہے گا۔ دنیا میں ایک بھی ایسا مفید کام یا کارآمد چیز نہیں ہے جسکو حاصل

کرنے کے لیے کوئی محنت درکار نہ ہو۔ لیکن بجلی کی طاقت سے کھیتی باڑی کرنے میں یہ آرام ہو گیا ہے کہ اب اس کو کرنے میں گلے پڑا ڈھول بجانے والی بات نہیں رہی۔ بجلی کی طاقت سے کھیتی باڑی کرنے کا صرف یہ مطلب ہے کہ ایک انسان کے جسم اور جان سے بوجھ اتار کر فولاد کے سر پر لاد دیا گیا ہے۔ ابھی تو ہم نے بجلی کی طاقت سے کھیتی باڑی کرنا شروع ہی کیا ہے۔ موٹر کار نے موجودہ کھیت پر زندگی کی شکل میں صرف اس وجہ سے بھاری تبدیلی نہیں کی ہے کیونکہ یہ ایک گھومنے پھرنے والی گاڑی ہے۔ بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اس کے اندر بجلی کی طاقت ہے۔ کھیتی باڑی کرنا صرف گاؤں کے لوگوں کا ہی پیشہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے خوراک پیدا کرنے کا ایک بڑا دھندا بننا چاہیے۔ اور جب یہ ایک بڑا دھندا بن جائیگا تو جیسی آجکل کھیتی باڑی ہو رہی ہے اُسکے لحاظ سے تو ایک کاشتکار کو اپنے کھیت پر تمام سال میں صرف چوبیس دن کام کرنا پڑیگا اور باقی کے دن کام کرنے والے بڑے مزے کے ساتھ کسی دوسرے دھندوں میں لگا سکیں گے۔ اصلی بات یہ ہے کہ کھیتی باڑی کا کام بالکل موسمی کام ہے اور کوئی آدمی سارا سال ہی اس کام میں مصروف نہیں رہ سکتا۔

کھیتی باڑی سے خوراک کی چیزوں کا دھندا بیوپار کے طور پر کرنے کا فائدہ صرف تب ہی ہو سکتا ہے جبکہ اسکے ذریعے خوراک کافی مقدار میں پیدا کی جا سکے اور سب لوگوں میں اسطرح سے تقسیم ہو جس سے ہر کسی کو اتنی مل سکے جس سے اُسکا پیٹ بھر کر کھانے کو سارا سال مل سکے۔ اگر ہم بہت بھاری تعداد میں ہر قسم کے اناج پیدا کرنے شروع کر دیں تو غلّے کے بیوپاری اتنی بڑی بڑی کمپنیاں کھڑی کر کے غلّہ کا بھاؤ کبھی گرا کر اور کبھی بڑھا کر یہاں تک کہ دونوں ہاتھوں سے خوب لوٹ رہے ہیں کوئی جگہ نہ رہے۔ جو کسان تھوڑی سی پیداوار کرتا ہے وہ ایک طرح سے ان سٹہ بازوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنجاتا ہے۔

ممکن ہے تب اُسوقت چھوٹی آٹے کی ملوں کی قسمت بھی جاگ اُٹھے وہ دن بہت برا تھا جب ہمارے گاؤں میں آٹے کی ملیں بند ہو گئیں۔ کاشتکار لوگ مل کر کام کرنا اتنا سیکھ جائینگے کہ وہ اپنی بڑی بڑی کمپنیاں کھولیں گے اور اپنی کوٹھیاں چلائیں گے سوٗروں کو خود پالینگے۔ اور اُن کا گوشت ٹینوں کے ڈبوں میں بھر کر باہر بھیجا کرینگے اور اپنی آٹے کی ملوں میں اپنا غلہ پیس کر طرح طرح کی خوراک کی چیزیں بنا کر مارکیٹ میں بکنے کے لیے بھیجا کریں گے۔

جب شہر بوسٹن کے آس پاس کافی بچھڑے مل سکتے ہیں تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں اس شہر کیواسطے بچھڑے پھر کسی دوسرے شہر مثلاً ٹیکساس میں پالے جائیں اور اُن کو اس غرض سے شکاگو میں لایا جا سکے تاکہ وہاں اُن کا گوشت تیار کر کے بوسٹن کا خرچ چلایا جا سکے۔

ملک کے اندر صرف چند مقاموں پر خوراک کی اشیا تیار کرنیوالے کارخانے جاری کرنیکی وجہ سے قدرتی طور پر انکی بار برداری اور بیچنے کے لئے دفتر یا کمپنیوں کے کھولنے کا خرچ بہت ہی زیادہ ہوتا ہے۔ اور اسکے علاوہ اس طریقہ سے چیزیں اتنی زیادہ تعداد میں ضائع جاتی ہیں کہ کسی ترقی حاصل کی ہوئی قوم اور سوسائٹی میں اسکا آیندہ جاری رہنا ایک منٹ کے لیے بھی اب برداشت نہیں کرنا چاہیئے۔

جتنی ترقی ہم نے پچھلے بیس سال کے اندر موٹر کاریں اور ٹریکٹر بنانے میں حاصل کی ہے اُتنی ہی ہم اگلے بیس سال کے اندر کھیتی باڑی میں ضرور کرینگے۔

بیان ۱۵

خیرات کیوں کی جائے

جب ایک قوم تہذیب والی بنجائے تو پھر اسکو خیرات کی رسم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی مجھے خیرات کرنیکی عادت بری نہیں لگتی۔ بھگوان نہ کرے کہ کبھی ہم ایسے پتھر دل ہو جائیں کہ ہمیں ایک محتاج آدمی کو دیکھ کر ترس نہ آئے۔ جنکے دل میں رحم نہیں اور جو دمڑی دمڑی پر جان دیتے ہیں وہ نہیں جان سکتے کہ انسانی ہمدردی کس بلا کا نام ہے۔ آج تک جو بھی بڑے بڑے کام ہوئے ہیں انکا خیال شروع میں انسانی ہمدردی سے ہی پیدا ہوا تھا۔ دنیا میں جو کام بھی لوگوں کی بھلائی کرنے کی نیت سے کیا جاتا ہے وہ لوگوں کی مدد کے لیے کیا جاتا ہے۔

افسوس ہے تو یہ کہ ہم نے اس بڑی اور نفیس نیت کی طاقت کو نہایت ہی نکمے مطلبوں کے لیے استعمال کیا ہے اگر انسانی ہمدردی ہمیں بھوکوں کو روٹی کھلانے کیلئے اکسا سکتی ہے تو کیا یہ اس سے بڑی خواہش ہمارے اندر پیدا نہیں کر سکتی کہ ہم سوسائٹی کے اندر کسی شخص کا بھوکا مرنا بالکل ناممکن بنا دیں۔ اگر ہم لوگوں کے ساتھ اتنی ہمدردی کر سکتے ہیں کہ اُن کی مشکلیں آسان کرنے میں ہم مدد دیں تو ہمارے اندر اتنی ہمدردی بھی ضرور ہونی چاہیئے کہ لوگوں کو وہ مشکلیں کبھی دیکھنی ہی نہ پڑیں۔

خیرات کرنا بڑا آسان ہے لیکن ایسی حالتیں پیدا کرنا جس میں اس کی ضرورت ہی نہ رہے ذرا مشکل کام ہے ایسی حالت پیدا کرنے کے لیے جبکہ خیرات کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے ہمیں یہ دیکھنا پڑیگا کہ انسان کی غریبی کا اصلی سبب کیا ہے۔ لیکن اس عرصہ میں ساتھ ساتھ ہمیں ایک غریب آدمی کی تھوڑی بہت مدد ضرور کرتے رہنا چاہیئے۔ مگر ہمیں اُس کی صرف یہ عارضی مدد کر کے ہی بیٹھ رہنا نہیں چاہیئے بلکہ ہمیں اُس کا دکھ دور کرنے کا کوئی پختہ علاج سوچنا چاہیئے مشکل یہ ہے کہ ہم اُس کے دکھ اور غریبی کے جو اصلی سبب ہیں اُن کو نہیں پکڑتے اکثر آدمی ایک غریب کنبے کی مدد

کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے لیکن بہت کم آدمی ایسے ملتے ہیں جو کبھی یہ سوچیں کہ ان کی غریبی بالکل کس طرح سے دور کی جاسکتی ہے۔

میرے دل میں لنگر اور بھنڈارے جو آجکل چل رہے ہیں انھیں دیکھ کر آگ سی لگ جاتی ہے انسانی ہمدردی اور مدد کرنے کا یہ کوئی طریقہ نہیں کہ بڑے بڑے بھنڈارے اور لنگر کھولنے کا انتظام کیا جائے جن سے خیرات کا اصلی مطلب بالکل جاتا رہتا ہے اور خیرات بالکل ایک نکمی اور واہیات سی چیز بنجاتی ہے۔

اصلی انسانی ہمدردی کبھی ناپ تول کر نہیں کی جاتی اور نہ کبھی اس کی اشتہار بازی کی جاتی ہے یتیم خانوں میں جتنے یتیم بچے پرورش پا رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ پرائیویٹ گھروں میں پل رہے ہیں اور لوگ ان سے محبت کرتے ہیں۔ ہردوار جیسی جگہوں میں جو بان پرست آشرم بڈھوں کے رہنے کے لیے کھلے ہوئے ہیں ان سے کہیں زیادہ بڈھے اپنے دوستوں کے مکانوں میں رہ کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لوگوں کو روپیہ ادھار دینے والی سوسائٹیوں کی نسبت گھروں کے اندر لوگ ایک کنبہ دوسرے کنبے کو روپیہ ادھار دے رہا ہے۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اندر لوگ ایک دوسرے کی مدد پرائیویٹ طریقے سے بڑی خوشی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ ایک سوچنے والی بات ہے کہ ہم کو لوگوں کی مدد کرنے کے لیے کیا ہمیں خیرات کی نیت سے لنگر اور بھنڈارے کھولنے چاہئیں یا نہیں۔

لنگر اور بھنڈاروں کے ذریعے جو خیرات کی جاتی ہے وہ نہ صرف ایک بے جان سی چیز ہے بلکہ اس سے مدد کی بجائے الٹا نقصان ہوتا ہے اس سے خیرات لینے والے کی بدنامی ہوتی ہے اور وہ اپنی نظروں میں آپ گر جاتا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو بھگتی کے خیال سے خیرات کرتے ہیں۔ کچھ سال پہلے لوگوں کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ لوگوں کی بھلائی کرنے کا کام ایک ایسی چیز ہے جس کو کرنا ہر شخص کا فرض نہیں۔ لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اس اصول کے مرید ہو گئے کیونکہ اس اصول کی جو نیت تھی وہ بہت اچھی تھی مگر نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی ایک بہت بھاری تعداد ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اور ایک بچے کی طرح محتاج بن کر خالی بیٹھ گئی اور منہ تکنے لگی۔ لوگوں کی بھلائی کا کام صرف پنڈتوں اور مولویوں کے حصے میں رہ گیا جس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مولویوں اور پنڈتوں کو لوگوں کی بھلائی کرنے کا موقع مل گیا۔ لیکن اس کی وجہ سے عام لوگوں کو اپنے اوپر بھروسہ رکھنے کی عادت نہیں رہی۔ اور نہ اس سے وہ حالت سدھری جس کو سدھارنے کی غرض سے

یہ بھلائی کا کام مولویوں اور پنڈتوں کے سپرد کیا گیا تھا۔

بچوں کی طرح ماں کا منہ تکنے کے علاوہ اس تعلیم کا ایک بہت برا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ لوگوں کے اندر اپنے اوپر بھروسہ رکھنے کے اور اپنی ہمت سے روزی کمانے کی بجائے اُن کے اندر خیرات کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوگیا جو کہ بالکل قدرتی تھا۔ دنیا میں عام طور پر یہ شکایت کی جاتی ہے کہ لوگ بڑے ناشکرے ہیں۔ اور اگر کوئی کسی کی مدد کرتا ہے تو وہ اُس کا شکر گزار نہیں ہوتا۔ مگر میرے خیال میں ایسا ہونا بالکل قدرتی بات ہے۔ کیونکہ اول تو جو ہم تھوڑی بہت خیرات کرتے ہیں وہ اصل میں سچی خیرات نہیں ہوتی۔ چونکہ وہ نہ سچے دل سے کی ہوئی ہوتی ہے اور نہ وہ سچی ہمدردی کے خیال سے کی ہوئی ہوتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کوئی آدمی بھی خیرات لینے کی خاطر دوسرے کے آگے ہاتھ پسارنا پسند نہیں کرتا۔

اس طرح کی "بھلائی کے کام" نے لوگوں کے اندر بدمزگی پیدا کر دی۔ اس لوٹ کے مال کو خیرات کے طور پر لینے والا یہ سمجھتا ہے کہ اس کے لینے سے اُس کی ہتک ہوئی ہے اور شاید خیرات کرنے والا بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس لوٹ کو خیرات دے کر اُس کی بھی ہتک ہوئی ہے۔ خیرات کرنے سے سوسائٹی کے اندر کبھی امن و امان قائم نہیں ہوا۔ خیرات کے لنگر اور بھنڈارے صرف اس منشا سے چلانے چاہئیں کہ آخر ایک دن وہ سب لوگوں کو اپنے پاؤں پر اتنا کھڑا کر دیں کہ اُن کی پھر بالکل ضرورت نہ رہے۔ لیکن اگر یہ اس فرض کو پورا نہیں کرتے تو یہ صرف روپیہ کمانے کا ڈھونگ ہے اور لوگوں کے اندر غریبی بڑھانے اور ان کو کاہل بنانے کا ایک اور طریقہ ہے۔

جب لوگوں کو یہ سکھلا دیا جائے کہ کس طرح سے وہ خالی نہ بیٹھ کر اپنی روزی پیدا کر سکتے ہیں تو پھر خیرات کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں اپنے کسی ایک پچھلے بیان میں بتا آیا ہوں کہ کس طرح سے ہم نے اپنے کارخانوں میں اس بات کا تجربہ کیا کہ اگر انڈسٹری کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کافی تعداد میں بانٹ دیا جائے تو لنگڑے بڈھوں اور اندھوں ان سب کے لیے کام کرنے کے واسطے جگہیں نکل سکتی ہیں۔ قاعدے کے ساتھ انڈسٹری چلانا کوئی ہوا نہیں کہ جو اس کے پاس آئے گا اُسی کو یہ کھا جائے گا۔ لیکن اگر انڈسٹری ایسا ہی بھوت ہے تو اس کی دنیا میں کوئی ضرورت

نہیں۔ انڈسٹری کے اندر اور باہر چاروں طرف ایسے کام ہیں جن کے لیے پورے طاقت والے آدمی درکار ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ایسے بھی کام ہیں اور بہتیرے جن میں ہنر اور کاری گری کی زیادہ ضرورت ہے اور جن کو کرنے کے لیے پرانے زمانے کے کاریگروں کی طاقت کی بالکل ضرورت نہیں اگر ایک انڈسٹری کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ دیا جائے تو اس میں کام کرنے کے لیے ایک طاقتور آدمی کو اپنی طاقت خرچ کرنے اور ایک کاری گر کو اپنا ہنر دکھلا کر کام کرنے کی کافی گنجایش ہے۔ پرانے زمانے میں یہ مصیبت تھی کہ انڈسٹری کے دھندوں میں ایک کاری گر کو اپنا کافی وقت اناڑی کام کرنے میں ضائع کرنا پڑتا تھا۔ اس سے اس کی کتنی طاقت فضول ضائع جاتی تھی۔ مگر اُس زمانے میں ہر ایک کام کرنے کے لیے ایک ہی آدمی کو ہنر کا اور اناڑی کام دونوں کرنے پڑتے تھے۔ اس لیے اگر ایک آدمی بالکل بدھو ہوتا تھا تو وہ کچھ ہنر سیکھ نہیں سکتا تھا اور اگر اُسے کوئی موقع نہ ملے تو وہ کسی دھندے میں بڑھ کر کچھ ترقی نہیں کر سکتا تھا۔

کوئی کاری گر صرف ہاتھ کی کار کر کے اپنا گذارہ کرنے کے لایق سے زیادہ پیسے نہیں کما سکتا اور نہ اُس کے پاس کبھی فالتو پیسہ جمع ہو گا۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ جب ایک کاری گر بوڑھا ہو جائے تو یا اُس کی پرورش اُس کے بچے کیا کریں گے۔ یا اگر اُس کے بچے نہیں تو سرکاری فنڈ سے اُس کو خرچہ ملنا چاہیئے۔ یہ بالکل غیر ضروری ہے۔ اگر صنعتی دھندوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کر کیا جائے تو لگ بھگ ہر ایک آدمی کے لیے اُس میں کام کرنے کی ضرور گنجایش نکل آتی ہے۔

جتنے اندھے اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹے ہوئے صنعتی دھندوں میں لگائے جا سکتے ہیں۔ اس سے بہت کم دنیا میں اندھے ہیں۔ اسی طرح جتنے لنگڑوں کو ان میں جگہ دی جا سکتی ہے اس سے لنگڑے بہت کم ہیں اور ان میں سے ہر ایک جس کو ہم اپنے انجان پنے میں خیرات کے قابل سمجھے بیٹھے تھے۔ وہ ان میں کہیں نہ کہیں اپنی لیاقت اور ہمت کے مطابق کام یا نوکری ڈھونڈ کر کم سے کم اپنے گذارہ کے لایق ضرور بخوبی پیسے کما سکتا ہے۔ جتنا کہ ایک نہایت ہوشیار اور پوری طاقت و جسم والا کاری گر۔ جب ایک کام کو ایک لنگڑا آدمی اچھی طرح سے کر سکتا ہے۔ تو پھر اس جگہ پر ایک پورے

جسم و طاقت والے انسان کو لگانا کیا طاقت کو ضائع کرنے کے برابر نہیں ہے ؟ ایک اندھے کو بینت یا بانس کی ٹوکریاں بنانے کے کام پر لگانا کتنی بھاری حماقت ہے۔ اسی طرح قیدیوں سے پتھر توڑنے جائے یا بھنگ کی پتیاں اکٹھی کرنے یا اسی طرح کے اور چھوٹے موٹے کام کرانے میں کسقدر طاقت بیکار ضائع جا رہی ہے۔

ایک اچھا جیل خانہ وہی ہے۔ جو نہ صرف اپنا خرچہ خود نکال کر پورا کر لیتا ہو۔ بلکہ وہ اپنے ہر قیدی کو اس قابل بنا دیتا ہو۔ کہ وہ وہاں پر رہتا ہوا اپنے کنبے کا گزارہ بھی بخوبی چلا سکے۔ یا اگر اوس کا کوئی گھر بار نہیں۔ وہ اتنا روپیہ جوڑ سکے۔ کہ اپنی قید ختم ہونے کے بعد جب وہ جیل سے باہر نکلے۔ تو اُس کو اپنا گزارہ کرنے کے لیے کسی کے محتاج ہونے کی قطعی ضرورت نہ رہے میں قیدیوں سے جبری مزدوری کرانے یا کھیتی باڑی پر غلاموں کی طرح ان سے بیگار لینے کی کسی تجویز یا سکیم کے بالکل حق میں نہیں ہوں۔ ایسی تجویزوں یا سکیموں سے بڑھ کر اور کوئی بری بات ہو نہیں سکتی۔ اصل بات یہ ہے کہ جیل خانوں میں رہتے ہوئے قیدیوں کی حالت کو سدھارنے کی سکیمیں بنانے میں ہم معقولیت کے حد سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ اور الٹے راستے پر جا پڑے ہیں حالانکہ جب تک دنیا میں جیل خانے موجود رہیں گے۔ تب تک اُن کے اندر ایسا اور اتنا مال بخوبی اور ضرور تیار کرا جا سکتا ہے۔ جو پبلک اور قیدیوں دونوں کے بہت کام آ سکتا ہے۔ اور جن سے ان سب کو خوب فائدہ ہو سکتا ہے۔ مجھے اس بات کا علم ہے۔ کہ اس وقت ایسے قانون موجود ہیں (اور یہ بیہودہ قانون بے سمجھ لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں) جو جیل خانوں کے اندر صنعتی دھندوں کو چلانے اور جاری کرنے سے منع کرتے ہیں۔ دراصل یہ قانون کاریگروں اور مزدوروں کی بھلائی کی غرض سے پاس کئے گئے تھے۔ مگر ان سے اُن کو ذرا بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ اور الٹا سوسائٹی کے سر پر ایک اور مفت کا بوجھ اور خرچہ ڈالنے کے علاوہ کسی آدمی کو رتی بھر بھی اس سے آرام یا فائدہ نہیں پہنچتا اگر عام لوگوں کی بھلائی کا دل میں سچا خیال ہو تو ہر سوسائٹی کے پاس اس قدر زیادہ کام ہے کہ اُس کو کرنے کے لیے اُس کے پاس اتنے آدمی موجود نہیں ہیں۔

اگر لوگوں کی بھلائی کی نیت سے انڈسٹری کو ٹھیک قاعدے کے ساتھ چلایا جائے

تو پھر خیرات اور دان پن کے کام کرنے کی بالکل ضرورت نہیں رہتی۔ دان پن کے کام کتنے ہی
اونچے خیال سے کیوں نہ کئے جاویں۔ ان سے لوگ اپنے اوپر بھروسہ رکھنا اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا
کبھی سیکھ نہیں سکتے۔ لوگوں کے اندر اپنے اوپر بھروسہ رکھنے کا مادہ ضرور پیدا ہونا چاہیئے۔ ہر ایک انسان
کے واسطے یہ بہت ضروری ہے کہ جو کچھ اُس نے آج تک حاصل کیا ہے۔ اُس سے زیادہ حاصل کرنے کی اس
کے دل میں سدا ضرور اُمنگ بنی رہنی چاہیئے۔ میں روزمرہ کی چھوٹی موٹی اور نکمی باتوں پر تلملاتے اور
چڑتے رہنا بالکل پسند نہیں کرتا۔ لیکن ہر ایک آدمی کے دل میں یہ خواہش ہمیشہ بنی رہنی چاہیئے۔ کہ جس
طرح سے میں نے یہ کام آج کیا ہے۔ اُس میں ابھی ترقی کی بہت گنجائش ہے اور یہ اُمنگ اُس کے دل میں
سدا بنی رہنی چاہیئے کہ کل کو وہ آج سے ضرور بہتر کام کرے گا۔ اگر انڈسٹری کے دھندے لوگوں کی بھلائی
کرنے کی نیت سے چلائے جاویں اور کاریگر اور کارخانوں کے مالک دونوں ہی ایمانداری سے اس خیال کی
پیروی کرتے رہیں تو ہر آدمی اتنی اچھی تنخواہ ضرور کما سکے گا جس سے اُس کے اندر اپنے اوپر بھروسہ قائم
ہو جائے اور وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو سکے جس دان پن کا وقت اور روپیہ لوگوں کو زیادہ دولت کمانے
کے طریقے سکھلانے میں خرچ ہوتا ہے وہ اُس خیرات سے لاکھ درجہ بہتر ہے جس میں صرف گھر سے روپیہ
باہر نکلتا رہتا ہے اور اس طرح سے دنیا میں وہ بیکاری پھیلانے کا ایک اور ذریعہ بن جاتا ہے ہر دوسری
چیز کی طرح دان پن کے کاموں سے بھی ضرور کچھ فائدہ نکلنا چاہیئے اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہونا بالکل ممکن
ہے میں نے خود ایک تجارتی سکول اور ایک ہسپتال کھول کر اس بات کا تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے۔ کہ کیا
ایسی سبھاؤں اور کمیٹیوں کو جن کو عام طور پر خیراتی سمجھا جاتا ہے اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں کیا جاسکتا؟ اور میں
اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بلاشک و شبہ ایسا ہو سکتا ہے۔

عام طور پر آج کل تجارتی سکولوں میں لڑکوں کو سوائے سرسری تعلیم کے کچھ نہیں سکھلایا جاتا۔ اور
افسوس یہ ہے کہ اس تعلیم کو بھی وہ استعمال کرنا نہیں جانتے۔ اس لیے ان سکولوں کو میں بالکل پسند نہیں
کرتا۔ ایک تجارتی اسکول ایک ٹیکنیکل کالج اور ایک معمولی اسکول کے درمیان ہرگز رکاوٹ کی چیز نہیں
ہونی چاہیئے۔ بلکہ یہ تو لڑکوں کو آمدنی پیدا کرنے کے طریقے سکھلانے کا ایک اور ذریعہ ہونا چاہیئے اگر
لڑکوں کو ان میں نکمے کام سکھلائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایسی چیزیں بنانا جن کو بنا کر رکھا ہی صرف

پھینک دینا پڑے۔ اور ان سے کوئی فائدہ نہ ہوتا ہو تو اس قسم کی چیزوں کے بنانے میں نہ ان کو کوئی دلچسپی ہوگی۔ اور نہ ہی وہ کبھی کوئی نئی بات سیکھیں گے۔ جو کہ ان کا حق ہے۔ اور جس کی خاطر وہ ان سکولوں میں داخل ہوئے ہیں۔ ایسے سکولوں میں ان لڑکوں کے گذارے کا عام طور پر کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ ہاں اگر سکول پبلک کے چندے سے چلتا ہو تو دوسری بات ہے۔ اس لیے جتنا عرصہ لڑکا سکول میں پڑھتا ہے تب تک اُس کے آمدنی پیدا کرنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ لیکن اکثر لڑکوں کو مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے جو کام بھی اُن کو کرنے کے لیے ملے گا اُسے وہ اپنا گذارہ نکالنے کی خاطر ضرور کرلیں گے۔ ان کے پاس یہ فیصلہ کرنے کا کبھی وقت نہیں ہوتا کہ ہم فلاں کام کریں گے اور فلاں نہیں۔

اِس طرح جب ایک لڑکا زندگی میں بغیر کچھ سیکھے اناڑی کے طور پر داخل ہوتا ہے تو اس سے لائق کاریگروں کی تعداد جو پہلے ہی بہت کم ہے۔ ایک نمبر اور بھی گھٹ جاتی ہے۔ آجکل جس طرح پر انڈسٹری کے دھندے چل رہے ہیں اُس کے لیے جتنی لیاقت اور مشق درکار ہے وہ نہ سکول کو جلدی چھوڑنے سے حاصل ہوگی اور نہ وہاں پر دیر تک رہنے سے۔ یہ سچ ہے کہ چند اونچے درجے کے ایسے سکولوں میں لڑکے کو ہاتھ کی کار سکھلانے اور اُس کا اس میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں سے کرنے والے کام سکھلانے کے بہت سے محکمے کھل گئے ہیں۔ مگر یہ صرف اوپر کا دکھاوا ہے۔ کیونکہ ان کے ذریعے ایک درمیانے درجے کے لڑکے کی دل کی امنگیں تو پیدا ہو سکتی ہیں مگر وہ پھل پھول نہیں سکتیں۔

ان حالتوں کو دیکھتے ہوئے اور ایک لڑکے کو معمولی تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعتی تعلیم بھی دینے کے خیال سے ۱۹۱۶ء میں ہنری فورڈ ٹریڈ سکول (Henry Ford Trade School) قائم کیا گیا۔ ہم نے اس سکول کو چلانے میں کسی قسم کی خیرات کا خیال نہیں کیا۔ یہ سکول اس نیت سے قائم کیا گیا تھا۔ کیونکہ ہماری خواہش تھی کہ ہم ان لڑکوں کی مدد کریں جو غریبی کی وجہ سے سکول میں آگے نہیں پڑھ سکتے۔ ادھر ہمیں اپنے کارخانوں میں اوزار بنانے والے کاریگروں کی جو یہ کام سیکھے ہوئے ہوں بہت ضرورت تھی۔ اس لیے یہ اس سکول کے لیے اور بھی اچھا ہو گیا۔ شروع

سے ہی ہم نے اس سکول کے چلانے میں اپنے سامنے تین بنیادی اصول رکھے۔ اوّل کہ ہر ایک لڑکے کو لڑکے کے طور پر رکھنا ہے اور اُس کو جلدی وقت سے پہلے کاریگر نہیں بنانا ہے دوسرے صنعتی تعلیم کے ساتھ ساتھ لڑکے کو ایسی چیزیں بنانی سکھائی جاویں جو کہ استعمال ہو سکیں جس سے اُس کے دل میں ذمّے داری کا خیال پیدا ہو اور جس کو کر کے وہ اپنی عزت سمجھے۔ وہ صرف وہی چیزیں بناتا ہے جو مارکیٹ میں بکنے والی ہوں۔ یہ سکول ایک پرائیویٹ سکول کے طور پر جاری کیا گیا ہے اور اس میں ۱۲ سے لے کر ۱۸ سال کے لڑکے پڑھتے ہیں۔ اس میں ہر ایک لڑکے کو وظیفہ ملتا ہے۔ اور جب ایک لڑکا سکول میں داخل ہوتا ہے تو اُس کو سال بھر کے خرچ کرنے کے لیے نقد ۱۲۰۰ روپیہ دیا جاتا ہے۔ اور اگر لڑکے کا ریکارڈ (Record) تسلی بخش ہو تو یہ رقم آہستہ آہستہ ۱۸۰۰ روپے تک بڑھا دی جاتی ہے۔

جو کام ایک لڑکا اپنی جماعت میں اور کارخانے کے اندر کرتا ہے اور جس دھندے میں وہ اپنا جتنا شوق ظاہر کرتا ہے ان سب کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ مگر جتنے نمبر وہ صنعت کے مضمون میں حاصل کرتا ہے اُس کے لحاظ سے اُس کے وظیفے کی رقم مقرر کی جاتی ہے۔ وظیفے کے ساتھ ساتھ ہر ایک لڑکے کو کچھ جیب خرچ بھی دیا جاتا ہے جس کو اسے اپنے سیونگ فنڈ میں جمع کرانا پڑتا ہے۔ یہ روپیہ اُس کا بینک میں جمع ہوتا رہتا ہے اور جب تک وہ سکول میں پڑھتا ہے تب تک وہ اس روپے کو وہاں سے نکال نہیں سکتا۔ لیکن اگر کوئی خاص ضرورت آپڑے تو وہ اپنے افسروں کی اجازت سے اس رقم میں سے کچھ روپیہ لے سکتا ہے

ایک ایک کر کے اس اسکول کو چلانے کے کی جتنی تکلیفیں ہو رہی تھیں۔ وہ سب رفع ہو رہی ہیں۔ اور جس غرض سے ہم نے یہ سکول چلایا تھا۔ اُس کو پورا کرنے کے واسطے ہمارے ہاتھ نئے نئے ذریعے اور طریقے لگ رہے ہیں۔ شروع میں ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ دن کا ایک تہائی حصہ لڑکے کو جماعت میں پڑھایا جاتا تھا اور باقی وقت لڑکے کو کارخانے کے اندر کام سیکھنے میں لگانا پڑتا تھا۔ مگر ہم نے یہ دیکھا کہ اس طرح روز روز تبدیلی کرنے سے لڑکے کی ترقی میں ایک قسم کی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اب ایک لڑکے کو یہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہفتے مقرر کر دیئے

گئے ہیں. یعنی وہ ایک ہفتہ جماعت میں کام کرتا ہے اور دو ہفتے کارخانے میں لگاتا ہے جماعتیں
لگاتار لگائی جاتی ہیں اور لڑکوں کو اس مطلب سے ہفتوں کا لحاظ رکھ کر کئی فریقوں میں بانٹ
دیا گیا ہے۔

سٹاف میں بہتر سے بہتر استاد رکھے گئے ہیں اور لڑکوں کے پڑھائی کی کتاب صرف
فورڈ کا کارخانہ ہی ہے۔ اس کے ذریعے جو اُن کو عملی تعلیم حاصل ہوتی ہے وہ آج کل کی بہت
سی یونیورسٹیوں سے کہیں زیادہ ہے۔ حساب کے سبق سیکھنے کے لیے اُن کو کارخانے کے
اندر جو روزانہ سوال پیدا ہوتے ہیں وہ نکالنے پڑتے ہیں۔ لڑکے کے دماغ میں کوئی فرضی سوال
نہیں گھڑے جاتے کہ اگر الف چار میل کشتی چلاتا ہے اور ب دو میل تو بتاؤ کہ دونوں کے
اندر کیا فرق ہے۔ ایسے سوال بالکل واہیات اور فضول ہیں۔ لڑکے کے سامنے مشینیں جس طرح کام
کر رہی ہیں اور کام کی جو اصلی حالت ہے رکھی جاتی ہے اور اُس کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ اس پر غور کرے
اور اس کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کرے۔ شہروں کو صرف نقشوں پر نہیں دکھایا جاتا جیسے کہ ایک کاغذ
کے اوپر پر سیاہی کے داغ ہوں اور نہ ملکوں کا حال ایک کتاب کے صفحوں کی طرح پڑھایا جاتا ہے جو مال
سنگاپور کو روانہ ہوتا ہے اور جو کچے مسالے افریقہ اور جنوبی امریکہ سے آتے ہیں اُن کی رسیدیں اور پرچے
اُس کو دکھائے جاتے ہیں جس سے اُس کو پتہ لگتا ہے کہ اس زمین پر کہاں کہاں کیسی آبادی ہے۔ اپنے
ماسٹر کی میز پر پڑا ہوا صرف ایک رنگین ساری دنیا کے نقشے کا گولہ دکھا کر اُس کو یہ چیزیں سمجھانے کی کوشش
نہیں کی جاتی علم طبیعات اور کیمیائی یعنی سائنس کے مضمونوں کو بتانے کے لیے ہمارے کارخانے کے اندر
ایک لیبارٹری بنی ہوئی ہے جس میں سائنس کے اصول عملی طور پر لڑکوں کو سکھائے جاتے ہیں اور اس کے
سبق لڑکوں کو اصل تجربہ کر کے پڑھائے جاتے ہیں۔ فرض کرو کہ ماسٹر نے یہ پڑھانا ہے کہ ایک پمپ کیسے کام کرتا
ہے۔ پہلے ماسٹر پمپ کے ہر ایک پرزے اور اُس کے کام کو بتاتا ہے اور لڑکے ان کے نسبت جو سوال کرتا ہے
اُن کا جواب دیتا ہے اور تب وہ ان سب لڑکوں کو اپنے ساتھ لے کر ایک بڑا پمپ دکھانے کے لیے انجن کے کمروں
میں لے جاتا ہے۔ سکول کے ساتھ ہم نے ایک باقاعدہ بڑھئی خانہ یعنی فیکٹری کا ورکشاپ بھی کھول رکھا ہے جس
میں کام کرنے کے لیے بڑھیا سے بڑھیا اوزار اور سامان موجود ہیں۔ یہاں پر لڑکے ایک مشین کو سیکھ کر دوسری

مشینیں بنانا سیکھتے ہیں۔ وہ صرف وہی پرزے یا چیزیں بناتے ہیں جو ہماری کمپنی کو درکار ہیں۔ لیکن ہماری ضرورتیں اتنی زیادہ ہیں کہ سب پرزوں اور چیزوں کی لاگ بھاگ ہمیشہ ہی ضرورت بنی رہتی ہے جب یہ پرزے یا چیزیں تیار ہو جاتی ہیں تو پھر ان کی جانچ کی جاتی ہے اور جانچ ہونے کے بعد انھیں فورڈ موٹر کمپنی خرید لیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو مال جانچ میں ناقص ہونے کی وجہ سے پاس نہیں ہوتا۔ اتنا سکول کو نقصان رہتا ہے۔

جو لڑکے خوب ترقی کر جاتے ہیں اُن کو اونچے درجے کے نازک کام یعنی مائیکرومیٹر (Micro meter) کا کام دیا جاتا ہے اور وہ یہ کام کرتے وقت اس کے ہر ایک عمل کو اچھی طرح سے سمجھ کر کرتے ہیں اور اس کے کرنے میں جو اصول ہیں اور جس غرض سے یہ کام کیا جاتا ہے اُس کو اچھی طرح سے سمجھ لیتے ہیں وہ اپنی مشینوں کی آپ ہی مرمت کر لیتے ہیں اور وہ یہ بھی سیکھ لیتے ہیں کہ مشینوں پر کام کرتے ہوئے کس طرح سے انھیں اپنی حفاظت کرنی چاہیے۔ وہ سانچہ بنانا بھی سیکھتے ہیں۔ اور اس طرح سے وہ اپنے استادوں کے ساتھ صاف ستھرے اور روشن دار کمروں میں رہ کر ایک کامیاب زندگی کی بنیاد ڈالتے ہیں۔

جب وہ سکول سے پاس ہو جاتے ہیں تو اُن کو کارخانوں کے اندر اچھی تنخواہوں پر نوکریاں حاصل کرنے کی کمی نہیں رہتی۔ اس بات کا اندر ہی اندر دھیان رکھا جاتا ہے کہ لڑکوں کا میل جول کن لوگوں کے ساتھ ہے۔ اور اُن کا چال چلن کیسا ہے۔ لڑکوں پر ڈنڈے کے ذریعے نگرانی نہیں رکھی جاتی۔ بلکہ پیار اور محبت کے ساتھ اُن کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ہمیں ہر ایک لڑکے کے گھر کی حالت کا اچھی طرح سے پتہ رہتا ہے۔ اور ہم سدا یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ اُس کو کس کام کا زیادہ شوق ہے۔ اُس کو کوئی کام سکھانے کے لیے زبردستی نہیں کی جاتی۔ اور نہ اُسے صرف کاٹھ کا پتلا بنایا جاتا ہے۔ ایک دن دو لڑکے آپس میں لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ تب ہم نے انھیں یہ لیکچر نہیں دیا کہ لڑنا بہت بری بات ہے۔ انھیں ہم نے یہ صلاح دی کہ اگر تم بیٹھ کر آرام کے ساتھ اپنے جھگڑے کا فیصلہ کر لو تو سب سے اچھا رہے گا۔ لیکن لڑکے آخر لڑکے ہی ہیں اور انھوں نے آخر یہ فیصلہ کیا کہ جس طرح پرانے زمانے میں ان باتوں کا فیصلہ ہوا کرتا تھا ویسے ہی ہم بھی کریں گے۔ تب ہم نے انھیں یہ کہا کہ یہ لو دستانے اور کارخانے کے فلاں کونے میں جا کر لڑائی کر لو۔ مگر شرط یہ ہے کہ اپنی لڑائی وہیں ختم کر کے آنا اور کارخانے سے نکل کر پھر جھگڑا بالکل مت

کرنا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں جنگ تو ضرور ہوئی مگر بہت چھوٹی اور پھر دونوں یار بن گئے۔

لڑکوں کے ساتھ لڑکوں جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے اور اُن کے اندر جو اچھی عادتیں ہوتی ہیں اُن کی تعریف کی جائے۔ جس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جب لڑکے اپنی جماعتوں یا ہمارے کارخانے کے اندر کام کرنے کے لیے آتے ہیں تو اُن کی آنکھوں میں اس بات کی ایک طرح کی چمک ہوتی ہے کہ وہ جلد ہی اس کام کے استاد بن جائیں گے۔ ان کے اندر یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔ وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ بھی کچھ ایسا ہی کام کر رہے ہیں جس کی کچھ قدر ہے۔ اس لیے وہ سب کام بڑی جلدی اور بڑے شوق سے سیکھ لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جو چیزیں وہ بنانی سیکھ رہے ہیں وہ ایسی ہیں جو کہ ہر ایک لڑکے کو ضرور آنی چاہئیں۔ اور گھر پر رہتے ہوئے وہ سدا اُن کو سیکھنا چاہتا تھا اور اپنے تمام رشتہ داروں اور واقف کاروں سے پوچھتا رہتا تھا۔ مگر کوئی نہیں بتاتا تھا اور نہ بتا سکتا تھا۔

اس سکول میں شروع میں چھ لڑکے داخل ہوئے تھے۔ مگر اب دو سو ہیں اور اب اس کا انتظام اتنا پکا اور عمدہ ہو گیا ہے کہ اس میں سات سو لڑکے پڑھ سکتے ہیں۔ پہلے اس کے چلانے میں گھاٹا رہا کرتا تھا۔ مگر کیونکہ یہ میرا ایک بنیادی خیال شروع سے رہا ہے کہ یہ کام جو کرنے کے قابل ہے اُس کو اس قابل بنایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ اس لیے یہ اسکول آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہوا اس حالت پر پہنچ گیا ہے کہ یہ اب اپنا خرچ خود بڑے مزے سے نکال لیتا ہے۔

ہم لڑکوں کے اندر جو اچھلنے کودنے کی عادتیں ہوتی ہیں اُن کو دبانے کی کوشش نہیں کرتے ہم لڑکوں کو کام گار بننا ضرور سکھاتے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنا لڑکپن بھول جائیں۔ یہ بات نہایت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں ایک لڑکا ساڑھے نو آنے سے لے کر ایک روپیہ ڈیڑھ آنہ فی گھنٹا کما لیتا ہے۔ اتنے پیسے شاید ایک نوجوان کو کسی اور جگہ آسانی کے ساتھ نہ مل سکیں۔ اس طریقے سے وہ ہمارے اسکول میں پڑھتے ہوئے باہر کسی اور جگہ کام کرنے کی نسبت اپنے کنبوں کا بہتر گزارہ کر سکتے ہیں جب وہ اسکول سے پاس ہو جاتے ہیں تو ایک تو ان کو معمولی تعلیم آ جاتی ہے اور دوسرے اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ دستکاری کی تعلیم بھی سیکھ لیتے ہیں جس کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ ایک کام گار کے طور پر

اتنے لایق ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی تنخواہ کما سکیں جس سے اگر وہ چاہیں تو اپنی تعلیم آیندہ جاری رکھ سکتے ہیں۔ اگر وہ آگے نہ بڑھنا چاہیں تو کم از کم اتنا ہنر اُن کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس سے وہ جہاں کہیں بھی چلے جائیں۔ کافی اچھی تنخواہ پا سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں وہ ہمارے کارخانوں میں ہی نوکریاں کریں مگر بہت سے پھر بھی ہمارے لڑکے ہمارے کارخانوں میں ہی ملازم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کو اور کسی جگہ اس سے بہتر نوکریاں ملنے کا پتہ نہیں ہوتا۔ مگر ہماری ہمیشہ یہی خواہش رہتی ہے کہ جن آدمیوں کو کام دیا جائے وہ اُس کام کرنے کے لایق ضرور ہونے چاہئیں لیکن ہم لڑکوں کو کبھی اپنے کارخانوں میں کام کرنے کے لیے مجبور نہیں کرتے۔ انھوں نے اپنی ہمت سے کام سیکھا ہے اور کسی نے اُن پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اس میں ہماری اُن پر کوئی خاص مہربانی نہیں ہے اور نہ کسی قسم کی خیرات کا سوال ہے۔ ہمارے ہاں ہر کام اپنے پیسے خود نکال کر کرنے والے کو ادا کرنا ہے۔

نورڈ ہسپتال بھی کچھ کچھ انہی اصولوں پر چلایا گیا ہے۔ مگر جنگ کی وجہ سے اس میں کچھ تھوڑی سی رکاوٹ پڑ گئی تھی۔ تب اسے ہم نے گورمنٹ کو دے دیا تھا۔ اور یہ جنرل ہسپتال نمبر 36 بن گیا تھا جس میں لگ بھگ ۱۵۰۰ بیمار رہا کرتے تھے۔ اس وجہ سے اس ہسپتال کے معاملے میں ہم کافی ترقی ابھی تک نہیں کر سکے۔ میں نے جان بوجھ کر اپنا نجی ہسپتال بنانا شروع نہیں کیا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں ہم نے اسے ڈیٹرائٹ جنرل ہسپتال کے طور پر بنانا شروع کر دیا۔ اور ہمارا یہ ارادہ تھا کہ اس کو لوگوں کے چندے سے کھڑا کیا جائے۔ میں نے بھی چندہ دیا اور عمارت بننی شروع ہو گئی۔ لیکن ابھی پہلی عمارت پوری تیار نہیں ہوئی تھی کہ چندے کا فنڈ ختم ہو گیا۔ اور مجھ سے اور چندے کی درخواست دی گئی۔ میں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں یہ کہتا تھا کہ اس فنڈ کے منیجروں کو عمارت کے شروع کرنے سے پہلے یہ حساب اچھی طرح سے لگا کر دیکھ لینا چاہیے تھا کہ کل لاگت کتنی آئے گی۔ اگر شروع میں ہی اس کے بنانے والے ایسی غلطیاں کر رہے ہیں تو اس کے تیار ہو جانے کے بعد لوگوں کو اس کے چلانے والوں پر کتنا اعتبار رہوگا۔ خیر میں نے یہ مان لیا کہ جتنا چندہ اب تک اکٹھا ہوا ہے وہ میں سب واپس کر دوں گا

اور سارا ہسپتال صرف میرا رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور ہم پورے زور کے ساتھ یہ ہسپتال بنا رہے تھے جبکہ پہلی اگست ۱۹۱۸ء کو یہ عمارت گورنمنٹ نے لے لی۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں یہ ہمیں واپس مل گئی اور اسی سال ۱۵ نومبر کو اس ہسپتال میں پہلا پرائیویٹ بیمار داخل ہوا۔

ڈیٹرائٹ میں یہ ہسپتال West Grand Boulevard پر واقع ہے اور بیس ایکڑ زمین گھیرے ہوئے ہے۔ تاکہ اگر کسی وقت ہسپتال کو بڑھانے کی ضرورت پڑے تو زمین کی دقت نہ ہو۔ ہمارا ارادہ یہ ہے کہ جیسے جیسے ضرورت پڑتی جائے ہسپتال بڑھانے جائیں۔ جو نقشہ ہم نے ہسپتال کا پہلے بنایا تھا وہ بالکل اب ترک کر دیا گیا ہے اور اب ہم نے ایک نئی قسم کا ہسپتال بنانے کا خیال کیا ہوا ہے۔ جس کی شکل اور انتظام بالکل نئے ڈھنگ کا ہے۔ امیروں کے لیے بہت سے ہسپتال ہیں، غریبوں کے لیے بھی بہت سے ہسپتال ہیں۔ لیکن ایسے درمیانے درجے کے آدمیوں کے لیے کوئی ہسپتال نہیں جو معمولی پیسوں میں اپنا علاج کرانا چاہتے ہوں۔ مگر یہ گوارا نا برداشت نہ کر سکتے ہوں کہ کسی ہسپتال میں مفت علاج کروا کر انھوں نے ایک قسم کی خیرات پائی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ جو ہسپتال لوگوں کی بھلائی کرنے کے لیے کھولے گئے ہیں وہ اپنا خرچ آپ نہیں نکال سکتے یعنی اس قسم کے ہسپتال یا تو لوگوں کے چندے سے چلنے چاہئیں یا ان کو مالدار لوگ سینی ٹوریم کی صورت میں چلائیں۔ اور ان سے منافع کمائیں۔ لیکن ہم نے جو یہ ہسپتال کھولا ہے وہ اس غرض سے ہے کہ یہ اپنا خرچ خود نکالے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کم سے کم لاگت پر لوگوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے۔ اور ان کو بالکل یہ محسوس نہ ہونے دے کہ اس طرح ان کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کی گئی ہے۔ یا ان پر کچھ احسان کیا گیا ہے۔

ہماری نئی عمارت میں کوئی جدا جدا حصے نہیں سب کمرے پرائیویٹ ہیں اور ہر ایک کمرے کے ساتھ غسلخانہ ہے۔ جو بیس کمرے ہیں جو سبھی ایک جیسے لمبے چوڑے ہیں۔ اور جن کے اندر بجلی اور فرنیچر کا سامان بالکل ایک جیسا ہے۔ یعنی کمروں میں بالکل کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم نے یہ پہلے سے ہی قاعدہ باندھا ہوا ہے کہ ہسپتال کے اندر کسی بھی چیز کی کوئی تمیز نہیں رکھی جائے گی۔ ہر ایک بیمار کا دوسرے سب بیماروں جیسا ایک درجہ ہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ جس طرح سے آجکل دوسرے ہسپتال چل رہے ہیں آیا وہ بیماروں کے فائدے
کے واسطے بنائے گئے ہیں یا ڈاکٹروں کے. میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ جہاں ایک لایق ڈاکٹر یا
سرجن کسی بیمار کو مفت دیکھتا ہے تو بھی وہ اکثر کر کے بڑے غور کے ساتھ اور کافی وقت خرچ کر کے
علاج کرتا ہے. لیکن میں یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ ڈاکٹروں اور سرجنوں کی فیسیں بیمار کی حیثیت کے
مطابق ہونی چاہیئے اور میرا یہ پختہ یقین ہے کہ ڈاکٹروں کی یہ بڑی بڑی فیسیں دنیا انسانیت کے ماتھے
پر کلنک کا ٹیکہ ہے اور ڈاکٹری پیشہ کی ترقی کی راہ میں سخت رکاوٹ ہے ابھی تک بیماری کی تشخیص
کا علم ڈاکٹروں کو پوری طرح سے نہیں آیا. میں کسی ایسے ہسپتال کا مالک بننا پسند نہیں کرتا جہاں کہ مجھے
یہ پورا یقین نہ ہو کہ اس جگہ پر ہر ایک بیمار کی بیماری ٹھیک ٹھیک طور پر پہچان لی گئی ہے اور ہر ایک کا علاج
صحیح طور پر ہو رہا ہے. کیونکہ میں یہ نہیں مانتا کہ جو ایک ڈاکٹر نے کہہ دیا اسی کے بھروسہ پر اندھا دھند
علاج کراتے رہنا عقلمندی نہیں ہے. لیکن ڈاکٹروں میں یہ ایک قسم کا قاعدہ بنا ہوا چلا آ رہا ہے کہ اگر
ایک ڈاکٹر نے غلط تشخیص کر دی تو پھر اس کو کسی دوسرے ڈاکٹر کے لئے کاٹ کر صحیح کرنا نہایت مشکل ہوتا
ہے اور برا مانا جاتا ہے اگر دوسرا ڈاکٹر سمجھدار ہے تو جب تک وہ پہلے ڈاکٹر کو بلا کر منا نہیں لے گا تب تک
وہ بیمار کی تشخیص یا علاج میں بالکل کوئی تبدیلی نہیں کرے گا اور پھر بھی اگر تبدیلی کرے گا تو اس طریقہ سے
کہ بیمار کو اس کا بالکل پتہ نہ لگے. ایک یہ خیال لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے کہ جب ایک بیمار ڈاکٹر
کے پاس آئے خاصکر ہسپتال میں تو ڈاکٹر کی جیسی مرضی ہو اس کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے. لیکن ایک
ایماندار ڈاکٹر کبھی اپنے بیمار کو لوٹنے کا ارادہ نہیں کرتا مگر ایک بے ایمان ڈاکٹر کی ہمیشہ یہی خواہش رہتی ہے
بلکہ بہتیرے ڈاکٹر جتنا بیمار کو راضی کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اتنا ہی یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جو بیماری
انھوں نے تشخیص کی ہے وہ کہیں غلط ثابت نہ ہو جائے.

ہمارے ہسپتال کا یہ منشا ہے کہ ہم یہاں پر ڈاکٹروں کو یہ چالیں چلنا نہیں دینگے اور سب سے زیادہ
پہلے بیمار کو راضی کرنے کا خیال کریں گے اسی لیے سب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس ہسپتال میں ہماری کچھ نہیں چلتی
ہسپتال میں جتنے ڈاکٹر اور دائیاں ملازم ہیں ان سب کو ایک سال کے لیے نوکر رکھا جاتا ہے اور ان کو
ہسپتال سے باہر پریکٹس کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی. چھوٹے موٹے سب ملا کر ہسپتال میں اکیس ڈاکٹر

اور سرجن ہیں۔ ان کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ چنا گیا ہے اور ان کو اتنی اچھی تنخواہیں دی جاتی ہیں کہ اگر وہ پرائیویٹ پریکٹس کرتے اور کامیابی کے ساتھ تو بھی وہ کبھی اتنا روپیہ نہ کما سکتے۔ ان میں سے کوئی ڈاکٹر کسی بیمار سے ایک دمڑی بھی نہیں لے سکتا اور ہسپتال کے اندر کوئی بیمار کسی باہر کے ڈاکٹر سے علاج نہیں کرا سکتا۔ لیکن اگر کسی بیمار کا فیملی ڈاکٹر آ کر ہماری مدد کرنا چاہے تو ہم بڑی خوشی سے اس کو آنے دیتے ہیں۔ ہم اُس کی جگہ چھیننا نہیں چاہتے بلکہ جتنا علاج اُس نے بیمار کا کیا ہوا ہوتا ہے اُس سے آگے اور علاج کرتے ہیں اور ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ جلدی سے جلدی بیمار کو راضی کر کے بیمار کو لوٹا دیا جائے ہمارے ہسپتال کے اندر سسٹم ایسا ہے کہ بیماروں کو ضرورت سے زیادہ ہم رکھنا نہیں چاہتے کیونکہ بیماروں سے ہم کچھ کمانا نہیں چاہتے۔ بیمار کے متعلق جو کچھ ہمارے ڈاکٹر سمجھتے ہیں وہ ہم اُس کے فیملی ڈاکٹر کو بتا دیتے ہیں۔ لیکن جب تک بیمار ہسپتال کے اندر رہتا ہے ہم اُس کی پوری ذمہ داری اپنے سر پہ لیتے ہیں اس لئے باہر کا ڈاکٹر آ کر اُس کا علاج تو نہیں کر سکتا۔ لیکن ہم فیملی ڈاکٹر کی پوری مدد لینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

ایک بیمار کا داخلہ ہمارے ہسپتال میں بڑا مزے دار ہوتا ہے۔ سب سے پہلے جب ایک بیمار آتا ہے تو اُس کو بڑا ڈاکٹر دیکھتا ہے۔ پھر بیمار کو باری باری سے تین یا چار ڈاکٹر یا جتنے ضروری ہوں الگ الگ دیکھتے ہیں۔ اس موقع پر یہ کبھی خیال نہیں کیا جاتا کہ بیمار کس بیماری کا علاج کرانے کے لیے ہسپتال میں آیا ہے۔ کیونکہ اب آہستہ آہستہ یہ بات ہماری سمجھ میں آ رہی ہے کہ صرف ایک بیماری کا علاج کرنے کی نسبت یہ زیادہ ضروری ہے کہ بیمار کو پوری صحت حاصل ہو۔ ہر ایک ڈاکٹر بیمار کا سر سے لے کر پیر تک پورا امتحان کرتا ہے اور ہر ایک ڈاکٹر اپنی رپورٹ علیحدہ بغیر دوسرے ڈاکٹروں سے مشورہ کئے بڑے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیتا ہے۔ اس طرح سے تین یا کبھی کبھی چھ یا سات بالکل مکمل اور بالکل الگ الگ تشخیص بڑے ڈاکٹر کے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ اور ان سب کو ملا کر بیمار کا پورا امتحان تیار ہو جاتا ہے۔ یہ سب دور اندیشیاں اس لئے کی جاتی ہیں۔ تاکہ جتنا آج تک حکمت اور ڈاکٹری کا علم بڑھا ہے اس کے مطابق ہم بیماری کی ٹھیک ٹھیک تشخیص کر سکیں

اسوقت ہسپتال کے اندر لگ بھگ چھ سو بیماروں کے رہنے کا انتظام ہے ہر ایک بیمار کی ایک جیسی فیس مقرر ہے جس میں کمرے کا کرایہ خوراک دوائی. ڈاکٹر کے معائنہ کرنے کی فیس اور نرسوں (دائیوں) کی لگاتار خدمت اور دیکھ بھال کرنے کا خرچ یہ سب شامل ہے. اس کے علاوہ اور کوئی بخشیش نہیں دینی پڑتی. نہ کوئی بیمار اپنی طرف سے کوئی پرائیویٹ دایہ الگ رکھ سکتا ہے. اگر ہسپتال کے ایک حصہ میں جتنی دایہ کا [illegible] ہیں اُس سے ایک بیمار کی وجہ سے زیادہ کی ضرورت ہے تو وہاں پر ایک اور دایہ [illegible] جاتی ہے. لیکن اس کا خرچہ الگ بیمار سے اور نہیں لیا جاتا. مگر ایسا بہت کم کرنا پڑتا ہے. کیونکہ [illegible] کو اُن کی بیماری کی حالت کے مطابق جتنی خبر گیری کی ضرورت ہوتی ہے اُس کے لحاظ سے فریقوں میں انھیں بانٹ کر رکھا جاتا ہے. یعنی ضرورت کے مطابق. شاید دو بیماروں پر ایک دایہ لگانی پڑے. یا پانچ بیماروں کے لئے صرف ایک دایہ کافی ہو. مگر ایک وقت میں ایک دایہ کے پاس سات سے زیادہ بیمار نہیں رکھے جاتے. کیونکہ ہسپتال کے اندر انتظام بہت اچھا ہے. اس لیے اگر بیماروں کو سخت بیماری نہ ہو تو ایک دایہ مزے سے سات بیماروں کا خیال رکھ سکتی ہے. عام طور پر ہسپتالوں میں دائیوں کو فضول بہت سا ادھر ادھر گھومنا پڑتا ہے. بیماروں کی خبرگیری کی نسبت اُن کا زیادہ وقت ہسپتال کے اندر ادھر اُدھر چلنے پھرنے میں خراب ہو جاتا ہے. ہمارے ہسپتال میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ نرسوں کو فضول زیادہ نہ گھومنا پڑے. ایک منزل میں جتنی سامان کی ضرورت پڑ سکتی ہے. وہ سب چیزیں پوری پوری وہاں پر موجود ہوتی ہیں. اور جس طرح ہم اپنے کارخانوں کے اندر ہمیشہ اس بات کی احتیاط رکھتے ہیں کہ کام گاروں کو کوئی فضول حرکت چلنے پھرنے کی نہ کرنی پڑے اسی طرح ہسپتال کے اندر بھی ہم نے اس بڑے رواج کو ہٹانے کی کوشش کی ہے ہسپتال کے اندر ایک بیمار کا خرچ کمرے کا کرایہ نرس اور ڈاکٹر کی فیس اور دوائیوں کی قیمت یہ سب ملا کر ساڑھے تیرہ (13½) روپے فی روزہ آتا ہے. اور جوں جوں ہمارا ہسپتال ترقی کرے گا یہ خرچ اور بھی گھٹ جائے گا. ایک بڑے آپریشن کا خرچ ۳۷۵ روپئے ہے. چھوٹے چھوٹے اپریشنوں کی فیس اُن کے مطابق چارج کی جاتی ہے سب فیسیں مقرر نہیں اور بیماری کے لحاظ سے بڑھا یا گھٹا دی جاتی ہیں. ایک فیکٹری کی طرح ہم ہسپتال کے سارے خرچ اور

لاگت کا حساب برابر رکھتے ہیں جس سے ہمیں پتہ رہتا ہے کہ ہمیں بیماروں سے کتنی فیسیں کس لحاظ سے چارج کرنی چاہئیں۔

مجھے کوئی ایسی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں ہمارا یہ تجربہ کامیاب نہ ہو۔ اگر انتظام اچھا ہو اور خرچ سوچ سمجھ کر ہسپتال کا کیا جائے تو کامیابی ضرور ہوگی جس طرح کہ ایک فیکٹری کا اچھا انتظام ہونے سے اس کا اس کا پورا پورا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اُسی طرح اگر ہسپتال کا انتظام بھی اچھا ہو تو ہسپتال سے بھی پورا پورا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے، اور اتنے تھوڑے خرچ پر کہ ہر ایک آدمی اُس سے فائدہ حاصل کر سکے ایک ہسپتال اور ایک فیکٹری کے حساب کے اندر صرف اتنا ہی فرق ہے کہ ہسپتال کے کام میں کوئی منافع کی اُمید نہیں رکھی جاتی۔ نہ ہم یہ اُمید کرتے ہیں کہ ہسپتال کے اندر جن چیزوں کو پرانی ہو جانے کی وجہ سے وقت وقت پر بدلنا پڑتا ہے۔ یا ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کرانی پڑتی ہے وہ سب خرچہ ہسپتال اپنے پاس سے نکال لے گا۔ اب تک ہم ہسپتال میں دو کروڑ ستر لاکھ روپیہ لگا چکے ہیں۔

اگر کسی طرح لوگ خیرات کرنے کی عادت کو چھوڑ دیں تو جو روپیہ لنگروں اور بھنڈاروں کے چلانے میں برباد ہوتا ہے اُسی رقم سے ہم مال سستا اور زیادہ تعداد میں تیار کر کے لوگوں کی کہیں زیادہ بھلائی کر سکتے ہیں۔ اس طرح سے نہ ہم صرف سوسائٹی اور لوگوں کو ٹیکس کے بوجھ اور بھنڈارے سے چھڑا سکیں گے بلکہ ہم ملک کی دولت کو بھی کافی بڑھالیں گے۔ بہت سے کام ایسے ہیں جو ہمیں مل کر کرنے چاہئیں، لیکن ہم انہیں لوگوں کو جدا جدا پرائیویٹ طور پر کرنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں ہمیں لوگوں کی بھلائی کی خاطر کچھ اور زیادہ سوچ کر ترقی کا کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک کے سب لوگوں کو زیادہ خوشحال بنانے کے لیے کوئی ایسے کام کرنا سیکھیں جس سے سب کے پاس دھن زیادہ بڑھے

ہماری زندگی کے واسطے روپیہ کی جو ضرورت ہے اُس کو کمانے کے جو اصلی اور سنہری قاعدے ہیں اُن کی ہمیں خبر نہیں اور اس وجہ سے اکثر لوگ سٹہ بازی میں پڑ کر صرف اپنے لیے خوب دھن، کمانے کی کوشش اور فکر میں لگے رہتے ہیں، جتنا ہماری زندگی سے پیدا ہو سکتا ہے اُس سے زیادہ کوئی نہیں کما سکتا۔ مگر پھر بھی لاگ بھاگ ہر ایک آدمی یہی سمجھتا ہے کہ وہ زیادہ کما سکتا ہے سٹہ بازوں کو اور روپیہ چاہیئے۔ مزدوروں کو اور روپیہ چاہیئے۔ کچے مسالوں کے سپلائی کرنے والوں کو

اور روپیہ چاہیئے، اور خریدنے والی پبلک کو اور روپیہ چاہیئے۔ کبنے کا ہر ایک آدمی یہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ آمدنی سے زیادہ خرچ کرکے ہمارا گزارہ نہیں۔ اتنی بات بچے بھی جانتے ہیں لیکن لوگوں کے دماغ میں یہ معمولی سی بات نہیں آتی کہ آمدنی سے زیادہ وہ کبھی خرچ نہیں کر سکتے اور جتنا مال وہ تیار کرتے ہیں اُس سے زیادہ وہ کھا نہیں سکتے۔

خیرات صرف اُسی حالت میں ہٹائی جا سکتی ہے جبکہ لوگ اچھی طرح سے سمجھ لیں کہ زندگی روپے اور دھن کی اصلی ضرورت کیا ہے۔ کیونکہ اس بات کی خبر نہ ہونے سے لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ ڈر سا لگا رہتا ہے۔ اگر ڈر اڑ جائے تو لوگوں کو اپنے اوپر بھروسہ کرنا آ جائے جب لوگ اپنے اوپر بھروسہ کرنا سیکھ لیتے ہیں تو پھر خیرات کی ضرورت نہیں رہتی۔

انسان کو ڈر اور خوف صرف کسی دوسرے آدمی یا چیز کے محتاج ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے فورمین کی مہربانی یا عنایت۔ دوکان کی خوشحالی یا مارکیٹ میں برابر کاروبار کے چلتے رہنے پر اپنی ترقی کی اُمید لگائے رکھنا۔ یعنی دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ خوف انسان کا وہ حصہ یا جزو ہے۔ جو اپنی ترقی اور خوشحالی دنیاوی حالات کے ماتحت کسی دوسرے کے ہاتھوں میں ہونا قبول کرتا ہے۔ جب آدمی کی رُوح اُس کے جسم کی غلام بن جاتی ہے تو اس کا نتیجہ لازمی طور پر خوف کا ہونا ہوتا ہے۔ ہار کی عادت صرف من کے ماننے کی بات ہے۔ اور ڈر کی ماں ہے۔ یہ عادت لوگوں میں اس لئے پکی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ لمبی سوچ نہیں کرتے۔ وہ کوئی کام تو کرنا شروع کر دیتے ہیں مگر جم کر نہ کرنے کی وجہ سے مکمل کر نہیں پاتے۔ کیونکہ صحیح جانکاری نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے پاؤں پہلا قدم اُٹھاتے ہی لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ ذرا آگے بڑھنے پر انہیں ایک اور ٹھوکر لگتی ہے۔ اور تھوڑا سا اور آگے بڑھنے پر اُن کو ایک ایسی مشکل نظر آتی ہے جس کو وہ سمجھتے ہیں کہ اس کو وہ کبھی پار نہیں کر سکتے تب وہ چلا اُٹھتے ہیں کہ "مر گئے"، اور کام چھوڑ چھاڑ کر ایک طرف ڈھیری ڈھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے ہارنے کا اپنے آپ کو کبھی پورا موقع ہی نہیں دیا۔ اُنھوں نے کبھی یہ ٹھنڈے دل سے سوچا ہی نہیں تھا کہ کس طرح سے وہ اپنے کام میں کامیاب ہونا کامیاب ہوں گے۔ اُنھوں نے یہ معمولی سی بات کبھی نہیں سوچی کہ دنیا میں کوئی کام بھی کرو۔ راستے میں ضرور کچھ نہ کچھ تکلیفیں آئینگی جو بالکل

قدرتی بات ہے۔ اور ان کو دیکھ کر وہ گھبرا گئے اور اپنی ہار مان کر بیٹھ گئے۔

لوگ اتنے ناکامیاب نہیں ہوتے جتنی وہ اپنی ہار مان بیٹھتے ہیں۔ اُن کو عقل روپیہ یا لیاقت یا ہمت کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر ان کے اندر حوصلہ اور جم کر کام کرنے کی کمی ہوتی ہے۔ دنیا کے اندر جو کامیابی نظر آتی ہے اُس سب کا بے تاج بادشاہ یہی جم کر کام کرنے کا معمولی سادہ اور پرانا قاعدہ ہے وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اپنی ناکامیابی کا الزام دوسری چیزوں پر یا اپنی قسمت پر تھوپتے ہیں وہ اپنے سے پہلے لوگوں کی کامیابیوں کو دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ کامیابیاں اُنھیں بڑی آسانی سے حاصل ہوگئی تھیں۔ مگر یہ بالکل غلط ہے اور اصلی بات اس سے بالکل مختلف ہے۔ دنیا میں ناکامیاب ہونا آسان ہے اور کامیابی حاصل کرنا ہمیشہ بہت مشکل ہے۔ ایک آدمی بڑی آسانی کے ساتھ کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن کامیاب ہونے کے لیے اس کو اپنا خون اور پسینہ ایک کر دینا پڑتا ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ جو چیزیں نکمی ہیں اور انسان کو اوپر اُٹھانے والی نہیں ہیں اُن میں کامیابی حاصل کرنا بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔

اگر ایک آدمی کو انڈسٹری کے دھندوں سے سدا ڈر لگتا رہتا ہے۔ تو بہتر ہے کہ وہ ایک ایسی جگہ چلا جائے۔ جہاں پر اُس کو انڈسٹری کا سہارا لینے کی بالکل ضرورت نہ رہے۔ وہ کھیتی باڑی کر سکتا ہے، اور آج کل تو کھیتی باڑی کرنے کے لیے لوگ اور بھی کم رہ گئے ہیں۔ اگر ایک آدمی کو ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ اگر اس کا مالک خوش ہوگا تبھی اُس کی ترقی ہوگی تو بہتر ہے کہ وہ اپنے مالک کے پنجے سے جتنی جلدی ہو سکے نکل آئے۔ وہ اپنا الگ کام جاری کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اس طریقہ سے اتنا دولتمند نہ بن سکے جتنا کہ اُس کا پہلا مالک۔ اور شاید اُس کو اتنی بھی کامیابی نہ ہو سکے۔ لیکن کم سے کم اُس کی جان کو جو ڈر کا عذاب لگا ہوا تھا اُس سے وہ چھوٹ جائے گا۔ کیا روپئے اور عزت کے مقابلے میں یہ کوئی چھوٹی سی چیز ہے؟ جس سوسائٹی کے اندر ایک آدمی پیدا ہوا ہے اگر اُس میں وہ اپنی حالت کے مطابق اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہے جس سے اُس کے دل میں کوئی ڈر یا خوف نہ رہے۔ تو اس سے اور اچھی بات کوئی نہیں جس جگہ پر تم کبھی کسی کے غلام بنے تھے وہیں پر آزاد ہو کر دکھاؤ۔ جہاں پر تم لڑائی ہارے تھے۔ وہاں پر ہی جیت کر دکھاؤ۔ میں اس بات کی سمجھ آئیگی

کہ گو تمھارے چاروں طرف بہت کچھ خرابیاں تھیں۔ لیکن اُن سے کہیں زیادہ خرابیاں تمھارے اپنے اندر موجود ہیں۔ اس لئے تمھارے اپنے اندر کی خرابیاں تم سے باہر جو اچھائیاں ہیں۔ اُن کو بھی برباد کر کے رکھ دیتی ہیں۔

اب بھی پرمیشور نے دنیا کے تختے پر جتنی چیزیں پیدا کی ہیں اُن میں انسان سب سے بہتر اور بڑا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو وہ پھر بھی انسان ہے۔ کل کو اگر بیوپار مندا پڑ جائے۔ تو بھی وہ انسان ہی بنا رہتا ہے جس طرح سردی گرمی کے مطابق انسان بدلتا ہوا بھی انسان ہی رہتا ہے۔ اُسی طرح حالتوں کے مطابق بدلنے پر بھی وہ انسان ہی رہتا ہے۔ اگر انسان کے دل میں صرف ایک یہ خیال اچھی طرح سے بیٹھ جائے تو اُس کی آنکھیں کھل جائیں اور اُس کی کایا ہی پلٹ جائے۔ آدمی کے پاس اپنے سے باہر کچھ بھی نہیں۔ آدمی کی ساری دولت اُس کے اپنے اندر ہی موجود ہے۔ اگر وہ ڈر کو باہر نکال پھینکے تو وہ دنیا میں بڑے چین کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر سکے گا۔ اور اُس کو کسی چیز کی کمی نہیں رہیگی۔

ہر امریکن کو یہ عہد کر لینا کر لینا چاہیئے کہ وہ کبھی کسی کی دھونس نہیں برداشت کرے گا۔ اور نہ کسی کی میٹھی باتوں میں پھنسے گا۔ امریکنوں کا کسی کی دھونس یا میٹھی باتیں سنتے ہی خون کھولنے لگ جانا چاہیئے یہ شراب کے نشہ کی مانند ہیں۔ دنیا میں چھاتی تان کر چلو۔ اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پسارو۔ دوسروں کا محتاج ہونا یا خیرات لینا کمزور اور نکمّے آدمیوں کا کام ہے۔

بیان ۱۶

ریلوے کمپنیاں

اس ملک کے اندر جس بُرے طریقے سے ریلوے کمپنیاں کام کر رہی ہیں اُس سے بڑھ کر اس بات کی کوئی مثال نہیں مل سکتی کہ کس طرح سے ایک بیوپار کے ذریعے بجائے خلقت کا بھلا کرنے کے الٹا نقصان کیا جا سکتا ہے۔ ریلوے کا انتظام کرنا ایک بڑا بھاری سوال ہے اور اس کو حل کرنے کے لیے بڑے بڑے لایق آدمیوں نے بہت دماغ لڑایا ہے۔ اور قابلیت سے بحث کی ہے۔ ہر ایک آدمی ریلوے کے انتظام سے ناخوش نظر آتا ہے۔ پبلک اس لیے خوش نہیں کیونکہ سواری اور مال گاڑی دونوں کا کرایہ بہت زیادہ ہے۔ ریلوے کے ملازم اس لئے ناخوش ہیں، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں تنخواہیں بہت تھوڑی ملتی ہیں اور کام ہم سے بہت زیادہ لیا جاتا ہے۔ ریلوے کمپنیوں کے مالک اس لئے ناخوش ہیں کیونکہ ان کا یہ خیال ہے کہ جتنی ہماری ان پر لاگت آئی ہے اُس کے مطابق ہم کو مناسب آمدنی نہیں ہوتی ایک دھندے کا انتظام تبھی اچھا سمجھا جا سکتا ہے جبکہ ہر شخص کی جس کا اس کے ساتھ تعلق ہو پوری پوری تسلی ہو جاوے۔ اگر ایک دھندے کو کر کے اُس کے مالکوں اور ملازموں اور پبلک کو فائدہ نہیں ہوتا۔ تو اس کا مطلب صاف ہے کہ جس طریقے سے وہ دھندا چل رہا ہے اُس کے انتظام میں کہیں نہ کہیں کچھ نقص ضرور ہے

میں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ ریلوے کے معاملے میں میرا جو علم ہے اُسے پتھر کی لکیر سمجھنا چاہئے ریلوے کمپنیوں کے معاملوں میں خوب واقفیت رکھنے والے بیشک اسوقت بہت ہونگے۔ لیکن امریکہ میں جس طرح سے اسوقت ریلیں چل رہی ہیں اگر وہ اُن کی لیاقت کا ثبوت ہے تو مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑیگا کہ اُس کو

دیکھ کر میرے دل میں اُن کی لیاقت اور علم کے لئے کوئی خاص عزت پیدا نہیں ہوئی۔ مجھے اس بات کے تسلیم کرنے میں ذرا بھی شک وشبہہ نہیں کہ ریلوے کمپنیوں کے جن منیجروں کے سپرد ریلوں کے چلانے کا کام واقعی ہے۔ اور اصل میں جو یہ کام کر رہے ہیں، وہ صحیح صحیح ریلوں کا انتظام اور انکو چلانے کا کام اتنی قابلیت اور لیاقت سے بخوبی کر سکتے ہیں جس سے ہر ایک کی پوری پوری تسلّی ہو جائے اور کسی کو بالکل شکایت نہ ہو، مگر اس کے ساتھ ہی مجھے یہ ماننے میں بھی ذرا شک وشبہہ نہیں۔ کہ حالات ایسے خراب پیدا ہو گئے جن سے مجبور ہو کر ان سب کو ایسا عمارہ انتظام اور کام کرنا پڑا بس جتنی خرابیاں ہمیں اسوقت نظر آتی ہیں۔ ان میں سے اکثر کی یہی وجہ جڑ ہے جن لوگوں کو ریلیں چلانے کی عقل تھی اور جو اس علم میں جانکاری رکھتے تھے۔ ان کو یہ انتظام کرنے کا موقع نہیں ملا۔

دھن کی نسبت میں اس سے پہلے کسی بیان میں لکھ چکا ہوں کہ ادھار دھن، ادھار لینے میں کون کون سے خطرے ہیں۔ یہ بالکل صاف بات ہے کہ جو آدمی اپنے انتظام کی غلطیوں کو چھپانے کی غرض سے خوب روپیہ ادھار لیتا ہے وہ ان غلطیوں کو درست کرنے کی بجائے روپیہ اُدھار لینا ہی بہت بہتر سمجھنے لگیگا۔ ہماری ریلوے کمپنیوں کے منیجروں کو زبردستی روپیہ اُدھار لینا پڑا۔ کیونکہ جب سے ریلوے چلی ہیں تبھی سے اُن کو کبھی آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اصل میں ریلوے کمپنیوں کے کرتا دھرتا ریلوے کے کام سے واقف کار نہیں۔ بلکہ ہمیشہ سے مینیجر یعنی مہاجن لوگ رہے ہیں۔ جب ریلوے کمپنیوں کی ساکھ بہت چڑھ گئی تھی تو ریلوے کمپنیوں کے چلانے والوں کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ پبلک کی خدمت کرنے کے بجائے فلوٹنگ بانڈ جاری کر کے اور سکیورٹیوں (Securities) میں روپیہ لگا کر خوب دولت پیدا کی جائے۔ ریلوے کی کمائی سے جو روپیہ پیدا ہوتا تھا اُس آمدنی کا بہت ہی تھوڑا حصہ جائیدادوں کو بحال کرنے میں خرچ ہوتا تھا جب قابل انتظام کی وجہ سے آمدنی اتنی بڑھ گئی کہ اسٹاک کے اوپر کافی ڈیویڈنڈ (dividend) دیا جا سکتا تھا۔ تو سب سے پہلے ان سٹے بازوں نے ریلوے کی مالی پالیسی کو ہاتھ میں لیکر اسٹاک کی قیمت کو پھیلانا اور اپنی جائیدادوں کو چھڑانا شروع کر دیا۔ اور آمدنی کی وجہ سے مارکیٹ میں جو ساکھ جم گئی تھی اُس کی شہ پر بانڈ جاری کر دیئے گئے۔ جب آمدنی کم ہو گئی یا کچھ عرصہ کے لئے گھٹ گئی تو ان سٹے بازوں نے اسی اسٹاک کو

کم داموں میں واپس خرید لیا اور اسی طرح سے ہمیشہ کبھی مال خرید لینا کبھی بیچ دینا یہ بیوپار شروع کر لیا
یونائیٹڈ سٹیٹس (U. S. A.) میں مشکل سے ایسی کوئی ریلوے کمپنی ملے گی جس کا ایک بار بھی دیوالہ
نہ نکل چکا ہو۔ کیونکہ کمپنی کے چلانے والوں نے کمپنی کے سر پہ دھڑا دھڑ سیکیورٹیوں کا اتنا بوجھ
لاد دیا کہ آخر میں وہ کمپنی ہی بیٹھ گئی۔ تب انھوں نے اس کا دیوالہ دے دیا اور بھولے بھالے
سیکیورٹی رکھنے والوں کی جیبوں سے روپیہ اینٹھنا شروع کر دیا۔ اور لین دین کا سلسلہ قائم کر کے پھر وہی
چالیں چلنی اور چالاکیاں کرنی شروع کر دیں۔

عام طور پر ایک بینکر کا ساتھی وکیل ہوا کرتا ہے ریلوے کمپنیوں کے اندر آج تک جو چالاکیاں
ہوتی رہی ہیں وہ بغیر ایک لائق وکیل کی صلاح کے نہیں ہو سکتی تھیں بینکروں کی طرح وکیلوں کو بھی
بالکل خبر نہیں کہ بیوپار کس کو کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ایک بیوپار قانون کی حد کے اندر چل
رہا ہے یا قانون کو اس کے مطابق بدلا یا توڑا مروڑا جا سکتا ہے تو بس بیوپار یا دھندا بالکل ٹھیک ٹھیک
چل رہا ہے۔ یہ لوگ صرف قاعدوں اور قانون کے مرید ہیں۔ بینکروں نے روپے کا انتظام منیجروں
سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور انھوں نے وکیلوں کی اس وجہ سے مدد لی تا کہ ریلوے کمپنیاں
قانون کو اس طریقے سے توڑیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریلوے
کمپنیوں کے اندر قانون کے بہت سے دفتر کھل گئے۔ حالات کے مطابق سیدھے راستے پر چلنے کی
بجائے ہر ایک ریلوے کمپنی نے وکیلوں کی رائے پر کام کرنا شروع کر دیا۔ کمپنی کے ہر محکمے کے اندر
قانونی قاعدوں کی بھرمار ہو گئی۔ بعد میں ان کے اوپر سرکار نے اور فیڈرل گورمنٹ نے اپنے اپنے الگ
قانون بنا کر اور ٹھونس دیئے۔ اور آج یہ حالت ہے کہ سب ریلوے کمپنیاں اس وقت قانون اور قاعدوں
سے اتنی سخت جکڑی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ جب ریلوے کمپنیوں کو اندر سے وکیلوں اور بینکروں نے اور
باہر سے سرکاری قانون اور قاعدوں نے کس کر پکڑا ہوا ہو تو بیچارے ریلوے منیجروں کی کیا طاقت ہے
کہ وہ کچھ بول سکیں یا کر سکیں۔ ریلوے کمپنیوں میں آج کل سب سے بھاری نقص یہی ہے کہ وکیل لوگ
بیوپار نہیں چلا سکتے جس طرح سے ہم نے ڈیرائے میں ٹولیڈو اور آئرن ٹن ریلوے چلائی ہے اس کو
دیکھ کر ہماری پوری تسلی ہو گئی ہے کہ بینکروں اور وکیلوں کی چنگل سے بچ کر ایک دھندا چلانے میں

واقعی بہت فائدہ رہتا ہے۔ ہم نے اس ریلوے کو اس لیے خریدا تھا کیونکہ ہم نے ریڈ ور وہ کے کنارے جو
کارخانہ جاری کیا تھا اُس کو کاٹ کر یہ ریلوے لائن گذرتی تھی ہم نے اس خیال سے اس کو نہیں خریدا تھا
کہ یہ سودا کر لینے میں ہم کو بڑا منافع رہے گا۔ یا یہ کہ ہم اپنے اور دھندوں کے ساتھ یہ اور کام بھی جوڑ لیں گے
اور نہ ہی ہمیں اس وقت یہ خیال تھا کہ اس کو خریدنے سے ہماری حالت بہت مضبوط ہو جائیگی۔ اس
ریلوے لائن کی اب جو اتنی اچھی حالت نظر آتی ہے وہ ہمارے خرید کر لینے کے بعد بنی ہے۔ مگر یہاں
یہ سوال نہیں۔ ہم نے اس ریلوے کو اس وجہ سے خریدا تھا۔ کیونکہ اس سے ہمارے راستے میں
رکاوٹ پڑتی تھی۔ اس لئے ہم نے کچھ نہ کچھ ضرور اس کا بندوبست کرنا تھا۔ اور اس کا علاج صرف
یہی تھا کہ اس کو اس طریقے سے چلایا جائے جس سے کچھ آمدنی کی صورت پیدا ہو۔ تب ہم نے
اس ریلوے کو چلانے کے لئے بالکل وہی قاعدے اور اصول استعمال کئے جن کے مطابق ہم
اپنے دوسرے دھندوں کے ہر ایک محکمے کو چلاتے ہیں۔ ابھی تک اس ریلوے لائن کو چلانے
کے لیے ہم نے کوئی خاص کوشش نہیں کی نہ اس کے ذریعے ہم نے لوگوں کو یہ جتلانا چاہا ہے،
کہ کس طرح سے ایک ریلوے کامیابی کے ساتھ چلائی جا سکتی ہے۔ اتنا ضرور درست ہے۔ کہ
کیونکہ ہمارا شروع سے ہی یہ اصول رہا ہے کہ کم سے کم لاگت پر پبلک کی زیادہ سے زیادہ خدمت
کی جائے۔ اور اُن کو آرام پہنچایا جائے۔ اس لیے ہماری آمدنی خرچ سے ہمیشہ زیادہ رہی ہے
جو کہ اس ریلوے لائن کی خراب حالت کو دیکھتے ہوئے واقعی ایک تعجب کی بات ہے۔ لوگ کہتے
ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر جو ہم نے تبدیلیاں کی ہیں وہ اتنی بڑی اور زبردست ہیں
کہ عام طور پر وہ دوسری ریلوے کمپنیوں میں نظر نہیں آتیں۔ حالانکہ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ تبدیلیاں
بالکل معمولی ویسی ہی ہیں۔ جو کہ ہمارے دوسرے دھندوں میں عام چالو ہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے
کہ جو اصول اور قاعدے بڑے بڑے دھندوں میں برتے جاتے ہیں وہی چھوٹے دھندوں میں
بھی استعمال ہونے چاہئیں۔ ہم نے اپنے دھندوں میں یہ آزما کر دیکھا ہے کہ اگر ہمارے اصول اور
قاعدے درست ہیں تو چاہے دھندا بڑا ہو یا چھوٹا۔ سبھی جگہ کام ٹھیک ہوتا چلا جاتا ہے جو اصول
ہم اپنے ہائی لینڈ پارک کے کارخانے میں استعمال کرتے ہیں وہی اصول ہر ایک کارخانے میں چاہے

وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ اور کہیں پر لگا ہوا ہو۔ پورے طور سے کامیاب ہوتے ہیں۔ اس بات سے بالکل کبھی فرق نہیں پڑتا۔ کہ فلاں کام ہم نے اپنا پانچ گنا بڑھایا ہے۔ یا پانچ سو گنا۔ ایک ہزار کے رقبے کا سوال صرف حساب کی بات ہے کہ وہ کتنا بڑا یا چھوٹا ہے اور کچھ نہیں۔

لگ بھگ بیس (۲۰) برس ہوئے۔ جب ہم نے ڈی۔ ڈی۔ آئی۔ ریلوے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ اور تب سے اس کا انتظام ہر تھوڑے سالوں کے بعد۔ بدلتا رہا ہے۔ آخری بار ہم نے اس میں تبدیلی ۱۹۱۴ء میں کی تھی۔ ریلوے لائنوں پر فیڈرل حکومتوں کا اختیار ہونے کی وجہ سے اور جنگ چھڑ جانے سے ان تبدیلیوں میں کچھ عرصہ کے لئے روکاوٹ پڑ گئی تھی اس ریلوے کی 43 میل لمبی پٹڑی ہے۔ باون (52) میل لمبی برانچیں ہیں اور 45 میل کے ٹکڑے ایسے ہیں جن کا دوسری ریلوے لائنوں کے اوپر حق ہے۔ یہ ریلوے لائن ڈیبرائے سے چل کر دریائے اداؤ کے کنارے آیرن ٹن تک لگ بھگ جنوبی ملک کے حصے میں چلتی ہے اور اس طرح مغربی ورجنیا کے کوئلوں کی کانوں میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ ملک کے اندر جو بڑی بڑی ریلوے لائنیں ہیں اُن میں سے اکثر اس کے راستے میں پڑتی ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ بیوپار کے طور پر اس ریلوے سے ہمیں کیوں نہ آمدنی ہو۔ اور آمدنی ہوتی بھی واہی ہے۔ اس نے بینکروں کا بھی پیٹ بھرا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں اس ریلوے لائن کے اوپر فی میل تین لاکھ پندرہ ہزار روپیہ لاگت آئی تھی۔ لیکن اگلی مرتبہ یہ خرچ صرف ایک لاکھ اکتالیس ہزار روپیہ رہ گیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس ریلوے لائن کی بنا پر کتنا روپیہ قرض لیا گیا۔ مگر میں یہ جانتا ہوں کہ جب ۱۹۱۴ء میں ہم نے اس کا انتظام بدلا۔ تو بانڈ لینے والوں کو ٹیکس کے طور پر ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ خزانے میں داخل کرنا پڑا تھا۔ اور اتنی ہی رقم ہماری کل لائن بنانے میں خرچ آئی تھی۔ حالانکہ اُس وقت مارکیٹ میں سود کی در لگ بھگ 5 آنے فی روپیہ تھی۔ تو بھی ہم نے اپنے رہن ناموں پر دس آنے فی روپیہ کے حساب سے سود ادا کیا۔ اور اپنے عام اسٹاک پر فی معمولی حصہ تین روپے اور پریفرڈ (ترجیحی) سٹاک پر پندرہ روپیہ فی حصہ منافع دیا۔ جو کہ کافی بڑی رقم ہے۔ کیونکہ ایسے بانڈوں پر سود ادا کرنے کا کوئی دستور نہیں اور سٹاک کے اوپر کچھ منافع بانٹنا تو بہت دور رہا۔ اس کمپنی کا رولنگ سٹاک (Rolling Stock)

یہ تھا۔ لگ بھگ (۷۰) ستر انجن۔ (۲۷) ستائیس مسافر گاڑیاں اور لگ بھگ اٹھائیس صد مال گاڑیاں جب ہم نے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس وقت ان سب چیزوں کی حالت نہایت خستہ تھی۔ اور ان میں سے بہت بالکل چلنے کے ناقابل تھیں، تمام عمارتیں گندی پڑی تھیں۔ دیواروں پر چونہ کی قلعی کی ہوئی نہ تھی۔ اور دروازوں اور کھڑکیوں پر پینٹ پالش سب اڑا ہوا تھا۔ ریلوے پٹریوں کو زنگ نے بالکل کھایا ہوا تھا۔ بلکہ انھیں ریل کی پٹری کہنا بھی ایک قسم کا مذاق کرنا تھا اس ریلوے کی ورکشاپوں میں ضرورت سے زیادہ کاریگر رکھے ہوئے تھے اور کام کرنے کے لیے مشینیں ضرورت کے موافق نہ تھیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ عملی طور پر ان میں اور ان پر ہر کام جو تیار کیا جاتا تھا۔ اور مال بنتا تھا۔ اس میں چیز بہت ضائع جاتی تھی۔ اور اس کے مقابلے میں اصل کام بہت تھوڑا ہوتا تھا۔ مگر اس کے باوجود یہاں پر نظام قائم رکھنے والے بڑے افسروں اور کام کرانے والے کارندوں کی حد سے زیادہ تعداد ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ اور ایک قانونی محکمہ بھی ضرور ہوتا تھا۔ اکیلے قانونی محکمے کا ہر ماہ لگ بھگ چون ہزار روپیہ خرچ تھا۔

اس ریلوے لائن کا انتظام ہم نے ماہ مارچ ۱۹۲۱ء میں اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کو چلانے کے لیے وہی اصول اور قاعدے برتنے شروع کیے جو ہم اپنے دوسرے دھندوں میں استعمال کرتے تھے۔ اس کا ڈیٹرائٹ میں انتظام کرنے کے لئے ایک بڑا دفتر تھا۔ ہم نے اس کو بند کر دیا۔ اور اس کی بجائے صرف ایک آدمی کے ہاتھ میں اس کا سارا چارج دے دیا۔ اور اس کو کام کرنے کے لئے مال گودام کے دفتر میں ایک کرسی اور میز دے دی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی ہم نے قانونی محکمے کو بھی ختم کر دیا۔ ریلوے کمپنیوں کو اتنی مقدمہ بازی کرنے کی ضرورت نہیں۔ جن جن لوگوں کا اس کمپنی کی طرف روپیہ مدت سے واجب نکلتا چلا آتا تھا۔ ان کے حساب کی جانچ پڑتال فوراً کی گئی۔ اور اسی وقت ادائیگی بھی کر کے انھیں ختم کر دیا گیا۔ اب اگر کسی کا حساب نکلتا ہے تو اس کا ساتھ ساتھ فوراً ہی ادا کر دیا جاتا ہے جس کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ اب ہمارا قانونی خرچ مشکل سے بھی ایک مہینہ میں چھ سو روپیہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ حساب کرنے کے لئے بہت سے بہی کھاتے فضول رکھے ہوئے تھے ان سب کو اڑا دیا گیا۔ ریلوے لائن پر کام کرنے والوں کی تعداد ۲۷۰۰ سے گھٹا کر صرف ۱۶۵۰ کر دی گئی۔

اپنے اور وعہدوں کی طرح ہم نے اس ریلوے کا انتظام کرنے والے افسروں کے بڑے بڑے
نام نہیں رکھے۔ بلکہ جن عہدوں کی قانون کے ماتحت ضرورت تھی صرف انہیں کو رکھ کر باقی تمام کو
یکدم موقوف کر دیا گیا۔ عام طور پر ریلوے کمپنیوں کے اندر ضابطہ کی پابندی بڑی سختی سے کیجاتی
ہے۔ اور اگر ایک چھوٹی سی بات بڑے افسر تک پہنچانی ہوتی ہے تو اس کو بھیجنے کے لیے ہر ایک
آدمی کو پہلے اپنے محکمے کے منشی کے پاس بھیجنا پڑتا ہے۔ پھر وہ اپنے افسر کے پاس بھیجتا ہے۔ اور
اس طرح سے آہستہ آہستہ وہ بات اس افسر تک پہنچتی ہے۔ غرضیکہ کوئی آدمی بھی کچھ کام نہیں
کر سکتا جب تک اس معاملے یا کام کے لئے اس کو اوپر سے حکم نہیں آجاتا۔ ایک دن میں سیر کرتا ہوا صبح
کے وقت ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ذرا جلدی نکل گیا تو میں نے دیکھا کہ لائن کو صاف کرنے کے
لئے ایک ریل گاڑی تیار کھڑی ہے اور انجن چلنے کے لیے دھواں چھوڑ رہا ہے مگر وہ چل نہیں سکتی
کیونکہ آدھے گھنٹے سے وہ انتظار کر رہی ہے کہ اس کو چلنے کی اجازت ملے۔ میں نے اپنی ذمہ داری
پر کام شروع کرا دیا۔ اور ابھی تک اوپر سے آرڈر نہیں آئے تھے۔ کہ ہم نے لائن صاف کر دی اور جہاں
جہاں لائن ٹوٹی ہوئی تھی اس کی مرمت بھی کر دی۔ مگر یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ لوگ یہ سمجھ نہیں
پائے تھے۔ کہ ایک آدمی کی اپنی ذمہ داری کیا چیز ہوتی ہے۔ لوگوں کو اوپر سے حکم آنے پر کام کرنے
کی عادت پڑی ہوئی ہے اور یہ عادت جلدی سے نہیں چھوٹ سکتی۔ اس لئے شروع شروع میں لوگ
اپنی ذمہ داری پر کام کرنے سے کتراتے تھے۔ لیکن جوں جوں ان کو تجربہ ہوتا گیا۔ ان کو یہ طریقہ پسند
آنے لگا اور اب ہر ایک آدمی اپنے کام کی ساری ذمہ داریاں اپنے سر پر لے کر بہت ہی خوش ہوتا
ہے۔ ایک آدمی کو فی روز آٹھ گھنٹہ کام کرنے کی تنخواہ ملتی ہے اور اس سے یہ امید رکھی جاتی ہے
کہ وہ یہ آٹھ گھنٹہ دل لگا کر کام کرے گا۔ اگر ایک آدمی انجنیئر ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں جو کام ہے اس
کو وہ چار گھنٹے کے اندر ختم کر لیتا ہے۔ تو وہ کارخانہ اس سے امید رکھتا ہے کہ باقی کے چار گھنٹوں
میں وہ خالی نہیں بیٹھا رہے گا۔ بلکہ کچھ اور کام کر کے بھی دے گا۔ اگر ایک آدمی آٹھ گھنٹے سے زیادہ
کام کرتا ہے تو اس کو اوور ٹائم (Over time) کے کچھ زیادہ پیسے نہیں ملتے اس لئے آٹھ
گھنٹے سے جو زیادہ وقت وہ لگاتا ہے اتنا ہی عرصہ وہ اگلے دن کام نہیں کرتا۔ یا کسی نہ کسی طرح

بچا لیتا ہے۔ اور اس طرح سے ایک دن کی وہ مفت تنخواہ مار لیتا ہے۔ مگر اصول یہ ہے کہ آٹھ گھنٹے کے دن میں آٹھ گھنٹے ہی کام کرنا چاہیئے۔ ہم نے آٹھ گھنٹے کا دن اپنے کامگاروں کی صرف تنخواہ مقرر کرنے کے لئے نہیں رکھا ہوا ہے، بلکہ ہم در اصل اُن سے کام بھی صرف آٹھ گھنٹے لیتے ہیں۔

ہم کم سے کم اٹھارہ روپیہ فی روز ایک کاریگر کو اپنے ہاں تنخواہ دیتے ہیں۔ ہم فالتو کاریگر نہیں رکھتے ہم نے دفتروں لوہارخانوں مشینوں اور ریلوے لائن پر کام کرنے والوں کی تعداد کم کر دی ہے۔ ایک محکمے میں جہاں پر پہلے اُنسٹھ آدمی کام کرتے تھے وہاں پر اب صرف بیس کرتے ہیں۔ بہت تھوڑا عرصہ ہوا ہم نے ایک جگہ مزدوروں کی ایک مدد لگائی۔ اس مدد میں بارہ آدمی کام کرتے تھے اور اُن پر ایک فورمین تھا۔ یہیں پاس ہی ایک اور مدد کام کر رہی تھی جس میں چالیس آدمی کام کر رہے تھے۔ دونوں کے پاس ایک جیسا لائن کو مرمت کرنے اور وہاں پر پتھر ڈالنے کا کام تھا۔ پانچ دن کے اندر ہماری مدد نے دو فرلانگ دوسری مدد کے مقابلہ میں زیادہ کام کر کے دکھا دیا۔ کتنے تعجب کی بات ہے۔

ریلوے پٹڑی کو نئے سرے سے بچھایا جا رہا ہے۔ لگ بھگ ساری لائن پر پتھر ڈالے گئے ہیں اور بہت سے میلوں میں نئی لائن بچھا دی گئی ہے۔ ہم اپنے لوہارخانوں اور ورک شاپوں میں انجنوں اور گاڑیوں کی بڑے تھوڑے خرچ پر مرمت کر رہے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ آج تک مال کی جو سپلائی آتی رہی ہے وہ بہت ہی گھٹیا درجے کی تھی۔ یا استعمال بالکل نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہم نے بہتر درجے کا مال منگوانا شروع کر دیا۔ اور اس بات کا خاص دھیان رکھا کہ کوئی چیز فالتو ضائع نہ جائے ہمارے ملازم لوگ اس کام میں یعنی بچت کرنے میں ہماری پوری پوری مدد کرتے ہیں۔ اور جو چیز استعمال ہو سکتی ہے اُس کو بالکل ضائع جانے نہیں دیتے۔ جب ہم کسی ملازم سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیوں جی تمھیں فلاں انجن یا مشین کا کچھ فائدہ بھی ہے یا نہیں۔ تو وہ جواب میں ہمیں ایک ریکارڈ بنا کر یہ ثابت کر دیتا ہے کہ جب سے اُس کے پاس یہ انجن یا مشین آئی ہے۔ تب سے اُس نے اتنی بچت کی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات یہ ہے کہ ہم نے ان چیزوں کے خریدنے میں اپنی جیب سے کوئی زیادہ خرچ نہیں کیا۔ بلکہ جو کوئی کچھ کمائی ہوتی رہی ہے اُسی میں سے یہ سب چیزیں خریدی گئی ہیں ہماری ہمیشہ یہی پالیسی رہی ہے۔

ہماری سب ریل گاڑیاں وقت پر اور باقاعدہ چلتی ہیں۔ مال گاڑیوں کے آنے جانے میں آگے جو وقت خرچ ہوتا تھا۔ وہ دو تہائی کم کر دیا گیا ہے۔ آگے اگر ایک مال گاڑی یا ویگن کسی جگہ سائیڈ ٹریک میں پڑی ہے تو کئی دنوں تک کوئی اُس کی خبر نہیں لیتا تھا۔ یہ کتنی بُری بات تھی کہ کسی کو یہ علم نہیں کہ فلاں گاڑی فلاں مقام پر کیوں اتنے عرصہ سے پڑی ہے۔ آگے ایک مال گاڑی کو فیلاڈلفیا یا نیو یارک جانے کے لیے آٹھ یا نو دن لگتے تھے۔ اب یہ سفر ساڑھے تین دن میں طے ہو جاتا ہے۔ اس طریقے سے یہ ریلوے پبلک کی خدمت کرتی ہے۔ اب تو لوگ کئی کئی طرح کی دلیلیں دیکر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کس طرح سے ہم نے اس ریلوے میں گھاٹے کی جگہ آمدنی کی صورت پیدا کر لی۔ مجھے بتلایا گیا ہے کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فورڈ کے کارخانوں میں جتنے کچے مسالے لگتے تھے اور جتنا مال تیار ہوتا تھا وہ سب اب اس ریلوے کی معرفت آنے جانے لگے تھے۔ ہاں لوکہ اگر یہ بات صحیح بھی ہو تو بھی اس بات کا کیا جواب ہے کہ اس ریلوے کو چلانے میں جتنا آگے خرچ آتا تھا اُس سے اب اتنا زیادہ کم کیوں ہونے لگا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس ریلوے کے ذریعہ جتنا مال ہم اندر لا سکتے ہوں یا باہر بھیج سکتے ہوں بھیجتے ہیں مگر اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمیں اس طرح سے فائدہ ہوتا ہے۔ ورنہ ہم کبھی ایسا نہ کرتے۔ پچھلے کئی سالوں سے ہم اپنا مال اس ریل کے ذریعے بھیجتے رہے ہیں کیونکہ اس میں ہمیں بہت آرام ہے۔ مگر ہم اس ریلوے لائن کو اس وجہ سے زیادہ استعمال نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس پر مال کے آنے جانے میں بہت دیر لگ جاتی تھی یہاں تک کہ اس کے ذریعہ مال آنے کی ہمیں پانچ یا چھ ہفتوں میں بھی اُمید نہیں ہوتی تھی اس طریقہ سے ہمارا روپیہ پھنسا رہتا تھا اور ہمارا اپنے کارخانوں میں برابر خوب مال تیار کرنے کا سلسلہ ٹوٹ جاتا تھا۔ کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی کہ اس لائن پر اتنی دیر کیوں لگتی تھی مگر پھر بھی دیر ہو ہی جاتی تھی۔ تب اس دیر کی وجہ سے جو نقصان ہوتا تھا۔ اُس کا جھگڑا کرنے کے واسطے اپنے قانونی محکمے کے پاس معاملہ بھیجنا پڑتا تھا۔ مگر یہ کوئی بیوپار کرنے کا طریقہ نہیں۔ ہماری یہ رائے ہے کہ اگر کہیں دیر ہوتی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے کام ہو رہا ہے اُس میں کوئی نہ کوئی کہیں پر ضرور نقص ہے اور اسکو رفع کرنے کی فوراً کوشش کرنی چاہیئے۔ بیوپار اس کا نام ہے۔

عام طور پر آج تک جتنی ریلوے کمپنیاں جاری رہی ہیں وہ سب فیل ہوئی ہیں اور جس بُرے اور بھدے طریقہ سے پہلے یہ ڈی۔ ڈی۔ آئی۔ ریلوے چلائی جا رہی تھی اُسکو دیکھ کر ہمارا یہ یقین ہو گیا تھا

کہ اگر دوسری کمپنیوں کا بھی یہی حال ہے۔ تو دنیا میں کوئی وجہ نہیں کہ یہ کیوں سب فیل نہ ہوں۔ بہت سی ریلوے کمپنیوں کے چلانے والے عملی آدمی نہیں بلکہ بینکر رہے ہیں جنھوں نے اپنے تمام قاعدے اور قانون صرف اس خیال کو لیکر بنائے ہیں کہ اس سے پبلک کو باربرداری یا مال کے لانے یا لیجانے میں کچھ سہولیت ہو یا نہ ہو۔ مگر کمپنی کو خوب آمدنی ہونی چاہیئے۔ یہ کمپنیاں فیل ہی صرف اسی وجہ سے ہوئی ہیں۔ کیونکہ انھوں نے لوگوں کی خدمت کرنے اور اُن کو آرام پہنچانے کی بجائے زیادہ توجہ روپیہ کمانے کی طرف دی پُرانے سڑے ہوئے قاعدوں پر ہمیشہ چلتے رہے۔ ترقی کا کبھی خیال نہیں کیا۔ اور جن لوگوں کو اس قسم کی ریلوے کمپنیاں چلانے کی جانچ آتی تھی اُنکو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا کبھی موقع نہیں دیا گیا۔

کیا ایک کروڑ روپیہ یا اس سے زیادہ اور خرچ کرنے سے یہ شکایت دور ہو سکتی ہے ؟ نہیں بلکہ اتنی رقم خرچ کرنے سے اتنی ہی رقم اور خرچ کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ اور معاملہ اور بھی خراب ہو جائے گا۔ کیونکہ اس قدر روپیہ لگانے کا یہ مطلب ہو گا کہ جو پرانے اور نکمے طریقے آج تک چل رہے ہیں وہ اور بھی پکّے ہو جائیں گے اور انہی کی وجہ سے یہ ساری خرابیاں ہیں۔

جو بیوقوفیاں اور غلطیاں ہم کچھ چند سال پہلے کر رہے تھے۔ وہی اب ہم پھر کر رہے ہیں۔ جب یونائیٹڈ سٹیٹس میں پہلے پہل ریلیں جاری ہوئیں۔ تو ٹیلی فون کی طرح لوگوں کو یہ سکھانے کی ضرورت پڑی تھی کہ ریلوں کے ہونے کا کیا فائدہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری تھا کہ یہ ریلیں اس طریقے سے چلائی جائیں جن سے کچھ آمدنی نکلے اور ریلوے کمپنیاں زندہ رہ سکیں مگر بدقسمتی سے یہ ریلوے کمپنیاں اُس وقت جاری ہوئیں۔ جبکہ بیوپار بہت ہی مندا تھا۔ اس لئے اُسوقت کام چلانے کی غرض سے ان میں کئی ایسی کھوٹی چالیں چلنی پڑیں جس کا اثر اب تک چلا جا رہا ہے اور وہی چالیں اب تک بھی قائم ہیں۔ اس ملک میں ریلوے کمپنیوں نے سب سے بھاری غلطی یہ کی کہ انھوں نے باربرداری کے دوسرے سب ذریعوں اور طریقوں کا گلا گھونٹ دیا۔ اسوقت ملک کے اندر نہروں کا ایک جال بچھانے کی ایک بڑی بھاری سکیم تھی۔ اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے بڑی کوشش ہو رہی تھی مگر ریلوے کمپنیوں نے ان نہر کی کمپنیوں کو خرید لیا۔ اور جہاں نہریں کھودی گئی تھیں مٹی جمع ہو کر وہ جگہ اپنے آپ پُر ہونے لگی۔ اور وہاں پر آہستہ آہستہ گھاس پھوس کا جنگل کھڑا ہو گیا۔ ملک کے مشرقی اور

درمیانی مغربی حصّوں میں اب بھی اس نہروں کے جال کے نشان موجود ہیں۔ اب ان نہروں کو نئے سروں سے پھر کھودا جا رہا ہے اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے کی کوشش ہو رہی ہے لوگوں کی سمجھ میں اب یہ بات آ رہی ہے کہ کس طرح سے سارے ملک کے اندر نہروں اور دریاؤں کے راستے قائم اور مقرر کر کے اپنے بیوپار کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ اور اس غرض سے بہت سی پبلک اور پرائیویٹ کمپنیاں قائم ہو رہی ہیں۔ بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُن کی محنت اور لگاتار کام سے کافی ترقی ہو رہی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور سوال بھی تھا۔ اور وہ تھا جہاں تک ممکن ہو سکے۔ مال کو خواہ مخواہ لمبے سے لمبے راستے ڈھونے کا سسٹم۔ ہر شخص جس کو اُن تمام چالاکیوں اور بکھیڑوں کا علم ہے جن کا بھانڈا پھوٹنے پر انٹرنیشنل کامرس کمیشن قائم کرنے کی ضرورت پڑی تھی وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس سے ہماری کیا مراد ہے۔ ایک زمانہ تھا جبکہ ریلوے کمپنیوں کے ملازم اپنے آپ کو مسافروں بیوپاریوں اور دھندا کرنے والے لوگوں کا نوکر نہیں سمجھتے تھے۔ اور وہ بیوپار کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا کہ یہ صرف ریلوے کے فائدے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ اس حماقت کے زمانے میں ریلوے کمپنیوں کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی۔ کہ جہاں سے مال ریل میں لادا گیا ہے۔ وہاں سے جہاں اس نے پہنچنا ہے۔ اسکو کبھی سیدھے راستے سے نہ لایا جائے۔ بلکہ اسکو لمبا چکر کاٹ کر لایا جائے اور راستے میں جتنی دوسری کمپنیوں کی لائنیں پڑتی ہیں۔ انکو بھی اسکے کرایہ میں تھوڑا بہت حصّہ ضرور ملنا چاہئے اور اگر اس طرح سے لوگوں کے وقت اور روپئے کا نقصان ہوتا ہے تو بلا سے ہوتا رہے اُس وقت اسی پالیسی کو ریلوے کمپنیاں اپنے لیے بہت اچھا سمجھتی تھیں اور افسوس یہ ہے کہ یہ خیال آجتک بھی بالکل جڑ سے نہیں گیا۔

ریلوے کمپنیوں کی اس پالیسی کی وجہ سے ہماری مالی زندگی میں جو ایک بھاری تبدیلی ہوئی وہ یہ تھی کہ ہمیں اپنے بہت سے دھندے ایک ہی جگہ پر لانے پڑے اسلئے نہیں کہ ان کو ایک جگہ اکٹھا کرنا ضروری تھا۔ یا اس سے لوگوں کا بہت بھلا ہوتا تھا بلکہ اس لئے کہ اس سے اور فائدوں کے علاوہ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ریلوے کمپنیوں کو آگے سے دگنا کام ملنے لگا۔

مثال کے طور پر گوشت اور اناج کی بات ہی لو. جو عام لوگوں کی سب سے بڑی خوراک ہے. اگر نقشے پر نظر ڈال کر اُن جگہوں کو دیکھو کہ کہاں کہاں پر گوشت کی چیزیں تیار کرنے کے کارخانے ہیں اور پھر یہ دیکھو کہ ان کے لئے کہاں کہاں سے مویشی آتے ہیں اور پھر غور کرو کہ اِن مویشیوں کو خوراک کی شکل میں تبدیل کر کے پھر وہیں واپس پہنچایا جاتا ہے. جہاں سے یہ مویشی آئے تھے تو پھر تمہاری سمجھ میں کچھ کچھ آسکے گا کہ اس باربرداری کا کیا اثر ہے. اور اس کا گوشت کی قیمت پر کتنا اثر پڑتا ہے - یہی حال اناج کا بھی ہے. ہر شخص جو اخباروں اور اشتہاروں کو پڑھتا ہے. وہ جانتا ہے. کہ ملک کے اندر آٹے کی بڑی بڑی ملیں کہاں کہاں لگی ہوئی ہیں. اور شاید اُسے یہ بھی خبر ہو کہ یہ ملیں یونائیٹڈ سٹیٹ کے اندر اُس حصے میں لگی ہوئی نہیں ہیں جہاں کہ اناج زیادہ پیدا ہوتا ہے. ہمارے ملک میں جسقدر بے انتہا اناج بیکار ہزاروں ویگنوں میں بھر بھر کر دور دور مقاموں کو ڈھویا جا رہا ہے. اُسکو دیکھ کر انسان کو زبان تلے اُنگلی دبانی پڑتی ہے اور آٹا پس جانے پر اس اناج کو پھر ریل کے ذریعے اُنھیں مقاموں پر پہنچایا جاتا ہے. جہاں سے یہ اناج آیا تھا جس سے ریلوے کمپنیوں کو خوب آمدنی ہوتی ہے. مگر یہ ریلوے پر فضول بھار ہے جس سے نہ تو اُن لوگوں کو کچھ فائدہ ہوتا ہے جو اناج پیدا کرتے ہیں اور نہ کسی اور کو. البتہ آٹے کی ملوں والوں اور ریلوے کمپنیوں کے مالکوں کی خوب چاندی تھی. ریلوے کمپنیاں ہمیشہ اس طریقے سے بڑے مزے کے ساتھ چل سکتی ہیں جن سے اُن کا اپنا کام تو خوب ہو. مگر ملک کے اندر کسی دوسرے بیوپار کو بالکل ذرا بھی فائدہ نہ ہوتا ہو اُن کو ہمیشہ اس طرح سے مال فضول ایک جگہ سے دوسرے مقام پر پہنچانے کا کام لگا تار خوب مل سکتا ہے جس جگہ پر گوشت اناج اور شاید روٹی بھی پیدا ہوتی ہے اگر وہاں ہی ان چیزوں کو روانگی سے پہلے تیار کرلیا جائے. تو ریل کے ذریعہ باربرداری کا خرچ آدھے سے زیادہ گھٹایا جا سکتا ہے. اگر ایک کمپنی پینسی لیوانیا میں کوئلے کی کان کھودنا چاہتی ہے اور کوئلے کو چھاننے اور بنانے کے لئے ریل کے ذریعے ہیٹنگن ہاؤس کونسن بھیجتی ہے اور وہاں سے پھر استعمال کرنے کے لئے ریل کے ذریعے پینسی لیوانیا واپس منگواتی ہے - تو یہ بالکل ویسی ہی واہیات بات ہے جیسے کہ گوشت کی خاطر پہلے ٹیکساس سے مویشی زندہ شکاگو لائے جائیں اور وہاں اُن کو ذبح کیا جائے اور پھر ان کو واپس ریل کے ذریعے ٹیکساس بھیجا.

جائے. یا یہ کہ پہلے کینساس سے اناج مینی سوٹا لایا جائے اور وہاں ملوں میں اس کا آٹا پیس کر اس کو پھر وہیں واپس بھیجا جائے. اس میں شک نہیں کہ اس طرح سے ریلوں کو تو خوب آمدنی ہوگی. مگر بیوپار کے لحاظ سے یہ بہت ہی بُرا کام ہے. باربرداری کے سوال پر بہت ہی کم لوگوں نے اس لحاظ سے غور کیا ہے کہ اس طرح سے فضول مال کو اِدھر سے اُدھر ریل کے ذریعہ لانے اور لے جانے میں بہت نقصان رہتا ہے. اگر ریلوں پر اس طریقے سے مال بیکار ڈھونے کے رواج کو کسی طریقے سے دور کرنے کی ترکیب نکال لی جائے. تو ممکن ہے کہ ہمیں ریل کے ذریعہ اور بہتر چیزیں لانے اور لے جانے کے لیے مل سکیں جس سے ملک کے بیوپار اور لوگوں کا بہت بھلا ہو سکے.

کوئلے کی طرح کی چیزوں کی نسبت یہ قاعدہ ہونا چاہیئے. کہ جہاں پر یہ موجود ہیں. وہاں سے اُن کو صرف اُس جگہ تک لے جایا جائے. جہاں پر وہ برتی جاتی ہیں. یہی قاعدہ دوسرے دھندوں کے کچے مسالوں کے واسطے بھی لاگو ہے. یعنی جہاں پر قدرت نے اُن کو پیدا کیا ہے. وہاں سے اُن کو صرف اُس جگہ تک اُٹھا کر پہنچانا چاہیئے. جہاں اُن سے لوگ کام لینے کو تیار رہیں. اور کیونکہ یہ سب کچے مسالے اکثر ملک کے ایک ہی حصے میں اکٹھے موجود نہیں ہوتے. اس لیے ان کو برتنے کے لئے باربرداری کے ذریعے ایک خاص بڑے مقام پر ضرور پہنچانا پڑتا ہے جہاں پر یہ سب استعمال ہو سکیں کوئلہ ملک کے ایک خاص علاقہ سے آتا ہے. تانبا دوسری جگہ سے لوہا کسی اور مقام سے اسی طرح لکڑی کسی اور جگہ سے آتی ہے. ان سب کو کام کرنے کے لئے دھندے کے واسطے ایک جگہ پر اکٹھا کرنا ضروری ہے.

مگر جہاں تک ممکن ہو سکے. کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ صنعتی دھندے ٹکڑوں میں بانٹ کر کئے جائیں. ہمارے ملک میں اس بات کی ضرورت ہے کہ چار بڑی بڑی آٹے کی ملوں کی بجائے جن جن علاقے میں اناج خوب پیدا ہوتا ہے وہاں پر چھوٹی چھوٹی بہت سی آٹے کی ملیں لگادی جائیں اور جہاں تک ممکن ہو سکے کوشش اس بات کی کرنی چاہیئے کہ جس علاقے میں کسی چیز کا کچّا مسالہ پیدا ہوتا ہے اس کچّے مسالے کا تیار کیا ہوا مال بھی وہیں پر بنایا جانا چاہیئے. اناج وہیں پس کر آٹا بن جانا چاہیئے جہاں پر وہ پیدا ہوتا ہے جس علاقے میں سوئر پائے جاتے ہیں. ان کے گوشت کی بنی ہوئی خوراکیں آچار وغیرہ بھی وہیں پر

تیار ہونے چاہئیں۔ اور اس مطلب کے لئے سو اور کسی مقام پر بھیجنے نہیں چاہئیں۔ روئی کے کارخانے روئی کے کھیتوں کے قریب لگنے چاہئیں۔ یہ کوئی بالکل کایا پلٹ دینے والا قاعدہ نہیں۔ مگر اس سے موجودہ نظام میں ضرور کھلبلی مچ جائے گی۔ نہ یہ کوئی نیا خیال ہے۔ بلکہ اصل میں تو یہ بڑا پرانا دستور ہے۔ ہمارے بزرگوں کا یہی قاعدہ تھا اور باربرداری کے موجودہ طریقوں کے جاری ہونے سے پہلے ہمیشہ یہی قاعدہ چلا آتا تھا۔ مگر اب تو یہ دستور ہو گیا ہے کہ ریل گاڑی یا کسی اور ذریعہ سے بیوپار کی ہر چیز دور دور ہزاروں میل ادھر سے اُدھر لائی جاتی ہے۔ اور پھر باربرداری کا یہ خرچ خریدار کے حساب میں چارج کر لیا جاتا ہے ملک کے ہر علاقے کے اندر ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ضرورت کی سب چیزیں وہاں ہی پیدا ہوں یا وہاں ہی تیار کی جاسکیں جس سے ریل گاڑی کے ذریعہ مال ڈھونے کا خرچ مفت میں برداشت نہ کرنا پڑے۔ جو چیزیں وہاں پیدا ہوتی ہوں۔ اُن کی جتنی وہاں پر کھپت ہو وہاں پر رکھ لی جائیں اور برتی جائیں اور باقی جتنا فالتو مال بچے وہ باہر کسی دوسرے علاقے کو بھیج دیا جائے۔ مگر یہ تبھی ہو سکتا ہے جب وہ کچے مسالوں مثلاً اناج اور مویشیوں کو خود پیدا کر کے خود ہی اُن سے خوراک کی چیزیں بھی تیار کریں۔ اگر لوگ پرائیویٹ کمپنیاں بنا کر یہ کام نہیں کر سکتے تو یہ کام کسان لوگ مل جل کر کر سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں کسانوں کے ساتھ سب سے بڑی بے انصافی یہ ہو رہی ہے۔ کہ حالانکہ سب سے زیادہ چیزیں پیدا کرنے والے وہی ہیں مگر اُن کو خود مارکیٹ میں اپنی پیداوار بیچنے کی اجازت نہیں دی جاتی اور اُن کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی پیداوار بیوپاریوں کے ہاتھ بیچیں۔ جو اُن کو خوراک کی شکل میں تبدیل کر کے آگے پبلک کے ہاتھ بیچتے ہیں۔ اگر ایک کسان اپنے اناج کا آپ ہی آٹا بنا لے۔ اپنے مویشیوں کا آپ ہی گوشت تیار کر لے۔ اور اپنے سوروں کا آپ ہی نمکین گوشت اور اچار وغیرہ تیار کر لے۔ تو اس سے نہ صرف زیادہ آمدنی ہونے لگے گی۔ بلکہ اس طرح سے وہ اپنے علاقے کے لوگوں کو جو ان چیزوں کو حاصل کرنے کے واسطے مفت میں ریلوں میں ڈھونے کا خرچ کرایہ وغیرہ کی شکل میں برداشت کرتے ہیں۔ اُس سے چھٹکارا دلا سکتا ہے۔ اور اس طرح سے ریلوے کو جو فضول کچے مال کو اِدھر اُدھر ڈھونے میں بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے اُس سے نجات مل سکتی ہے جس سے ریلوے کو بہت فائدہ ہوگا۔ یہ بات نہ صرف بالکل واجب ہے اور عملی طور پر ہو سکتی ہے۔ بلکہ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ اس کے بغیر گذارہ ہی نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ

یہ قاعدہ اب بہت سے مقاموں پر برتا جا رہا ہے۔ لیکن جب تک یہ قاعدہ اور بھی زیادہ زور کے ساتھ اور زیادہ کچے مسالوں کے ڈھونے میں ملک میں جگہ جگہ استعمال نہ ہوگا۔ تب تک اس کا پورا اثر اور فائدہ باربرداری کے نظام میں نظر نہیں آئے گا۔ اور نہ تب تک لوگوں کے گھر کا خرچ کم ہوگا۔

قدرت کا یہ ایک بڑا اچھا اصول ہے کہ جس کام یا دھندے سے خلقت کی بھلائی نہیں ہوتی۔ اس کی آمدنی جاتی رہتی ہے اور وہ اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

ہم نے اپنی عام پالیسی پر عمل کرتے ہوئے۔ ڈی۔ ڈی۔ آئی۔ ریلوے کو چلا کر یہ دیکھا کہ ہم اس پر ریل کرایہ کم کر سکتے ہیں اور اپنا کاروبار بڑھا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے کچھ کمی کی بھی مگر انٹر سٹیٹ کامرس کمیشن نے اس کمی کو منظور نہیں کیا۔ اور ہمیں یہ کمی کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ ایسی حالت میں ریلوے کمپنیوں کو بیوپار کے اصول پر چلانے کے سوال پر بحث کرنا یا ان کے ذریعے خلقت کی خدمت کرنے کے معاملے کو سوچنا ہی کیا بالکل فضول نہیں ہے ؟

بیان سترہ

سرسری بات چیت

دنیا میں تھامس اے۔ ایڈیسن سے بڑھ کر لمبی سوچ کرنے والا اور سمجھدار آدمی ملنا مشکل ہے۔ سب سے اوّل مرتبہ بہت سال پہلے شاید ۱۸۹۶ء یا اُس کے قریب میں اُن کو ملا تھا۔ جب میں ڈیٹرائٹ ایڈیسن کمپنی میں نوکر تھا۔ منہیٹن میں بجلی کا کام کرنے والوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی اور کیونکہ اُس وقت ایڈیسن صاحب علم بجلی کے مانے ہوئے لیڈر تھے۔ انہوں نے وہاں ایک ایڈریس پڑھا تھا اور میری بجلی کمپنی میں میرے ساتھیوں اور دوسرے بہت سے آدمیوں نے مجھے بار بار یہ کہہ کر ڈرایا تھا کہ جو وقت گیسولین انجن بنانے میں خرچ کر رہا ہوں وہ سب برباد جائے گا۔ کیونکہ آئندہ زمانے میں صرف بجلی کے ذریعہ ہی جو طاقت پیدا ہوگی وہی چل سکے گی اور کسی کے لئے کچھ گنجائش نہیں۔ مگر ان نکتہ چینیوں کا مجھ پر بالکل کچھ اثر نہیں ہوا۔ میں رات دن اپنی پوری طاقت کے ساتھ اپنا انجن بنانے میں لگا ہوا تھا۔ لیکن کیونکہ اتفاق سے ایڈیسن صاحب میرے کمرے میں ہی ٹھیرے ہوئے تھے۔ میرے دل میں یہ آیا کہ کیوں نہ اس بجلی کے علم کے اُستاد کی بھی رائے نہ لے لی جائے کہ کیا اُن کے خیال میں آئندہ صرف بجلی کی طاقت کا ہی بول بالا رہے گا۔ اس لئے جب ایڈیسن صاحب اپنا

ایڈریس پڑھ چکے۔ تو ہم نے اُن سے کچھ منٹوں کے لئے علیحدہ گفتگو کی۔ اور جو کچھ میں کر رہا تھا اُن کو بتایا۔
وہ سُن کر بہت ہی خوش ہوئے۔ جہاں بھی علم کی اُن کو کوئی نئی چیز ملتی ہے اُس کی وہ ہمیشہ تلاش
میں رہتے ہیں تب میں نے اُنہیں پوچھا کہ کیا اُن کے خیال میں اندر سے بھکنے والے انجن کے واسطے
آئندہ زمانہ میں چلنے کی کچھ گنجائش ہے یا نہیں۔ اُنہوں نے جو جواب دیا وہ کچھ اس طرح تھا۔
ہاں اگر کوئی اس قسم کا انجن تیار کیا جائے جو وزن میں بہت ہلکا ہو مگر اُس سے کافی طاقت
پیدا ہو سکے۔ اور اپنے آپ میں وہ مکمل ہو تو وہ خوب چلے گا۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں آسکتا جبکہ صرف
ایک ہی قسم کی طاقت سے ملک کا سارا کام ہو سکے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ بجلی کیا اور کتنا کام
کر سکتی ہے۔ مگر یہ میں ضرور کہتا ہوں کہ یہ سارے کام کبھی نہیں کر سکتی۔ تم اپنا انجن بنانے میں
ضرور لگے رہو۔ اگر تم اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ اور جو چیز تم چاہتے ہو وہ تمہیں مل گئی تو تمہارا
انجن خوب چلے گا۔

یہی ایڈیسن صاحب کی خوبی ہے۔ اُس وقت بجلی کا علم ابھی نیا نیا ہی نکلا تھا۔ اور ترقی
کی بڑی گنجائش تھی اور اس لائن میں ایڈیسن صاحب سے بڑھ کر کوئی آدمی نہ تھا۔ بجلی کی لائن
میں جو دوسرے معمولی آدمی اس وقت تھے اُن کو بجلی کے سوائے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ مگر
ایڈیسن صاحب جو ان کے لیڈر تھے اُن کا دماغ بہت روشن تھا اور وہ اس بات کو خوب
اچھی طرح سے سمجھتے تھے کہ ملک کے اندر سارا کام کبھی بھی صرف ایک ہی طاقت سے نہیں ہو سکتا
میں سمجھتا ہوں کہ وہ اسی وجہ سے اس کام کے لیڈر بنے۔

یہ تھی ایڈیسن صاحب کے ساتھ میری پہلی ملاقات۔ اس کے کئی برس بعد جب ہمارا
موٹر کاریں بنانے کا کام خوب چل نکلا تھا اور ہم کافی تعداد میں کاریں بنانے لگ پڑے تھے
تب میں اگلی مرتبہ اُن کو ملا تھا۔ اُن کو ہماری پہلی ملاقات اچھی طرح سے یاد تھی۔ اس کے بعد ہم
بہت بار ایک دوسرے کو ملتے رہے۔ اور اب وہ میرے ایک نہایت ہی عزیز دوست ہیں
اور ہم دونوں نے مل کر بہت سی سکیمیں نکالی ہیں۔

اُن کو لگ بھگ ہر ایک لائن کا علم ہے۔ اُن کے ساتھ کسی مضمون پر بھی گفتگو کرو۔ اُس کی

اُن کو ضرور کافی واقفیت ہو گی۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر لائن کا علم سمندر کی طرح ہے جس کی گہرائی
کا کچھ پتہ نہیں۔ ان کا یقین ہے کہ ہر چیز ممکن ہے۔ مگر وہ ہوا سے کبھی باتیں نہیں کرتے وہ ایک
ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ اُن کے اصول کے مطابق "ناممکن" کا لفظ صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس
وقت تک ہمیں اُس چیز کے متعلق پوری پوری واقفیت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ وہ جانتے ہیں
کہ جوں جوں ہماری واقفیت بڑھے گی توں توں ہمارے اندر "ناممکن" کو جیت لینے کی طاقت
آتی جائے گی۔ ناممکن کو ممکن بنانے کا صحیح طریقہ یہی ہے اور محنت کر کے واقفیت حاصل کئے
بغیر کسی کام کو کرنے کے لئے کود پڑنا بالکل غلط طریقہ ہے۔ ایڈیسن صاحب سچ مچ دنیا کے سب سے
بڑے سائنس داں ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کے اندر کام کو بڑھانے اور انتظام کرنے کی بھی عقل
ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ بڑی لمبی لمبی سکیمیں اپنے دماغ سے نکال سکتے ہیں بلکہ انہوں نے عملی طور پر
انہیں کامیاب بنا کر بھی دکھا دیا ہے۔ انہوں نے کاریگروں اور دھندوں کا انتظام
کرنے میں کمال کی لیاقت ظاہر کی ہے۔ مگر عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ایک نئی چیزوں کے
ایجاد کرنے والے آدمی کے پاس یہ عقل نہیں ہوتی اور وہ صرف خیالی پلاؤ ہی پکانا جانتا ہے
اصل میں بھگوان نے اس کو بیوپاری بننے کے لئے پیدا نہیں کیا تھا۔ مگر حالات نے مجبور کر کے
اس کو زبردستی بیوپار میں ڈھکیل دیا۔ ایڈیسن صاحب نے کچھ ایسی طبیعت پائی ہے کہ وہ جس
کام میں بھی ہاتھ ڈالتے اُسی کو پورا کر دکھاتے۔ کیونکہ جس کام کی طرف وہ توجہ کرتے ہیں اُس کے
اونچ نیچ کو وہ پوری طرح سے سمجھ لیتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا وصف ہے جو آج کل بہت تھوڑے
لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ جن اور لوگوں نے میرے ساتھ دوستی ڈالنے کی مجھے عزت بخشی اُن میں ایک
جان بروز صاحب بھی تھے۔ پرندوں سے مجھے بھی بہت محبت ہے مجھے باہر میدانوں اور
جنگلوں میں گھومنے کا بڑا شوق ہے۔ آبادی سے باہر نکل کر میں کھلے میدانوں میں گھوم پھر کر
اور جنگلے پھاند کر بڑا خوش ہوتا ہوں۔ ہم نے اپنی زمین پر پرندوں کے پانچسو گھر بنا رکھے ہیں! اور
ہم انہیں پرندوں کے ہوٹل کہتے ہیں۔ ایک ہوٹل کا نام ہوٹل پونٹ جرٹرین ہم نے رکھا ہے

جس میں ابابیلیں رہتی ہیں۔ اور جس کے اندر چھپّر خانے ہیں۔ جاڑے کے سارے موسم میں درختوں
کے ساتھ تار کی ٹوکریوں میں پرندوں کے لئے خوراک لٹکائی جاتی ہے اور اُن کے لئے پانی کا
ایک بڑا حوض بھرا رہتا ہے جس کو بجلی کے ذریعہ گرم رکھا جاتا ہے۔ تاکہ ٹھنڈ کے مارے پانی
جم نہ جائے۔ گرمیاں ہوں یا سردیاں۔ سارا سال پرندوں کے واسطے خوراک۔ پانی۔ اور بسیرے
کا پورا پورا انتظام موجود رہتا ہے۔ ہم نے بجلی کے گھروں میں تیتر اور بٹیروں کے انڈوں کو
سیبیا ہے اور پھر ان بچوں کو پالنے کے لئے بجلی کے دوسرے بڑے گھروں میں رکھ کر پرورش
کی ہے۔ ہم نے ہر طرح کے گھر اور گھونسلے پرندوں کے لئے بنائے ہیں۔ معمولی چڑیاں بڑی
ناشکری ہوتی ہیں اور اُن کو چاہے کتنا کھلاؤ پلاؤ وہ تمہارے ساتھ ہلتی نہیں۔ وہ اپنے لئے ایسے
گھونسلے چاہتی ہیں۔ جو بالکل ایک جگہ ٹکا ہوا ہو۔ وہ ہوا میں جھولنا پسند نہیں کرتیں۔ مگر پھدکیوں
کو جھولنے والے گھونسلے بڑے پسند ہیں۔ اسی لئے ہم نے پھدکیوں کے گھونسلے فولاد کی تاروں پر
چڑھا کر اس طرح سے لٹکا دئے کہ جب ہوا چلے۔ تو یہ گھونسلے ہوا میں خوب جھولیں۔ پھدکیوں کو
یہ چیز بہت پسند آئی۔ مگر معمولی چڑیوں کو نہیں۔ پھدکیاں اب ان گھونسلوں میں بڑے مزے کے
ساتھ رہتی۔ گرمیوں میں ہم شاہ دانہ کا پھل درختوں کے ساتھ لگا رہنے دیتے ہیں۔ اور اسٹابری بھی
جھاڑیوں سے نہیں توڑتے۔ اور میرے خیال میں اس کی وجہ سے ہماری زمین میں باہر سے اتنی زیادہ
تعداد میں اور اتنے زیادہ قسم کے پرندے آتے ہیں کہ ہمارے علاقے میں اور کسی جگہ اتنے نہیں ملتے
ایک بار جان بروز صاحب ہمارے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور ایک دن وہ کہنے لگے کہ انہوں
نے ہماری سرحد میں ایک ایسا پرندہ دیکھا ہے جس کی بابت اُن کا خیال تھا کہ اس سے پہلے انہوں
نے کسی اور جگہ نہیں دیکھا تھا۔

دس سال پہلے ہم باہر سے بہت زیادہ پرندے منگوایا کرتے تھے اور ہمارے ہاں
لگ بھگ پانچ سو کی تعداد میں زرد کھٹ بڑھئی۔ مینا۔ ہر مینا۔ سُرخ چڑیاں۔ چہچہانے والی چڑیاں
بڑی مینا۔ نیل کنٹھ۔ رنگ برنگی چڑیاں اور چنڈول جمع ہو جایا کرتے تھے۔ وہ ہمارے پاس کچھ عرصہ
ٹھہرتے تھے۔ مگر اب وہ کہاں ہیں۔ اس کی مجھے خبر نہیں۔ میں اب باہر سے اور پرندے نہیں منگواتا

پرندوں کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ جہاں پر وہ رہنا چاہیں رہا کریں۔

پرندوں سے بڑھ کر کوئی ساتھی نہیں۔ ایک تو وہ خوبصورت بہت ہوتے ہیں اور دوسرے اُن کو اپنے پاس رکھ کر خوشی بڑی حاصل ہوتی ہے۔ مگر اس کے علاوہ ہمیں اُن کی مالی لحاظ سے بھی اس لئے سخت ضرورت ہے کہ وہ زمین کے اندر کھیتی باڑی کو اُجاڑنے والے جو کیڑے پیدا ہوتے ہیں ان کو وہ تباہ کر دیتے ہیں۔ میں نے اپنی فورڈ کمپنی کا رسوخ صرف ایک ہی بار استعمال کیا ہے اور وہ پرندوں کے حق میں قانون بنوانے کے واسطے تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح سے جو ہمیں کامیابی حاصل ہوئی اُس کو دیکھتے ہوئے میری یہ حرکت کچھ ناجائز نہ تھی۔ سال کے خاص خاص موسموں میں ملک سے اُڑ کر باہر جانے والے اور پھر لوٹ کر آ جانے والے پرندوں کے لئے آرامگاہیں بنانے کے لئے کانگریس میں مدت سے ایک قانون بنام ویکس میکلین برڈ بل پاس ہونے کے لئے پیش تھا۔ اور یہ پوری اُمید تھی کہ یہ کبھی پاس نہ ہو سکے گا۔ اس بل کو پیش کرنے والوں کی مدد پر اور حمایت کرنے والے کانگریس کے ممبروں کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ بیچارے پرندے اپنے حق میں خود تو ووٹ دے نہیں سکتے تھے۔ اس لئے اس بل کو پاس کرانے کا کام ہم نے اپنے ہاتھوں میں لیا۔ ہمارے چھ ہزار بیوپاری تھے اُن سب کو ہم نے لکھا کہ ہر ایک اپنے اپنے حلقہ کے گورنمنٹ ممبر کو اس بل کی حمایت کرنے کے لئے تار دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بل کے حق میں بہت سے ووٹ ہو گئے۔ اور یہ پاس ہو گیا۔ ہم نے آج تک کبھی اپنی کمپنی کا رسوخ پولیٹیکل مطلب کے واسطے استعمال نہیں کیا اور نہ کریں گے۔ مگر ہم یہ مانتے ہیں کہ لوگ جس کام کو کرنا چاہیں۔ اس کے حق میں قانون بنوانے کا اُنہیں اختیار حاصل ہے۔

جان بروز صاحب کی بات بیچ میں ہی رہ گئی یہ درست ہے کہ مجھے پہلے ہی سے یہ خوب پتہ تھا کہ وہ کون ہیں اور جو کتابیں اُنہوں نے لکھی تھیں اُن سب کو میں پڑھ چکا تھا مگر میری اُن سے ملاقات صرف چند سال پہلے ہی ہوئی تھی۔ جب اُنہوں نے موجودہ زمانے کی نئی نئی ترقیوں کے خلاف اپنی آواز اُٹھائی۔ وہ روپے سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اور خاص کر اُن کو یہ بات دیکھ کر بہت ہی نفرت ہوتی تھی کہ جب بے ہودہ لوگوں کے ہاتھ میں روپیہ آ جاتا ہے تو

اس کے ذریعہ وہ قدرت کے خوبصورت نظاروں کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ اس وجہ سے اُن کو صنعت سے بھی نفرت ہو گئی جس کے ذریعہ خوب روپیہ پیدا ہوتا ہے۔ کارخانوں اور ریلوں کے شور غل سے اُن کو نفرت تھی اس لئے وہ ہر قسم کی صنعتی ترقی کے خلاف تھے۔ اور انہوں نے یہ خیال ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ اگر موٹر کاریں چل پڑیں تو لوگوں کے اندر قدرت کے نظاروں سے لطف اُٹھانے کا مادہ بالکل جاتا رہے گا۔ اس معاملہ میں میرا اُن سے بنیادی مت بھید تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ کیونکہ اُن کا دل بہت نرم ہے اس لئے جوش میں آکر وہ غلط راستے پر جا پڑے ہیں۔ اس لئے میں نے اُنہیں اپنی ایک موٹر کار بھیجدی۔ اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس کو استعمال کر کے دیکھیں۔ کہ آیا اس کے ذریعے وہ قدرت کے نظاروں کو آگے سے زیادہ دیکھ سکتے ہیں یا نہیں۔ پہلے پہل اس موٹر کو چلانا سیکھنے میں اُنہیں کچھ دقّت محسوس ہوئی۔ مگر جب وہ یہ سیکھ گئے تو اُن کی رائے اس معاملے میں بالکل ہی بدل گئی۔ اُنہوں نے دیکھا کہ جب سے یہ کار اُن کے پاس آئی ہے تب سے وہ قدرت کے نظارے زیادہ دیکھ سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد وہ پرندوں کی تلاش میں ہمیشہ اسی پر چڑھ کر جایا کرتے تھے۔ اُن کی سمجھ میں اب یہ بات آگئی تھی کہ اپنے گھر موضع سلیب سائیڈس کے اِرد گرد صرف چند میل گھومنے کے بجائے آئندہ وہ دور دور تک علاقے میں پھر کر پرندے تلاش کر سکتے ہیں۔

اس کارخانے کے ذریعہ ہماری دوستی قائم ہو گئی۔ اور دوستی بھی بڑی مزیدار۔ جان بروز صاحب کی دوستی پاکر کوئی شخص بھی بہتر بنے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ قدرت کا علم اُنہوں نے اپنی روزی کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا تھا۔ نہ ہی وہ کبھی اپنے دل کی محبّت کو دماغ پر قابو پانے دیتے تھے۔

گھر سے باہر نکل کر پرندوں کے معاملے میں ہر ایک آدمی کا دل پسیج جاتا ہے۔ اور ایک پرندے کی عادتوں اور خصلتوں کو جاننے کے لئے وہ بالکل ویسا پتّھر دل نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ لوہے کی مشینوں کے اصول اور طریقے ڈھونڈنے کے لئے۔ مگر جان بروز صاحب نے یہ کام کر کے دکھا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اُنہوں نے پرندوں کے متعلق جو کچھ دیکھ کر لکھا وہ باتیں بہت

حد تک بالکل درست تھیں۔ وہ یہ بالکل برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ لوگ پرندوں کی نسبت اچھی طرح سے دیکھ بھال کئے اوٹ پٹانگ باتیں لکھ کر پبلک کے سامنے پیش کریں۔ جان بروز صاحب قدرت کو اس لئے پیار کرتے تھے کیونکہ ان کو شروع سے ہی قدرت کے ساتھ بہت پیار تھا۔ وہ قدرت کو اس لئے پیار نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اس سے اُن کو اپنی کتابوں کے لئے کافی مسالہ مل جاتا تھا کہ وہ اپنی روٹی کما سکیں۔ اُن کو قدرت سے محبت پہلے تھی۔ اس کی نسبت اُن کو کچھ لکھنے کا خیال پیچھے سے آتا تھا۔

زندگی کے آخری حصّہ میں جاکر وہ فلاسفر بن گئے تھے۔ اُن کی فلاسفی قدرت کی اتنی فلاسفی نہ تھی جتنی کہ وہ قدرتی فلاسفی تھی۔ جیسے کہ آبادی اور شہر کے جھنجھٹوں سے دور جنگلوں میں درختوں کے تلے رہنے والا کوئی یوگی اپنے نیک اور پاکیزہ خیال ظاہر کر کے لوگوں کے دلوں کو سکھ اور شانتی پہنچا رہا ہو۔ وہ دیوی دیوتاؤں کے پجاری نہیں تھے۔ نہ ہی وہ یہ مانتے تھے کہ دُنیا کی ہر چیز خدا ہے۔ مگر اُن کے خیال کے مطابق پرماتما اور آتما میں یا آتما اور پرماتما میں بہت لمبا چوڑا فرق نہیں تھا۔ جان بروز صاحب نے اپنی زندگی بڑے چین کے ساتھ بسر کی۔ یہ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ساری عمر اسی جگہ اپنے گاؤں میں رہے۔ جہاں پر وہ پیدا ہوئے تھے تمام زندگی اُن کو ایسی جگہ اور حالت میں رہنے کا موقع ملا جہاں پر اُن کے دل کو پوری پوری شانتی مل سکتی تھی۔ جنگلوں سے اُنہیں بہت پیار تھا۔ اور اُنہوں نے شہر کی دھول اور خاک مٹی پھانکنے والے لوگوں کو بھی ان سے محبّت کرنا سکھا دیا۔

جو کچھ جنگلوں سے اُنہوں نے سبق سیکھا یا فائدہ اُٹھایا۔ وہ لوگوں کو بتلانے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔ ساری عمر وہ مشکل سے اپنے گزارہ لائق پیسے کماتے رہے۔ اگر وہ چاہتے تو کافی دولت کما سکتے تھے مگر یہ اُنہوں نے اپنی زندگی کا کبھی مقصد ہی نہیں بنایا تھا۔ امریکہ کے اور علم قدرت کے جانچ کاروں کی طرح وہ بھی اپنے آپ کو پرندوں کے گھونسلوں اور پہاڑی رستوں کا انسپکٹر ظاہر کر کے خوب روپیہ پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن اس طرح سے سادہ زندگی بسر کرنے کوئی آدمی امیر نہیں بن سکتا۔

جب اُن کی عمر ستر سال سے اوپر ہو گئی تو صنعت کی نسبت اُن کے خیالوں میں بھاری تبدیلی

آگئی۔ اس تبدیلی کو لانے میں شائد میرا بھی کچھ حصہ تھا۔ اُس وقت اُن کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی، کہ صرف پرندوں کے گھونسلے ڈھونڈنے کے کام میں لگ کر ہی ساری دُنیا کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ اُن کی زندگی میں ایک ایسا وقت آیا تھا جبکہ وہ موجودہ زمانے کی سبھی نئے طریقوں کے سخت برخلاف تھے۔ اور خاص کر کارخانوں کی چمنیوں سے دُھواں اُٹھتے دیکھ کر اور لوگوں کی بھیڑ کا شور و غل سُن کر وہ بہت ہی ناراض ہوا کرتے تھے۔ شائد اس لحاظ سے وہ کچھ کچھ کتابیں اور نظمیں لکھنے والوں سے ملتے جُلتے تھے۔ ورڈزورتھ کو ریلوں سے بڑی نفرت تھی اور تھورو یہ کہا کرتا تھا کہ قدرت کے نظاروں کا مزا صرف پیدل چل کر ہی اُٹھایا جا سکتا ہے۔ شائد ایسی باتوں کا ہی اثر تھا جن کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لئے جان بروز صاحب صنعتی ترقیوں کے خلاف ہو گئے تھے مگر صرف تھوڑے عرصہ کے لئے اُن کو جلدی پتہ لگ گیا کہ قدرت کا یہ بہت بڑا انصاف ہے کہ دُنیا میں اور لوگوں کے خیال اور مذاق اُن سے مختلف ہیں۔ جس طرح سے اُن کے خیال اور مذاق دوسرے لوگوں سے مختلف ہیں۔ یہ دُنیا اور اُن کے حق میں دونوں کے واسطے بہت ہی فائدے کی بات تھی۔ جب سے لوگوں کو اس کام کی کچھ عقل آئی ہے تب سے لے کر آج تک پرندوں کے گھونسلوں میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ اور پرندے اب بھی اپنے گھونسلے ویسے ہی بناتے چلے آتے ہیں۔ مگر یہ کوئی دلیل نہیں۔ کہ اس وجہ سے لوگ اب بھی پہاڑوں اور جنگلوں کی اندھیری غاروں سے نکل کر موجودہ زمانے کے ہوادار۔ کھُلے مکانوں میں رہنا نہ سیکھیں۔ جان بروز صاحب کی یہی خوبی تھی کہ جہاں اُنہیں اپنی غلطی معلوم ہوتی تھی وہ جھٹ مان لیتے تھے۔ وہ قدرت کے عاشق ضرور تھے۔ مگر آنکھیں بند کر کے اُس کی غلامی نہیں کرتے تھے۔ کچھ وقت پا کر اُن کو موجودہ زمانے کی ترقیوں کی قدر معلوم ہونے لگی۔ اور ان کو وہ پسند کرنے لگے۔ گو یہ بڑی مزے دار بات ہے کہ اُن کے خیالوں میں یہ تبدیلی اُس وقت آئی جبکہ اُن کی عمر ۰۰ سال کی ہو گئی تھی۔ جان بروز صاحب ہمیشہ نئی نئی چیزوں کو سیکھنے کے لئے تیار رہتے تھے اور ضرورت پڑنے پر اپنی رائے بدل ڈالنے سے ذرا نہیں ہچکچاتے تھے۔ اس لئے وہ آخری دم تک بڑھتے چلے گئے۔ جو آدمی کچھ سیکھنے کو تیار نہیں۔ وہ سمجھو مر چکا ہے اور اُس کا جنازہ

نکلنے میں بس تھوڑی سی ہی اور دیر ہے۔

اُن کو سب سے زیادہ ایمرسن کی کتابیں پسند تھیں۔ نہ صرف اُن کو اس مصنّف کی کتابیں زبانی یاد تھیں۔ بلکہ اُن کے دل پر اس کی بڑی گہری چھاپ پڑی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے مجھ کو بھی ایمرسن کی کتابیں پڑھائیں۔ ایمرسن نے اُن کے دِل اور دماغ پر اتنا گہرا غلبہ پالیا تھا کہ اُنکی زندگی میں ایک وقت ایسا آیا جب وہ بالکل اُسی کی طرح سوچا کرتے۔ اور اسی کی طرح گفتگو کیا کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ اُن کی یہ عادت جاتی رہی۔ اور وہ اپنے دماغ سے بھی کام لینے لگے۔ یہ اُن کے حق میں اچھا ہی ہوا۔

جان بروز صاحب کی موت دُکھ کی گھڑی نہ تھی۔ جب اناج دھوپ کھا کر پک جاتا ہے اور فصل کاٹنے کے لئے تیار کھڑی ہوتی ہے تو اگر اُس وقت کسان لوگ آکر اُس کے پولے باندھ لیتے ہیں تو اناج کے لئے کوئی آنسو نہیں بہاتا۔ دُنیا میں اس کی عمر اتنی ہی تھی اور پرمیشور نے جس کام کے لئے اُس کو بنایا تھا وہ اس کا پورا ہو گیا۔ یہی بات جان بروز صاحب کی زندگی کی نسبت کہی جا سکتی ہے۔ اُنہوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ اور اس کو گلنے یا سڑنے نہیں دیا اپنی عمر کے آخری سانس تک وہ کام میں ڈٹے رہے۔ اُن کی تجویزیں اتنی بڑی تھیں جو ان کی زندگی میں پورے طور سے تیار نہیں ہو سکتی تھیں۔ اور اُن کے مرنے کے بعد بھی جاری رہیں۔ جس دن وہ مرے وہ اُن کا چوراسیواں جنم دن تھا۔ قدرت کے جن نظاروں سے وہ ساری عمر پیار کرتے رہے ایسے ہی جگہ میں اُن کو دفن کیا گیا۔ اور اس جگہ کی اتنی ہی حفاظت کی جاتی ہے جتنا کہ اُن کو اپنی زندگی میں اس سے پیار تھا۔

جان بروز اور ایڈیسن کے ساتھ میں نے اور ہاروے۔ ایس۔ فائرسٹون نے مل کر خوب آوارہ گردی کی اور سیر سپاٹے کئے۔ ہم موٹر کاروں کا ایک قافلہ بنا لیتے تھے اور خیموں میں سویا کرتے تھے۔ ایک بار ہم چلتے چلتے گنجیروں کی طرح ایڈیروں ڈیکس سے بھی آگے بڑھ کر ایلگینیز کے علاقے میں پہنچ گئے۔ اور پھر دکن کی طرف اور نکل گئے۔ ان سیر سپاٹوں میں ہمیں بڑا لطف حاصل ہوتا ہے لیکن پیچھے جا کر ان میں ایک یہ نقص پڑ گیا تھا کہ لوگوں کی نظروں میں یہ بہت کھٹکنے لگ پڑے تھے۔

میں شروع سے ہی جنگ کے خلاف رہا ہوں۔ اور آج میں اس سے اور بھی زیادہ
خلاف ہوں۔ خواہ اس بات کو پولیٹیکل آدمی مانیں یا نہ۔ مگر دنیا اس بات کو مانتی ہے کہ جنگ سے
کبھی کچھ نہیں ہوتا۔ آج ہم کو دنیا کے انتظام کے اندر جتنی خرابیاں اور برائیاں نظر آرہی ہیں
وہ سب جنگ کی مہربانیاں ہیں۔ اور اسی وجہ سے ملک کے اندر ساری گڑبڑی پیدا ہو رہی ہے
یہ درست ہے کہ لڑائی چھڑ جانے سے چند آدمی امیر ہو جاتے ہیں۔ اور باقی غریب۔ لیکن جو امیر بن
جاتے ہیں وہ وہ آدمی نہیں ہوتے جو لڑائی میں جاکر خود لڑے ہوں۔ یا جنہوں نے لڑائی میں کچھ
خاص مدد کی ہو۔ لڑائی چھڑ جانے سے کسی دیش بھگت کو آمدنی نہیں ہوتی۔ جب آدمی کے دل میں
دیش بھگتی کی سچی آگ ہو وہ جنگ سے یعنی دوسرے لوگوں کی زندگیوں کو قربان ہونے سے کبھی
روپیہ پیسا نہیں کما سکتا۔ جب تک کہ سپاہی جنگ میں جاکر لڑائی کرکے روپیہ پیدا نہ کریں۔ جب تک
مائیں اپنے بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتار کر روپیہ پیدا کرنے کے لئے تیار نہ ہوں تب تک کسی
شہری کا یہ حق نہیں کہ وہ اپنے ملک کی آن اور عزت کو بچانے کے لئے جو ساز اور سامان درکار
ہے اس میں سے اپنے لئے وہ ایک پیسہ بھی منافع حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

جب تک دنیا کے اندر لڑائیاں جاری رہیں گی۔ تب تک ایک ایماندار بیوپاری کے لئے
جنگ کے ذریعہ اپنے واسطے زیادہ اور جلدی جلدی منافع کمانا روز بروز آگے سے مشکل ہوتا
چلا جائے گا۔ جنگ سے جو دولت اکٹھی لوگ کرتے ہیں اس کی قدر گھٹ رہی ہے۔ جو لوگ
جنگ کے دنوں میں خوب روپیہ کما لیتے ہیں۔ وہ پبلک کی نظروں میں آہستہ آہستہ گرتے چلے
جاتے ہیں اور ان کی مخالفت بڑھتی جاتی ہے۔ بیوپار کے لئے امن و امان کی ضرورت ہے۔
کیونکہ بازار میں جتنی چین ہوگی اتنا ہی بیوپار چلے گا۔ اور اس کے علاوہ ایک بڑی بات یہ بھی ہے
کہ کیا کبھی کسی نے جنگ کے دنوں میں نئے نئے دھندے اور کارخانے نکالے ہیں؟ ہرگز نہیں۔
اگر پچھلی لڑائی پر ٹھنڈے دل سے بغیر کسی طرفداری کے غور کیا جائے کہ اس سے پہلے مارکیٹ
کی کیا حالت تھی اور اس سے نتیجہ کیا نکلا۔ تو ہم کو صاف صاف پتہ لگ جائے گا کہ دنیا کے اندر چند آدمیوں
کا ایک ایسا گروہ بنا ہوا ہوتا ہے جس کی بہت بھاری طاقت ہے جو اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے

کھلے طور پر ظاہر ہونے نہیں دیتا۔ اس کے ممبر کسی بڑے عہدے کو پانے کے لئے مارے مارے نہیں پھرتے۔ اور نہ اختیار حاصل کرنے کے لئے کوئی بڑی نوکریاں ڈھونڈتے ہیں۔ اور یہ گروہ کسی خاص ایک قوم کا نہیں بلکہ سبھی قوموں کے لوگوں کا بنا ہوا ہوتا ہے مگر اس کے ممبر کسی نہ کسی طرح ایک ایسی طاقت پیدا کر لیتے ہیں جس کو استعمال کر کے ہر ایک گورنمنٹ تمام مشہور اور بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں۔ اخباروں اور لیکچر دینے والوں۔ غرضیکہ پبلک پر اثر ڈالنے والی ہر چیز کے ذریعے دنیا کے اندر آگے سے بھی زیادہ طاقت حاصل کرنے کے لئے لوگوں میں گھبراہٹ اور خوف حد سے زیادہ پیدا کر دیتے ہیں۔ جوئے بازوں کی مدت سے یہ ایک پرانی چال چلی آتی ہے کہ جب ایک جوئے باز میز پر کافی روپیہ پڑا ہوا دیکھ لیتا ہے تو شور مچا دیتا ہے کہ پولیس آگئی پولیس آگئی۔ یہ سن کر لوگ گھبراہٹ میں روپیہ میز پر ویسے ہی چھوڑ کر بھاگنے کی فکر کرتے ہیں۔ اور وہ جوئے باز یہ سب روپیہ سمیٹ کر چمپت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا کے اندر یہ گروہ ایسا ہے جو یوں ہی "لڑائی" کا ڈھول پیٹتا رہتا ہے۔ جسے سن کر قومیں گھبرا اٹھتی ہیں۔ لوگ اپنی حفاظت کی خاطر اور امن چین قائم کرنے کے لئے بے شمار جانیں گنوا بیٹھتے ہیں اور قربانیاں کرتے ہیں۔ اور اس گھبراہٹ سے یہ گروہ اپنے ہاتھ خوب رنگ لیتا ہے۔

یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ گو ہم فوجی مقابلوں میں ضرور جیت گئے۔ مگر دنیا لڑائیوں کو بھڑکانے والوں پر آج تک پورے طور سے فتح پانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ ہم کو یہ کبھی بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ لڑائیوں کی بلا کہیں باہر سے نہیں آتی۔ بلکہ لوگ اسے خود زبردستی پیدا کرتے ہیں اور اس کے قاعدے اور اصول پکے بندھے ہوئے ہیں۔ جن کے اوپر چل کر دو قوموں کے درمیان لڑائی کرنے کا سامان پیدا کیا جاتا ہے۔ جس طرح سے کوئی اور دھندا یا کام چلانے کے لئے تجویزیں بنائی جاتی ہیں اسی طرح لڑائی چھیڑنے کے لئے بھی سب کچھ انتظام پہلے سے سوچا جاتا ہے۔ پہلے لوگوں کو خوب بھڑکایا جاتا ہے۔ بڑی ہوشیاری کے ساتھ طرح طرح کی جھوٹی کہانیاں اور باتیں اس قوم کے خلاف لوگوں کے اندر پھیلا کر طرح طرح کے شک اور اندیشے پیدا کئے جاتے ہیں جس کے ساتھ لڑائی کرنے کا ارادہ ہو۔ پہلے ایک قوم کے اندر یہ آگ لگا دو پھر دوسری قوم

کو پہلی قوم کے خلاف بھڑکا دو۔بس لڑائی ٹھن جائے گی۔اس کے لیئے صرف دو چیزیں درکار ہیں۔
ایک تھوڑے سے ایسے ایجنٹ جو بڑے چالاک ہوں اور جن کا بالکل کوئی ایمان نہ ہو۔ اور
دوسرے چند ایسے اخبار۔جن کو یہ اُمید ہو کہ لڑائی چھڑ جانے سے اُن کے اخبار کی اشاعت
بہت بڑھ جائے گی۔ اور اُن کو خوب آمدنی ہونے لگے گی۔تب کوئی نہ کوئی کسی قوم سے ایسی
حرکت ضرور جائے گی جس سے لڑائی شروع ہو جائے گی جب دو قوموں کے درمیان نفرت
کا جذبہ خوب پیدا کر دیا۔ تو اس قسم کی کوئی خاص حرکت کرا دینا کوئی بڑی بہادری کی بات
نہیں رہ جاتی۔

ہر ایک ملک میں ایسے بہت سے آدمی پائے جاتے ہیں جن کو پچھلی دنیا کی بڑی لڑائی
چھڑ جانے سے خوشی حاصل ہوئی تھی اور اُس کے بند ہو جانے پر رنج ہوا تھا سول وار یعنی امریکہ کی
خانہ جنگی چھڑ جانے سے سنکڑوں امریکنوں کی قسمت جاگ اُٹھی اور اسی طرح اس پچھلی دنیا کی بڑی
لڑائی سے ہزاروں امریکن لوگ خوب دولت مند ہو گئے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ
جنگ اُن لوگوں کے حق میں بڑا اچھا بیوپار ہے جن کو اس طرح سے روپیہ کمانا اچھا لگتا ہے جس
طرح سے جنگ میں خون کی ندیاں بہتی ہیں اُسی طرح جنگ میں روپے کی بھی چاروں طرف ریل
پیل ہو جاتی ہے۔

اگر ہم یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لیں کہ وہ دراصل کونسی چیز ہے جس کو پا کر ایک قوم بڑی
بنتی ہے تو ہم اتنی جلدی لڑائیاں کرنے پر بھڑکائے نہیں جا سکتے۔ ایک قوم زیادہ تجارت کر کے
بڑی نہیں بنتی۔ ایک ملک خود مختار گورنمنٹ کی طرح اپنے چند آدمیوں کو مالدار بنانے سے بڑا نہیں
بن جاتا۔ نہ ہی ایک ملک کھیتی باڑی کو چھوڑ کر بہت سے کارخانے چلا لینے سے بڑا بنتا ہے ایک
ملک اصل میں تب ہی بڑا بنتا ہے۔جب وہ اپنے علاقے کے کچّے مسالوں کو اور اپنے لوگوں کے
اندر اُن سے فائدہ اُٹھانے کی لیاقت پیدا کر کے ایسا اچھا انتظام کر دیتا ہے کہ اُس کی تمام آبادی
کا پیٹ مناسب اور پورے طور پر بھرنے لگتا ہے۔ اور اُس کا ہر ایک باشندہ خوشحال ہو جاتا ہے۔
لوگوں کو بدیشی تجارت کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ ہماری یہ خواہش ہونی چاہئے

کہ ہر ایک قوم جہاں تک ممکن ہو اپنے پاؤں پر آپ کھڑی ہو جائے۔ بجائے اس کے کہ ہم یہ چاہیں کہ دوسری قوم ہماری اُن چیزوں کی ہمیشہ محتاج رہے جو ہم تیار کرتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم اُس قوم کو یہ مال خود بنانا سکھلا دیں تاکہ آئندہ وہ بھی سدا خوشحال رہیں۔

جب ہر قوم یہ سیکھ لے گی کہ جو چیزیں وہ خود بنا سکتی ہے اُن کو خود بنائے جو پھر ایک دن ایسی حالت پیدا ہو جائے گی۔ کہ ایک قوم دوسری قوم کو صرف وہی خاص خاص چیزیں تیار کر کے دے گی جن کے اندر قیمتوں کے مقابلہ کا بالکل کوئی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ جو خاص خاص چیزیں گرم ملکوں میں پیدا ہوتیں ہیں اُن کے مقابلے میں ٹھنڈے ملک وہ چیزیں ہرگز کبھی تیار نہیں کر سکتے ہمارا ملک چائے پیدا کرنے میں کبھی پورب دیش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نہ ہم اسی طرح ربڑ پیدا کرنے میں اپنے دکنی علاقے کے مقابلے میں ٹھہر سکتے ہیں۔

ہماری بہت سی بدیشی تجارت اس وجہ سے ہو رہی ہے۔ کیونکہ ہمارے بدیشی خریداروں کو پوری عقل نہیں۔ اور کیونکہ ہم بڑے خود غرض ہیں اس لئے ہماری یہی کوشش رہی ہے کہ وہ سدا ایسے ہی بے وقوف بنے رہیں۔ لیکن اگر بُدّھو قوموں کو اپنے لوگوں کی بھلائی کرنے کا خیال سوجھ جائے تو وہ پھر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر میکسیکو کی بات لو۔ میکسیکو کو ترقی دینے کے لئے بڑی بڑی تجویزیں نکالی جا رہی ہیں۔ مگر اصل میں ان تجویزوں کو لوٹ کھسوٹ ہی کہنا چاہیئے۔ قدرت نے اس علاقے کے اندر کچے مسالوں کی شکل میں دولت کے ڈھیر لگائے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ کچے مسالے دوسرے ملکوں کے لوگ اپنا گھر بھرنے کے لئے استعمال کرنے لگ پڑیں۔ تو یہ میکسیکو کی ترقی نہیں۔ اُلٹی بربادی ہے۔ جب تک میکسیکو کے رہنے والے خود لائق نہیں بنتے تب تک میکسیکو کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ کیا آج تک کبھی دوسرے ملکوں کے لوگوں نے یہاں روپیہ لگا کر میکسیکو کی "ترقی" کے نام پر بھی میکسیکو کے باشندوں کی حالت بہتر بنانے کا ذرا بھی خیال کیا ہے؟ آج تک باہر کے ملکوں کے جن لوگوں نے آ کر اس علاقے میں کام شروع کیا ہے۔ وہ میکسیکو کے باشندوں سے صرف مزدوری یا چھوٹے چھوٹے کام ہی لیتے رہے ہیں۔ اس بدیشی تجارت نے میکسیکو کے باشندوں کی عزت کم کر دی ہے۔

لیکن جو دور اندیش نہیں۔ وہ اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ایسا کرنا شروع کر دیا تو پھر ہماری بدیشی تجارت کا کیا بنے گا؟

جب افریقہ کے باشندے اپنے لئے اپنے ملک کے اندر روئی خود پیدا کرنے لگیں گے جب روس کے باشندے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کھیتی باڑی کے اوزار خود بنانے لگیں گے۔ جب چین کے باشندے اپنے استعمال کے لئے جو مال درکار رہے خود تیار کرنا سیکھ جائیں گے۔ تو اس سے فرق ضرور پڑ جائے گا۔ لیکن کیا کوئی سمجھدار آدمی یہ کبھی مان سکتا ہے کہ جنگل کی طرح چند قومیں دنیا کی تمام ضرورتوں کو پوری کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں؟ بالکل نہیں۔ ہمیں اس وقت کا خیال کرنا چاہئے۔ جب دنیا میں ہر جگہ علم اور سائنس کی روشنی پھیل جائے گی اور جب ہر قوم کے لوگ اپنے پاؤوں پر آپ کھڑا ہونا سیکھ جائیں گے۔

جب ایک ملک اپنی بدیشی تجارت بڑھانے کی فکر میں پاگل ہوا بڑی دوڑ دھوپ شروع کر دیتا ہے۔ تو اس کو سپلائی پوری کرنے کے لئے بہت سے کچے مسالے دوسرے ملکوں سے منگوانے پڑتے ہیں۔ اپنے ملک کے لوگوں سے کولہو کے بیل کی طرح کام لینا پڑتا ہے اور اپنے ملک کے اندر پرائیویٹ طور پر امیر آدمیوں کی ایک ٹولی بن جاتی ہے۔ اور اپنے ملک کی نوری ضرورتوں کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لینی پڑتی ہیں۔ ہمارے خود اپنے ملک یونائیٹڈ سٹیٹ کے اندر اپنا اتنا کام پڑا ہے کہ ہمیں بہت عرصے تک بدیشی تجارت کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس کھیتی باڑی کر کے خوراک پیدا کرنے کے لئے کافی مشین ہیں اور اس کام کو پورا کرنے کے واسطے ہمارے پاس کافی روپیہ بھی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر ہم اپنے ہی ملک کی ترقی کے کام میں لگ جائیں۔ تو اس کام کو کرنے میں جتنا وقت درکار ہو گا۔ اس عرصے کے لئے ہمارے پاس کافی خوراک اور روپیہ موجود ہے۔ اور ہمیں بدیشی تجارت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے واسطے اس سے بڑھ کر اور بے وقوفی کی کیا بات ہو گی۔ کہ جب ہمارے خود اپنے ملک کے اندر سو سال کے لئے کام کرنے کا مسالہ موجود ہے جس سے ہم اپنے لوگوں کو خوشحال بنا سکتے ہیں تو ہم یونائیٹڈ سٹیٹ کے اندر اس

وجہ سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر خالی بیٹھے رہیں کیونکہ جاپان فرانس یا کسی اور ملک سے ہمیں مال سپلائی کرنے کے لئے کوئی آرڈر نہیں ملا ہے؟

اصل میں لوگوں کی خدمت کرنے سے ہی تجارت پیدا ہوتی چلی آئی ہے۔ بیوپاری اپنا مال اُن لوگوں کے پاس لے جا کر بیچتے تھے جن کے ہاں یہ موجود نہیں ہوتا تھا۔ جس ملک میں اناج پیدا ہوتا تھا وہاں سے اناج اُس ملک کو لے جایا جاتا تھا جہاں پر یہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جنگل والے ملک سے لکڑی اس علاقے میں پہنچائی جاتی تھی جہاں پر درخت نہ ہوتے تھے۔ انگور والے ملک اپنا پھل ٹھنڈے ملکوں میں بھیجتے تھے۔ جس علاقہ میں چراگاہیں تھیں وہ گوشت اُس جگہ بھیجتا تھا جہاں پر سبزی نہ ہوتی تھی۔ اِسی کا نام لوگوں کی خدمت ہے۔ جب دُنیا کی تمام قوموں کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا یہ ہنر آ جائے گا تو پھر ہر جگہ تجارت اسی اصول پر ہوا کرے گی۔ تب پھر کاروبار لوگوں کی خدمت کا ایک ذریعہ بن جائے گا۔ اُس وقت قیمتوں کے مقابلے کا کوئی سوال نہیں رہے گا۔ کیونکہ پھر مقابلہ کرنے کی کہیں ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ ہر ملک اور قوم صرف خاص خاص لائنوں کا مال تیار کیا کرے گی جو ایک طرح سے اپنا اکیلا ٹھیکہ ہوگا اور جن میں اُس کو کسی دوسرے ملک یا قوم کے ساتھ مقابلے میں قیمتیں گھٹانے یا بڑھانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ جب سے دُنیا پیدا ہوئی ہے تب سے سبھی قوموں کے اندر کسی ایک لائن یا کام میں خاص طور پر آگے بڑھنے کا الگ الگ مادہ پایا جاتا ہے۔ کوئی گورنمنٹ چلانے میں دوسری نئی آبادیاں قائم کرنے میں۔ تیسری کھیتی باڑی کرنے میں۔ چوتھی بیوپار میں۔ غرضیکہ سبھی الگ الگ اپنے کسی خاص کام میں بہت ہوشیار ہیں۔ پریذیڈنٹ لنکن کہا کرتے تھے کہ ہماری قوم آدھی غلام اور آدھی آزاد رہ کر کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ انسان کی نسل ہر زمانہ میں اور لگاتار دُنیا میں آدھی ڈاکو اور آدھی ڈاکوؤں سے لُٹ جانے والی بن کر بھی قائم نہیں رہ سکتی جب تک ہم ایک جیسے خریدار اور بیچنے والے نہیں بنتے۔ جب تک ہم برابر کے پیدا کرنے والے اور مال کو کھانے والے نہیں بنتے اور جب تک ہم بیوپار کو صرف منافع کمانے کا ذریعہ نہ بنا کر اسے لوگوں کی خدمت کرنے کے درجے پر نہیں لے جاتے۔ تب تک دُنیا کے اندر کسی کبھی

طرح کی گڑبڑی ضرور رہے گی۔

فرانس دُنیا کو کچھ ایسا مال سپلائی کر سکتا ہے جس میں کوئی اور قوم یا ملک اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا یہی حال اٹلی کا ہے۔ روس کی بھی یہی بات ہے جنوبی امریکہ کے ملکوں کی نسبت بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جاپان برطانیہ اور یونائٹڈ سٹیٹ کے متعلق بھی۔ اس لئے جتنی جلدی ہم بیوپار کرنے کے اس اصول پر آجائیں کہ ہر ملک صرف اپنی خاص خاص چیزوں کو ہی بنا کر مارکیٹ میں سپلائی کیا کرے اور کوئی ایک قوم یا ملک دوسرے ملکوں کی ہر قسم کی تجارت کو ہڑپ کرنے کا خیال بالکل چھوڑ دے۔ اتنی جلدی ہی ساری دُنیا کے اندر سب قومیں اور ملک ایک دوسرے کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گی۔ اور سب میں صلح صفائی قائم ہو جائے گی۔ دُنیا کی ساری تجارت کو اکیلے اپنے ہاتھ میں لینے سے جنگ کی آگ بھڑک سکتی ہے۔ اس سے بھی خوشحالی نہیں بڑھ سکتی۔ ایک دن آئے گا جب بدیشی ملکوں سے کاروبار کرنے والے بڑے بڑے بینکروں کی سمجھ میں یہ سچی بات آجائے گی۔

مجھے آج تک لاکھ ڈھونڈنے پر بھی پچھلی دُنیا کی بڑی لڑائی چھڑ جانے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند آدمیوں نے جن کو لڑائی ہو جانے سے منافع کمانے کی بڑی اُمید تھی مل کر ایسی نازک حالت پیدا کر دی جس کی وجہ سے یہ لڑائی ٹھن گئی۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ کچھ قومیں صلح کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور اگر صلح کے لئے تیار ہیں اور اگر صلح کے لئے کچھ کوشش کی جائے تو اس سے اُن کو خوشی ہوگی میں نے اس پر اعتبار کر لیا اور مجھے یہ اُمید ہوگئی کہ یہ خبر سچی ہے۔ اور اسی لئے میں نے سٹاک ہالم کو ایک وفد بنا کر اپنے خرچ پر بھیجا جس کا بعد میں "پیس شپ" یعنی صلح کا جہاز" کا نام پڑ گیا تھا۔ مجھے اپنی اس حرکت پر افسوس نہیں کیونکہ اس ڈیپوٹیشن کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ صرف اس وجہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کوشش ہی فضول تھی۔ کامیابیوں کی نسبت ہم اپنی ناکامیابیوں سے زیادہ سبق حاصل کرتے ہیں۔ اس ڈیپوٹیشن کے سفر سے جو کچھ میں نے سیکھا اُس سے میری تسلی ہوگئی کہ جتنا اس میں وقت اور روپیہ خرچ ہوا ہے وہ بے کار نہیں گیا۔ مجھے پتہ نہیں کہ اُس وقت جو مجھ کو اطلاع ملی تھی وہ سچی تھی

جھوٹ۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کو ہر شخص ماننے کیلئے تیار ہوگا۔ اگر کسی طرح سے ۱۹۱۶ئہ میں اس جنگ کو ختم کر دینا ممکن ہوجاتا تو دنیا کی حالت آج سے کہیں بہتر ہوتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ فتح حاصل کرنے والوں کی ساری طاقت فتح حاصل کرنے میں اور ہارنے والوں کی ساری طاقت ڈٹ کر مقابلہ کرنے میں ضائع ہوگئی۔ اگر سچ پوچھا جائے تو اس جنگ سے نیک نامی والا یا ذلیل کسی قسم کا بھی فائدہ نہیں ہوا۔ جب یونائٹڈ اسٹیٹ اس جنگ میں کود پڑا تو آخر میں میں نے اپنے دل میں یہ اُمید باندھی تھی کہ اس جنگ سے آئندہ کے لئے ہمیشہ لڑائیوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ لیکن اب مجھے یہ پتہ لگ گیا ہے کہ جس طرح بڑی بھاری آگ لگا دینے سے آئندہ آگ لگ جانے کا خدشہ نہیں مٹ سکتا اُسی طرح لڑائیاں کرنے سے بھی لڑائیاں نہیں مٹ سکتیں۔ جب ہمارا ملک جنگ میں داخل ہوا تو یہ ہر ایک شہری کا فرض ہوگیا کہ جہاں تک ممکن ہوسکے۔ وہ اپنے ملک کو فتح حاصل کرنے میں اپنی پوری پوری مدد کرے میرا یہ یقین ہے کہ اگر ایک آدمی اصولاً جنگ کے برخلاف ہے اُس کا بھی یہ فرض ہے کہ جب لڑائی شروع ہوجائے تو پھر وہ جان توڑ کر اس میں مدد کرے۔

میں جنگ کے اس لئے برخلاف نہیں ہوں۔ کیونکہ میں صلح پسند آدمی ہوں۔ یا ستیہ گرہ کے اصول کا پیرو ہوں۔ ممکن ہے کہ دُنیا میں موجودہ تہذیب کی حالت ایسی ہو کہ قوموں اور ملکوں کے درمیان معاملوں کا فیصلہ امن و امان سے ساتھ بات چیت کرنے سے نہ ہوسکتا ہو۔ اور شاید اُن کے لئے تلوار اُٹھانے کی ضرورت ہو۔ مگر آج تک لڑائیوں کے ذریعہ کبھی کسی معاملے کا قطعی فیصلہ نہیں ہوا۔ البتہ اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ لڑتے کرتے والے اس بات پر رضامند ہوجاتے ہیں کہ جس معاملہ کی خاطر ہم آپس میں لڑ بھڑ رہے ہیں اُس کا فیصلہ ایک جگہ بیٹھ کر کیوں نہ کر لیا جائے۔

ایک بار جب ہم لڑائی میں داخل ہو ہی گئے۔ پھر ہم نے اپنے فورڈ کے سب کارخانے گورنمنٹ کا کام کرنے اور گورنمنٹ کو مال بنا کر دینے میں پورے طور سے لگا دئے جب تک یونائٹڈ سٹیٹ نے

لڑائی میں داخل ہونے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ تب تک ہم نے بدیشی لڑنے والے ملکوں کے جنگی آرڈر
سپلائی کرنے سے بالکل انکار کر دیا تھا۔ ہمارے کاروبار کا یہ ایک پکّا اصول ہے کہ جب تک کوئی
خاص بڑی ضرورت سر پر نہ آ پڑے۔ تب تک ہم نے اپنے تیار کرنے کی تعداد اور رفتار میں
ہرگز کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ ہم اسے اپنے انسانی اصولوں کے خلاف سمجھتے ہیں کہ جب لڑائی میں
ہمارا اپنا ملک شامل نہیں۔ اُس میں کسی طرف کی بھی کسی قوم یا ملک کی کچھ مدد کی جائے لیکن جب
یونائیٹڈ اسٹیٹ جنگ میں شریک ہو گیا۔ تو پھر ان اصولوں کو لاگو کرنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ ماہ اپریل
۱۹۱۷ء سے لے کر نومبر ۱۹۱۸ء تک ہماری فیکٹری نے لگ بھگ صرف گورنمنٹ کے لئے ہی
مال تیار کر کے دیا۔ پیچھے کی طرح ہم تب بھی اپنے کارخانوں میں موٹر کاریں۔ اُن کے پُرزے۔ بڑا
مال اُٹھانے کے خاص ٹرک اور ایمبولینس گاڑیاں بنایا کرتے تھے۔ مگر ان کے ساتھ ساتھ ہم نے
اور بھی کئی نئی چیزیں گورنمنٹ کے لئے بنانی شروع کر دیں۔ جن کو ہم نے آگے کبھی نہیں بنایا
تھا۔ ہم نے ڈھائی ٹن اور چھ ٹن کے ٹرک بھی بنا کر گورنمنٹ کو دیئے۔ ہم نے گورنمنٹ کے لئے بہت
بڑی تعداد میں لبرٹی موٹریں۔ ہوائی جہازوں کے سلنڈر اور ریلوں کے پلیایوں کے واسطے ۱۰۵۵
اور ۴.۷ ملی میٹر سائز کی آہنی کوٹھیاں بنائیں۔ ہم نے اپنے ہائی لینڈ پارک اور فلاڈلفیا کے کارخانوں
میں کان میں لگا کر سُننے والی مشینیں اور فولاد کے ٹوپ تیار کئے اور کشتیاں جن کو ایگل بوٹ کہتے ہیں
بھی بنائیں۔ اور ان کے علاوہ جنگ میں استعمال ہونے والی پائیٹیں کمپنسیٹرز۔ اور ذرہ بکتر بھی بنا کر
دیئے۔ ایگل بوٹ بنانے کیلئے ہم نے اپنے ریور رُو کے کارخانے کے قریب ایک الگ کارخانہ
جاری کر دیا تھا۔ یہ کشتیاں سمندر میں ڈُبکنی کشتیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے خاص طور پر تیار کی گئی
تھیں۔ یہ ۲۰۴ فٹ لمبی ہوتی تھیں اور ساری فولاد کی تیار کی جاتی تھیں۔ ان کے بنانے کے واسطے
ہمارے لئے یہ ایک خاص شرط تھی کہ جنگ کے واسطے جو ہم دوسرا سامان تیار کر کے گورنمنٹ کو دے
رہے ہیں اُس میں ان کے بنانے کی وجہ سے ہرگز کسی قسم کی رکاوٹ نہ پڑے۔ اور یہ جتنی جلدی بن سکیں
بنا کر گورنمنٹ کے حوالے کر دی جائیں ان کشتیوں کا ڈیزائن محکمہ نیوی نے خود ہمیں بنا کر دیا
تھا۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۱۷ء کو میں نے محکمہ نیوی کو یہ اطلاع دے دی کہ میں ان کشتیوں کو بنانے کے لئے تیار

ہوں۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۱۸ء کو اس کی نسبت گورنمنٹ نے فیصلہ کر دیا اور محکمہ نیوی نے اس کا ٹھیکہ فورڈ کمپنی کو دے دیا۔ ۱۱ر جولائی ۱۹۱۸ء کو ہماری یہ پہلی کشتی تیار ہو کر سمندر میں پہنچ گئی۔ ہم نے ان کے بنانے میں کہیں ڈھلا ہوا یا جمایا ہوا گرڈر استعمال بالکل نہیں۔ ہم ان کو پیٹے ہوئے فولاد کی بڑی بڑی چادروں میں سے پورا پورا ایک ٹکڑا کاٹ کر بناتے تھے۔ یہ کارخانوں کے اندر تیار ہوتے تھے۔ چار مہینے کے اندر ریور روگے اس کارخانے کی عمارتیں ایک تہائی میل تک تیرہ ایکڑ سے کچھ زیادہ رقبے میں پھیل گئیں جو ۵۰۰ فٹ چوڑی اور سو فٹ اونچی تھیں۔ ان کشتیوں کو نیوی کے انجینیروں نے تیار نہیں کیا تھا۔ بلکہ ہمارے اپنے آدمیوں نے ہی اپنے کارخانوں کے اندر دوسری چیزوں کی طرح اس نئی چیز کو بھی اپنے مال تیار کرنے کے معمولی اصولوں پر چل کر بنایا تھا۔

جب صلح ہو گئی تو ہم نے فوراً یہ جنگ کا سامان بنانا بند کر دیا۔ اور پھر اپنی وہی پرانی چیزیں بنانے لگ پڑے

... ...

ایک لائق آدمی وہ ہوتا ہے جو کام کر کے دکھا سکے اور اس کے کام کرنے کی لیاقت اس بات پر منحصر ہے کہ اس کے اندر ہنر کتنا ہے۔ اور اس کے ہنر کا اندازہ اس بات سے لگے گا کہ اس نے آج تک سیکھا کیا ہے۔ اور اپنا ہنر بڑھانے کے لئے اور اس کو سنوارنے اور ضابطہ میں لانے کے لئے اس نے کتنی کوشش کی ہے۔

ایک علم دار آدمی وہ نہیں کہلاتا جس کا حافظہ اتنا تیز ہو کہ اس کو ملکوں کی پچھلی لڑائیوں اور بادشاہوں کی حکومتوں کی تاریخیں خوب یاد ہوں۔ بلکہ اصل میں وہ ہے جو کام سچ مچ کر کے دکھلائے ایک آدمی نے کالج میں پڑھ کر خواہ کتنی ہی ڈگریاں حاصل کیوں نہ کر لی ہوں لیکن اگر اس کے اندر سوچنے سمجھنے کا مادہ پیدا نہیں ہوا تو وہ علم دار نہیں بن سکتا۔ دنیا میں سب سے مشکل کام سوچنے سمجھنے کا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں دماغ سے ٹھیک طور پر کام کرنے والے اتنے تھوڑے آدمی موجود ہیں مگر اس اصول کے دونوں سروں پر بڑے گڑھے ہیں جن سے بچنے کی ضرورت ہے۔ ایک ہے ہر ایک قسم کی تعلیم کو نفرت کی نظر سے دیکھنا۔ اور دوسری طرف گڑھا ہے۔ یہ دیہاتی اور نامعقول فرضی خیال کہ سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے سے جہالت کا اندھیرا بالکل دور ہو جائیگا

اور سوسائٹی کے درمیانے درجے کے لوگ بھی اسے حاصل کر کے خوب مالدار بن جائیں گے کوئی سکول
یا کالج کسی شخص کو یہ تعلیم کبھی نہیں دے سکتا۔ کہ دنیا میں اگلے سال کیا ہوگا۔ لیکن ان میں داخل ہو کر ہم
صرف تھوڑی سی ایسی چیزوں کا ضرور علم ہو سکتا ہے جن کو ہم سے پہلے دنیا نے کرنے کی کوشش کی تھی
اور ان میں کتنی کامیابی ہوئی اور کہاں کہاں یہ تجربے ناکامیاب ہوئے۔ اگر اس تعلیم کا منشا یہ ہو کہ ایک
نوجوان طالب علم کو ان چند چھوٹے اور نکمّے اصولوں کی واقفیت ہو جائے جن پر چلنے کی آدمیوں نے
پیچھے کوشش کی تھی۔ اور وہ ناکامیاب ہوئے تھے تاکہ اس کو خود اپنے تلخ تجربوں کے ذریعے ان پر
اپنا وقت ضائع نہ کرنا پڑے تو سچ مچ یہ ایک بہت ہی اچھی چیز ہے۔ جو تعلیم ہم کو گزرے ہوئے زمانہ
کی ناکامیوں اور جھوٹے اصولوں سے خبردار کرتی ہے وہ واقعی بہت مفید ہے۔ مگر بہت سے
پروفیسروں کے من گھڑنت اور خیالی اصولوں کو سیکھ لینا اصلی تعلیم نہیں ہے۔ بغیر تجربہ کئے خیالی
اصول گھڑتے رہنا واقعی بڑا دلچسپ ہے۔ اور کبھی کبھی اس سے فائدہ بھی ہو جاتا ہے۔ مگر اصلی معنوں
میں یہ تعلیم نہیں۔ مثال کے طور پر آج کل جو سکول اور کالجوں میں سائنس پڑھائی جاتی ہے وہ یہ
ہے کہ طالب علموں کو سیکڑوں ایسی فرضی باتیں اور قاعدے اس کی نسبت بتائے جاتے ہیں جنکو
تجربے سے ثابت کر کے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ اور مزا یہ ہے کہ جو ان کو نہیں جانتا اس کو کہا
جاتا ہے کہ یہ ان پڑھ ہے یا انجان ہے۔ یا اسی طرح کا کسے کوئی اور نام دے دیا جاتا ہے۔ اگر
گھر بیٹھے خیالی پلاؤ پکانے کا نام ہی تعلیم ہے تو پھر ایک آدمی بڑے مزے کے ساتھ اپنے دل سے
اٹکل پچو باتیں گھڑ کر کیوں نہیں علم دار بن سکتا۔ اور اسی اصول پر چل کر وہ ساری دنیا کو انجان کہہ سکتا
ہے۔ کیونکہ دنیا کو اس کی اٹکل پچو باتوں کا علم نہیں۔ مگر سب سے بڑھیا تعلیم ایک انسان کیواسطے
وہ ہے جو اس کو اپنی طاقتوں اور لیاقتوں سے خبردار کرتی ہے۔ اور اس کو سکھاتی ہے کہ قدرت
نے جو طاقتیں اور لیاقتیں اس کو بخشی ہیں ان کو وہ کسی طرح سے پورے طور پر استعمال کر سکتا ہے
اور کسی طرح سے وہ اپنے دماغ سے کام لے کر پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کالج میں تعلیم حاصل کرنے
کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو سکتا ہے کہ آدمی وہاں رہ کر اپنے دماغ کو ٹھیک طور پر استعمال کرنا سیکھے
اور جہاں وہ اپنی دماغی قوتوں کو بڑھاوے اور جو کام کرنے کے وہ قابل ہو اس کو کرنے کی اہلیت

اندر اور بھی طاقت مضبوط ہو۔ مگر جیسا کہ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والا ہر ایک انسان جانتا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ صرف کالجوں کے اندر ہی رہ کر ایک آدمی کی دماغی قوت ترقی کر سکتی ہے۔ ایک آدمی کی اصلی تعلیم اُس وقت شروع ہوئی ہے جب وہ سکول سے نکل کر زندگی کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ زندگی کی مصیبتوں کو جھیل کر اور مشکلوں سے ٹکر لے کر ہی ایک انسان کو سچی تعلیم حاصل ہوتی ہے۔

علم کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ اور ایک وقت میں کون سے علم کی سب سے زیادہ قدر ہے۔ اس کا فیصلہ اس بات پر منحصر ہے۔ کہ ایک آدمی زمانے میں اور کس جگہ میں اور کونسی سوسائٹی کے اندر پیدا ہوا ہے۔ اور اُس وقت کونسے علم کا سب سے زیادہ رواج تھا۔ دوسری ہر چیزوں کی طرح علم کے بھی بہت سے رواج ہیں۔ جب ہم میں سے کئی چھوٹے چھوٹے بچے تھے اُس وقت صرف بائبل کو جان لینا ہی پورا علم کہلاتا تھا۔ ہمارے بڑوں میں چند ایسے آدمی تھے جن کو ساری بائبل منہ زبانی یاد تھی اور اس لئے لوگ اُنہیں بہت بڑا آدمی سمجھتے اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اُس زمانے میں بائبل کی تعلیم کو جاننے والے کی بہت بھاری قدر تھی۔ لیکن اس زمانے میں آج یہ کہنا مشکل ہے کہ جس کو اب بائبل کی پوری پوری واقفیت ہے۔ اُس کو صرف اس وجہ سے کوئی علم دار کہے گا یا نہیں۔

میرے خیال میں علم کی تعریف ایک ایسی چیز ہے جس کو پہلے کسی لائق شخص نے محنت کر کے حاصل کیا ہو اور پھر اس کو ایک ایسی شکل میں بنا کر آگے آنے والی نسلوں کے لئے رکھ گیا ہو۔ جسے ہر آدمی جو اس کے لئے ارادہ کرے۔ کوشش کر کے سیکھ سکتا ہو۔ دنیا کے اندر اگر ایک آدمی پورے جسم دل اور دماغ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور اگر بھگوان نے اُسے یہ عقل بخشی ہے کہ وہ ان اوزاروں کو درست طور پر استعمال کر سکے جن کو ہم پڑھنے یا لکھنے میں کتابوں کے نام سے پکارتے ہیں۔ تو دنیا کے تختے پر کوئی ایسا علم نہیں جس کو اگر وہ چاہے تو حاصل نہ کر سکتا ہو۔ آج تک انسانی دماغ نے جو کچھ سیکھا ہے اگر وہ سب باتیں آج ہر ایک آدمی کو نہیں آتیں۔ تو اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ کسی شخص نے بھی یہ سب باتیں جاننا ضروری خیال نہیں کیا۔ جو باتیں کسی دوسرے نے دریافت کی ہوئی

ہوتی ہیں۔ اُن کو اپنے دماغ میں ٹھونسنے کی بجائے لوگ یہ زیادہ پسند کرتے ہیں کہ وہ اپنے دماغ سے خود چیزیں دریافت کر کے نکالیں۔ یہ ممکن ہے کہ تم اِدھر اُدھر گھوم کر اپنی ساری زندگی علم حاصل کرنے میں ہی خرچ کر دو۔ لیکن پھر بھی جتنا تمہارا علم ہو موجودہ زمانے میں تمہارے بڑھنے اور چمکنے کیلئے بالکل ناکافی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارے دماغ میں پچھلے زمانے کی باتیں ٹھسا ٹھس بھری ہوئی ہوں اور تمہارے دماغ میں یہ اتنی بھر جائیں کہ ان کے سوائے وہاں اور کچھ بھی نہ رہے۔ مطلب یہ ہے کہ بہت سی چیزوں کو جان لینا اور دماغ میں بہت سی باتوں کو بھر لینا دماغی ترقی سے بالکل ایک علٰحدہ چیز ہے۔ ممکن ہے کہ ایک آدمی بہت علم دار ہو اور پھر بھی گدھا ہو۔ اور اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ ایک آدمی اَن پڑھ ہو۔ اور پھر بھی بہت علم دار ہو۔

تعلیم کا یہ منشا نہیں ہے کہ ایک آدمی کا دماغ بہت طرح کی باتوں سے خوب بھر دیا جائے بلکہ اس کا اصلی مطلب یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان کو سوچنے اور سمجھنے میں اپنا دماغ ٹھیک طور پر استعمال کرنے کی عقل آجائے۔ بہت بار یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر ایک آدمی نے بہت سی پہلے کتابیں پڑھی ہوئی نہ ہوں تو وہ ایک معاملہ پر کہیں زیادہ بہتر سوچ سکتا ہے۔

عام طور پر انسان کے اندر یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ جس چیز کو آج تک کسی نے نہ حاصل کیا ہو یا سیکھا ہو۔ وہ جھٹ سے یہ مان لیتا ہے کہ وہ چیز اور بھی کوئی بنا نہیں سکتا۔ لیکن میری خیال میں اب تو ہر شخص کو اچھی طرح سے پتہ لگ گیا ہوگا کہ انسان نے آج تک کھوج کر جو علم حاصل کیا ہے وہ آئندہ اور نیا علم حاصل کرنے کے راستہ میں ہرگز کبھی رُکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ انسان کا علم کبھی اتنا نہیں بڑھا کہ کوئی یہ کہہ سکے کہ آئندہ اس میں اور ترقی نہیں ہوسکتی۔ ابھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کو ہمیں سیکھنے کی ضرورت ہے۔

ترقی کو روکنے کا یہ اچھا طریقہ ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی کے دماغ میں پچھلی کتابوں کا علم ٹھسا ٹھس بھر دیا جائے تب وہ یہ محسوس کرنے لگ پڑے گا کہ اب میں پورا علم دار بن گیا ہوں۔ اور مجھے اور زیادہ سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایک انسان کے لئے اس طرح سے صرف علم دماغ میں بھرتے جانے سے بڑھ کر اور کوئی نکما کام نہیں ہوسکتا۔ اصل تعلیم کی پہچان یہ ہے کہ تم دُنیا سے دُکھ اور غریبی کو دور

نے اور دُنیا کے زخموں پر مرہم پٹی کرنے میں کتنی مدد کر سکتے ہیں۔ اگر ایک آدمی صرف اپنا ہی پیٹ کچھ سیکھ کر بھر سکتا ہے۔ تو پھر بھی وہ اکیلا ہی ہے۔ مگر اگر وہ دس سو یا ہزار آدمیوں کے پیٹ بھرنے کا کچھ سلسلہ بنا سکتا ہے۔ تو اُس کا شمار ایک میں نہیں بلکہ بہتیروں میں ہوگا۔ ممکن ہے کہ بہت سی باتوں کی نسبت جو کہ کتابوں میں درج ہیں اُس کا علم بوسیدہ اور پُرانا ہو گیا ہو۔ لیکن پھر بھی وہ اس کے باوجود ایک علم دار آدمی کہلائے گا۔ جب ایک انسان کو اپنے کام یا لائن کی خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ پورے طور سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اُس نے بی۔ اے۔ یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ سچ مچ اَب اُس کی گنتی سمجھدار آدمیوں میں ہوا کرے گی۔

... ...

ہم نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں یہودی قوم کی نسبت کچھ خیال ظاہر کیے ہیں۔ اور جن کا ہمارے دُشمنوں نے یہودیوں پر دھاوا یہودی لڑائی یا یہودی قوم کے خلاف زہر وغیرہ وغیرہ نام رکھے ہیں۔ مگر جس شخص نے اس کتاب کو غور سے پڑھا ہے اُس کو اس کے متعلق کچھ اور زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اس کتاب کو لکھنے میں جو ہماری نیت تھی اور منشا تھا وہ اس کے پڑھنے سے بالکل صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ ہم نے اس کتاب میں ایک ایسے سوال پر بحث کی ہے جس کا ہمارے ملک پر گہرا اثر ہے جس کی تہہ میں نسلی فرق کام کرتا ہے اور جس کا تعلق ایک خاص قوم کے لوگوں کی بجائے دھرم کے اونچے اصولوں کے ساتھ زیادہ ہے۔ اس کتاب کے اندر جو کچھ ہم نے لکھا ہے اُس کی سچائی کا اندازہ صرف وہ صاف دل سے پڑھنے والے ہی لگا سکیں گے جو اس کے مضمون اپنی زندگی کے تجربوں کی کسوٹی پر لگا کر جانچ کریں گے۔ اگر ہماری تحریر اور اُن کے زندگی کے تجربے مل جاتے ہیں تو ماننا پڑے گا۔ کہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ سچ ہے۔ لیکن ہمارے بیانوں کو بے بنیاد اور غیر معقول ثابت کیے بغیر ہم کو گالیاں شروع کر دینا پرلے سرے کی حماقت ہے۔ سب سے پہلے دیکھنا یہ چاہیئے کہ ہمارے بیانوں کے اندر سچائی کتنی ہے۔ مگر ہمارے نکتہ چیں سب سے زیادہ اسی بات سے گھبراتے ہیں۔

ہماری کتاب کے مضمون کو پڑھنے والے فوراً یہ سمجھ جائیں گے کہ ان کو لکھنے میں ہم نے بالکل

کسی طرفداری سے کام نہیں لیا۔ البتہ جن اصول پر چل کر ہماری یہ موجودہ تہذیب کھڑی ہوئی ہے اُس کی حمایت میں ہم نے اپنی قلم ضرور چلائی ہے۔ کچھ عرصے سے ہمارے ملک کے اندر ایک ایسی ہوا چل پڑی تھی جس کی وجہ سے ہمارے لٹریچر کے اندر کچھ خرابی آگئی تھی۔ کھیل تماشاؤں میں کچھ بے حیائی داخل ہوگئی تھی۔ اور لوگ آپس میں ضرورت سے زیادہ آزاد ہوکر ملنے جُلنے لگ پڑے تھے۔ کاروبار کے اندر سے پُرانے وقتوں کی ایمانداری اور نیک نیتی خارج ہو چکی تھی۔ غرضیکہ ہر چیز اور کام کے اندر تھوڑی بہت خرابی یا بُرائی ایک طرح سے پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ قدرت نے گوری قوم کو اُجڈ پیدا کیا ہے۔ اور اس لئے اس میں شیکسپیئر کے ڈراموں کے ایکٹروں کی طرح وحشی پن آگیا ہے۔ بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ کسی چور راستے سے کالے رنگ کی قوم کے بیہودہ طریقے ہماری بات چیت اور تحریر بلکہ ہر کام میں کسی نہ کسی طرح سے داخل ہوگئے ہیں۔ اور انہوں نے ہماری ہر چیز کو اتنا گھیر لیا کہ اب ان کے خلاف آواز اُٹھانے کی سخت ضرورت تھی۔ اس زہر کے اثر کو دور کرنے کی نہ صرف ہمیں کوشش کرنی چاہیئے۔ بلکہ جس قوم نے یہ زہر پھیلایا ہے۔ اُس کے سمجھدار آدمیوں کو بھی اس کے ہٹانے کی زبردست کوشش کرنی چاہیئے۔ پرمیشور کا یہ لاکھ لاکھ شکر ہے اور کالے رنگ کے عقلمند لوگوں کی تعریف کرنی چاہیئے۔ کہ انہوں نے امریکہ کی برائیوں کے ساتھ اس زہر کو نہ ملنے دینے کے لئے بھاری قدم اُٹھایا ہے۔ مگر زیادہ مالدار اور علم دار ہو جانے کی وجہ سے عیسائی لوگوں میں جو یہ پُرانا اور ناکارہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ ہم دوسری قوموں سے اونچے ہیں اس کو دور کرنے کی ابھی بہت ضرورت ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ ہم نے اس کتاب میں لکھا ہے وہ امریکہ میں یہودیوں کے سوال پر آخری فیصلہ ہے۔ اور کہ اُس کا ایک لفظ بھی غلط نہیں۔ کتاب کو لکھتے وقت اس سوال کا جو اثر ہم نے ملک پر دیکھتے تھے صرف وہی اس میں ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن جب یہ اثر نہیں رہا اور اس میں کچھ تبدیلی آگئی تو اس کی نسبت ہماری رپورٹ میں بھی ضرور فرق پڑنا چاہیئے۔ اس لئے اس وقت اس سوال کا فیصلہ یہودیوں کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ اگر وہ اتنے سمجھدار رہیں جتنا کہ وہ اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں تو وہ امریکہ کے لوگوں کو یہودی بنانے کی بجائے یہودیوں کو امریکہ کا باشندہ بنانے کی

کوشش کریں گے۔ خدا نے یونائیٹڈ اسٹیٹ کو عیسائی دھرم کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور یہ آخر تک عیسائی ہی رہے گا۔ مگر اس میں نسلی فرق کا کوئی سوال نہیں بلکہ اس کی تہہ میں ایک ایسا بنیادی اصول کام کرتا ہے جس کا دوسرے مذہب کے اصولوں سے یہ فرق ہے کہ اس پر چل کر نیکی اور شرافت کے ساتھ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا ایک آدمی کے لئے زیادہ موقع ہے اور یہ سوسائٹی کے لئے کچھ ایسے فائدے اور طریقے باندھ دیتا ہے جن کا تعلق انسانی حقوق اور ذمہ داریوں کی نسبت عیسائی ملت کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہے

کسی خاص قسم کے لوگوں سے نفرت کرنا یا دشمنی رکھنا یہ امریکہ کے لوگوں کی خصلت نہیں۔ نہ یہ عیسائی دھرم کا اصول ہے۔ ہم صرف ایسے اصولوں، جھوٹے اصولوں کے خلاف ہیں جن کی وجہ سے لوگ نیکی اور شرافت سے دور ہٹتے چلے جا رہے ہیں۔ اس بات کا بڑا آسانی کے ساتھ پتہ چل سکتا ہے کہ یہ جھوٹے اصول کہاں سے نکلتے ہیں اور ان کے طریقے دریافت کر لینا کوئی بڑی مشکل بات نہیں اس لئے جب ان کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے تو یہ ختم ہو جاتے ہیں۔ ہم نے بھی صرف یہی بھانڈا پھوڑنے کا طریقہ استعمال کیا ہے۔ جب لوگ یہ دیکھ لیں گے کہ ان برائیوں کی جڑ کہاں ہے اور کیا ہے تو پھر وہ دھوکا نہیں کھا سکتے۔ کاش کہ امریکہ کے لوگ ایک بار یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس وقت ہمارے اندر جو خرابی پیدا ہو گئی ہے وہ قدرتی گراوٹ کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ زبردستی ہمیں الٹے راستے پر دھکیل کر لے جایا جا رہا ہے۔ تو پھر ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ جب بیماری کا پتہ لگ جائے تو بیمار کو لازمی طور پر صحت ہو جاتی ہے۔

ہم نے یہ کتاب کسی برے خیال سے یا کسی پر حملہ کرنے کی نیت سے نہیں لکھی جب ہم نے یہ دیکھا کہ اس معاملے کی نسبت امریکہ کے لوگوں کو کافی علم ہو گیا ہے اور اب وہ اس کا فیصلہ خود کر سکتے ہیں۔ تو ہم چپ ہو گئے۔ ہمارے دشمن یہ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ کام بدلہ لینے کی غرض سے شروع کیا تھا اور بعد میں ڈر کر ہم چپ ہو گئے۔ وقت آنے پر خود پتہ چل جائیگا کہ ہمارے نکتہ چین صاف صاف میدان میں اس لئے نہیں اترتے کیونکہ وہ اصلی سوال پر بحث کرنے سے کتراتے ہیں۔ وقت آنے پر یہ بھی ظاہر ہو جائیگا کہ ہم ان لوگوں کی نسبت یہودیوں کے زیادہ گہرے دوست ہیں جو منہ پر انکی تعریف کرتے ہیں۔ اور انکی پیٹھ پیچھے چغلی کرتے ہیں۔

بیان ۱۰

جمہوری گورنمنٹ اور صنعت

شاید آج کل کسی لفظ کی اتنی مٹی پلید نہیں ہوتی جتنی کہ لفظ "جمہوری گورنمنٹ" کی۔ اور میرے خیال میں جو سب سے زیادہ اس کا ڈھول پیٹتے ہیں اصل میں سب سے کم وہی اس کو چاہتے ہیں مجھے ہمیشہ ایسے آدمیوں سے کھٹکا لگا رہتا ہے جو جمہوری گورنمنٹ کی بابت چکنی چپڑی باتیں کیا کرتے ہیں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ یا تو ایسے آدمی اپنے لئے کسی خاص قسم کی ایک خود مختاری حاصل کرنا چاہتے ہیں یا وہ حکومت کی باگ ڈور کسی ایسے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں جو اُن کے لئے وہ کام کر دے جو اُنہیں خود کرنا چاہیئے تھا۔ میں ایک ایسی جمہوری گورنمنٹ قائم کرنا چاہتا ہوں جس کے اندر ہر شخص کو اُس کی لیاقت کے مطابق کام کرنے اور کمانے کا ایک جیسا موقع مل سکے۔ میری رائے میں اگر ہم خلقت کی خدمت کرنے کی طرف زیادہ توجہ دیں تو ہمیں اس بات کی خاص پرواہ نہ رہے گی کہ ملک میں حکومت چل رہی ہے اور ہمیں تب زیادہ اُن کاموں کی فکر ہو گی جو کرنے والے ہیں۔ اگر خلقت کی خدمت کرنا ہی ہمارا اصول بن جائے تو پھر ہمیں صنعت یا زندگی میں نیکی اور محبت بڑھانے۔ لوگوں کا بھلا کرنے، دکانوں کو کھولنے اور بند کرانے کیلئے قاعدے بنانے کے واسطے اور اسی طرح کے دیگر معاملوں کی نسبت جن کا اصل میں ہماری زندگی کے ساتھ کچھ تعلق نہیں انتظام

کرنے کی ہمیں بالکل ضرورت نہ رہے گی۔ تب ہم ہر معاملے کی تہہ کو پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اور اسی بات کی ہمیں اس وقت سخت ضرورت ہے کہ ہمیں ہر بات کی اصلیت کا پتہ لگے۔

ایک آدمی کے دل کو دھکا لگتا ہے جب اُس پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ دُنیا میں سارے انسان نہیں یعنی دُنیا میں ساری قومیں اپنے سے دوسری قوموں کے لوگوں کو ہمدردی کی نگاہ سے نہیں دیکھتیں۔ اس بات کو ظاہر کرنے کی بہت کوششیں کی گئی ہیں کہ یہ کمزوری یا نقص کسی ایک خاص فرقہ میں ہی صرف پایا جاتا ہے۔ لیکن اصل میں یہ سب ہی فرقوں یا سوسائٹی کے "طبقوں" میں موجود ہے۔ کیونکہ یہ فرقہ بندی یا طبقہ کا خیال محض فرضی ہے۔ ایک زمانہ تھا جس وقت لوگوں کو یہ یقین دلانے کے لئے بڑے زور شور سے یہ پروپیگنڈا لگاتار کیا جاتا تھا کہ صرف امیر لوگ ہی بیدرد ہوتے ہیں۔ اُس وقت عام رائے لوگوں کی یہ ہو گئی تھی کہ غریب لوگ بڑے ہمدرد اور نیک ہوتے ہیں۔

لیکن دُنیا کے اندر "امیروں" اور "غریبوں" کی تعداد بہت ہی تھوڑی ہے اور سوسائٹی ان دو جماعتوں میں ساری تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ ان دو جماعتوں کو کام کرنے کے لئے سوسائٹی کے اندر اتنے "امیر" اور "غریب" آدمی موجود نہیں ہیں۔ کئی امیر غریب بن گئے مگر اُن کی خلقت نہیں بدلی۔ اسی طرح بہت سے غریب آدمی امیر ہو گئے لیکن پھر بھی اس سے اُن کی طبیعت پر کچھ اثر نہیں پڑا۔

سوسائٹی کے اندر امیر اور غریب لوگوں کے درمیان بھاری تعداد میں ایسے آدمیوں کا ایک طبقہ ہے جو امیر ہیں نہ غریب۔ اگر ایک ایسی سوسائٹی بنائی جائے جس کے ممبر صرف لکھ پتی لوگ ہی ہوں تو اُس کی حالت ہماری موجودہ سوسائٹی سے مختلف نہیں ہوگی۔ کیونکہ کچھ لکھ پتیوں کو اناج پیدا کرنا پڑے گا۔ اور روٹی پکانی پڑے گی باقی کچھ مشینیں بنائیں گے، کارخانے جاری کریں گے اور دوسرے ریل گاڑیاں چلائیں گے وغیرہ وغیرہ ورنہ وہ تمام بھوکے مر جائیں گے کسی نہ کسی کو یہ سب کام کرنے ہی ہوں گے۔

اصل میں ہماری سوسائٹی کے اندر کوئی خاص "جماعتیں" نہیں، دو طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کام کرنے والے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو کام نہیں کرتے۔ سوسائٹی کے اندر اکثر بہت سی "جماعتوں" کا ذکر ہوتا رہتا ہے جن کا اصل میں کوئی نام و نشان نہیں۔ مثال کے طور پر

سرمایہ داروں کے کچھ اخباروں کو لو۔ ان میں مزدور جماعت کی نسبت کئی ایسے بیان چھپتے رہتے ہیں
جنہیں پڑھ کر منہ میں اُنگلی لینی پڑتی ہے۔ ہم بھی کبھی مزدور تھے۔ اور آج بھی ان سے الگ نہیں۔ اسی
لئے ہم جانتے ہیں کہ یہ سب الزام جھوٹے ہیں۔ یہی حال مزدور جماعت کے چند اخباروں کا ہے
ان میں سرمایہ داروں کے خلاف ایسی ایسی باتیں لکھی ہوئی ملیں گی کہ آدمی پڑھ کر حیران رہ جاتا ہے
لیکن دونوں طرف سے جو باتیں کہی جاتی ہیں اُن میں تھوڑی بہت سچائی ضرور ہے۔ جو آدمی
سر سے لے کر پاؤں تک سرمایہ دار ہے اور اس کے سوائے کچھ نہیں۔ جو دوسرے لوگوں کے
گاڑھے پسینہ کی کمائی پر گلچھرّے اُڑا رہا ہے۔ اس کے خلاف جتنا بھی کہا جائے تھوڑا ہے۔ وہ
کسی حالت میں بھی اُس کام جوئے باز سے بہتر نہیں۔ جو کاریگروں اور مزدوروں کو طرح طرح کے
سبز باغ دکھا کر ان کی جیب سے ان کی تنخواہ کے پیسے نکلوا کر جوا کھیلتا ہے۔ سرمایہ داروں کی اخباروں
میں مزدوروں اور کاریگروں کے خلاف جو مضمون نکلتے ہیں۔ وہ کسی بڑے کارخانوں کی منیجروں
کے قلم کے لکھے ہوئے نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کے لکھنے والے چند ایسے آدمی ہیں۔ جو اسی کام کی تنخواہ
پاتے ہیں۔ اور اس لئے وہ صرف وہی باتیں لکھتے رہتے ہیں۔ جن کو پڑھ کر وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے
مالک خوش ہوں گے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں صرف اپنے مالکوں کو خوش کرنے کے خیال سے لکھتے
اگر مزدور لوگوں کے اخباروں کو اُٹھا کر دیکھو تو ان میں لکھنے والوں کی ایک ایسی جماعت ملے گی۔ جو
اسی طرح سے مزدوروں کے دلوں میں سرمایہ داروں کے خلاف بیٹھے ہوئے نفرت کے جذبوں کو
بھڑکاتے ہیں۔ یہ دونوں قسم کے لکھنے والے صرف پروپیگنڈا کرنے والے ہیں اور جس پروپیگنڈا سے
لوگوں کی سچی بات کا پتہ نہیں چلتا وہ آخرکار ایک دن اپنے آپ تباہ ہو جاتا ہے اور ہونا بھی ایسا
چاہیے۔ اگر تم لوگوں کو دیش بھگتی کا اُپدیش اس لئے دیتے ہو۔ کہ تم تو اُن کے تن سے کپڑے اُتروا کر
چھینتے رہو اور وہ خاموش کھڑے تمہارا منہ تکتے رہیں تو تمہارا یہ پاکھنڈ بہت دیر تک نہیں چل سکتا
بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم لوگوں کو تو یہ اُپدیش دو۔ کہ خوب دل لگا کر کام کرو اور مال زیادہ سے
زیادہ تعداد میں تیار کرو تاکہ اس کی آڑ میں بیٹھ کر خود خوب نفع کما سکو۔ اسی طرح کاریگر بھی محض زبانی جمع
خرچ سے کام کئے بغیر بہت دیر تک اپنے مالک کی نوکری پر نہیں رہ سکتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کارخانہ داروں کو چند ایک ایسی باتوں کا پتہ ہے جن کا ملازموں کے لئے جاننا اس لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے مالکوں کی نسبت ٹھیک رائے قائم کرسکیں اور درست طور پر فیصلہ کرسکیں۔ اسی طرح اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ملازموں کو چند ایک ایسی باتوں کی خبر ہے جن کا کہ مالکوں کو جاننا بہت ضروری ہے لیکن حالت یہ ہے کہ سچ پوچھو تو دونوں میں کسی طرف کو بھی پورے حال کی واقفیت نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اگر کبھی کوئی پروپیگنڈا کامیاب ہوسکتا ہے تو اس نقص کے سبب فیل ہو جاتا ہے۔ جہاں پر سوسائٹی کے اندر دو جماعتوں کے درمیان بالکل الگ الگ خیال ہوں وہاں یہ بالکل نامناسب بات ہے کہ ایک کے اصول اور قاعدے دوسرے سے زبردستی منوائے جائیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں جو خیال بیٹھے ہوئے ہیں ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے اور پھر ان سے تجویزیں نکالی جائیں۔

مثال کے طور پر مزدور سبھا کے معاملے اور ہڑتال کرنے کے حق پر غور کرو۔ ملک میں مزدور سبھا کے صرف انہیں آدمیوں کی مضبوط ٹولی ہے جن کو ایسی سبھاؤں سے بڑی بڑی تنخواہیں مل رہی ہیں۔ ان میں سے چند تو بہت امیر ہوگئے ہیں اور کئی ایک نے اپنا اختیار اتنا بڑھا لیا ہے کہ وہ سرکار کے بڑے بڑے مالی محکموں میں بھی اپنا دخل جمانے لگے ہیں۔ باقی کر اتنے کنزرویٹو سوشلسٹ ہیں کہ ان کے خیال بہت کچھ بولشوزم اور انارکی سے ملتے جلتے ہیں لیکن چونکہ ان کو ان سبھاؤں سے اچھی تنخواہیں مل رہی ہیں اس لئے انہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور اسی لئے وہ اس قسم کے تباہ کرنے والے پروپیگنڈا میں اپنا سارا وقت خرچ کرسکتے ہیں۔ ملک میں ان سب نے اپنے لئے کافی رسوخ اور اختیار اس وجہ سے پیدا کرلیا ہے ورنہ اگر دوسرے لوگوں کی طرح انہیں بھی زندگی کی تکلیفیں اور مشکلیں جھیل کر روپیہ کمانے پڑتے تو میاں جی کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔

اگر ان مزدور سبھاؤں کا سرکاری عملہ بھی ایسا ہی مضبوط، ایماندار، شریف اور سمجھدار ہوتا جیسا کہ ان سبھاؤں کے باقی ممبر لوگ ہیں تو پچھلے چند سالوں میں اس ہل چل کی بالکل ہی شکل اور شکل بدل کر ہو جاتی۔ مگر دو چار اچھے آدمیوں کو چھوڑ کر اس سرکاری عملہ کے اندر کسی میں وہ

خوبیاں موجود نہیں جو کہ عام طور پر ایک درمیانہ درجہ کے کاریگر میں پائی جاتی ہیں بلکہ اس
علمہ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ کاریگروں اور مزدوروں کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ
اُٹھالیں، اور خاص کر باہر سے آئے ہوئے کاریگروں اور مزدوروں کا جن کو ابھی تک امریکہ کے
لوگوں کی اصلی خصلت کا پتہ نہیں لگا اور جن کو نہ ہی کبھی لگ سکے گا اگر وہ اسی طرح سے اپنے مزدور
سبھاؤں کے لیڈروں کے مایا جال سے باہر نہیں نکلیں گے۔

کچھ ایسے بھی کاریگر اور مزدور پائے جاتے ہیں جن کے سر پر "دھڑا بندی کی لڑائی" کا
بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اور جن کے دماغ میں یہ خیال پختہ طور پر بیٹھ گیا ہے کہ انڈسٹری یعنی کارخانوں
میں جتنی زیادہ بدامنی پھیلے گی اتنی ہی ہماری اور ترقی ہوگی یعنی اُنہوں نے یہ اصول پکڑ لیا ہے کہ
جب تمہیں چھتیس روپے روز کی تنخواہ ملنے لگے تو اس پر خاموش ہو کر مت بیٹھ جاؤ بلکہ تب
بیالیس روپیہ روز تنخواہ پانے کے لئے واویلا مچانا شروع کردو جب کام کرنے کے لئے تمہارا دن
آٹھ گھنٹہ کا مقرر ہو جائے تو ایک بے وقوف کی طرح اتنے سے ہی خوش ہو کر چپ نہ رہو بلکہ تب
یہ شور مچانا شروع کردو کہ دن آٹھ گھنٹے کے بجائے چھ گھنٹے کا مقرر ہونا چاہئے۔ مطلب یہ کہ
کچھ نہ کچھ چھیڑ چھاڑ ہونی چاہئے۔ اور سدا لگی رہنی چاہئے۔ ان کم سمجھ لوگوں کو چھوڑ کر باقی سبھی کاریگر
اتنی عقل رکھتے ہیں کہ اُن کی حالت آزمائے ہوئے اچھے اصولوں پر چل کر ہی بہتر ہو سکتی ہے لیکن
ان سبھاؤں کے لیڈروں کے دماغ میں یہ بات نہیں گھستی وہ چاہتے ہیں کہ ہمیشہ ملک کے اندر
یہی حالتیں رہیں یعنی بے انصافی ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکانا۔ ہڑتالیں۔ نفرت۔ اور
دشمنی وغیرہ وغیرہ تاکہ لوگ کبھی اوپر نہ اٹھ سکیں ورنہ ان سبھاؤں کے اہلکاروں کی ضرورت ہی
کیا رہے گی۔ پہلے وہ خود ایک ہڑتال کرانے کا ایک سامان پیدا کر دیتے ہیں اور پھر لوگوں کو دکھا
کہتے پھرتے ہیں کہ دیکھا تمہیں ہماری کتنی ضرورت ہے!"

مزدوروں کا سچا لیڈر وہ ہے جو اُن کو زیادہ کام کرنے اور زیادہ تنخواہ پانے کا راستہ دکھاتا ہے
نہ کہ وہ شخص جو اُن سے ہڑتالیں کرواتا ہے اور کارخانوں کے ضروری اور چلتے کاموں میں اُن کے ذریعہ
رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ اور اس طریقہ سے آخرکار ایک دن مزدوروں کی یہ حالت کرا دیتا ہے کہ

کے مرنے لگتے ہیں۔ آنے والے زمانے میں مزدوروں کی صرف وہی سبھا ملک کے اندر زندہ
سکے گی جس کو کارخانہ داروں اور مزدوروں دونوں کی بھلائی کا خیال ہو اور جس کا منشا یہ ہو کہ
خلقت کی خدمت کر کے اپنے آپ کو دُنیا کے اندر مفید اور لائق ثابت کر سکے۔

دنیا کے اندر ایک تبدیلی آ رہی ہے جب ان مزدور سبھاؤں کے نمائشی لیڈروں کے گروہ کا
خاتمہ ہو گا تو اُس کے ساتھ ساتھ ایسے اُجڈ کارخانہ داروں کے گروہ کا بھی خاتمہ ہو جائے گا جنھوں نے
اپنے ملازموں کی بھلائی کے واسطے کوئی چھوٹے سے چھوٹا اچھا کام نہیں کیا جب تک کہ اس کو کرانی کے
لئے اُن کے گلے پر چھری نہیں رکھی گئی اور وہ اس کے کرنے کے لئے مجبور نہیں ہو گئے۔ بس یہ سمجھ لینا چاہئے
کہ اگر یہ اُجڈ کارخانہ دار ایک زہر ہیں تو مزدور سبھاؤں کے نمائشی خود غرض لیڈر اس زہر کو مارنے کی
دوا تھے اور جب مزدور سبھاؤں کے لیڈر خود ایسا زہر بن گئے تو گویا اس زہر کو مارنے کے لئے اُجڈ
کارخانہ دار پیدا ہو گئے۔ لیکن دونوں ہی منحوس ہیں اور ایک اچھی سوسائٹی میں دونوں کے لئے ہی بالکل
کوئی جگہ نہیں اور شکر ہے کہ دونوں ہی اکٹھے دُنیا سے غائب ہو رہے ہیں۔

آج صرف اُجڈ کارخانہ داروں کی یہ آواز سُنائی دیتی ہے کہ "اس وقت مزدوروں کے سر
کچل ڈالنے کا موقع ہے اب یہ پورے طور پر ہمارے قابو میں ہیں"۔ لیکن یہ آواز بھی "دھڑا بندی کی
لڑائی" کی آواز کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ دھیمی پڑتی جاتی ہے۔ مال تیار کرنے والوں نے یعنی ایک
سرے سے دوسرے سرے تک کارخانوں میں چھوٹے سے چھوٹے مزدور سے لے کر بڑی سے بڑی
اسامی پر کام کرنے والے کاریگروں نے مل کر اب ایک سچی سبھا اپنے لئے قائم کر لی ہے اور آئندہ
وہ اپنے سب معاملوں کا خود ہی فیصلہ کیا کریں گے۔

دیکھا جاتا ہے کہ آج ملک کے اندر بدامنی پھیلا کر لوگوں کی جیب سے پیسے ٹھگنا ایک اچھا خاصہ
بیوپار بن گیا ہے۔ یہ بیوپار اس غرض سے نہیں کیا جاتا کہ اس کے ذریعہ کسی جھگڑے یا فساد کا فیصلہ
ہو یا کوئی کام نکلے بلکہ اس کو کرنے میں نیت صرف یہ ہوتی ہے کہ ملک کے اندر بدامنی جاری رہے
اس کام کو کرنے کے لئے جو ہتھیار استعمال کئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں طرح
طرح کے فرضی خیال اور قاعدے بٹھائے جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ اس قسم کے جھوٹے وعدے

کئے جاتے ہیں جو جب تک دُنیا قائم رہے گی کبھی پورے نہیں ہوں گے۔

میں مزدور سبھاؤں کے خلاف نہیں ہیں کسی بھی ایسی سبھا کے برخلاف نہیں جس کے ہونے سے لوگوں کی ترقی ہوگی۔ لیکن جب ایک سبھا اس خیال سے قائم کی جاتی ہے خواہ وہ کارخانے کے مالکوں کی ہو یا کاریگروں کی۔ کہ مال کی تیاری پر کسی قسم کی بندش لگائی جائے تو میں اس کو برداشت نہیں کرسکتا۔

چند ایک اصول اور قاعدے ایسے ہیں جو ایک کاری گر کے لئے بہت ہی خطرناک ہیں اور جن سے اُس کو بچنے کی سخت ضرورت ہے کیونکہ ان سے اُس کی اپنی ذات کو اور اُس کے ملک کو بہت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کئی بار ایسا کہا جاتا ہے کہ جتنا تھوڑا ایک کاریگر کام کرے گا اُتنی ہی زیادہ جگہیں دوسرے کاری گروں کے کام کرنے کے لئے نکل آئیں گی۔ اس بیہودہ دلیل میں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ سُست کام کرنے سے نئی آسامیاں پیدا ہوتی ہیں لیکن کاہلی سے کبھی کوئی نئی جگہ نہیں نکلی نہ کوئی نیا کام پیدا ہوا ہے اُلٹا اس سے تو پبلک کے سر پر بوجھ زیادہ بڑھتا ہے۔ ایک محنتی آدمی کبھی بھی اپنے ساتھی کاریگر کی نوکری نہیں چھینتا بلکہ سچ پوچھو تو ایک محنتی کاریگر اپنے محنتی منیجر کا ساجھی دار ہے جو اپنے کام کو بڑھا کر نئی نئی آسامیاں اپنے دھندے میں پیدا کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ جگہیں کام کی اپنے ہاں نکالتا ہے۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ سمجھدار لوگوں کے اندر بھی یہ فضول خیال پھیل گیا ہے کہ ایک ہی نوکری یا کام کو اپنی چھاتی کے ساتھ چمٹا رکھنے سے وہ کسی دوسرے کاریگر یا آدمی کو اپنے لئے کام یا نوکری حاصل کرلینے میں مدد دیتے ہیں۔ مگر اس معاملے پر تھوڑا سا بھی غور کرنے سے پتہ چل جائے گا کہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ برکت والا بیوپار یعنی ایسا بیوپار جس میں کام کرنے والوں کے لئے عزت اور آبرو کے ساتھ کافی روپیہ کمانے اور ترقی کرنے کے روز بروز زیادہ سے زیادہ موقع نکلتے ہیں اصل میں وہ ہے جس میں ہر ایک کام کرنے والا ہر دن اپنا کام ختم کرکے اُس پر گھمنڈ کرسکے اور سب سے زیادہ مضبوط اور طاقتور وہی ملک ہے جس میں لوگ ایمانداری کے ساتھ کام کرتے ہیں اور مال تیار کرنے میں کسی طرح کی ٹھگ بازی نہیں کرتے۔ بیوپار کے سچے قانون کے ساتھ کوئی چالاکیاں نہیں کرسکتا کیونکہ یہ قانون اتنے زبردست ہیں کہ جو انہیں توڑتا ہے اس کی یہ

خوب درگت بناتے ہیں۔

اگر جس کام کو پہلے دس آدمی کرتے تھے اب صرف نو آدمیوں کے ذریعہ ہونے لگ پڑا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دسواں آدمی بیکار ہو گیا فرق اب صرف اتنا پڑے گا کہ وہ اب اس خاص کام یا دھندے پر لگا ہوا نہیں اور پبلک کو اس دھندے کیلئے اس شخص کا افزود خرچہ آئندہ برداشت نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ آخر کار ہر مال کے بنانے کا خرچ پبلک کو ہی ادا کرنا پڑتا ہے۔

جب ایک کارخانے دار اپنی زندگی کا یہ اصول بنا لیتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے کارخانے میں عقل اور لیاقت کے ساتھ ہر کام کا انتظام کرنے کی کوشش کرے گا اور وہ اتنا ایماندار ہے کہ وہ پبلک سے اپنے مال کے صرف اتنے ہی جائز دام چارج کرتا ہے جو کہ اس کے اصلی خرچ کے لحاظ سے مناسب ہوں تو ایسے کارخانہ کی ترقی ہی ترقی ہے اور اس کے اندر ہمیشہ اتنے نئے کام نکلتے رہیں گے جن میں اس دسویں آدمی کے لگے رہنے کی گنجائش ضرور ہوگی۔ جس کارخانہ کا انتظام اچھا ہوتا ہے وہ ہمیشہ پبلک کو سستا مال بیچنے کی نیت سے اپنے کاریگروں اور مزدوروں کا خرچ کم کرنے کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ کام سدا بڑھتے رہنے کی وجہ سے اس میں اس کارخانہ کی نسبت زیادہ آدمی ملازم ہوں گے جو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے اور ادھر اُدھر سے روپیہ بٹورنے کی فکر میں رہتا ہے اور جو اپنی بدانتظامی کا فضول خرچ زبردستی پبلک کی جیب سے ادا کرواتا ہے۔

یہ دسواں آدمی غیر ضروری خرچ تھا۔ آخر اس کا بوجھ مال خریدنے والے کے سر پر فضول پڑتا تھا لیکن اگر یہ آدمی اس خاص کام یا دھندے کے لئے غیر ضروری تھا۔ تو اس سے یہ مراد نہیں کہ دنیا میں اور جو اتنے کام ہیں ان میں کسی کے اندر بھی اس کی ضرورت نہیں۔ یا یہ کہ خود اسی کارخانہ کے اندر جہاں وہ یہ کام کر رہا تھا۔ اس کے لئے اور کوئی کام باقی نہیں رہا۔

کارخانوں کی بدانتظامی کا خرچ آخر کار پبلک کی جیب سے نکلتا ہے۔ آج کل دنیا کے اندر جو مشکلیں اور تکلیفیں نظر آتی ہیں ان میں سے آدھی اس وجہ سے ہیں کہ کارخانہ دار ایک کام کو ایک ہی رٹ میں آج تک کرتے چلے آئے ہیں۔ اور اس میں نئے طریقے یا ترقی کرنے کی راہیں نہیں نکالتے۔

ان کی ہمیشہ سُنار کی طرح سونے میں کھوٹ ملا کر زیور بنانے کی نیت رہتی ہے۔ اور سدا یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان کی اپنی بدانتظامی۔ نالائقی اور نکمّے مال کا خرچ پبلک کے سر سے نکلتا رہے۔ جہاں جس کام کو ایک آدمی بخوبی کرسکتا ہو۔ اور اُس کو کرنے کے دو آدمی مقرر اور تنخواہ پا رہے ہوں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ پبلک کو اُس چیز اور کام کے اصل سے دُوگنے دام ادا کرنے پڑ رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ کہ یونائیٹڈ سٹیٹ میں صرف تھوڑا ہی عرصہ ہوا۔ لڑائی میں شامل ہونے سے کچھ سال پہلے ہماری کاریگر اور مزدور عام طور پر جتنا مال تیار کرکے دینے اور کام کرنے لگ پڑے تھے۔ اُتنا آگے کوئی نہیں کرکے دیتا تھا۔

کارخانے میں کام کرنے والے کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ کہ جتنے گھنٹے روز اُس کی ڈیوٹی ہو اُتنا عرصہ وہ اپنے کام پر حاضر رہے بلکہ اُس کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس عرصہ کی جتنی اُس کو تنخواہ ملتی ہے اُس کے ہم پلّہ کا کام بھی کارخانہ کو کرکے دے۔ مگر جب اس ترازو کا کوئی سا پلڑا بھاری ہو کر جھکنے لگتا ہے یعنی دونوں صورتوں میں جبکہ یا تو کاریگر کام زیادہ کرکے دیتا ہے اور اُس کو اس کے عوض میں پورے پیسے نہیں ملتے یا جتنا وہ کام کرتا ہے اُس کے مقابلہ میں اُس کو تنخواہ زیادہ ملتی ہے تو اُس دھندے کے اندر جلد ہی سخت گڑبڑ مچ جاتی ہے اور اگر یہی حالت سارے ملک کے اندر پھیل جائے تو بیوپار کا بالکل ہی تختہ اُلٹ جائے گا۔ تمام صنعتی مشکلوں کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ کارخانہ کے اندر اس بنیادی ترازو کے دونوں پلڑوں میں برابر کا وزن نہیں۔ اگر کاریگروں کا اس میں کچھ قصور ہے تو کارخانوں کے مالک بھی اس الزام سے بَری نہیں کیونکہ انہوں نے اپنا انتظام بہت ڈھیلا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اگر وہ عقل کے ساتھ چل کر اپنے طریقوں کو بہتر بنا لیتے تو یہ عین ممکن تھا کہ اُن کے پاس جو پہلے کاریگر کام کر رہے تھے ان میں سے سَو آدمی نکال کر کسی دوسرے کام پر لگا سکتے جس کے لئے بعد میں انہوں نے پانچسو اور نئے آدمی بھرتی کر لئے چونکہ یہ بہت آسان بات تھی اور اس میں دماغ کو کچھ تکلیف نہ کرنی پڑتی تھی پبلک دھڑا دھڑ مال خرید کر رہی تھی کیونکہ بیوپار تیزی پر تھا۔ اس لئے کارخانہ چلانے والے مزے کے ساتھ پڑے سو رہے تھے اور انہیں کچھ پرواہ نہ تھی۔ کارخانہ کی طرح دفتر میں بھی یہی حال تھا۔ وہاں پر بھی کاریگروں کی طرح مینیجروں اور بڑے اہلکاروں نے اس ترازو کے

کانٹے کو عین درمیان میں کھڑا رکھنے کے قانون کو توڑا ہوا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے اندر کوئی بھی ضروری یا اچھی چیز صرف مانگنے سے نہیں ملا کرتی یہی وجہ ہے کہ عام طور پر سب ہڑتالیں فیل ہو جاتی ہیں حالانکہ اوپر سے کئی بار یہ نظر آتا ہے کہ وہ کامیاب ہو گئی ہیں اگر ایک ہڑتال ہونے سے تنخواہیں بڑھ گئیں یا کام کرنے کے گھنٹے گھٹ گئے اور اس طرح سے پبلک کے سر پر بوجھ بڑھے گا تو اصل میں یہ ہڑتال ناکامیاب ثابت ہوئی ہے کیونکہ اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ کارخانہ اب پبلک کی زیادہ خدمت نہیں کر سکے گا اور جتنے آگے اس میں ملازم کام کرتے تھے تو انہوں کو اب یہ نوکر نہیں رکھ سکے گا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی ہڑتال بھی جائز نہیں کئی بار اس سے کام کے اندر خاص خرابی یا نقص کا پتہ چل جاتا ہے کاریگر ایک معقول وجہ سے بھی ہڑتال کر سکتے ہیں لیکن اس طرح سے اُن کو انصاف مل سکتا ہے یا نہیں یہ ایک دوسرا سوال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے لئے واجب شرطیں اور مناسب تنخواہیں حاصل کرنے کے لئے ہڑتال کرنا جائز ہے، یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ ایک آدمی کو کوئی چیز کے حاصل کرنے کے لئے ہڑتال کرنی پڑے جو کہ اُس کا قدرتی طور پر پورا حق ہے۔ امریکہ کے کسی بھی باشندے کو اپنا اصلی قدرتی حق کسی چیز میں حاصل کرنے کے لئے ہڑتال کرنے کی ضرورت نہیں پڑنی چاہیئے بلکہ اُس کو وہ چیز اور حق اپنے آپ آسانی کے ساتھ بغیر کسی جھگڑے رگڑے کے مل جانی چاہیئے۔ جو ہڑتالیں کسی جائز وجہ سے ہوتی ہیں اُن میں عام طور پر قصور مالک کا ہوا کرتا ہے۔ چند ایک مالک مالک رہنے کے قابل نہیں۔ ملازموں کو بھرتی کرنا۔ اُن سے پورا پورا کام لینا اور ایمانداری کے ساتھ اُن کی لیاقت کے مطابق اور اپنے دھندے کی خوشحالی کے لحاظ سے اُن کی مناسب تنخواہیں مقرر کرنا۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہیں جس طرح سے ایک کاریگر خراد پر کام کرنے کے ناقابل ثابت ہو سکتا ہے اُسی طرح ایک مالک بھی اپنی ڈیوٹی بجا لانے کے ناقابل ثابت ہو سکتا ہے۔ جائز اصول یا بات کیلئے ہڑتالیں کرنا اس بات کی علامت ہے کہ اس دھندے کا مالک اپنی ڈیوٹی کے قابل نہیں اور وہ اپنے فرض کو اچھی طرح سے ادا نہیں کرتا۔ اس لئے بہتر ہے کہ اپنے لئے وہ کوئی اور جگہ تلاش کرے جہاں پر وہ کام کو اچھی طرح کر سکے۔ ایک نالائق کاریگر کی نسبت ایک نالائق مالک کی وجہ سے دھندے کے اندر زیادہ مصیبت پھیلتی ہے اور گڑبڑ مچتی ہے۔ کیونکہ اگر کاریگر ایک جگہ کام خراب کرتا ہے تو اُس کو بدل کر کسی دوسر

کام پر لگا یا جا سکتا ہے۔ لیکن مالک کی حالت ہیں یہ ممکن نہیں۔ اس سے تو خدا ہی سمجھے تو سمجھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہڑتال وہ جائز ہوتی ہے جس کے کرنے کی کوئی ضرورت نہ پڑتی اگر مالک نے اپنا فرض پورا کیا ہوتا۔

ایک دوسری قسم کی ہڑتال ہوتی ہے ـــــ جس کا اصلی منشا سامنے نظر نہیں پڑتا اس قسم کی ہڑتال کرنے والا عام طور پر ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو جوڑ توڑ کرنے میں بڑا اُستاد ہوتا ہے اور جو اپنا کچھ مطلب سدھ کرنے کے لئے کاریگروں کو آگے کر کے اُن کے کندھوں پر بندوق رکھ کر چلاتا ہے۔

اس بات کو ہم اپنی مثال دے کر ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے فورڈ کے کارخانہ خوب بڑھ گئے ہیں اور ان کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی ہشیاری اور لیاقت سے عمدہ مال سپلائی کر کے پبلک کی ایک سچی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اپنے کاریگروں کے ساتھ انصاف کرنے اور اچھا سلوک برتنے کے لحاظ سے کوئی ہماری طرف اُنگلی نہیں اُٹھا سکتا۔ اس کو دیکھ کر قدرتی طور پر بٹے بازوں کی منہ میں پانی بھر آیا ہے۔ اگر کسی طرح سے اُن کا اس پر اختیار ہو جائے تو آج تک اس کو کامیاب بنانے میں ہم نے ایمانداری کے ساتھ جو کوشش کی ہیں اُن کی وجہ سے یہ لوگ اس سے خوب منافع کمائیں وہ فوراً کاریگروں کو اتنی بڑی تنخواہیں دینا بند کر دیں اور ہم نے جو اتنے منافعوں میں سے کاریگروں کو حصہ دینے کا سلسلہ جاری کیا ہوا ہے اس کو اُڑا دیں۔ پبلک کی جیب سے جتنا روپیہ وہ نکلوا سکتے ہوں وہ لے کر چھوڑیں اور مال نکما بنا کر کاریگروں اور مزدوروں کو کم سے کم تنخواہ دے کر جتنی بچت ہو سکتی ہو اُس کو کرنے سے وہ کبھی نہ ملیں اور ہمارے اس دھندے کی بھی ویسی ہی بُری حالت کر دیویں جیسی کہ اور دوسرے کاموں کی جو چھوٹے اور نکمے اصولوں پر اس وقت چل رہے ہیں ہو رہی ہے۔ ممکن ہے کہ ان بٹے بازوں کی نیت یہ ہو کہ اس طرح سے ہم خود خوب مالدار بن جائیں یا وہ ہمارے اس دھندے کی پالیسی کو بدل دینا چاہتے ہوں کیونکہ بہت سے دوسرے کارخانوں کے مالک جو یہ نہیں چاہتے کہ اپنے کاریگروں کے ساتھ انصاف سے کام لیا جائے اور اس لئے وہ ہمارے کارخانے کو دیکھ کر بہت گھبراتے ہیں۔ لیکن اِن لوگوں کی پیش نہیں چلتی ہمارے کارخانہ کے اندر سے تو کوئی آگ نہیں بھڑکائی جا سکتی کیونکہ ہمارے کاریگروں کے پاس ہڑتال کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ اس لئے اب انھوں نے دوسرا ہتھیار استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ کیونکہ ہمارا کام بہت بڑھ گیا ہے اس لئے ہمیں

کچے مسالے باہر سے بہتیری فرموں کے ذریعہ حاصل کرنے کا بندوبست کرنا پڑتا ہے اور کئی ایسی فرمیں ہمیں یہ مسالے سپلائی کرنے میں بہت مشغول رہتی ہیں۔ اب ان لوگوں کی چال یہ ہے کہ اگر کسی طرح سے ان فرموں سے ہمارے مسالے آنا بند کرا دیں تو ہمارے دھندے کو اس سے ایک ایسی گہری چوٹ لگے گی جس سے ہمارا بہت نقصان ہوگا۔

چنانچہ باہر جن کارخانوں میں ہمارا مال تیار ہو رہا ہے۔ اور جو فرمیں ہمیں کچے مسالے سپلائی کر رہی ہیں۔ ان میں کام کرنے والوں کو ہڑتال کرنے کے لئے طرح طرح سے بھڑکایا جا رہا ہے۔ اور ہر ممکن طریقہ سے یہ کوشش جاری ہے کہ ہمارے دھندے کو باہر سے کسی قسم کا مال سپلائی نہ ہو سکے۔ لیکن اگر ان باہر کے کارخانوں اور فرموں کے کاریگروں کو ان کی اصلی چال کا پتہ لگ جائے تو وہ ان کے ہتھے کبھی نہ چڑھیں لیکن ان کو اس کی خبر نہیں لگی۔ اس لئے بے خبری میں وہ ان چالباز سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ناچ رہے ہیں۔ لیکن ایک بات ہے جس کو دیکھ کر اس قسم کی ہڑتال میں شریک ہونے والے کاریگروں کے دلوں میں ضرور شک پیدا ہو جانا چاہیئے۔ اگر ہڑتال کرنے والے کاریگر اور ان کے مالک ایک دوسرے کی بات سننے اور ماننے کے لئے تیار ہوں اور پھر بھی صلح صفائی نہ ہوتی ہو تو یہ اس بات کا پختہ ثبوت سمجھ لینا چاہیئے کہ کوئی تیسرا ایسا آدمی بیچ میں پڑ کر ہڑتال کو ختم ہونے نہیں دیتا جس کا اس کے جاری رہنے میں بہت فائدہ ہے۔ پردے کے پیچھے چھپا ہوا ایسا آدمی کسی صورت میں بھی کاہی شرطوں پر ان دونوں کے درمیان صلح صفائی ہوتی نہیں دیکھنا چاہتا۔

لیکن اگر ہڑتال کرنے والے کاریگر جیت گئے تو کیا اس سے اُن کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ باہر کے پتلے بازوں کے ہاتھوں میں یہ بڑا دھندا پکڑ کر کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے ساتھ آگے کی نسبت بہتر سلوک ہونے لگ جائے گا یا اُن کو زیادہ تنخواہیں ملا کریں گی؟

اس کے علاوہ ایک تیسری قسم کی ہڑتال ہے جس کو کرانے والے ایسے سرمایہ دار لوگ ہوتے ہیں جو اس طرح سے کاریگروں کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ امریکہ کا ریگر ہمیشہ سے اس بات کے لئے مشہور رہا ہے کہ وہ معاملہ کا سوچ سمجھ کر ٹھیک فیصلہ کرتا ہے۔ وہ اُن لوگوں سے کبھی نہیں بہکایا جاتا جو بڑی بڑی ڈینگیں مارنے والے ہوں۔ اور یہ کہتے ہوں کہ ہمارے پاس پارس پتھر ہے وہ اپنے لئے اپنے دماغ سے

سوچتا ہے اور اپنی عقل کا استعمال کرتا ہے۔ اُس کی سمجھ میں یہ بنیادی اصول آگیا ہے کہ کسی مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے دلیل کی جگہ دھینگا مشتی نہیں لے سکتی اس خوبی کی وجہ سے امریکہ کے کاریگر نے نہ صرف امریکہ میں بلکہ تمام دنیا کے اندر اپنے لئے خاص رسوخ پیدا کر لیا ہے۔ پبلک اُس کے خیالوں کو بڑے ادب کے ساتھ سنتی ہے اور اُس کے مطالبوں کی عزت کرتی ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے کاریگر کے دل اور دماغ کو بولشویک رنگ میں حد سے زیادہ رنگنے کی نہایت زبردست کوشش کی جا رہی ہے اور اُن کو ایسی اُلٹی سیدھی باتیں سمجھائی جا رہی ہیں جن کا اگر اثر ہو گیا تو پبلک کے دل میں جو آج تک اُن کی عزت رہی ہے وہ اُڑ جائے گی اور اُن پر نکتہ چینی ہونے لگے گی۔

لیکن محض ہڑتالیں نہ ہونے سے کسی صنعت میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو کاریگر کو یوں کہنے کے برابر ہے کہ بھئی تمہیں ہم سے شکایت ضرور ہے مگر اس کا علاج ہڑتال نہیں بلکہ اس سے تو معاملہ کی صورت اور بھی بگڑ جائے گی چاہے تم جیتو یا ہارو ممکن ہے کہ اس طرح کہنے سے کاریگر مان لے کہ یہ بات سچی ہے اور ہڑتال نہ کرے لیکن کیا اس سے تکلیف مٹ جائے گی؟ نہیں اگر کاریگر اپنی حالت کو بہتر بنانے کیواسطے ہڑتالوں کو ایک اوچھا ہتھیار سمجھ کر ترک کر دے تو یہ مالکوں کا اور بھی بڑا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ فوراً کاریگروں کی حالت کو بہتر بنانے اور ان کی شکایتوں کو دور کرنے کا مناسب انتظام ڈھونڈنے میں لگ جائیں۔

اس سلسلے میں کاریگروں کی نسبت فورڈ کے کارخانوں کا تجربہ یونائیٹڈ اسٹیٹ اور باہر دوسرے ملکوں میں نہایت تسلی بخش رہا ہے۔ ہماری کسی قسم کی سبھاؤں کے ساتھ دشمنی نہیں مگر ہم کسی مالکوں یا مزدوروں کی سبھاؤں کے انتظام میں کبھی دخل نہیں دیتے اور نہ اس میں شریک ہوتے ہیں۔ ہم اپنے کارخانوں میں جو تنخواہیں دیتے ہیں وہ ہمیشہ اتنی زیادہ ہوتی ہیں اور کاریگروں کے لئے دن میں کام کرنے کے لئے اتنے تھوڑے گھنٹے مقرر کئے جاتے ہیں کہ کوئی نیک سبھا اس سے کبھی زیادہ مانگنے کا حوصلہ نہیں کرے گی جو کچھ ہم کر رہے ہیں اُس سے زیادہ کوئی اور سبھا ہمارے ملازموں کے لئے ہرگز نہیں کر سکتی۔ ہمارے کچھ ملازم ایسی سبھاؤں کے شاید ممبر ہوں لیکن زیادہ تعداد ایسے ملازموں کی ہے جو ممبر نہیں۔ ہمیں اس کی خبر نہیں اور نہ ہم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی ہے کیونکہ اس بات کا ہمارے اوپر ذرا بھی اثر نہیں ہم سبھاؤں

کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُن کی نیک منشاؤں کے ساتھ ہماری پوری ہمدردی ہے مگر جو کام وہ بُری نیت سے کرتے ہیں اُس کی ہم مخالفت کرتے ہیں۔ اس کے عوض میں میرے خیال میں سبھائیں ہمیں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں کیونکہ آج تک ہمارے کارخانوں میں کبھی بھی کسی سبھا نے اپنے نام کے زور سے ہمارے اور ہمارے ملازموں کے درمیان کودنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہاں کبھی کبھی ہمارے کارخانوں میں فساد کھڑا کرنے کی ایسے لوگوں نے ضرور کوشش کی ہے جو شروع سے ہی کھلبلی ڈلوانے کے عادی رہے ہیں لیکن ہمارے آدمیوں نے عام طور پر ان کی بالکل کچھ پرواہ نہیں کی اور انہوں نے ان کو بھی سمجھا کہ یہ لوگ انسان کی شکل میں حیوان ہیں اور قدرت کی انسانی کاریگری میں جو کبھی بھول چوک ہو جاتی ہے۔ اُس کا یہ نمونہ ہیں۔

انگلینڈ میں ہمیں اپنے مانچسٹر کے کارخانے کے سلسلے میں تجارتی سبھاؤں کے ساتھ ضرور مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ مانچسٹر میں لگ بھگ سارے کاریگر ان سبھاؤں کے ممبر ہیں اور انگریزی تجارتی سبھاؤں نے تیاری مال کی نسبت جو قاعدے بنا کر بندشیں لگائی ہوئی ہیں وہ وہاں پر بھی جاری ہیں۔ ہم نے وہاں ایک کارخانہ خریدا جس میں کام کرنے والے ترکھانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی سبھاؤں کی ممبر تھی۔ خبر پاتے ہی سبھا کے اہلکاروں نے ہمارے کارخانہ کے افسروں کے ساتھ ان کی نسبت شرطیں طے کرنے کے لئے لکھا مگر ہم صرف اپنے ملازموں سے واسطہ رکھتے ہیں اور باہر کے قائم مقاموں سے کبھی بات چیت نہیں کرتے۔ اس لئے ہمارے افسروں نے اس سبھا کے اہلکاروں کو ملنے سے انکار کر دیا تب اُنہوں نے ہمارے ملازم ترکھانوں کو کہا کہ وہ ہڑتال کر کے باہر آ جائیں۔ مگر اُنہوں نے انکار کر دیا۔ چنانچہ سبھا نے اُن کو اپنی ممبری سے خارج کر دیا۔ تب ان ترکھانوں نے سبھا کے خلاف یہ دعوی کیا کہ سبھا کے فنڈ میں جو منافع اُن کے حصّہ میں نکلتا ہے وہ اُنہیں ملنا چاہیئے۔ مجھے علم نہیں کہ اس مقدمہ بازی کا کیا نتیجہ نکلا۔ لیکن اس کے بعد انگلینڈ میں ہمارے کارخانوں کے معاملے میں تجارتی سبھاؤں کے اہلکاروں نے پھر کبھی ہمارے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ اور اُنہوں نے ہمارے انتظام میں دخل نہیں دیا۔

ہم اپنے ملازموں سے زبردستی کوئی کام نہیں کرواتے۔ ہمارا اپنے ملازموں کے ساتھ بالکل نقد سودے والا معاملہ ہے۔ یعنی وہ ہمیں کام کر کے دیتے ہیں اور اس کے عوض میں ہم اُنہیں پیسے دیتے

ہیں کسی کا ایک دوسرے پر احسان نہیں ہے۔ جس زمانے میں ہم نے اپنے ملازموں کی تنخواہیں یکدم بہت زیادہ بڑھا دی تھیں اُس وقت ہمیں اُن پر نگرانی کرنے کے لیے کافی تعداد میں آدمی رکھنے پڑتے تھے۔ ان کاریگروں کی گھریلو زندگی کی تحقیقات کی گئی اور یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ یہ لوگ اپنی ان بڑی تنخواہوں کو کیونکر استعمال کرتے ہیں۔ شاید اُس وقت یہ حساب رکھنا بہت ضروری تھا اور اس کے ذریعہ ہمیں بہت سی باتوں کا پتہ لگا مگر یہ سلسلہ ہمیشہ کیلئے جاری نہیں رکھا جا سکتا اور اس لئے ترک کر دیا گیا۔ ہم یہ نہیں مانتے کہ کارخانہ میں ایک خاص شخص بڑا برکت والا ہے یا یہ کہ اُس میں یہ طاقت ہے کہ اگر مٹی کو ہاتھ ڈالے تو سونا بن جائے۔۔ یا کہ یہ سارا کھیل ایک خاص آدمی کے سر پر چل رہا ہے اور سب کچھ اُسی کی بدولت ہے اب ایسی باتوں کو ماننے کا زمانہ گیا۔ اب لوگ کچھ کام عملی شکل میں کیا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ خالی باتوں سے اُن کی تسلی نہیں ہوتی اور صرف سُنی سنائی باتوں پر اعتبار کر کے کسی آدمی کو بڑا نہیں مان لیں گے سوسائٹی کے اندر آپس میں میل جول کی صورتیں محض ادھر اُدھر کی باتیں کرنے سے پیدا نہیں ہو جاتیں بلکہ انسان کو انسان سے میل ملاپ بڑھانے کے لئے روزانہ کچھ اور بھی عملی شکل میں کرنا پڑے گا۔ اور اس معاملہ میں کارخانہ دار اپنی نیک نیتی کا سب سے اچھا ثبوت اس طرح سے دیکتے ہیں کہ کارخانہ کی طرف سے وہ اپنے ملازموں کی بھلائی کیلئے کوئی ایسا کام کر کے دکھائیں جس میں کارخانہ کا کچھ خرچ ہوتا ہو اور سب کا فائدہ ہوتا ہو۔ کارخانہ دار اپنی نیک نیتی صرف اس طرح سے ثابت کر سکتے ہیں اور کاریگروں کے دلوں میں اپنی عزت قائم کر سکتے ہیں۔ پروپیگنڈا کرنے اخباروں میں مضمون نکالنے اور لیکچروں سے کچھ نہیں بنے گا صرف سچے دل سے ٹھیک کام کئے ہوئے کا دوسروں کے دل پر اثر ہوتا ہے خالی باتوں سے گھر پورا نہیں ہوتا۔

سچ مچ کوئی بھی بڑا دھندا اکیلے کسی خاص آدمی کے سر پر نہیں چل سکتا۔ وہ آہستہ آہستہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اُس میں کسی خاص آدمی یا آدمیوں کی کوئی گنتی نہیں رہتی جس طرح سے کسی ایک جگہ میں بہت سے کام کرنے والے کاریگروں میں کسی ایک خاص کا نام نہیں لیا جاتا۔ اُسی طرح ایک بڑے دھندے میں مالک کی اپنی کوئی خاص الگ ہستی نہیں رہتی۔ دونوں نے مل کر مال تیار کرنے کا ایک بڑا کارخانہ قائم کیا ہے جو مال بنا کر باہر بھیجتا ہے جس کو دُنیا خریدتی ہے۔ اور جس کے عوض میں دُنیا روپیہ

ادا کرتی ہے اور اس روپیہ سے اُس کارخانہ میں کام کرنے والے ملازم کی گذران ہوتی ہے۔ یہ سب اُس دھندے کا ہی پرتاپ ہے۔

سچ مچ ایک بڑا دھندا ایک طرح سے پوجنے کی چیز ہے جس سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں کنبوں کا پیٹ پلتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا میں نت نئے سورج بچے پیدا ہوتے ہیں لڑکے اور لڑکیاں سکول میں پڑھنے جاتے ہیں اپنی نوکری کے بھروسے پر نوجوان کاریگر شادیاں کرتے ہیں اور اپنے گھر بساتے ہیں اور ہزاروں آدمی اپنی اس کمائی کے پیسے سے اپنے کنبے اور خاندان کے لئے گھر بنوا کر کھڑے کر رہے ہیں اور اُن کا سب خرچ قسطوں میں یا اکٹھا برداشت کر رہے ہیں۔ اگر ہم اس بات پر ذرا غور کریں کہ یہ سب سلسلہ صرف ایک بڑے کارخانہ کے سر سے چل رہا ہے جو بھاری تعداد میں مال تیار کر کے دُنیا میں بھیج رہا ہے۔ تو کیا اس کے چلانے والے مالک کا یہ ایک مذہبی فرض نہیں ہو جاتا کہ وہ اس کو خدا کی ایک بخشش سمجھ کر اس کا انتظام نہایت ایمانداری اور نیک نیتی سے کرتا ہوا اس کام کو جاری رکھے! انسانوں کی حفاظت کی نسبت ایسے دھندے کو سنبھال کر رکھنا کہیں زیادہ ضروری ہے۔

کارخانہ کا مالک اپنے ملازموں کی طرح ہی ایک انسان ہے اور دوسرے انسانوں کی طرح سے غلطی کر سکتا ہے اور اُن سے زیادہ اپنے اندر عقل یا لیاقت نہیں رکھتا جتنی اُن میں عقل اور لیاقت ہوگی اُسی حد تک وہ اپنا فرض اچھا یا بُرا ادا کر سکے گا۔ اگر وہ اپنے دھندے کو ٹھیک طریقہ پر چلا سکتا ہے اور اگر اُس کے ملازموں کو اُس پر اتنا اعتبار ہے کہ وہ کام کو صحیح راستے پر رکھے گا اور اُن کی نوکری کو کوئی خطرہ نہیں ہے تب بے شک اپنے عہدے کے قابل ہے ورنہ وہ اپنی ڈیوٹی کیلئے اتنا ہی نالائق ثابت ہوگا جتنا کہ ایک چھوٹا بچہ۔ دوسرے آدمیوں کی طرح ایک مالک کا اندازہ بھی صرف اُس کی لیاقت سے لگانا چاہئے۔ ممکن ہے کہ وہ کچھ لکھا پڑھا نہ ہو اور شاید ٹھیک طور پر اپنے دستخط بھی نہ کر سکتا ہو لیکن اُس کے کام کو تو دیکھو کتنا بڑا دھندا کھڑا کر دیا ہے جس سے روٹی ملتی ہے اور روٹی پیدا کرنا کوئی چھوٹی سی بات نہیں بلکہ بڑی قیمتی چیز ہے یہ دھندا ایک حقیقت ہے اور یہ سچ مچ کچھ کر کے دکھا رہا ہے اس میں جان ہے اور اس کی زندگی کا ثبوت یہ ہے کہ اس سے برابر اپنے ملازموں کی تنخواہیں نکل رہی ہیں۔

ہر تجارتی کام یعنی ایک طرح کی چیز یا مال تیار کرنے والے سب کارخانے آپس میں جتنا اتفاق

کرکے کام کریں گے اُتنا ہی فایدہ رہے گا مگر اس معاملہ میں ایک احتیاط کی بڑی سخت ضرورت ہے.
اور وہ یہ کہ آپس میں اتنا یا اس قسم کا اتفاق نہ ہو جانا چاہیئے جس سے مقابلہ میں کوالٹی کو بہتر بنانے یا
اپنی لاگت گھٹا کر قیمتوں کو کم کرنے کی کسی کو ضرورت ہی نہ رہے کیونکہ اس طرح سے آئندہ زیادہ محنت
کرنے اور ترقی کے راستہ میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ مال تیار کرنے میں سب کارخانوں کا مل کر
سوچنا اور کام کرنا ایک بات ہے اور ایک کارخانہ کے اندر سب ملازموں کا آپس میں اتفاق کے ساتھ
آرام اور چین سے کام کرتے رہنا بالکل دوسری بات ہے۔ کچھ کمپنیاں اور کارخانے اس اتفاق
کو قائم رکھنے کی کوشش میں اپنا اتنا وقت اور طاقت خرچ کر دیتی ہیں کہ اُن کے اندر جس منشا سے وہ
جاری ہوئی تھیں اُن کو پورا کرنے کے لئے کام کرنے کے واسطے کوئی حرکت یا جان نہیں رہتی سب
سے پہلے اس منشا کا دھیان کرنا چاہیئے جس کو حاصل کرنے کی غرض سے یہ کمپنی یا کارخانہ قائم ہوا ہے۔
صرف وہی کارخانہ اتفاق یا میل ملاپ رکھ کر چلنے والا کہلایا جا سکتا ہے جس کے تمام ملازموں کے دماغ
میں صرف ایک ہی دھن یعنی اُس منشا کو پورا کرنے کی لگن سمائی ہوئی ہو اور وہ اُسی کو حاصل کرنے میں
دل و جان سے لگے ہوئے ہوں۔ ایک کارخانہ میں مل جل کر کام کرنے کا سنہری اصول یہی ہے کہ
ملازموں کے سامنے صرف ایک منشا یا مُدعا ہو جس پر سب کا نہایت نیتی سے یقین ہو اور جس کو حاصل کرنے
کے لئے سب کے دلوں میں سچی خواہش ہو۔ مجھے ایسے آدمی پر ترس آتا ہے جو ایسا نرم دل اور موم کی ناک
ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے کام کو کرنے سے پہلے اس بات کا سخت خیال رکھتا ہے کہ اُس کے اردگرد کے
سب آدمی اُس سے خوش رہیں۔ اور کوئی اُس سے ناراض نہ ہونے پاوے۔ دنیا میں اس قسم کے بہتیرے
آدمی پائے جاتے ہیں اور اُن کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب تک وہ اپنے دل کو اور مضبوط اور طبیعت
کو سخت بنا کر اس نرم دلی کی عادت کو نہیں چھوڑتے تب تک وہ ناکامیاب رہتے ہیں۔ نہ صرف اُنکو
بیوپار میں ناکامیابی حاصل ہوتی ہے بلکہ وہ اپنی پرائیویٹ زندگی میں بھی ناکامیاب ثابت ہوتے
ہیں۔ ان لوگوں کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گو یہ جوان ہو گئے ہیں مگر ابھی تک ان کے جسم
کے اندر ہڈیاں اتنی سخت اور مضبوط نہیں ہوئیں جس سے یہ اپنے پاؤں پر بغیر سہارے کے کھڑے
ہو کر چل پھر سکیں۔ آج کل کمپنیوں اور کارخانوں کے اندر سب کو خوش کرنے کے اصول پر بہت زور

دیا جاتا ہے۔ لوگوں کو اس بات کا بہت شوق ہے کہ وہ صرف اُنہیں لوگوں کے ساتھ رہ کر کام کریں جو اُن کی طبیعت کے موافق ہوں۔ آخر میں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اندر جو بہت ساری خوبیاں اور اچھے اوصاف ہیں اُن میں سے کئی اس طرح سے مارے جاتے ہیں۔

مجھے خوف ہے کہ کہیں میرا مطلب غلط نہ سمجھ لیا جائے جب میں کسی آدمی کیلئے "سب کو خوش رکھنے" کے لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس سے میری مُراد یہ ہوتی ہے کہ اُس شخص کو ہر معاملے کا اپنے دماغ کی بجائے اپنے دل کی پسند یا ناپسند کے مطابق یعنی محض اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ فرض کرو کہ تمہیں ایک آدمی پسند نہیں تو کیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُسمیں ضرور کچھ نہ کچھ نقص ہے۔ اُلٹا ممکن ہے کہ اس سے تمہارا اپنا ہی کچھ قصور نکلتا ہو۔ جو سچی بات ہے اُس پر تمہاری پسند یا ناپسند کا کیا اثر ہے؟ ہر شخص جو تھوڑی بہت بھی عقل رکھتا ہے۔ جانتا ہے کہ وہ کئی ایسے آدمیوں کو ناپسند کرتا ہے جو اصل میں اُس سے بہت زیادہ قابل ہیں۔

اب اسی اصول کو کارخانوں کے علاوہ دُنیا کے اور کاموں اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں استعمال کر کے دیکھیں تو ظاہر ہوگا کہ امیروں کا غریبوں سے اور غریبوں کا امیروں سے محبت کرنا ضروری نہیں۔ نہ ہی یہ ضروری ہے کہ مالک کی ملازم کے ساتھ یا ملازم کی مالک کے ساتھ محبت ہو۔ ضروری بات یہ ہے کہ ہر ایک شخص دوسرے کے ساتھ اُس کی لیاقت اور ہمت کے مطابق انصاف سے سلوک کرے۔ اس کا نام ہے اصلی جمہوری گورنمنٹ اور یہ سوال نہیں کہ کوٹھیاں اور بنگلے اور کارخانے اور ریلیں کس کی ملکیت میں ہیں جمہوری گورنمنٹ کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ مالک یا لیڈر کون ہونا چاہیئے؟

یہ سوال بالکل یہ پوچھنے کے برابر ہے کہ "فلاں راگیوں کی پارٹی میں سے کون پنچم سُر میں گائیگا"؟ اس کا جواب بالکل سیدھا ہے کہ وہی جو پنچم سُر میں گا سکتا ہے۔ ایک اکبر کی محفل میں تان سین کو کون راج گدی سے اُتار سکتا ہے۔ لیکن فرض کرو کہ راگ کی کوئی جمہوری گورنمنٹ اپنے کسی قانون کے ماتحت اُسکو وہاں سے اُٹھا کر بہت نیچے بٹھائے۔ تو کیا اُسکی جگہ کوئی اور نہیں رہ سکتا ہے؟ یا کیا اس کی وجہ سے تان سین کی میٹھی تانوں اور دل کھینچ لے جانے والے گانوں میں کچھ فرق پڑ جائے گا؟

بیان ۱۹

ہم آگے کو کیا امید رکھیں

جو علامتیں اس وقت نظر آ رہی ہیں اُن کو دیکھ کر اگر ہم نے اندازہ لگانے میں غلطی نہیں کھائی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ہم ایک تبدیلی میں سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے چاروں طرف تبدیلی آہستہ آہستہ ہو رہی ہے جس کا ہمیں بہت کم پتہ لگتا ہے لیکن تبدیلی ہے ضرور۔ ہمیں آہستہ آہستہ یہ واقفیت ہو رہی ہے کہ ایک حالت کو پیدا کر سکنے کے لئے فلاں چیز کا کیا اثر ہوتا ہے دُنیا کے اندر اس وقت جو ہم اتنی ہلچل دیکھتے ہیں اور جو ایک طرح سے ہمارے کارخانوں اور زندگی کا ایک ضروری حصّہ بن گئی ہے وہ اصل میں اس بات کی صرف ظاہری علامتیں ہیں کہ دنیا اپنی کایا کچھ پلٹ رہی ہے۔ لوگوں کے خیال اب بدل رہے ہیں اور سچ مچ ابھی تک ہمارے طریقوں میں جو خرابیاں موجود رہی ہیں اُن کو آئندہ دور کرنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے خیال کچھ نہ کچھ بدل ڈالیں۔ پہلے زمانہ میں ہم ہٹ دھرمی کے نرالے وصف کی بہت تعریف کیا کرتے تھے جو اصل میں صرف اکھڑپن ہوتا تھا لیکن اب اس کی جگہ روشن دماغی لے رہی ہے اور ابھی تک ہمارے کاروبار میں جو بے جا لحاظ اور نرمی پائی جاتی تھی۔ وہ بھی آہستہ آہستہ رفع ہو رہی ہے۔ دُنیا غلطی سے اس ہٹ دھرمی اور بے جا لحاظ وغیرہ کو ترقی کے نام سے پکارتی تھی۔ اب ہمیں اصلیتوں کا پتہ لگنے لگا ہے اور اب ہماری سمجھ میں آ رہا ہے کہ دنیا کے اندر زندگی کا پورا پورا لطف اُٹھانے کے لئے جتنی بھی چیزیں درکار ہیں وہ سب ہماری پاس

موجود ہیں اور اگر ہم ایک بار یہ سمجھ لیں کہ وہ ہیں کیا اور کس لئے پیدا کی گئی ہیں تو ہم ان کا آگے سے بہتر انتظام کر سکیں گے۔

جو کچھ بھی خرابی ہے اور ہم سب چاہتے ہیں کہ ہمارے اندر بہت سی خرابیاں ہیں وہ سب دور ہو سکتی ہیں اگر ہم ٹھیک طور پر یہ دیکھ لیں کہ اس خرابی کی جڑ کہاں ہے۔ یہ بیماری ہمارے اندر اتنا گھر کر گئی ہے اور ہمیں یہ جلنے کی کہ دوسرے کے پاس کیا ہے اور کیا نہیں اتنی فکر رہتی ہے کہ ہم نے ایک طرح سے اس کو ایک ذاتی سوال بنا لیا ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ اتنا بڑا اور گہرا ہے کہ اس میں کسی خاص آدمی کے ہونے یا نہ ہونے کا بالکل کچھ اثر نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے مالی معاملوں میں انسانی عادتوں اور خصلتوں کی وجہ سے کافی فرق پڑتا ہے۔ دنیا میں خود غرضی ہے اور واقعی اس کا زندگی کے تمام کاموں میں جہاں ایک دوسرے سے ٹکر لینی پڑتی ہے۔ بڑا زبردست اثر ہے۔ اگر خود غرضی کسی خاص جماعت یا قوم کا خاصہ ہوتا تو اس کا علاج آسانی سے ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ کمزوری ہر جگہ انسان کی نس نس میں داخل ہو چکی ہے اس کے علاوہ لالچ کا ہونا۔ دوسروں کی بڑھتی دیکھ کر جلنا اور حسد کرنا یہ برائیاں بھی موجود ہیں دنیا میں محض اپنی زندگی کو قائم رکھنے کیلئے آگے جتنی پکڑ دھکڑ کرنی پڑتی تھی اتنی اب نہیں رہی گو یہ ممکن ہے کہ اس بارے میں بے اعتباری چاہے زیادہ بڑھ گئی ہو کہ شاید کل کو ہماری نوکری یا کام کا سلسلہ قائم رہے گا یا نہیں لیکن جیوں جیوں یہ پکڑ دھکڑ کم ہوتی جائے گی تیوں تیوں ہمیں اپنی خوبیوں اور بہتر خصلتیں ظاہر کرنے کا زیادہ موقع ملے گا۔ جتنا ہم اس تہذیب کو اختیار کرتے جائیں گے اتنے ہی اس کے کھردرے کنارے ہمیں کم چبھیں گے۔ دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی کی ضرورتیں بھی بہت بڑھ گئی ہیں۔ افریقہ کے کسی راجہ کی ساری ریاست میں اتنا مال تیار اور اس زور سے کام نہیں ہوتا ہوگا۔ جیسا اس وقت امریکہ کے ایک معمولی کارخانے کے پچھواڑے میں ہو رہا ہے۔ زمین کے شمالی سرے پر آباد اسکیمو قوم کے سارے لوگوں کو مل کر اتنے لاؤ لشکر کی ضرورت نہیں جتنا کہ امریکہ کے ایک معمولی لڑکے کو کیونکہ اسے اپنے استعمال کے لئے رسوئی کے بھانڈے برتن۔ کھانے کا کمرہ سونے کا کمرہ۔ ایندھن کا کمرہ وغیرہ وغیرہ اپنی چیزوں کی ضرورت ہے کہ جن کی فہرست دیکھ کر پانچسو سال پہلے کا بڑے سے بڑا شوقین اور عیش لوٹنے والا بادشاہ بھی دنگ رہ جائے۔ زمانہ کے اندر فیشن بڑھ جانے کا ایک خاص دور ہوا کرتا ہے

ہماری حالت اس وقت بالکل ایک دیہاتی گنوار آدمی جیسی ہے جو اپنی ساری کمائی لے کر کسی بڑے شہر میں آتا ہے اور ہر چیز کو دیکھتا ہے اور اُسے خرید لیتا ہے۔ ابھی تک ہم نے اس بات کو ٹھیک طور سے نہیں پہچانا کہ دُنیا کے اندر اس قسم کی نقلی انگوٹھیاں اور چھلے اور خالی ٹیپ ٹاپ کی چیزیں اتنی چل پڑی ہیں کہ ان کو بنانے میں صنعت کا کافی سامان اور مال خرچ ہونے لگتا ہے اور مزدوروں اور کاریگروں کی ایک بھاری تعداد ان کاموں میں لگی ہوئی ہے۔ مگر یہ چیزیں اتنی نکمّی اور واہیات ہیں کہ ان کو صرف روپیہ ٹھگنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ اور لوگ انہیں محض دل بہلانے کیلئے خریدتے ہیں۔ مطلب یہ کہ یہ چیزیں دُنیا میں کسی کے مطلب یا کام کی نہیں ہیں۔ یہ ردّی سے بنی ہیں اور اب بھی چھپن کوڑا سے بہتر نہیں ہیں۔ ہماری سوسائٹی اس قسم کی فضول چیزیں بنانے کی منزل سے آگے نکل گئی ہے اور وہ دن دور نہیں جبکہ صنعت کا کام دنیا کی صرف ضرورتوں کو پورا کرنے کا ہوگا۔ اور تب ہمیں اُمید رکھنی چاہئے کہ ہماری زندگی اور بھی بہتر ہو جائے گی حالانکہ ہماری موجودہ حالت بھی اس مطلب کو حاصل کرنے کے لئے کچھ اتنی بُری نہیں اور کم سے کم اس میں کوئی رُکاوٹ نہیں ڈالتی۔

آہستہ آہستہ ہماری روپیہ کو خدا مان کر پوجنے کی عادت چھوٹ رہی ہے۔ امیر ہونا اب کوئی خاص شان کی بات نہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو اب ایک درمیانہ درجہ کے آدمی کو امیر بننے کی بہت اُمنگ نہیں۔ پہلے کی طرح اب لوگ دھن کے پیچھے پاگل اور اندھے ہوئے نہیں پھرتے۔ دولت سے اُنہیں دہشت تو کیا ہوتی ہے۔ اور امیروں کی اُن کو ذرا پرواہ نہیں۔ اگر ہم فالتو نکمّی چیزوں کو اکٹھا کر کے اپنا گھر بھر لیں۔ تو یہ ہمارے لئے کوئی تعریف کی بات نہیں۔

صرف تھوڑا سا غور کرنے سے یہ بات صاف نظر آجاتی ہے کہ جہاں تک ایک آدمی کے ذاتی فائدہ کا تعلق ہے بہت دولت اکٹھی ہو جانے سے اُن پر بالکل کچھ اثر نہیں پڑتا۔ انسان آخر انسان ہے اور جتنی اور جس قسم کی خوراک پیٹ بھرنے کیلئے اور سردی سے بچنے کے لئے پوشاک ایک امیر آدمی کے لئے درکار ہیں اُتنی ہی وہ ایک غریب کے لئے بھی ضروری ہیں اور ایک وقت میں ایک آدمی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ایک سے زیادہ کمرے میں رہائش نہیں رکھ سکتا۔

لیکن اگر ایک آدمی کے دل میں خلقت کی بھلائی اور خدمت کرنے کا خیال ہے اگر اُس کے دماغ

میں ایسے ہی بڑی بڑی تجویزیں آئی ہوئی ہیں جن کو چلانے کے لیے معمولی طریقے اور چھوٹی موٹی چیزیں بالکل ناکافی ہیں اگر اس کی یہ اُمنگ ہے کہ وہ اپنی زندگی صنعت کے ریگستان کو گلاب کی کیاری کی طرح سرسبز بنانے میں خرچ کر دے گا اور اگر اس کی یہ خواہش ہو کہ وہ روزمرہ کام کرنے والے کاریگروں اور مزدوروں کی طبیعتوں میں تازگی اور شوق پیدا کر کے اُن کے چال چلن کو اوپر اُبھارے اور اُن کو آگے سے زیادہ لائق بنا دے تو اُسے کاروبار کے بڑے منافعوں اور دولت کے ڈھیروں میں چھپے ہوئے اُسی طرح بھاری فائدے نظر آئیں گے جس طرح ایک کسان کی آنکھوں کے سامنے غلّے کے بیج دیکھ کر پکّی ہوئی فصلوں اور لہلہاتے کھیتوں کا نقشہ کھنچ جاتا ہے جن کی پیداوار وہ خود غرضی میں پھنس کر اکیلا عین اُسی طرح ہرگز نہیں کھا سکتا جس طرح ایک آدمی کی یہ کوشش کرنا بالکل بے کار ہے کہ سورج کی کرنیں صرف اُسی تک پہنچیں اور کسی دوسرے کو دھوپ بالکل نہ مل سکے۔

دُنیا میں دو طرح کے بیوقوف پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ لکھ پتی جو یہ سمجھتا ہے کہ بہت سا روپیہ اکٹھا کر لینے سے اُس کے ہاتھ میں اصلی طاقت آ جائے گی اور دوسرا وہ کنگال سوسائٹی کے سدھارنے والا جس کا یہ خیال ہے کہ اگر کسی طرح سے وہ سوسائٹی کے اندر ایک گروہ سے دھن دولت چھین کر کسی دوسری جماعت کو دینے میں کامیاب ہو جائے تو دنیا کی سب خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ یہ دونوں غلط رستہ پر ہیں۔ اُنہیں یہ غلط فہمی ہو رہی ہے کہ اگر یہ امیر لوگ جو ہماری ترقی کے راستہ میں خواہ مخواہ رکاوٹیں ڈالتے رہتے ہیں اور مفت میں بڑے بنے پھرتے ہیں کسی طرح ہمارے قابو میں آ جاویں تو اس سے کاریگروں کی ایک بھاری تعداد بھی ہماری مٹھی میں آ جائے گی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں کئی آدمیوں نے جنہوں نے لاکھوں روپیہ پیدا کئے اور جنہیں روپیہ کمانے کی خوب اٹکل آتی تھی عام خلقت کی خوشحالی اور دھن کو ذرا نہیں بڑھایا کیا پتے بازوں سے بھی کبھی دُنیا کی دولت بڑھ سکتی ہے؟

اگر ہم سب لوگ اپنی اوقات اور طاقت و لیاقت کے لحاظ سے دولت کمانے کی ہر آدمی کے واسطے مناسب حد مقرر کر دیں تو ہر شخص کو کھانے پینے کے لیے کافی مل سکتا ہے اور ہر آدمی کا بڑے مزے کے ساتھ گزارہ ہو سکتا ہے۔ دُنیا میں زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی اشیا کی تبھی کمیابی ہوتی ہے جبکہ مال کافی تعداد میں تیار نہ ہوتا ہو۔ مگر یہ کمیابی نہیں کہلاتی کہ گویا ایک آدمی کی ضرورتیں پوری

ہوگئی ہیں لیکن اس کی جیب ابھی روپیوں سے نہیں بھری۔ اور اکثر کافی تعداد میں مال صرف اُس صورت میں تیار نہیں ہوتا جبکہ ہمیں اس بات کی خبر نہیں ہوتی کہ ہمیں کیا مال تیار کرنا چاہئے اور کس طرح سے۔

. . . .

اس سلسلے میں ہمیں بنیادی اصول کی تشکیل میں سب سے پہلے یہ تین باتیں ضرور ماننی پڑیں گی۔ اوّل یہ کہ ہر شخص کے واجب گزارے لائق زمین نہ صرف ہر قسم کی خوراک بلکہ ہر ایک ایسی چیز جس کی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے کافی تعداد میں پیدا کرتی ہے یا پیدا کر سکتی ہے کیونکہ دُنیا میں ہر چیز زمین سے پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے یہ بالکل ممکن ہے کہ کاریگروں۔ مزدوروں۔ کارخانہ داروں۔ سوداگروں۔ تنخواہوں اور منافعوں کے بندوبست اور انتظام ایسے عمدہ قاعدے میں باندھ لئے جائیں کہ ہر شخص کو جس کا اس دھندے سے کچھ تعلق ہے اُس کو اس کے کام کے مطابق پورے انصاف سے دام مل جاویں اور تیسرے یہ کہ اگرچہ انسان کی خصلت میں بہت سی کمزوریاں ہیں تو بھی اُن کے ہوتے ہوئے ہم اپنے بیوپار کے سسٹم کو ایسے اچھے طریقے سے چلا سکتے ہیں کہ گو ہمارے کاروبار کے اندر سے خود غرضی بالکل تو شائد نہیں دور ہو سکتی مگر اس کی وجہ سے جو کام کرنے والوں کے ساتھ مالی معاملوں میں سخت بے انصافی ہوتی ہے اُس کو کافی حد تک ہٹایا جا سکتا ہے۔

. . . .

ایک انسان کے لئے بیوپار کرنا مال تیار کرنے یعنی کارخانے چلانے اور مال کے منافعوں کو انصاف کے ساتھ سب کے درمیان حصّہ رسدی بانٹنے کی عقل و لیاقت ہونے یا نہ ہونے کے لحاظ سے آسان یا مشکل ہوتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بیوپار منافع کمانے کے لئے بنا ہے۔ یہ بات غلط ہے بیوپار پبلک کی بھلائی یا خدمت کرنے کے لئے بنا ہے۔ یہ بھی ایک پیشہ ہے۔ اور اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس کو اختیار کرنے والوں کے واسطے اس کے بھی اعلےٰ اور نیکی کے اصول قائم اور مقرر کئے جاویں اور جو ان کو توڑے۔ وہ فوراً اس کی برادری سے باہر نکال دیا جاوے۔ بیوپار کے پیشے میں تو ان نیکی کے اصولوں پر چلنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ بیوپاری پیشہ کے نیکی کے اصول ہمیشہ اس بات پر زور

زور دیتے ہیں کہ بیوپار کرنے والا اپنے کام میں پورا پورا ایماندار اور سچا رہے۔ اور ایسا اُسے اپنی خوشی سے اور اس میں اپنی شان سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ نہ کہ کسی کے ڈر کے مارے یا مجبور ہو کر۔ یہ اصول اتنے زبردست ہیں کہ جو ان کے خلاف چلتا ہے۔ اُس کو یہ خود ہی پکڑ لیتے ہیں۔ اور پکڑ کر سزا بھی خود ہی دے دیتے ہیں۔ ایک دن آئے گا جب بیوپار کے اندر سے بے ایمانی کی وبا بالکل نکل جائے گی۔ اور یہ عمدہ دُھلے ہوئے کپڑے کی طرح بالکل صاف اور سُتھرا ہو جائے گا۔ ایک مشین جو پل پل میں چلتی ہوئی رُک جاتی ہے۔ ناقص ہے اور اس کا نقص اُس کے اندر ہی موجود ہے۔ ایک انسان کا جسم جو ہر دوسرے تیسرے روز بگڑا رہتا ہے۔ بیمار جسم ہے اور اس کی بیماری اُس کے اندر ہی ہے یہی حالت بیوپار کی ہے۔ بیوپار کے نقص اور ان میں سے بہت سے نقص ایسے ہیں جو بیوپار کے نیک خمیر میں ہی پہلے دن سے ملے ہوئے ہیں۔ اور اس کی ترقی کے رستہ میں بھاری رُکاوٹ ہیں اور قدم قدم پر اسے بیمار کرتے رہتے ہیں۔ وہ دن آنے والا ہے جب سب لوگ بیوپار کے ان نیکی کے اصولوں کی قدر کرنے لگ جائیں گے۔ اور ان پر چلنے لگیں گے تب ہر شخص دیکھ لیگا کہ سچ مچ بیوپار ہی دُنیا میں سب سے پُرانا اور مفید پیشہ ہے۔

آج تک فورڈ کے کارخانوں نے جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ میں نے کیا ہے وہ عملی طور پر کام کر کے یہ ظاہر کرنے کی غرض سے کیا گیا ہے کہ بیوپار میں منافعوں سے پہلے خلقت کی بھلائی کا دھیان رکھنا چاہیئے اور جس بیوپار دھندے کے کرنے سے دُنیا کی حالت بہتر ہوتی ہے وہ ایک شریف پیشہ ہے۔ مجھے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہمیں اپنے دھندوں میں ترقی ــــ جو لوگوں کو اتنی بڑی اور انوکھی نظر آتی ہے اور جسے میں کامیابی کے نام سے اس لئے نہیں پکارتا کیونکہ اس لفظ کے عام طور پر معنی ہیں "آئندہ کے لئے ترقی کے منہ پر تالا جڑ دینا" اور ابھی تو ہم نے ترقی کے میدان میں قدم ہی رکھا ہے ــــــــ جو حاصل ہوئی ہے وہ محض ایک اتفاق کی بات ہے اور کہ جو طریقے ہم نے استعمال کئے ہیں وہ ہیں تو اچھے لیکن وہ صرف ہماری خاص چیزوں کے بنانے کے واسطے ہی کام دے سکتے ہیں اور کسی اور لائن یا دھندے میں اُن سے پوری نہیں پڑ سکتی۔ نہ ان کے ذریعہ کوئی اور چیز تیار ہو سکتی ہے اور نہ ہمارے سوائے کوئی دوسرا آدمی ان طریقوں پر چل سکتا ہے یا چل کر فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

افسوس ہے کہ بغیر آزمائے ہوئے یہ مان لیا گیا ہے کہ ہمارے اصول اور قاعدے ایک سرے سے

غلط ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ اُن کو اچھی طرح سے سمجھا نہیں گیا۔ شکر ہے کہ ان پر چلنے سے جو نتیجے نکلے ہیں اُن کو دیکھ کر یہ اعتراض بہت حد تک دور ہو گیا ہے لیکن اب بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جو پورے دل کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے کیا ہے وہ کوئی اور کمپنی نہیں کر سکتی تھی یا یہ کہ ہمیں ایک چھومنتر مل گیا ہے اور کہ ان اصولوں اور طریقوں کو استعمال کر کے جس طرح سے ہم خوب موٹر کاریں اور ٹریکٹر بناتے ہیں اسی طرح اور اُس زور سے نہ ہم نہ کوئی اور جوتیاں۔ ٹوپیاں۔ سینے کی مشین۔ گھڑیاں۔ ٹائپ رائٹر یا اور اسی طرح کی کوئی ضروری شے ہرگز تیار کر سکتا تھا۔ اور کہ اگر ہم بھی کوئی دوسرا کام کر کے دیکھیں تو ہمیں جلد ہی پتہ لگ جائے گا کہ واقعی ہم غلطی پر تھے۔ میرا ان میں سے کسی بات پر اتفاق نہیں۔ خالی باتیں سے کچھ نہیں بنتا اور جو کچھ ہم اس کتاب میں پیچھے لکھ آئے ہیں اُس سے یہ بات اچھی طرح سے ثابت ہو جاتی ہے قدرت نے ہمیں کوئی ایسی چیز یا ساز و سامان نہیں دیا جو دوسرے حاصل نہ کر سکتے ہوں ہمارا مقصد اُتنا ہی اچھا ہے جتنا کہ کسی اور کا جو اپنا کام دل و جان سے کرے جس زمانہ میں ہم نے کام شروع کیا تھا اُس وقت کی حالت ایسی اچھی نہیں کہی جا سکتی تھی جس سے ہمیں کوئی خاص مدد ملی ہو۔ ایک طرح سے ہم نے کام بالکل خالی ہاتھوں ہی شروع کیا تھا جو کچھ ہمارے پاس اس وقت ہے وہ ہماری کمائی ہے جس کو ہم نے سر توڑ محنت کر کے اور ایک اصول پر پورا بھروسہ رکھ کر کمایا ہے۔ آج تک جسے عیش کی چیز سمجھا جاتا تھا اُس کو ہم نے ضرورت کی شے میں تبدیل کر کے دکھا دیا اور بغیر کسی چالاکی یا دھوکے کے جب ہم نے موجودہ موٹر کار وغیرہ بنانے کا کام جاری کیا تھا اُس وقت ملک کے اندر سڑکیں بہت تھوڑی تھیں۔ گیسولین بھی کم تھی اور پبلک کے دل میں اس خیال نے پورا گھر کیا ہوا تھا کہ یہ موٹر کار زیادہ سے زیادہ ایک امیر آدمی کا کھلونا مانا جا سکتا ہے۔ ہاں ہمیں صرف ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ اس سے پہلے کسی اور نے اس کام میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔

ہم نے ایک ایسے طرز اور اصول پر مال بنانا شروع کر دیا جس کو اس سے پہلے بیوپاریوں کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ لوگوں کو ایک نئی چیز ہمیشہ بے ڈھنگی لگتی ہے اور ہم میں سے کئی آدمیوں کی قدرت نے ایسی خصلت بنائی ہے کہ اُن کے دماغ سے یہ خیال کبھی دور نہیں ہو سکتا کہ ہر چیز جو نئی ہے ضرور ہی بے ڈھنگی اور شاید بے ڈول بھی ہوگی۔ یہ ٹھیک ہے۔ کہ اس نئے طرز اور اصول نے کسی عملی حصے یا طریقے

تھوڑی بہت تبدیلی ہمیشہ ہوتی رہتی ہے کیونکہ ہم لگاتار نئے اور بہتر طریقے کام میں داخل کرنے کی تلاش
رہتے ہیں۔ لیکن ہمیں اس وقت تک اس کے قانون اور قاعدوں کو بدلنے کی ضرورت نہیں پڑی اور
مجھے کوئی ایسی صورت نظر آتی ہے کہ آئندہ کبھی ہمیں انہیں بدلنے کی ضرورت پڑے گی کیونکہ میرا یہ پختہ
یقین ہے کہ یہ اصول ہر جگہ اور ہر موقع کے لئے ٹھیک ہیں اور ان پر عمل کرنے سے ہم سب کی زندگی آگے
بہت بہتر اور اونچی ہو جائے گی۔

اگر میرے یہ خیال نہ ہوتے تو میں ان دھندوں کو آج تک بھلا کیوں کرتا رہتا۔ کیونکہ ان کے
سوائے جو میں روپیہ کماتا ہوں۔ اس کی میری نگاہ میں کوئی خاص قدر نہیں ہے۔ روپیہ کا صرف اتنا ہی فائدہ
ہے کہ اس کے ذریعہ ہمیں دنیا کے سامنے عملی طور پر زندہ مثال پیش کرکے یہ اصول ثابت کرنے میں پوری مدد
ملتی ہے کہ ایک دھندا صرف اسی حد تک جائز ہے۔ جہاں تک یہ خلقت کی خدمت کرتا ہے سوسائٹی
جتنا اس پر خرچ کرتی ہے اس سے زیادہ کما کر اس کو اسے واپس دینا چاہئے ورنہ اگر اس سے سوسائٹی میں
اس کا بھلا اور فائدہ نہیں ہوتا تو اس کا نہ ہونا ہی اچھا ہے۔ میں نے اس اصول کو موٹر کاروں اور ٹریکٹر
کاروبار میں اچھی طرح سے ثابت کرکے دکھا دیا ہے اور اب میں اس کو ریلوے کمپنیوں اور میونسپل کمیٹیوں
چلانے میں بھی اچھی طرح سے ثابت کرکے دکھانا چاہتا ہوں۔ مگر اپنی کسی ذاتی تسلی یا زیادہ روپیہ
کمانے کی نیت سے نہیں۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ ایک آدمی کو ان اصولوں پر چل کر دوسرے کے مقابلہ
جو دھندا صرف روپیہ کمانے کی نیت سے کرتا ہے کہیں زیادہ منافع نہ ہو۔ میں اس اصول کو اس وجہ
ثابت کرکے دکھانا چاہتا ہوں تاکہ ہم سب کے پاس اور بھی زیادہ دولت ہو۔ اور سب دھندوں کے
یہ پبلک کی زیادہ خدمت کرکے ہم اپنی زندگی اور بھی بہتر طریقہ سے گزار سکیں۔ خالی ڈینگیں مارنے سے
کبھی دور نہیں ہو سکتی یہ صرف محنت سے اور سوچ بچار کر کام کرنے سے ہی ہٹائی جا سکتی ہے۔ ہم تو اصل
ایک طرح سے اس اصول کے صرف تجربہ کرنے والے ہیں اور اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں لیکن اگر
آمدنی خوب ہوتی ہے تو یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ ہم ٹھیک اصول پر چل رہے ہیں کیونکہ
ایک اس قسم کی دلیل ہے جو بغیر بحث کئے خود اپنے آپ کو ثابت کرتی ہے۔
اس نئے طرز اور اصول کا اس کتاب کے پہلے بیان میں ذکر کیا ہے تو بھی اس کے اصولوں پر چل کر

ہمیں جو اپنے کام میں آج تک فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ ان کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے میں انہیں دوبارہ یہاں پر لکھنا چاہتا ہوں کیونکہ یہی ہمارے سب کاموں کی بنیاد ہے۔

(۱) آگے کا خیال کر کے نہ گھبرانا اور پچھلی کامیابی پر پھولا نہ سمانا۔ جو آگے کی سوچ کر کے ڈرتا ہے جس کو فیل ہو جانے کا خوف ہے۔ وہ ایک طرح سے اپنے چاروں طرف گھیرا سا ڈال کر اپنے آپ کو بند کر لیتا ہے۔ کسی کام میں فیل ہو جانے کا صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ ایک انسان کو وہی کام زیادہ عقل کے ساتھ شروع کرنے کا دوبارہ اس طرح سے موقع ہاتھ آتا ہے۔ ایمانداری کے ساتھ محنت کرتے ہوئے کسی کام میں فیل ہو جانے میں ہرگز کوئی بدنامی نہیں۔ بدنامی فیل ہو جانے سے خوف کھانے میں ہے۔ ایک آدمی نے اپنے پچھلے تجربوں سے جو سبق حاصل کیا ہے اُس کا صرف اتنا ہی فائدہ ہے کہ اس کو اپنے سامنے رکھ کر وہ اپنے لئے آئندہ ترقی کرنے کے راستے اور تجویزیں ڈھونڈھ سکتا ہے۔

(۲) دوسروں کے مقابلہ بازی (کمپٹیشن) کی پرواہ نہ کرنا:۔ ایک آدمی سب سے بہتر کرتا ہے۔ یا ایک مال کو سب سے عمدہ تیار کرتا ہے۔ صرف اسی کو وہ کام کرنے یا مال تیار کرنے کا حق ہونا چاہئے۔ جو اُس کا مقابلہ کرنا چاہتے ہوں۔ وہ بڑے شوق سے اُس کے ساتھ ٹکر لیں۔ مگر عقل اور تمیز کے ساتھ یعنی اُس سے بہتر کام کر کے یا مال بنا کر۔ نہ کہ زبردستی۔ دھینگا مشتی اور اوچھی چالیں چل کر کسی کا رزق مارنا بڑا جرم ہے کیونکہ اپنے ذاتی منافع کی خاطر دوسرے کو چلتے ہوئے یوں تباہ کر کے رکھ دینا ایک طرح سے اپنے بھائی بندوں کے منہ سے روٹی چھیننے کی کوشش کرنے کے برابر ہے۔ اور یہ بھاری پاپ ہے۔

(۳) تجارت میں سب سے مقدم پبلک کی خدمت کا خیال رکھنا اور اس سے اُتر کر یعنی اس کے بعد اپنے منافعوں کو حاصل کرنے کی فکر کرنا۔ منافع کے بغیر کوئی سا کاروبار بھی کبھی نہیں بڑھ سکتا۔ اگر ایک کاروبار مناسب طریقے اور انتظام کے ساتھ کیا جاوے۔ تو اُس میں ضرور منافع ہوگا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان کو یہ منافع پبلک کی اچھی خدمت کرنے کے عوض میں انعام کے طور پر ملنا چاہئے۔ اور لازمی طور پر یہ ملتا بھی ہے۔ مگر کوئی کاروبار جو صرف منافع کمانے کی غرض سے چلایا جاتا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ منافع پبلک کی اچھی خدمت کرنے کے انعام ہیں اور اچھے منافعے صرف اسی طریقے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

(۴) مال تیار کرنا یہ نہیں کہلاتا کہ اس کے بنانے میں سستے کچے مسالے یا سامان جوڑ دئے جائیں اور

تیار مال خوب اونچی قیمت پر مارکیٹ میں بیچا جاوے۔ مال تیار کرنے کا یہ مطلب ہے کہ مناسب کچے مسالے یا سامان اس مال کے بنانے کے لئے خریدے جائیں اور کم سے کم لاگت لگا کر ان کچے مسالوں کو ایک ایسی شکل میں تبدیل کر کے پبلک کے سامنے پیش کیا جائے جس سے یہ لوگوں کے استعمال کی ایک چیز بنجائے اور پھر مارکیٹ میں اسے بیچا جائے۔ جوئے بازی سٹے بازی اور چالبازیوں سے اس قسم کی ترقی کرنے کے راستے میں بھاری رکاوٹ پڑتی ہے۔

. . . .

بے شک ہماری بہتری کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہم کارخانے لگا کر خوب دھڑا دھڑ مال تیار کیا کریں لیکن اصل میں اس سے بھی زیادہ جس چیز سے فرق پڑے گا وہ یہ ہے کہ اس کی تہہ میں ہماری نیت کیا ہے جب ہماری سچے دل سے یہ نیت ہوتی ہے کہ ہم پبلک کی خدمت کریں تب ہمارا مال تیار کرنا واقعی اصلی پبلک کی خدمت ہے۔ دھن اور صنعت کے موجودہ قاعدے جو سر سے پاؤں تک بناوٹی ہیں اور جنہیں آجکل قانون کے شاندار نام سے پکارا جاتا ہے استعمال کرنے پر جس کثرت سے جھوٹے ثابت ہو رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو بناتے وقت علم اور عقل کی بات تو دور رہی، ٹھیک انکل سے بھی کام نہیں لیا گیا۔ دنیا میں تمام مال اور دھن دولت کی جڑ زمین اور اس کی پیداوار ہے۔ زمین کی پیداوار کو اس کی تمام شکلوں میں اتنی کافی تعداد میں تیار کرنا اور اتنا پائیدار بنانا جس سے لوگوں کا نہ صرف گذارا چل سکے بلکہ وہ اپنی زندگی کا پورا پورا لطف بھی اٹھا سکیں۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ ایک مالی سسٹم قائم کرنے کے واسطے اصل بنیاد یہی ہے۔ ہم چیزیں بنا سکتے ہیں اور مال تیار کرنے کا سوال بہت اچھی طرح سے حل ہو چکا ہے۔ ہم ہر طرح کی چیزیں جتنی چاہیں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں تیار کر سکتے ہیں۔ جہاں تک ہماری روزمرہ کے استعمال آنے والی چیزوں کا تعلق ہے اس کا انتظام نہایت عمدہ ہو گیا ہے۔ اس وقت لوگوں کے دماغ میں بے شمار ایسے طریقے اور تجویزیں بھری پڑی ہیں جن کو استعمال کرنے سے انسان کی جسمانی زندگی حد سے زیادہ مکمل ہو جائے گی مگر اس وقت ہم جو چیزیں بنا رہے ہیں ان میں بہت مصروف ہیں اور ہم اس بات پر کافی غور نہیں کرتے کہ ہم کیوں ایسا کر رہے ہیں۔ مارکیٹ میں مقابلہ بازی یعنی کمپیٹیشن کرنے کا ہمارا سسٹم اور ہماری روز نئی نئی چیزیں بنانے کی عادت غرضیکہ ہماری تمام لیاقتیں اور ہنر آج کل صرف اسی بات میں خرچ ہو رہے ہیں کہ

ہم اپنے کھانے پینے اور رہنے کے واسطے دھڑادھڑ مال تیار کریں اور اس کے ذریعہ خوب کامیابی اور دھن حاصل کریں۔

مثال کے طور پر لوگوں کے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ .. ..

دوسرے آدمیوں یا پارٹیوں کا نقصان کرکے ایک آدمی اپنا ذاتی یا اپنی پارٹی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ کسی دوسرے کو تباہ کر دینے سے کبھی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر کسان مل کر کارخانے داروں کو تباہ کر دیں تو کیا اس سے کسانوں کی حالت بہتر بن جائے گی؟ کیا سرمایہ داروں کو کاریگر اور مزدور تباہ کر دینے سے کبھی فائدہ ہو سکتا ہے؟ یا کاریگروں اور مزدوروں کو سرمایہ دار کو تباہ کر دینے سے کیا کبھی فائدہ ہو سکتا ہے؟

کیا بیوپار میں کوئی آدمی اپنے مقابلے والے کو تباہ کرکے فائدہ حاصل کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ تباہ کرنے والے مقابلے سے کبھی کسی کو فائدہ نہیں ہوا۔ جس مقابلہ سے زیادہ تعداد میں لوگوں کی ہار اور صرف چند ہی شخصوں کی جیت ہوتی ہے جو سینہ زوری سے دوسروں کو دبانا چاہتے ہیں وہ بالکل اُڑا دینے کے قابل ہے جن خوبیوں سے ترقی پیدا ہوتی ہے وہ تباہ کرنے والے مقابلے کے اندر کبھی پائی نہیں جاتیں۔ ترقی ہمیشہ آپس میں نیک نیتی اور دریا دلی کے ساتھ مقابلہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ بُرا مقابلہ ہمیشہ ذاتی ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسان یا پارٹی دوسروں پر زبردستی کرکے اپنا فائدہ کرنا چاہتی ہے۔ یہ ایک طرح کی جنگ ہے۔ اس کی تہہ میں یہ خواہش چھپی ہوئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح دوسرے کا سب کچھ چھین لیا جائے۔ اس میں پوری خود غرضی بھری ہوئی ہے یعنی اس میں انسان کی یہ نیت کبھی نہیں ہوتی کہ وہ بہتر مال تیار کرکے لوگوں کے سامنے گھمنڈ کر سکے۔ نہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے دھندے میں دوسروں کی نسبت پبلک کی زیادہ بہتر خدمت کر سکے اور نہ ہی یہ اُمنگ ہوتی ہے کہ مال تیار کرنے کے نئے نئے طریقوں کو استعمال کرکے اُن کے تجربے کرے۔ اس کے سر پر ایک ہی دُھن سوار ہوتی ہے کہ کسی طرح سے وہ اپنے دھندے کے دوسرے کارخانوں کو بند کرا دینے میں کامیاب ہو جائے تاکہ ساری مارکیٹ اُس اکیلے کے ہاتھ میں آ جائے اور وہ خوب روپیہ کما سکے جب اُس کی یہ خواہش پوری ہو جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آئندہ کو وہ گھٹیا مال بنانا شروع کر دیتا ہے۔

. . . .

اگر ہم اس قسم کے تباہ کرنے والے مقابلے کی کمینی چال چھوڑ دیں تو اس کے ساتھ ساتھ ہمارے دل کے اور بہت سارے وہم اور فضول خیال بھی مٹ جاویں گے۔ ہم کو پُرانے طریقوں اور بزرگوں کے رواجوں نے نہایت سخت جکڑا ہوا ہے۔ اور ایک چیز کا استعمال یا فائدہ ہمارے باپ دادا کے وقت میں ہوا کرتا تھا وہی اب بھی چلا آتا ہے ہمیں کچھ اپنی عقل بھی دوڑانی چاہیئے۔ ہمارے لئے کچھ ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت ہے۔ ہم کچھ چیزوں کو شروع سے ایک طرح استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ اور ہم کچھ چیزوں کو ایک خاص ذریعہ سے باہر بھیجتے رہے ہیں اور جب وہ استعمال کچھ مندا پڑ جاتا ہے یا وہ ذریعہ بند ہو جاتا ہے تو ہمارا وہ دھندا بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں مندی مارکیٹ کے تمام بُرے نتیجے برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر اناج کو لو۔ یونائیٹڈ سٹیٹ میں لاکھوں کروڑوں من اناج جمع پڑا ہے جس کے نکاس کی کوئی ظاہری صورت نظر نہیں آتی۔ اناج کی کچھ مقدار انسان اور حیوان کے خوراک کے طور پر کام آتی ہے۔ مگر اس طرح ساری خرچ نہیں ہوتی۔ شراب پر بندش لگنے سے پہلے اناج کی کچھ مقدار شراب بنانے میں استعمال ہوا کرتی تھی جو کہ بڑھیا قسم کے اناج کا کچھ بہت اچھا استعمال نہ تھا۔ لیکن چونکہ شروع سے ایسا ہوتا چلا آیا تھا اس لئے اناج کی انہی دو طریقوں سے کھپت ہوتی تھی۔ اور جب ایک طریقہ یا راستہ بند ہو گیا تو اناج کے ڈھیروں کے ڈھیر جمع ہونے لگے۔ عام طور پر سٹاک کے جمع ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس اُمید میں بیٹھے رہتے ہیں کہ جب نرخ چڑھے گا تو یہ سٹاک بیچیں گے۔ لیکن اگر ہمارے ہاتھ میں کافی روپیہ آبھی جائے تو بھی کبھی کبھی ہمارے پاس خوراک کے سامان اتنے اکٹھے ہو جاتے ہیں کہ ہمارے لئے اُن کو استعمال میں لا کر ختم کرنا ناممکن ہے۔

اگر خوراک کے سامان اتنی کثرت سے پیدا ہونے لگیں کہ ہم بطور خوراک اُن کو استعمال کر کے ختم نہ کر سکیں تو ہم اُن کے لئے اور استعمال کے ڈھنگ کیوں نہ نکالیں۔ کیا وجہ ہے کہ اناج صرف سوروں کو پالنے اور شراب نکالنے کے کام میں ہی استعمال کیا جائے۔ اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ ہم صرف ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں۔ اور اناج کی مارکیٹ پر جو مصیبت کا پہاڑ گر پڑا ہے اس پر آنسو بہاتے رہیں۔ کیا اناج کے لئے سور کا گوشت بنانے یا شراب نکالنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں رہا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ان دو کے علاوہ اناج کے واسطے اور کوئی استعمال کے ڈھنگ بالکل نہ ہوں۔ ہمیں اناج کو استعمال کرنے

کے اتنے زیادہ ڈھنگ آنے چاہئیں کہ پہلے جو ضروری ضروری استعمال ہیں اُن کے لئے اس کی پوری مقدار لے لینے کے بعد جو باقی بچے اُس کو بغیر ضائع کئے استعمال کرنے کے واسطے ہمارے پاس ہمیشہ کافی طریقے ہوں۔

ایک دفعہ کسانوں نے اناج کو بطور ایندھن جلایا تھا کیونکہ اناج کثرت سے ملتا تھا اور کوئلے کی کمی تھی۔ یہ اناج کو ختم کرنے کا بہت بھدا طریقہ تھا لیکن اس نے دماغ کے اندر ایک خیال پیدا کر دیا۔ اناج کے اندر ایندھن چھپا پڑا ہے۔ اس سے تیل اور الکوہل کی شکل میں ایندھن نکل سکتا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ کوئی آدمی اناج کے اس نئے استعمال کو پکڑ کر کام شروع کرے تا کہ اناج کا جو سٹاک ملک کے اندر جمع ہو گیا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ختم ہو سکے۔

ہمارے پاس ایک کام کو کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ کیوں ہونا چاہئے۔ دو کیوں نہ ہوں تا کہ اگر ایک خراب ہو جائے تو دوسرے سے کام لے لیا جائے۔ اگر سور کے گوشت کا دھندا مندا پڑ جائے تو کسان لوگ کیوں نہ اس قابل ہوں کہ وہ اناج سے اپنے ٹریکٹروں کے واسطے ایندھن نکال سکیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہر چیز کو طرح طرح سے استعمال کرنا سیکھیں یہ ایک اچھا خیال ہے کہ ہر کام و چیز کو ہر جگہ طرح طرح سے استعمال کر کے دیکھا جاوے۔ ہمیں آج تک روپیہ کے استعمال کرنے کا ایک ہی طریقہ آتا ہے۔ جن کے پاس روپیہ کافی ہے اُن کے لئے تو یہ طریقہ بہت ہی اچھا ہے اور سود کھانے اور اُدھار پر روپیہ چڑھا کر دولت مند بننے والوں کے واسطے جو روپیہ اور روپیہ سے چلنے والے کارخانوں کے جن کے ذریعہ خوب روپیہ پیدا اور کمایا جاتا ہے۔ ایک طرح سے ٹھیکہ دار ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور طریقہ نہیں ہو سکتا۔ جن کو یہ طریقہ پسند ہے اُن کو یہ مبارک رہے لیکن لوگوں کو اب پتہ چل گیا ہے کہ جب اُن پر بھیڑ پڑتی ہے تو یہ طریقہ بالکل فیل ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے سارا کاروبار بند ہو جاتا ہے اور سب کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔

اگر دولت مندوں کی حفاظت کے واسطے خاص قانون اور قاعدے بنے ہوئے ہیں تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ عام لوگوں کی حفاظت کے واسطے بھی ایسے خاص قاعدے وغیرہ کیوں نہ بنائی جائیں مارکیٹ میں مندی سے بچنے کے لئے سب سے بڑی حفاظت ہر ایک چیز کے نکاس اور استعمال کی طرح طرح

ے طریقے ڈھونڈنے اور روپے کو مناسب ڈھنگ سے استعمال کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ کاریگروں
ر مزدوروں کے بارے میں بھی ہمیں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ ضرورت ہے کہ نوجوانوں کے کچھ چلتے پھرتے
ستے قائم کئے جائیں۔ جو کھیت پڑنے پر کھیتی باڑی۔ کانوں۔ کارخانوں یا ریلوے میں جہاں بھی ضرورت ہو
کرنے کے لئے فوراً پہنچ جاویں۔ اگر کبھی اس بات کا خطرہ پیدا ہو جائے کہ کوئلے کی کمی ہو جانے کی وجہ
ے سو کارخانوں کی بھٹیاں بند ہو جائیں گی جس کی وجہ سے دس لاکھ آدمی بے کار ہو جائیں گے تو
ر پار اور انسانیت دونوں کے لحاظ سے کیا یہ بہت اچھی تجویز نہیں ہے کہ کانوں سے کوئلہ نکالنے اور
ں گاڑیاں چلانے کے واسطے کافی تعداد میں آدمی اپنے آپ کو بطور والنٹیئر پیش کریں۔ اس دُنیا میں کچھ نہ کچھ
م کرنے کے لائق ہر وقت نکلتا رہتا ہے۔ اور یہ کام ہم نے ہی کرنا ہے۔ چاہے باہر سے یہ نظر آتا ہو کہ دنیا
ے اندر بالکل کچھ کام نہیں رہا اور بیوپاری زبان میں سب کام دھندہ بالکل ٹھنڈا پڑا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک
ص جگہ بالکل کچھ کام کاج نہ ہو مگر کسی دوسری جگہ ہمیشہ کچھ کام کرنے کے واسطے ضرور ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ
ہمیں اپنے اندر ضرور ایسے دستے قائم کرنے چاہئیں جو جہاں بھی اس قسم کا تھوڑا بہت کام نکلے وہاں
و پہنچ کر ضرور اُسے کریں تاکہ ملک میں جہاں تک ممکن ہو سکے بے کاروں کی تعداد کم ہو۔

. . . .

ہر کام اور ہر چیز میں ترقی آہستہ آہستہ ہوا کرتی ہے اور پہلے پہل تھوڑے سے آدمیوں میں نظر
تی ہے۔ جن کے پیچھے چل کر وہاں کے سارے لوگ بھی ویسے ہی کرنے لگ پڑتے ہیں ترقی انسان کے
پنے اندر سے شروع ہوتی ہے جب وہ اُچاٹ دل کی بجائے سچّی لگن سے کام کرنے لگ جاتا ہے
جب وہ اندھیرے میں اِدھر اُدھر ٹٹولنے کی بجائے ایک ٹھیک پختہ راستے پر چل پڑتا ہے۔ جب وہ اپنی رائے
ایک پختہ فیصلہ میں تبدیل کر لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جب وہ ایک کام میں صرف اُمیدوار رہنے کی بجائے
اُس کا اُستاد بن جاتا ہے جب وہ ایک ٹوکری ڈھونے والے مزدور سے بڑھتا ہوا ایک لائق کام گار جس کو
اپنے کام میں سچا مزا آتا ہے۔ بن جاتا ہے۔ جب وہ ماتحت رہنے کی بجائے اس قابل رہ جاتا ہے کہ وہ بغیر کسی
نگرانی یا ہدایت کرنے کے اپنا کام نہایت ایمانداری اور پوری محنت سے کرتا رہتا ہے۔ تب سمجھنا چاہئے کہ دُنیا
نے واقعی ترقی کی ہے۔ یہ ترقی اتنی آسان نہیں ہے۔ آج کل زمانہ بہت نازک ہو رہا ہے کیوں کہ لوگوں کو یہ

سبق پڑھایا جاتا ہے کہ ہر کام آسانی سے ہو جانا چاہیئے مگر ہر کام جس کی کچھ قیمت یا قدر ہے کبھی آسان نہیں ہوگا۔ اور جتنی ہماری ذمہ داری بڑھتی جائے گی اُتنا ہی کام زیادہ مشکل ہوتا چلا جائے گا۔ یہ درست ہے کہ ایک انسان کو فرصت ضرور ملنی چاہیئے۔ ہر ایک آدمی کو جو محنت کرتا ہے کافی فرصت ملنی چاہیئے۔ جو شخص زیادہ سخت محنت کرتا ہے اُس کے لئے اتنی فرصت لازمی ہے کہ وہ آرام کرسی پر کچھ عرصہ کیلئے لیٹ کر آرام کر سکے۔ اور گھر میں بیوی بال بچوں کے ساتھ بیٹھ کر یا کلب میں جا کر اپنی طبیعت کو خوش کر سکے اتنا تو اُس کا پیدائشی حق ہے لیکن جو آدمی محنت مزدوری نہیں کرتا وہ بالکل کسی آرام یا فرصت پانیکا حقدار نہیں۔ یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ ایک آدمی کو اس بات کی اجازت دی جائے کہ وہ بغیر کام کئے اپنے پیٹ پر صرف ہاتھ پھیر کر زندگی کے دن بڑے مزے کے ساتھ بسر کرتا رہے۔ کئی کام بلا ضرورت سخت ہوتے ہیں اُنہیں مناسب بندوبست کر کے نرم بنایا جا سکتا ہے۔ ایک آدمی کو اپنا کام پوری طرح سے کرنے میں سہولت پہنچانے کے واسطے ہر ممکن ترقی اور تجویز استعمال کرنی چاہیئے اور ایک انسان سے وہ کام لینے کی کبھی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ جو فولاد کی مشینوں کے کرنے کے قابل ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کر لینے کے بعد ایک کام آخر کام ہی رہتا ہے۔ اور ایک آدمی جو اپنا کام تن من لگا کر کرتا ہے ضرور مانے گا کہ واقعی یہ کام کہلانے کے قابل ہے۔

یہ خیال رہے کہ کسی آدمی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے لئے یہ فیصلہ کرے کہ میں اتنے کام کروں گا اور اس سے زیادہ نہیں۔ ممکن ہے جو کام اُس کے حصّہ میں آیا ہے وہ اُس کی اُمید سے تھوڑا ہو۔ ایک آدمی کا اصل کام ہمیشہ اتنا نہیں ہوا کرتا جتنا کہ وہ کرنا پسند کرتا ہے۔ ایک آدمی کا اصلی کام وہ ہے جو اُس کو سونپا گیا ہے۔ اس وقت جتنے چھوٹے کام سوسائٹی کے اندر نکلے ہوئے ہیں اُتنے آئندہ نہیں رہیں گے۔ اور جب تک دُنیا میں یہ چھوٹے درجے کے کام موجود ہیں تب تک کسی نہ کسی کو انہیں کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن یہ کوئی وجہ نہیں کہ کیونکہ آدمی کے سپرد چھوٹے درجے کا کام ہے اس لئے اُس کو خمیازہ بھگتنا پڑے گا لیکن ان چھوٹے درجے کے کاموں کی نسبت ایک بات کہی جا سکتی ہے جو کہ بہت سے بڑے کاموں کے بارے میں جو زیادہ ذمہ داری کے بتائے جاتے ہیں کہی جا سکتی اور وہ یہ ہے کہ وہ ملک اور سوسائٹی کے لئے مفید ہیں عزت دار ہیں۔ اور شریفانہ ہیں۔

وقت آگیا ہے کہ ہمیں اپنے تمام کام اور دھندوں میں سے جسمانی مشقت کی سختی اور شدّت کو قطعی طور پر اُڑا دینا چاہیئے۔ کامگاروں کو محنت کرنے پر کبھی اعتراض نہیں ہوتا۔ مگر وہ مشقت کی بے جا اور ناگوار سختی اور شدت سے ضرور گھبراتے اور جی چُراتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اس سختی اور شدت کو جہاں بھی دیکھیں فوراً ختم کر دینا چاہئے۔ جب تک ہم اپنے روزمرہ کے کام کاج اور دھندوں میں سے اس مشقت کی سختی اور شدت کو دور نکال کر پھینک دینے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ تب تک ہم پورے طور پر مہذب کہلانے کے مستحق نہیں ہوں گے یہ ٹھیک ہے کہ کچھ حد تک اس کا علاج نئی نئی ایجادوں کے ذریعہ اب ہو رہا ہے۔ اور ہم بہت حد تک بھاری اور سخت کاموں کو کچھ ہلکا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جن میں لوگوں کی بہت سی طاقت فضول خرچ ہوتی تھی اور وہ کمزور ہو رہے تھے مگر ان بھاری اور سخت محنت کے کاموں کو اتنا ہلکا کر دینے کے باوجود ہم ابھی تک اس بات میں کامیاب نہیں ہوئے کہ ایک کام کو سدا ایک ہی طریقے سے کرنے کا جو بُرا رواج ہے اُس کو بھی کسی طرح دور کر سکیں یہ ایک اور نقص ہے جس کو دور کرنے کی ہمیں کچھ تدبیریں سوچنی چاہئیں تاکہ ایک کام کو سدا ایک ہی طریقے سے کرنے کی بُری رسم اُڑ جائے۔ اور اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو پھر کوئی شک نہیں کہ ہمیں اپنے سسٹم میں سے اور بہت سی خرابیوں کو دور کرنے کے واسطے کئی نئی تبدیلیاں مل جائیں گی۔

. . . .

آج کام کرنے کے جتنے موقعے پیدا ہو گئے ہیں۔ اُتنے پہلے کبھی نہیں تھے۔ اس وقت ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے بہت زیادہ موقعے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ پچیس سال پہلے ایک نوجوان کو بیوپار کا جو سسٹم ملتا تھا۔ اُس سے آج اس میں داخل ہونے والے نوجوان کو بالکل مختلف سسٹم سے واسطہ پڑتا ہے۔ کیونکہ سارا سسٹم ایک قاعدے میں اچھی طرح سے بندھ گیا ہے۔ ایک انسان کو اس میں اپنی من مانی کارروائی کرنے یا دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کا کم موقع ملتا ہے اور بہت تھوڑے ایسے معاملے رہ گئے ہیں جن کے بارے میں اُس کے اکیلے اپنے اختیار سے آئندہ کوئی اندھا دھند فیصلہ کرنے کا اندیشہ ہو۔ موجودہ کامگار ایک طرح سے اپنے کارخانے اور دھندے کا ساجھی دار بن گیا ہے۔ اس لئے اب وہ اپنی من مانی کارروائیاں کر نہیں سکتا مگر پھر بھی یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ کاریگروں اور کامگاروں کے ساتھ لوہے کی مشینوں جیسا سلوک ہونا چاہئے یہ بالکل غلط ہے کہ سارے کام ایک نظام میں بندھ جانے کی وجہ سے لیاقت دکھانے کا موقع جاتا رہا ہے۔

اگر وہ نوجوان ان وہموں میں نہ پھنس کر ٹھنڈے دل سے موجودہ سسٹم پر غور کرے گا تو اُسے پتہ لگے گا کہ جس چیز
کو ابھی تک وہ اپنی ترقی کے راستے کی رُکاوٹ سمجھ رہا تھا وہ اصل میں اُس کی مدد کے ذریعے ہیں۔

فیکٹریاں چلانے کا اصلی منشا یہ نہیں ہے کہ وہاں کام کرنے والوں کو اپنی لیاقت بڑھانے
ظاہر کرنے کا موقع نہ دیا جائے بلکہ ان سے اصلی غرض یہ ہے کہ درمیانے درجے کی عقل کی وجہ سے جو اتنی
چیز ضائع ہو جاتی ہے اور نقصان ہوتا ہے اُس کی روک تھام کی جائے۔ ان کے لگانے کا یہ ہرگز مطلب
نہیں کہ لوگوں کی اُمنگوں کو دبایا جائے اور روشن دماغ آدمیوں کو اپنی پوری لیاقت اور محنت کے ساتھ
کام کرنے سے روکا جائے۔ بلکہ اصلی مراد یہ ہے کہ جو لاپرواہ لوگ ہیں اُن کو سوسائٹی اور ملک کا زیادہ
نقصان کرنے سے کسی طرح ہٹایا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر سستی۔ لاپرواہی۔ آرام طلبی اور بے دلی کو بلا روک
ٹوک پھیلنے کی اجازت دے دی جائے تو اس طرح ہر شخص کا بہت نقصان ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں
ایک فیکٹری کبھی ترقی نہیں کر سکتی اور اس لئے اپنے کامگاروں کو اچھی تنخواہیں نہیں دے سکتیں۔ جب
ایک کارخانہ یا کمپنی اپنے لاپرواہ کامگاروں کو اُن کی آرام طلب طبیعت سے زیادہ کام کرنے پر مجبور کرتی
ہے تو یہ اُن کی اپنی بھلائی کے لئے ہے کیونکہ اس طرح سے اُن کے جسم زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ اُن
کے دل کو زیادہ تسلی رہتی ہے او چین ملتا ہے اور گزارہ کرنے کے لئے اُن کے پاس کچھ دولت بھی جمع ہو
جاتی ہے۔ لیکن اگر ہم ایسے لاپرواہ کامگاروں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی من مانی کارروائیاں کرنے دیتے
تو پھر کیا ہم اپنے کاریگروں اور کامگاروں کو کبھی اچھی تنخواہیں ادا کر سکتے تھے اور اس کے علاوہ ہمارے تیار
مال کرنے کی اپنی رفتار کتنی سُست پڑ جاتی؟

اگر فیکٹری کے اس سسٹم کے ذریعہ جو درمیانے درجے کے عقل کو اونچے درجے پر لے جاتا ہے ایک
کامگار کی لیاقت کو بھی اُبھرنے کا موقع نہیں ملتا۔ تو یہ سسٹم بہت خراب ہے۔ واقعی بہت خراب ہے۔ مگر
ایک سسٹم کو چلانے کے واسطے خواہ وہ کتنا مکمل کیوں نہ ہو۔ لائق آدمیوں کی ہمیشہ ضرورت ہوا کرتی ہے۔
کوئی سسٹم اپنے آپ نہیں چل سکتا۔ اور اس نئے سسٹم کو چلانے کے لئے پرانے کی نسبت اور بھی زیادہ
روشن دماغ آدمی درکار ہیں۔ پہلے کی نسبت اس وقت روشن دماغ آدمیوں کی کہیں زیادہ ضرورت
ہے۔ گو شاید اب اُن سے وہی کام نہ کرایا جائے جو پہلے اُن سے لیا جاتا تھا۔ اس معاملہ کا بھی بالکل تجلی

کی طاقت جیسا حال ہے۔

آج سے پہلے مشینیں انسان کے ہاتھ یا پاؤں کی طاقت سے چلائی جایا کرتی تھیں حالانکہ وہ طاقت اُن مشینوں کے خود اندر موجود تھی۔ مگر اب ہم نے وہ طاقت وہاں سے ہٹالی ہے اور اس کو ایک جگہ بجلی گھر میں اکٹھا کر دیا ہے۔ اسی طرح ہم نے یہ انتظام کر دیا ہے کہ دماغی کام کرنے والے نہایت لائق کامگاروں کو فیکٹری کے ہر کام اور عمل کو خود اپنے ہاتھ سے کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگ فیکٹری سے الگ دور اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے سوچ سمجھ کر نئی نئی تجویزیں اور طریقے نکالتے رہتے ہیں اور تجربے کرتے رہتے ہیں۔

ہر ایک کارخانہ یا دھندا جو بڑھ رہا ہے ساتھ ساتھ اپنے قابل کامگاروں کے واسطے نئی نئی اسامیاں اور جگہیں نکالتا رہتا ہے۔ یہ ترقی کرنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ نئی آسامیاں روزمرہ یا ڈھیروں میں پیدا ہوتی رہیں گی۔ ہرگز نہیں۔ یہ صرف سخت محنت کرنے سے ہی نکلا کرتی ہیں اور ان کو پانے کا صرف وہی کامگار حقدار ہوتا ہے جو اپنا روز کا کام نہایت ہی ہوشیاری اور لیاقت سے کرتا رہتا ہے اور ذرا نہیں گھبراتا اور اتنی محنت کرنے کے باوجود ہمیشہ چست اور چوکس رہتا ہے۔ بیوپار میں چھو منتر کے ذریعہ یا اپنی لیاقت کا گھڑی دو گھڑی بھر چمتکار دکھا کر کام کرنے والے کے لئے بالکل کوئی جگہ نہیں بلکہ یہاں پر ٹھوس اور پائیدار کام ذمّے داری کے ساتھ کرنا ہوتا ہے۔ بڑے بڑے دھندے اور کارخانے چلانے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اُن میں ترقی کرنے کا ہر ایک قدم آہستہ آہستہ اور سوچ سمجھ کر اُٹھایا جائے۔ ایک نوجوان کو جس کے دل میں ترقی کرنے کی بہت اُمنگ ہو لمبی سوچ کرنی اور جلد بازی نہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ ہر کام کو پکا ہونے میں کافی وقت لگا کرتا ہے۔

. . . .

دنیا کے اندر بہت سی تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔ ہم آہستہ آہستہ قدرت کا غلام ہونے کی بجائے قدرت کو اپنے ماتحت کرنا سیکھیں گے۔ آج تک ہم نے علم اور ہنر کی جتنی پونجی اکٹھی کی ہے وہ اصل پوچھو تو بڑی معمولی ہے اور حالت یہ ہے کہ اس ساری پونجی کا زور لگانے کے باوجود اس وقت تک بھی ہمارا گزارہ قدرت کے ذخیروں اور وسیلوں سے ہو رہا ہے۔ اور ہم غلطی سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کے بغیر ہمارا کام

ایک منٹ بھی نہیں چل سکتا۔ ہم زمین کھود کھود کر کوئلہ اور دھاتیں نکال رہے ہیں اور درخت دھڑا دھڑ کاٹ رہے ہیں۔ کوئلے اور دھاتوں کو ہم خوب استعمال کر رہے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ ختم ہو رہے ہیں۔ اور جس تیزی اور رفتار سے درخت کاٹے جا رہے ہیں اُتنے آئندہ سو سال میں نئے پیدا نہیں ہوں گے۔ وہ وقت جلد آنے والا ہے۔ جب ہم سورج کی کرنوں سے ہی اپنے روزانہ استعمال کے لئے حرارت پیدا کر سکیں گے اور ہمیں کوئلہ کے محتاج ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اتنی ترقی تو ہم نے اب تک کر بھی لی ہے کہ ہم پانی کی طاقت سے بجلی پیدا کر کے حرارت حاصل کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ میرا پختہ یقین ہے کہ جوں جوں سائنس بڑھتی جائے گی ہم ایسی ترکیب یا طریقے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس کے ذریعہ ہم اپنی معمولی چیزوں کو اس قدر بہتر بنا سکیں گے جو دھاتوں سے بھی اچھا کام دیں گی۔ مثال کے طور پر صرف روئی کا نام لیا جا سکتا ہے جس کی طرف ابھی تک ہم نے پوری توجہ نہیں دی۔ اور جس کے اندر بے شمار استعمال اور دولت کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ آج کل جیسی لکڑی مل رہی ہے اُس سے کئی گنا بہتر ہم پیدا کر سکتے ہیں۔ مگر ہمارے دل میں دُنیا کے ساتھ بھلائی کرنے کی سچی لگن اور خواہش ہونی چاہیئے ضرورت اس کی ہو کہ ہم میں سے ہر ایک نیک نیتی اور پوری محنت کے ساتھ وہ کام اور کاروبار جو اُس کے حصہ میں آیا ہے کرتا رہے۔

× × × × × × × × ×

سب کچھ ہو سکتا ہے اگر دل میں پورا یقین اور سچی لگن ہو تو پھر ناممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے اور ہماری سب اُمنگیں اور اُمیدیں پوری ہو سکتی ہیں۔